

فروری 2015

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

پاک سوسائٹی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت نمائندہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

باقی و مدیر اعلیٰ محمود ریاض

مدیر — رضیہ جمیل

مدیر منظم — اذریاض

مدیر اعزازی — امت الصبور

فلم ٹیلی وژن — شاہین رشید

اشہارائے — خالہ جیلانی

MEMBER
APNS
CPNE



Copied From



- 224 سحر ساجد 'غزلِ رحمت'
74 بسنتی جردن 'حصارِ ذاتِ دُعا'
36 راشدہ رفعت 'محبتِ زندگی ہے'



- 98 سیما بنت عامر 'آتشِ فشان'
67 نظیر فاطمہ 'اکلوتا'
64 کنیز نور علی 'پالِ سی'
58 فریدہ فرید 'محبتیں بانئیں'



- 263 قابل اجیری 'غزل'
264 شکیب جلالی 'غزل'
264 حمیدہ شاہین 'غزل'
263 علی راسخ 'نظم'

ترجمہ سالانہ بڑے گیسٹری
پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 5000 روپے
امریکہ، نیپال، آسٹریلیا --- روپے

- 10 رضیہ جمیل 'پہلی شمع'
11 شمیم فاطمہ 'حمد'
11 ناصر کاظمی 'نعت'
12 ادارہ 'نئی کی باتیں'



- 31 شاہین رشید 'درستک'
22 شاہین رشید 'یہ مکتبی زبیری'
27 آسیہ رزاق 'شادی مبارک ہو'
285 ادارہ 'شعاع کے ساتھ'



- 246 نبیلہ عزیز 'قصِ سہل'



- 178 سمیرا حمید 'یاد'
108 فرح بخاری 'شہِ خراں طویل سہی'

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



270	خالہ جیلانی	کھلتا کسی پہ	272	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	موسم کے پیکوان	265	صباحہ	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	خوبصورت بنتے	279	واصفہ سہیل	ایمنہ خاتون
			267	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
			282	امت الصور	تاریخ کے جھوٹے
			17	امینہ زرین	سیر و جہاں

فروری 2015

جلد 29 نمبر 6

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے لوہن حسن پر شنگ پر لیس سے چھوڑ کر شائع کیا - مقام ۲۰ پی پی آر سی ایچ ایس - سوٹائی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-3276681/2

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

Copied From Web



دعوتِ حیدر

شعاع کا فروری کا شمار آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اہل مغرب جو مسلمانوں پر انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور عدم برداشت جیسے سنگین الزامات عائد کرتے رہے ہیں، فرانس میں پیش آنے والے حالیہ واقعہ نے انہیں ایک بار پھر موقع فراہم کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی کردار کشی کے لیے وہ سرگرم اور متحد ہو گئے ہیں۔ مغربی میڈیا اس مہم میں پیش پیش ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا پیغام پندرہ سو سال سے دہریوں میں اجالا کر رہا ہے۔ آپ کی تعلیمات قیامت تک انسانیت کی راہوں کو روشن کرتی رہیں گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔ اہل مغرب جانتے ہیں کہ ایک عام سائے عمل مسلمان بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا جذبات و احساسات رکھتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا شرانگیز اظہار رائے کس سنگین اظہار عمل کو جنم دے سکتا ہے۔ یورپ کے اہل علم اور دانش وروں کو سوچنا چاہیے کہ آزادی اظہار کے نام پر شرانگیزی کر کے وہ دنیا کو کس طرف لے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں پر تنگ نظری اور بنیاد پرستی کا الزام لگانے والے کس انتہا پسندی اور تعصب کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

چالیس ملکوں کے سربراہان ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلے اور لاکھوں افراد نے ان کے ساتھ یک جہتی کا مظاہرہ کیا۔ آزادی اظہار کے ان نام و نہاد علم برداروں کے لیے خود ان کے روحانی پیشوا پوپ فرانسس کا یہ تبصرہ بہترین جواب ہے۔

”آزادی اظہار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر کوئی میری ماں کے لیے نازیبا الفاظ استعمال کرے تو اسے میرا گھونسا کھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے“

آزادی اظہار کی حدود نہ صرف مغربی میڈیا بلکہ ہمارے میڈیا کو بھی مقرر کرنا ہوں گی۔

اس شمارے میں،

- ، قرآنِ بخاری کا مکمل ناول۔ شام خزاں طویل سہی،
- ، سمیر حمید کا مکمل ناول۔ ”یارم“ تکمیل کے مراحل میں،
- ، لبنی جدون، راشدہ رفعت اور سحر سابد کے ناولٹ،
- ، سیما بنت عامر، نظیر فاطمہ، فریدہ فرید اور کنیز نور علی کے افسانے،
- ، نی ای فنکارہ۔ یمنی زیدی سے ملاقات،
- ، بیٹا کر میردو جہاں کرنا۔ آئندہ زیدی کا تبصرہ،
- ، معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- ، پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ، خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
- فروری کا شمار آپ کو کیا سال گا، آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔



دل کی دُنیا میں ہے روشنی آپ سے
ہم نے پائی نئی زندگی آپ سے

کیوں نہ نازاں ہوں اپنے مقدر پہ ہم
ہم کو ایمان کی دولت ملی آپ سے
کل بھی معذور تھا آپ کے نور سے
ہے منور جہاں آج بھی آپ سے

دُشمنوں پر بھی درِ رمتوں کا کھلا
راہ و رسمِ محبت چلی آپ سے
دل کا غنچہ چمکتا ہے صلی علی
اپنے گلشن میں ہے تازگی آپ سے

ختم ہے آپ پر شانِ پیغمبری
یہ روایت مکمل ہوئی آپ سے

نامر کاظمی



خدا یا تو رحیم و مہربان ہے
تیرا لطف و کرم سب پر عیاں ہے
تو ہے موجود ہر ذرے میں لیکن
تیرا پس کر زنگا ہوں سے نہاں ہے
تیرا مشکور ہے ایک ایک ذرہ
تیرا ممنون یاں ہر انس و جان ہے
کھلے ہیں بھول تیرے اذن ہی سے
تیرے ہی حکم سے دریا رواں ہے
تو ہی مالک ہے ہر اک شے کا مولا
زمین تیری، تیرا ہی آسمان ہے
جسے بخشتی ہے تو نے اپنی رحمت
عموں کے دریاں وہ شاد ماں ہے
نہیں ہے فکر پھر اس کو کسی کی
تیرا کلمہ اگر وردِ زباں ہے

شمیم ناملہ



عشاء کے بعد بات چیت کی کراہت

اس سے مراد وہ بات چیت ہے جو اس وقت کے علاوہ دیگر اوقات میں جائز ہے اور اس کا کرنا اور چھوڑنا دونوں برابر ہیں۔ لیکن وہ بات جو اس وقت کے علاوہ دیگر اوقات میں حرام ہو تو وہ اس وقت (عشاء کے بعد) زیادہ حرام اور زیادہ مکروہ ہوگی۔ لیکن بھلائی کی بات جیسے علمی مذاکرہ، نیک لوگوں کی حکایت، عمدہ اخلاق کا تذکرہ، مہمان کے ساتھ اور کسی ضرورت مند وغیرہ کے ساتھ گفتگو کرنا، تو اس میں کوئی کراہت نہیں بلکہ یہ مستحب (پسندیدہ) ہے۔ اسی طرح کسی عذر یا سبب کی وجہ سے بات کرنے میں بھی کوئی کراہت نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں جن کا میں نے ذکر کیا ان پر صحیح حدیثیں دلالت کرتی ہیں۔ (یہ احادیث ملاحظہ ہوں)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء سے پہلے سونے کو اور عشاء کے بعد بات چیت کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) عشاء سے قبل سونے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح عشاء کی نماز فوت ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے اور عشاء کے بعد جائز بات چیت اس لیے ناپسندیدہ ہے کہ اس سے سونے میں تاخیر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان کے لیے تہجد یا فجر کے وقت اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے اس صورت میں گویا نماز فجر کے فوت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان عشاء کی نماز کے فوراً بعد سو جائے تو اس لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ اس کی دن کی سرگرمیوں کا

اختتام نماز پر ہو گا جو الفضل ترین عمل ہے۔

(2) یہ بھی یاد رہے کہ جب عشاء کے بعد بات چیت ناپسندیدہ ہے تو دوسرے کام بھی جن میں کوئی دینی فائدہ اور شرعی غرض نہیں ہے، مکروہ ہوں گے جیسے کھیل کود، تاش بازی، شطرنج وغیرہ اور آج کل کی عالمی لعنت ٹیلی ویژن اور ویڈیو وغیرہ دیکھنا۔ یہ ساری چیزیں تو ویسے بھی حرام ہیں۔ عشاء کے بعد ان لغویات میں مصروف رہنا اور بھی زیادہ حرام ہوگا۔ اسی طرح امام نووی رحمۃ اللہ نے علمی مذاکرے وغیرہ کو جو جائز بلکہ مستحب قرار دیا ہے تو یہ بھی مشروط ہے بروقت نماز فجر کی ادائیگی کے ساتھ۔

پیش گوئی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں عشاء کی نماز پڑھائی۔ پس جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا۔

”بھلا بتلاؤ تو سہی“ یہ رات کون سی ہے؟ بے شک جو شخص آج روئے زمین پر زندہ ہے، صدی کے پورے ہونے تک وہ باقی نہیں رہے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ آج کی رات کے بعد جو زندہ ہیں، وہ صدی کے راس (پورے ہونے یا سرے) پر باقی نہیں رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پہلی صدی ہجری کے اختتام تک وفات پا گئے۔ سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی

ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ ہیں جن کا انتقال ایک سو اسی ہجری میں ہوا یعنی آپ کے فرمان کے پورے سو سال بعد۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔
(2) اس میں عشاء کے بعد ضروری باتیں اور علم سے متعلق گفتگو کا دوازہ ہے۔

عشا کی نماز تاخیر سے پڑھنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے رہے۔ چنانچہ آپ ان کے پاس تقریباً "آدھی رات کو آئے اور ان کو عشاء کی نماز پڑھائی" (حضرت انس فرماتے ہیں) پھر ہمیں خطبہ دیا جس میں فرمایا۔
"سنو! بے شک بعض لوگ نماز پڑھ کر سو گئے اور تم جتنی دیر انتظار کرتے رہے برابر نماز ہی میں رہے۔" (بخاری)

فائدہ : اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ عشا کی نماز نصف رات تک مؤخر کی جاسکتی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس کے لیے جاگنا بھی جائز ہے تاکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جاسکے۔ تیسری بات یہ کہ انتظار کی ساری مدت نماز میں شمار ہوگی اور اس حساب سے زیادہ اجر و ثواب ملے گا۔

شوہر کی اجازت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ خاوند کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر روزہ رکھے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اس کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو داخل ہونے کی اجازت دے۔" (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل : (1) روزے سے مراد نفلی روزہ ہے۔ علاوہ ازیں اسی طرح دیگر نفلی عبادات ہیں مثلاً "نفلی نماز اور تلاوت وغیرہ" یہ سب کام خاوند کی موجودگی میں خاوند کی اجازت کے بغیر کرنے جائز نہیں۔

(2) اسی طرح خاوند کی رضامندی کے بغیر عورت کو گھر میں اپنے محرم کو بھی داخل ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ چہ جائیکہ غیر محرم مردوں اور رشتے داروں کو۔ البتہ جن محرموں کے لیے اس نے صراحتاً "اجازت دے رکھی ہو یا اس پر وہ خاموش رہتا ہو تو ان کو عورت گھر کے اندر آنے کی اجازت دے سکتی ہے۔

امام سے پہلے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کیا تمہارا ایک آدمی جب اپنا سر امام سے پہلے اٹھاتا ہے اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر بنا دے یا اللہ اس کی صورت کو گدھے کی صورت میں بدل دے۔" (بخاری و مسلم)
فائدہ : اس میں امام سے پہلے کرنے کی وعید بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کے سر یا شکل و

صورت کو گدھے کے سر یا صورت میں بدل دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس لیے مقتدی کو ہر کام امام کے بعد کرنا چاہیے۔ امام سے پہلے رکوع یا سجدے میں جانا یا پہلے سر اٹھانا کوئی اور کام پہلے کرنا سخت گناہ اور نہایت خطرناک ہے۔

نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی کراہت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ : انسان کے دائیں بائیں دو پہلو ہیں، انہیں کوکھ کہا جاتا ہے۔ نماز کی حالت میں ان پہلوؤں (کوکھوں) پر ہاتھ رکھنا تکبر کی علامت ہے جب کہ نماز تو سرا سر بارگاہ الہی میں عجز و نیاز مندی کے اظہار کا نام ہے۔ تاہم پہلو میں درد ہو اور اس کی وجہ سے کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی ضرورت پیش آجائے تو بات اور ہے۔ اس وقت ایسا کرنا جائز ہوگا۔

نماز سے پہلے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ ”کھانے کی موجودگی میں نماز نہیں اور نہ اس وقت جب کہ پیشاب یا خاٹے کی شدید حاجت ہو۔“ (مسلم)

فائدہ : یہاں نفی بمعنی نفی ہے، یعنی کھانے یا پیشاب یا خاٹے کی حاجت کے وقت کوئی شخص نماز نہ پڑھے۔ لیکن یہ حکم ایسے شخص کے لیے ہے جس کو شدید بھوک لگی ہو اور کھانا بھی سامنے تیار ہو۔ کیونکہ اس صورت میں وہ کھانے سے پہلے نماز پڑھے گا تو سکون اور خشوع و خضوع سے نماز نہیں پڑھ سکے گا۔ اسی طرح پیشاب یا خاٹے کی ضرورت بھی شدید ہو تو پہلے قضا کی حاجت کا اہتمام کرے اور پھر نماز پڑھے۔

نماز میں آسمان کی طرف دیکھنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ اپنی نماز میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔“ چنانچہ اس کی بابت آپ کا جواب سخت ہو گیا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”لوگ اس سے باز آجائیں ورنہ ان کی نگاہیں اچھلی جائیں گی۔“ (بخاری)

فائدہ : نماز میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا خشوع و خضوع کے منافی ہے اس لیے اس پر سخت وعید فرمائی گئی ہے۔ تاہم نماز کے علاوہ مثلاً ”دعا کے وقت یا غور و فکر کے وقت آسمان کی طرف نگاہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

بغیر نذر کے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کی کراہت کا بیان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں ادھر

ادھر دیکھنے کی بابت پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یہ ایک جھپٹ ہے جس کے ذریعے شیطان بندے کی نماز کا کچھ حصہ اچک لیتا ہے۔“ (بخاری)

فائدہ : جھپٹ یا اچک لینے کا مطلب ہوتا ہے کسی کی غفلت اور بے خبری میں نہایت تیزی سے اس کی چیز لے لینا۔ جب انسان نماز میں خشوع و خضوع کے بجائے ادھر ادھر دیکھتا ہے تو یہ گویا انسان کی غفلت اور بے خبری ہے جس سے شیطان فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کی نماز کو بے اثر کر دیتا ہے۔

قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت کا بیان

حضرت ابو مرثد کناز بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”قبروں کی طرف رخ کر کے نماز مت پڑھو اور نہ ان کے اوپر بیٹھو۔“ (مسلم)

فوائد و مسائل : (1) قبروں کی طرح رخ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح مشرکین کے ساتھ مشابہت ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں غیر اللہ کی تعظیم کا پہلو بھی اس سے نکلتا ہے جو انسان کو شرک کی طرف لے جاتا ہے۔

(2) قبروں پر بیٹھنے سے انسان کی تذلیل ہوتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو توقیر و تکریم سے نوازا ہے۔ اس لیے ان دونوں کاموں سے بچنا چاہیے۔

نمازی کے آگے سے گزرنے کی حرمت کا بیان

حضرت ابو جہیم عبد اللہ بن حارث بن صمد انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والے شخص کو یہ علم ہو جائے کہ اس کا کتنا گناہ ہے تو وہ گزرنے کے

بجائے چالیس تک کھڑے رہنے کو اپنے لیے بہتر سمجھے گا۔

حدیث کے راوی بیان کرتے ہیں، مجھے یاد نہیں کہ آپ نے چالیس دن، چالیس مہینے یا چالیس سال فرمایا تھا۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) اس سے معلوم ہوا کہ نمازی کے آگے سے گزرنا نہایت سخت گناہ ہے۔ نمازیوں کو بھی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ سترے یا ستون کے بغیر عام گزر رکھ کر کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھیں۔ اس سے یا تو گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے یا مسئلے سے ناواقف لوگ آگے سے گزرتے رہتے ہیں۔

(2) اگر سترہ وغیرہ نہ ہو تو کتنے فاصلے سے نمازی کے آگے سے گزرنا جائز ہے، اس کا اندازہ تین میٹریا تین صف کیا گیا ہے۔ مزید احتیاط کے طور پر چار پانچ صف کا اندازہ کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔

جمعے کے دن کو روزے کے لیے اور جمعے کی رات کو نماز پڑھنے کے لیے مخصوص کرنے کی کراہت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم جمعے کی رات کو دو سری راتوں کے درمیان سے قیام (نفل نماز وغیرہ) کے لیے خاص نہ کرو اور جمعے کے دن کو دو سرے دنوں کے درمیان سے روزے کے لیے خاص نہ کرو، مگر یہ کہ جمعہ اس مدت میں آجائے جس میں تمہارا ایک آدمی روزے رکھتا ہو۔“ (مسلم)

فائدہ : جیسے ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھنا کسی شخص کا معمول ہو، اس میں جمعے کا دن آجائے یا عاشورے یا عرسے کا روزہ رکھتا ہو، اس میں جمعہ کا دن آجائے یا ایام بیض کے روزوں میں جمعہ آجائے یا اس نے نذر کے روزے شروع کر رکھے ہوں، ان میں جمعہ آجائے۔ ان تمام صورتوں میں جمعے کے دن روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ صرف بطور خاص جمعے کے دن کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

جمعہ کے دن کا روزہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”تم میں سے کوئی شخص جمعے کے دن روزہ نہ رکھے۔ ہاں، اس کے ساتھ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کا روزہ ملا لے (تو پھر کوئی حرج نہیں)۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں جمعے کے دن روزہ رکھنے کی ایک اور صورت کا بیان ہے کہ، ”نعرات یا ہفتے کے دن کا روزہ ساتھ ملا لیا جائے تو ٹھیک ہے۔“

ممانعت

حضرت محمد بن عباد بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔

”کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعے کے دن کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے؟“ انہوں نے فرمایا ”ہاں۔“ (بخاری و مسلم)

جمعہ کا روزہ

ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہ بیان فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (ایک مرتبہ) جمعے والے دن ان کے پاس تشریف لائے جب کہ وہ روزے سے تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا۔

”کیا تم نے کل روزہ رکھا تھا؟“

انہوں نے عرض کیا ”نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کیا تمہارا ارادہ کل کا روزہ رکھنے کا ہے؟“

انہوں نے عرض کیا ”نہیں۔“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”روزہ افطار کر لو۔“ (بخاری)

فائدہ : اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے صرف جمعے کا روزہ رکھا ہو تو اسے توڑنا ضروری ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

(3) کھلائے پلائے جانے سے، مراد بھی روحانی قوت ہی ہے نہ کہ روزے کی حالت میں کسی خصوصی غذا کا اہتمام، کیونکہ کھانا پینا تو روزے ہی کے منافی ہے۔

قبر پر بیٹھنے کی حرمت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تم میں سے کسی شخص کا انگارے پر بیٹھنا، جو اس کے کپڑوں کو جلا دے اور اس آگ کا اثر اس کی جلد تک پہنچ جائے، کسی قبر پر بیٹھنے سے بہتر ہے۔“ (مسلم)

فائدہ : قبر پر بیٹھنے میں مردے کی اہانت کا پہلو ہے، اس لیے اس کو بھی سخت گناہ قرار دیا ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

قبر کو پختہ کرنے اور اس پر عمارت (قبہ وغیرہ) بنانے کی ممانعت

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ کیا جائے، اس پر بیٹھا جائے اور اس پر کوئی عمارت بنائی جائے۔ (مسلم)

فائدہ : قبروں کو پختہ کرنا ایک تو فضول خرچی ہے، کیونکہ اس سے کوئی فائدہ مردے کو نہیں ہوتا۔ دوسرے، اس میں فوت شدگان کی ایسی تعظیم ہے جو انسان کو شرک کی طرف لے جاتی ہے۔ قبروں پر قبہ اور گنبد وغیرہ بنانے کا بھی یہی معاملہ ہے اور قبروں پر بیٹھنا مکرم انسانیت کے منافی ہے۔ اس لیے ان تینوں کاموں سے روک دیا گیا ہے۔



بغیر کھائے پیے دو دن یا زیادہ دن مسلسل روزہ رکھنا

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال کا روزہ رکھنے سے منع فرمایا۔ صحابہ نے عرض کیا

”آپ خود تو وصال کرتے ہیں (بغیر کھائے پیے مسلسل روزہ رکھتے ہیں؟“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”میں تم جیسا نہیں ہوں، مجھے تو (اللہ کی طرف سے) کھلایا پلایا جاتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : (1) بعض شرعی معاملات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خصوصی احکام تھے جن کی رو سے، بعض چیزیں آپ پر واجب تھیں امت پر وہ واجب نہیں، آپ کے حق میں وہ جائز تھیں، امت کے لیے ان کا جواز نہیں ہے۔ ایسی چیزیں آپ کی خصوصیات کہلاتی ہیں جن میں امت کے لیے آپ کی اقتداء کرنا جائز نہیں ہے بلکہ گناہ ہے۔ ان ہی خصوصیات میں سے ایک صوم وصال ہے جس کا مطلب ہے بغیر کھائے پیے مسلسل کئی دن کا روزہ رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو صبر و تحمل کی جو خصوصی قوت عطا فرمائی تھی، اس کی وجہ سے آپ روزوں میں وصال فرمایا کرتے تھے لیکن افراد امت میں وہ قوت نہیں کہ وہ اس کا تحمل کر سکیں اس لیے ان کے لیے وہ جائز نہیں۔

(2) میں تم جیسا نہیں کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ نے مجھے جو خاص قوت عطا کی ہے، اس سے تم محروم ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہی نہیں۔ کیونکہ یہ مطلب انما انا بشر مثلکم نص قرآنی کے خلاف ہے۔

مجموعہ محمد خالد خستہ (سفرنامے)

مصنف: محمد خالد خستہ

تبصرہ: امانت زین

دنیا کیا ہے؟
خانہ بدوش!

ہر اکلا مرہلہ۔ پچھلے مرحلے سے جدائی کا تقاضا کرتا ہے۔ بچپن، جوانی، رشتے، صحت، عروج۔ سب کچھ چھوڑتے چھوڑتے ہنسی خوشی۔ دنیا چھوڑنے کی صلاحیت موجود ہو تو یہ منظر ہے اس عنصر کا کہ مجمع و حرص سے محفوظ ایک دل ہے جو درویش کا ہے! کیونکہ بس درویشی ہی وہ ہنر ہے جو آبلہ پائی کے ان تمام مرحلوں سے گزرنے کا آسان نسخہ ہے!

احساس، خیال کو پنہائیاں عطا کرنے والا عنصر ہے۔ اور اس کا مزہ۔ سمندر کی وسعت اور گہرائی سے مماثل۔ دل کا مقام ہے۔ ایک شفاف دل کا عطا ہونا۔ حصول لطف کا بے مشکل ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ ہر لمحہ نیرنگی خیال، سمجھ ایسی ہمیشہ ثابت ہوتی ہے کہ چار دن کی اس دنیا میں کہ جس کو بے ثبات کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سرشاری کے عالم میں۔ ایسی بھرپور زندگی گزار جاتے ہیں جو تار و کامیاب تو ہوتی ہے۔ قابل رشک و تقلید بھی ٹھہرتی ہے!

زیر نظر کتاب صاحب کتاب کے ان اوصاف کو آپ سے متعارف کرواتا ہے اور کیا مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے کہ صاحب کتاب کو پتہ کیا جائے یا کتاب کو کس طرح دونوں کو مربوط کیا جائے؟

خیر۔ چلتے ہیں دلچسپ سفر ناموں کے مجموعے کی جانب۔ جہاں آپ کے لطف اور خیال کو بھی پنکھ عطا ہوتے ہیں!

”تب ہم پہاڑیوں سے باہر ایک میدان میں نکل آئے یہ پہاڑیاں اب ایک سرخ خواب کی طرح

ہمارے بائیں کوڑھلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ بھوہروں کی مملکت ختم ہو چکی تھی۔ ہم کپاس کے ایک کھیت کے پاس سے گزرے، جس کے حاشیے پر شان دار درخت ایک زمردیں قطار کی طرح صف باندھے کھڑے تھے۔ ڈوڈوں میں کپاس کے پھول سفید

ہیروں کی طرح دمک رہے تھے۔ مجھے اس سے پہلے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ کپاس کا کھیت بھی اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے۔ مگر کپاس کا یہ کھیت تقریباً ”پہلا منظر تھا“ جس نے پہاڑوں کے منظر کی یکسانیت اور یک رنگی کو توڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے اچانک باغ ارم کی طرح مہک اٹھا۔ اس کے تصور سے اب بھی میرا دل اچھلنے لگتا ہے۔“

”اگر آپ ابدیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ڈھیلو سے نوں کوٹ تنک اونٹ پر سوار ہو کر رات کے وقت سفر کرنے کا مشورہ دوں گا۔ سورج غروب ہوتے ہی اس سفر میں ابدیت رخنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سفر کہیں ختم نہیں ہوگا۔ ریت کے ٹیلے ایک دوسرے کے بعد، موت کی سی اٹل ناگزیریت کے ساتھ آتے ہیں۔ اور مسافریوں محسوس کرتا ہے جیسے بقا کی اس بے پایانی میں اسے ان ٹیلوں سے قطعی کوئی مضر نہیں۔“

”اگر کوئی حیوان مشین سے کسی طرح مناسبت رکھ سکتا ہے تو وہ صرف اونٹ ہے۔ اس سے زیادہ مطمئن، بے اعتنا اور آسودہ خاطر اور کوئی جانور نہیں۔ اسے غور سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنی خوراک میں بھی دلچسپی نہیں لے رہا، تاہم یہ ایک ناقابل تصور مقدار نکل جاتا ہے۔ ایک جگہ پر ٹادیر بیٹھے رہتا اس

ہوئے مضبوط جھٹے والا یہ شخص 'بروباری'، تحمل، خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کا یہ پتلا۔ رسول علی کا مذہب صرف ایسا ہی شخص دنیا میں پھیلا سکتا تھا۔ اس نے مذہب کی سچی روح اپنے اندر قلیل کر لی تھی اور اس کا دکھتا ہوا چہرہ اس کی اندرونی روشنی کا پتہ دیتا تھا۔ وہ ایک مذہبی جنونی نہ تھا۔ ان آدمیوں میں سے نہیں جو خدا کا چغہ پہن کر اپنے ہم نفسوں پر حج بن کر بیٹھتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب متعین کر دیتے ہیں۔

ہر سفر ایک مہم نہیں ہو سکتا۔ اس کو مہم بنانے کے عناصر دریافت اور حصول طلب کی سچی لگن ہیں۔ سو ہر سفر کے اختتام پر فہم و ادراک کے نئے مہمان جہان ہمراہ ہوتے ہیں!

”مذہب میں جو حقیقی طور پر خوفناک اور شیطانی

غصہ ہے وہ جنون کا ہے اور میری نظر میں ایک مذہبی دیوانے سے بڑھ کر قاتل نفرت اور گھناؤنا شخص اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جنون آدمی کا سب سے ذلیل جبلی جذبہ ہے۔ یہ نفرت کی دیوی کو پیدا کرتا ہے۔ نفرت ہمیشہ تباہ کرتی ہے اور نفرت پر جو کچھ پلتا ہے زندہ رہنے والا نہیں ہوتا۔“

یاد رہے کہ یہ نظریہ ہر مذہب کے حوالے سے مربوط ہے!

”ہمارے گائیڈ نے جو ایک نورانی وجود کے بلکے قدموں سے چلتا جاتا تھا، ہماری ڈھارس بندھائی کہ جمیل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس کے یقین دلانے کے باوجود یہ پہاڑ نہ ختم ہونے والا ثابت ہوا۔ راستہ اس کے ارد گرد ایک سانپ کی طرح سکڑتا، پٹتا چلا گیا تھا۔ بعض جگہ یہ راستہ آدمی کے پاؤں کے سہارے سے بھی باغی ہو جاتا اور وہاں سے گزرنے کے لیے چٹانوں کی نوکوں اور کنکروں کو پکڑنا پڑتا۔ ایک خاص نم دار جگہ کا تصور کر کے مجھے اب بھی پسینہ چھوٹ جاتا ہے۔ یہاں راستہ یک لخت ختم ہو جاتا تھا اور تین چار فٹ خلا کے بعد یہ پھر شروع ہو جاتا تھا۔ خلا نیچے چٹانی کھائیوں سے کوئی بائیس سو فٹ بلندی پر ہو گا۔ پاؤں کی

کے جذبات پر (اگر اس کے کوئی جذبات ہوتے ہیں)۔ ظاہری طور پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا سارا دن مسلسل چلتے رہتا۔ میرے خیال میں کسی اور حیوان میں اتنی قوت، برداشت اور لاپرواہی نہیں جتنا اونٹ میں اور اگر اسے بزرگوں نے صحرا کے جہاز کا لقب دیا ہے تو وہ بالکل راستی پر تھے۔ بزرگ بھی کبھی سچی باتیں کہہ جاتے تھے میرے دوستو!“

یہ ذکر ہے، 1945ء میں تھر کے گاؤں ڈھلو سے نوں کوٹ تک کے اس سفر کا جو اونٹ پر بیٹھ کر طے کیا گیا۔ صحرا کی چاندنی رات کا حسن، ساربان کے نغمے، درختوں کے مہیب سائے میں ڈھلتی ہوئی تخیل کی وارداتیں۔ اور پھر صبح کے ظہور کا دل آویز بیان۔ صبح

جس کے لیے ”عناصر کی کروٹوں میں سے ایک یہی کروٹ مجھے سب سے زیادہ اور خوب صورت“ کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔

مسافر کی عمر اس وقت 25 سال تھی!

دوسرا سفر جو انہوں نے ایک ایسے شخص سے ملاقات کی بنا پر رکھا جو دور افتادہ علاقے میں محض اپنے محدود وسائل سے طلباء کی تعلیم کے لیے دن رات وقف کیے ہوئے تھا۔ یہ سفر سائیکل پر طے ہوا۔ اور راستے میں چلنے والے تمام کروار، مناظر کا احوال کتنی آسانی اور روانی سے ہم تک پہنچتا ہے!

”یہ ایک وسیع رات تھی۔ محرم کی تیسری کا چاند ایک زیر درانی کی طرح تاریک، خمیلی آسمان میں متعلق تھا۔ اس کی دھار کی زد میں ایک سفید چنچل ستارہ مسکرا رہا تھا۔ مولوی فقیر اللہ کا غریبانہ کوٹھا مسجد، ارد گرد طالب علموں کے حجرے، مدھم اور براسرار کھیتوں کی وسعت میں ایک نیلے جھپٹے کا لحاف، اوڑھے خاموش پڑے تھے۔“

”یہ ریاستی و قلعہ عالم جس کا علی فقہ اور حدیث کا مطالعہ وسیع تھا جو مجسم طہانیت اور رضا تھا جو فولاد کے مجسمے کی طرح ٹھوس اور دن کی طرح ایمان دار اور بے باک تھا۔ کھلی ہواؤں اور صالح خوراک کے بنے

ذرا سی چوک سے آدمی گر کر نیچے چٹانوں پر پات پاش ہو سکتا تھا۔ ہم سب کے چہرے خوف سے سفید ہو گئے، مگر آخر الامر ہم ایک ایک کر کے چٹان کے سوراخوں میں پاؤں رکھتے دوسری طرف پہنچ گئے۔ اپنے گہرے اور شفاف اور اک پر ابھرنے والے ہر عکس کو بڑھنے والے کے ذہن پر مرتسم کرنے کی صلاحیت جزئیات نگاری کہلاتی ہے اور ارد گرد موجود تمام عناصر کا مشاہدہ قاری کو مربوط تسلسل سے جوڑے رکھتا ہے!

اس پہنچ دار راستے پر چلتے ہوئے ہم پہاڑ کے ایک کونے پر آئے اور یہاں اچانک ہماری نظریں فطرت کے ایک بے مثل نظارے پر پڑیں اور ایک لمحے کے لیے ہمارے سانس رک گئے، ہم دم بخود ہو کر اس معجزے کو دیکھنے لگے۔

نیچے جنگلوں سے ڈھانپے ہوئے چٹانی نشیبوں اور بلندیوں کے درمیان ایک زریں دھند کے میدان میں سیف الملوک جھیل یا قوت — کی طرح جڑی ہوں تھی۔ سفید برف کے تودے اس کی صاف سبز سطح پر تیر رہے تھے ان میں سے چند اپنے خاص زاویے کی وجہ سے سورج کی روشنی میں خون سا چھلکا رہے تھے۔ جھیل کے مشرقی کونے سے کچھ دور ایک بڑا شکوہ برف سے سفید پہاڑ اپنا مغرور سر اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ تراشا ہوا بلور تھا۔ اور اسی لیے وہ اسے شیشہ پہاڑی کہتے ہیں۔ اس آسمانی منظر کو دیکھ کر ہماری سب تھکاوٹ گویا جادو کے اثر سے اتر گئی۔

یہ کائناتی منہم تھی جو 3500ء میں سر کی گئی اور ہر منہم اپنے آغاز سے انجام تک کے ہر مرحلے، ہر پڑاؤ، ہر دریافت، ہر کردار، ہر منظر کی مجسم تصویر ہے۔ وہ سفری صعوبتیں ہوں یا سہولتوں کی عدم دستیابی، شہوں کے نام ہوں یا کھیت کھیلان۔ خانہ بدوش قافلے، موٹی اور ان کے چرواہے، چٹکی ہوئی چاندی یا ڈوبتے ابھرتے سورج کے رنگوں کا بیان۔ ہم ان مناظر کو نئی حیرت اور خوشی کے ساتھ دیکھتے ہیں!

”کئی قسموں اور قوموں کے، پھسوں اور پسوں نے میرے بستر کو ایک تڑپا دیئے والا دینے بنالیا، لیکن وہاں کا ایک بدترین عذاب مکعب ال تھیں۔ کھیاں وہاں ایسے اونچے مقام پر اور سرد موسم میں کیوں تھیں یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ بہر حال وہ وہاں موجود تھیں اور جھنڈوں میں جھنجھکتی ہوئی یا خار کرتی ہوئی نتھنوں اور کانوں میں کھسی پڑتی تھیں، کبل کے نیچے آکر قیصر کے گلے یا آستین میں سے انسانی جلد تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈتی تھیں، ایک ٹھنڈے تک یہ سزا بھگتنے کے بعد میں نے سونے کی خواہش کو خیر باد کہہ دیا اور پائپ سگا کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔“

”ہم ایک سیلون میں جا گئے۔ یہ ایک بے انتہا غلط اور تاریک جگہ تھی۔ حجام صورت سے ایک قاتل معلوم ہوتا تھا، مگر ایک بار اندر جا کر پلٹنا ممکن تھا۔ میں نے ایک بالکل کندا سترے سے حجامت کرائی۔“

جانبیہ سفر کے بارے میں ان کی رائے۔
”مگر ایک شخص میں خلتہ بدوشی اور سفر کا اصل جذبہ نہیں، اگر وہ چیزوں اور اپنے ہم جنسوں کو ایک شاعر کی روح سے دیکھنے سے قاصر تو ایسے آدمی کے لیے بہتر ہے کہ وہ سفر نہ کرے۔ ایسے آدمی کے لیے سفر میں نفع نہیں۔“

”اپنے سفر کے اختتام پر ہم نہ صرف جسمانی طور پر زیادہ صحت مند تھے بلکہ ہر طریق سے پہلے سے زیادہ سیانے اور زیادہ بہتر آدمی تھے۔ سوائی منہم نے ہماری رگوں میں گردش کرنے ہوئے خون کو نیا کر دیا تھا، ہمارے دماغ پر جسے ہوئے میل کو دھو ڈالا تھا اور اسے خوب صورت یادوں کا خزانہ دے کر بے اندازہ اسیر کر دیا تھا۔“

چلیے ریل کے سفر پر
”یہ مسافر گاڑی شاید دنیا بھر کی گاڑیوں میں سب سے آہستہ رفتار تھی۔ یہ زریں سہ پہر میں چھک چھکاتی اس کلکی اور آکسی سے چل رہی تھی جیسے اسے کسی خاص منزل پر نہ جانا ہو، بلکہ بس یونہی مٹر

جھوڑ رباقی تمام سفر اندرون ملک مقامات کے ہیں جس سے محمد خالد اختر کے رویے کا بنیادی عنصر ظاہر ہوتا ہے جس کی رو سے اصل اہمیت اس مقام کی نہیں ہے جس کا سفر اختیار کیا گیا ہے بلکہ سفر کے انسانی تجربے کی ہے۔

”پڑھنے والے کو مسحور کرنے والی بات ان انسانی کرداروں کی رنگارنگی ہے جو اپنی اپنی مخصوص صورت حال سے دوچار انسانوں پر مشتمل زندگی کا میلہ ہی ہے جس سے محمد خالد اختر کا سفری تجربہ عبادت ہے۔“

چلیے دیکھتے ہیں اپنے کچھ شہر جو ہمارے ہیں لیکن ہمارے پاس ان کو دیکھنے کی فرصت اس طرح سے نہیں!

”ہم اب لاہور کے نزدیک تھے۔ اندھیری عملی رات میں پیلی، نیلی اور سرخ روشنیاں بکھر رہی تھیں۔ ہمارے دلوں نے وہ لذیذ دھڑکن محسوس کی جو لاہور میں وارد ہونے والے ہر سچے مسافر کو محسوس ہوتی ہے۔ تم خواہ پہلی بار لاہور کے نزدیک آؤ، خواہ تیسویں بار، یہ عجیب روح کی اٹھان، یہ رُاشتیاق دھڑکن تمہیں ضرور محسوس ہوگی۔ لاہور ایک ایسی کافر محبوبہ ہے، لاتعداد دلربائیوں اور عشوہ طراریوں کی حامل کہ اس کے چاہنے والے اس کے لیے ہمیشہ تڑپتے رہتے ہیں۔“

ہم راوی پر سے گزر کر شیخوپورہ جانے والی سڑک پر مڑے تو سورج نکل آیا۔ ہمارے گرد کی وسیع کھیتوں اور سبزے کی دنیا دمک اٹھی۔ ہمارے دل گانے لگے۔ ہوا میں بہار کا سانس تھا۔ فصلیں کٹ چکی تھیں اور کٹے ہوئے کھیت پہلے سونے کے تھے۔“

”خوشاب ایک چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے۔ یہاں تم گویا ہریت کی عتالی پہاڑیوں کے سائے میں آجاتے ہو اور اچانک ان کی مودودی سے آگاہ ہو جاتے ہو۔ ہمارا احمد ندیم قاسمی بھی تو ان ہی پہاڑوں کا رہنے والا ہے۔ ابھی کیورس نے مجھے بتایا کہ یہ پہاڑ نمک کا پہاڑ ہے۔ یہ نمک کا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ تو گلاب اور غنبر

گشت کرنے نغلی ہو۔ مگر اسے ملکوال تک ہی تو جانا تھا“ جلدی کی ضرورت ہی کیا تھی؟“

”ترائی ایک مستقل دلچسپیوں کی تصویروں کا الہم تھی۔ ابھی تمہارے سامنے ایک اونچی گھاس اور سبزے کی چراگاہ ہوتی، دوسرے لمحے ایک سیاہ آب و گیہا چٹیل میدان تمہارے سامنے آجاتا اور اس کی ویرانی تمہارے خون کو برف کر دیتی۔“

قاری کو قاطب کرنے والی تحریر میں انسیت کا اولین احساس، دھیرے دھیرے پختہ اور گہرا ہوتا جاتا ہے اور پڑھنے والا خود کو ہر لمحے میں صاحب تحریر کے ساتھ محسوس کرنے کا لطف اٹھاتا ہے۔

”اے میرے قاری! یقیناً کسی دن تم اور میں اسی طرح اکٹھے اس سڑک پر سانا کوئٹی جائیں گے، کیونکہ ایک ایسے نام والی جگہ کو دیکھے بغیر آدمی زندہ ہی کیسے رہ سکتا ہے!“

سنیے۔ کتابوں سے دار فتلی کے عالم کی ایک کیفیت ”مجھے کتابوں سے محبت ہے۔ پرانی، قدیم، مڑے ہوئے، کینوں والے ورقوں، انگوٹھوں سے میلے صفحوں والی کتابوں سے خصوصی دنیا میں کوئی خوشبو مجھے اس خوشبو سے زیادہ پسند نہیں جو بوسیدہ نسخوں، ان کی قدیم جلدوں اور زرد پائے ہوئے اوراق سے آتی ہے۔“

خالد صاحب کے فوق مطالعہ نے ان کے تخیل پر ہمیشہ قائم رہنے والے اثرات مرتب کیے۔ انگریزی، اردو دونوں میدانوں کی شناساوری نے ان کے اسلوب بیان پر ایک منفرد لہجہ عطا کیا، جو فطری روانی کے جمل اور اثر آفرینی سے بھرپور ہے۔ دوران سفر اپنے شناسا کرداروں سے تشبیہات آپ پر ان کے فوق مطالعہ کا راز کھولتی ہیں۔

کتاب کے تبارنی الفاظ، قاری کو پیش آنے والے ذہنی ارتقاء کے مرحلے کے لیے جلا بخش رہنمائی فراہم کرتے ہیں اور اپنے ہنر کی مشاقی کے مظہر بھی۔

”زیر نظر جلد میں شامل آخری تین سفر ناموں کو

کے رنگ کا ہے یہ ایک مستقل طور پر جھانکتا ہوا پہاڑ ہے اور خوشاب کے بازاروں اور کوچوں کو ایک زندہ شفیق دوست کی مانند دیکھتا رہتا ہے۔
دیکھیے ایک جگہ رکنے کا منظر۔

”ہم نے چائے کی ایک چھوٹی دکان میں بیٹھی چائے اور کھن لگے بری بنوں کا ناشتا کیا۔ ان چھوٹی چائے کی دکانوں میں جو ساری رات کھلی رہتی ہیں، مجھے — بڑا رومانٹک ماحول نظر آتا ہے۔ ان کی کھردری لمبی میزیں، بین کی کرسیاں، نیلی نام چینی کی چائے دلیاں۔ میں ان سب سے محبت کرتا ہوں اور ان لوگوں سے بھی جو وہاں آتے ہیں۔ یہاں ہر شے ایک رفاقت کی خوشبو ہوتی ہے اور تمہاں زندگی کی گہما گہما کامزاد دیکھتے ہو۔“

نفسخہ اڑائے بغیر مزاج پیدا کرنا فطری خوش طبعی کی بدولت ہے اور صورت حال کے مطابق فطری ہیئت کدالی سے مزاج کا عنصر وجود لینا قدرتی رفاقت کا مظہر۔

”رش کی حالت دیکھ لے ہمارا جی بیٹھ گیا، مگر قلیوں

نے ہماری ہمت بندھائی۔ انہوں نے پہلے تو جوتوں توں کر کے بند دروازے کی کھڑکی سے ہمارا سلمان اندر پھینکا اور پھر سلمان کے بعد ہماری باری آگئی اور قلیوں نے ہمیں باری باری اٹھا کر دروازے سے اندر گھسیڑ دیا۔ کلنی عرصے تک ہمیں ہٹانہ لگ سکا کہ ہم کون سے ہیں اور ہمارا اسباب کون سا۔ آوی آوی پرچہ اٹھا بیٹھا تھا۔ بعض لوگ دوسرے لوگوں کی گود میں بیٹھے تھے۔ بعض اسباب کے اوپر اٹکے ہوئے تھے اور میں نے کم از کم ایک لیا مسافر بھی دیکھا جس کے اوپر اسباب بیٹھا ہوا تھا۔“

”ترائی کے میدانوں اور پہلی پہاڑیوں پر رات بڑھ گئی تھی۔ کھیوٹہ دور پہلی پہلی روشنیوں کا انبوہ تھا۔ اٹھ بجے گاڑی ملکوال جنکشن میں داخل ہو گئی۔“

داؤی سوات کا محل دیکھیے۔
”ہمارے سامنے زمروں گھاس کے قطعے کے

حاشیے پر سنگ مرمر کے چبوترے پر ایک چھوٹا سفید محل ایستادہ تھا۔ اس ننھے محل میں پھول کی ایک تہی کی سی نزاکت تھی۔ ایک غیر مرئی صفت یہ پریوں کا محل تھا۔ پریاں اس وقت کہیں گئی ہوئی تھیں اور محل سوتا تھا۔

آخری تین سفر نامے ترکی، یونین اور قونیہ کی مہمات کی داستانیں ہیں جو انہوں نے 72 سال کی عمر میں اسی دلوں اور گرم جوشی سے طے کیں۔ جو صرف ایک خالص مبہم جو کا خلاصہ ہوتی ہیں۔
”دونوں کے پیچھے یہ تہتر برس کا بچہ تھا، نیم جاں بوڑھا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے آپ کو پینتیس برس کا جوان سمجھتا۔“

تیز رفتاری سے بدلتی ارد گرد کی دنیا میں ترکی سے اب پاکستانی تھوڑا سا عرصہ گزرا ہے۔ لیکن یہ دو دوا 91ء کے سفر کی ہے اور اپنے آپ میں ترکی کی دلکش داستان ہے۔

ترکی کا سفر نامہ انہوں نے مکتوب غالب کے انداز میں لکھا ہے جو زبان و بیان کا خوب صورت نمونہ ہے۔
”ہاں صاحب، تمہارے استنبول کو تین مسافروں نے خوب چھاننا پھاننا حق سیاحت لودا کیا کہ مار کو پولو بھی سنے تو جمل و تلوام ہو۔“

بس، ٹرین، جہاز، فیری پکڑنے اور چھوٹنے کے دلچسپ قصے، یونانی جزیروں کے خوب صورت مناظر، جہاز کے عرشے سے سمندر میں ڈوبتے سورج کے رنگ، رہائش اور سیاحت کے لطف، انگیز بیان آپ کے تخیل کو اڑتا ہوا قلمین بتا دیتے ہیں۔

دیویش کی ایک خوبی دینے کی صفت ہوتی ہے اس کے پاس جو موجود ہو وہ اسے دینے میں ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتا۔ اس دیویش کے پاس دینے کے لیے اپنے ذہنی، قلبی و روحانی تجربات کا جو ہر اور لطف تھا۔ سو اس نے کمال فیاضی سے دیا۔ ایک سچے مہم جو کی رفاقت کا لطف اس کے لطف اٹھانے کی صلاحیت سے لطف اٹھانے کا لطف اگر آپ بھی جستجو کرتے

ڈرامہ سیریل آپ کی کنیز کی کنیز

یمینی زید کا سہ ملاقات

شاہین رشید

ایک گفتگو۔

”ہیلو کیسی ہو۔ ماشاء اللہ بہت اچھی پر فارمر ہو؟“
”جی ہاں ماشاء اللہ کا شکر ہے بہت شکریہ پسند کرنے کا۔“
”کیا مصروفیات ہیں۔ کیا آئن ایر ہے اور کیا انڈر پروڈکشن ہے؟“

”ماشاء اللہ سے مصروفیات بہت زیادہ ہیں آپ کی دھانوں سے۔ آج کل ”جیو“ سے ”آپ کی کنیز“ آئن ایر ہے اور پی ٹی وی سے ”کس سے کہوں“ جبکہ آنے والے سیریز میں ”جگنو“ فاروق رند کی ڈائریکشن ہے۔ بہت ہی ہلکا پھلکا لائٹ کامیڈی کروار ہے میرا۔“
”پارس“ کے نام سے جیو سے ہوگا اسے عامر یوسف نے ڈائریکٹ کیا ہے اے اینڈ ٹی کی پروڈکشن ہے اور جگنو کے بارے میں مزید بتاؤں کہ اسے ”آمنہ مفتی“ نے لکھا ہے۔“

”اپنے لیے کروار کا انتخاب کرنا مشکل ہے یا آسان۔ اور 2014ء آپ کا کیسا گزرا؟“

”جو آپ نے پوچھا کہ انتخاب کرنا مشکل ہے یا آسان تو میں سمجھتی ہوں کہ کروار کا انتخاب کرنا بہت مشکل ہے۔ پتا نہیں چلا کہ کون سا بہتر ہے اور کون سا نہیں۔ اور 2014 تو بہت ہی اچھا گزرا کام کے حوالے سے بھی اور ویسے بھی گور آپ کو یہ بھی بتانا چاہوں گی کہ مجھے ”ایس بزی“ جو کہ بلی ووڈ کی پروڈکشن کمپنی ہے انہوں نے ایک فخر فلم کے لیے مجھ سے رابطہ کیا اور ایڈریٹول کی پیشکش کی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر بہت ہی اوٹ اسٹینڈنگ کام ہو تو آپ کریں ورنہ نہ کریں۔“



یمینی زیدی ناظرین کے لیے اب نیا نام نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی بہترین پر فارمنس سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ آپ کی کنیز میں اس کا بہترین کروار ہے ایک ڈری سہمی گلوں کی لڑکی ایک بڑے گھر میں بیانی جاتی ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے اس کی بہترین ترجمانی اس فنکار نے کی ہے۔ آج کل کیا آئن ایر ہے کیا کچھ آنے والا ہے اور کیا کچھ کرنا ہے یہ جاننے کے لیے یمینی سے



بہر حال سین کروانے سے پہلے میں سچ سچ بہت روئی،
بے شک مجھے ایکسٹنگ کا شوق ہے۔ مگر یہ کام تو انتہائی
مشکل تھا اور یہ سوچ کر بہت خوفزدہ ہو رہی تھی کہ اگر
خدا خواستہ کچھ ہو گیا تو۔۔۔ خیر میں نے بہت سی دعائیں
مانگیں اور اپنے آپ کو اس سین کے لیے تیار کیا اور
بڑی بہادری سے وہ سین کرایا اور پھر ڈائریکٹر سے کہا
کہ آپ دیکھ لیں کہ میں نے کیسا کیا، اگر ٹھیک نہ لگے
تو میں دوبارہ کروانے کے لیے تیار ہوں، پتا نہیں اتنی
ہمت مجھ میں کہاں سے آگئی تھی۔ لیکن میں سچ بتاؤں
۔۔۔ اس سیریل میں میں نے بہت محنت کی ہے۔ یوں
سمجھے کہ میں نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ گاؤں کے
سین براڈل ڈریس میں بھانگنا کھیتوں میں رسی بندھی
ہوئی۔۔۔ مگر جب سیریل آن ایر آتا ہے اور لوگ
ایندرون ملک اور بیرون ملک پسند کرتے ہیں۔ ہماری
تعریف کرتے ہیں، جب کینڈا، آسٹریلیا، پیرس، امریکہ
برطانیہ سے آپ کے لیے اون آتے ہیں تو یقین کریں
کہ محنت کا صلہ وصول ہو جاتا ہے اور ڈھیروں خون
برہ جاتا ہے۔“

دوسرے ملک میں جا کر عام سے کردار کرنے کی میری
نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی انتہا سے فلم
کی آفر آتا ہی میرے لیے بہت اچھی بات تھی اور
خوشی اس بات کی ہوئی کہ ہمارا کام دوسرے ملکوں میں
بھی دکھایا جا رہا ہے اور پسند کیا جا رہا ہے۔“
”بالکل۔۔۔ آنے والے سیریلز میں کردار کس قسم
کے ہیں پونڈیا نیگیٹو۔ آپ کے زیادہ تر کردار تو پونڈیو
ہی ہوتے ہیں۔ اور کس قسم کے رول پسند ہیں؟“
”میں نے پونڈیو اور نیگیٹو دونوں ہی طرح کے
کردار کیے ہیں۔ رشتے کچھ ادھورے سے میں میرا
تھوڑا نیگیٹو رول تھا۔ اور آنے والے سیریلز میں سب
میں پونڈیو ریل ہیں یا پھر لائیٹ کامیڈی رول ہیں۔
میں چاہتی ہوں کہ بہت ہی اسٹونگ قسم کے کردار
کروں بجز میں صداقت ہو اور لوگوں کو پتا چلے کہ
ہماری پاکستانی لڑکی کتنی اسٹونگ ہوتی ہے، مردوں کے
قدم سے قدم ملا کر چلتی ہے اور اپنے گھر کے لیے کتنی
قریبانیاں دیتا ہے۔ بس جس میں پرفارمنس ہو وہ کرنا
چاہوں گی۔“

”آپ کی کنیز“ میں ایک سین میں آپ کو کتوں کے
آگے ڈالا جاتا ہے۔ اور ڈرایا جاتا ہے۔ یہ کتنا حقیقی تھا۔
”اس ڈرامے میں کتوں والا سین انتہائی خوفناک
تھا۔ اور وہ سین کئی دنوں سے ملتوی ہو رہا تھا کیونکہ
ڈائریکٹر کو یہ یا تک قسم کے کتے نہیں مل رہے تھے۔ اور
جب ملے اور مجھے دکھائے گئے تو میں نے تر سین
کروانے سے منع کر دیا۔ اور بہت مشکل سے ڈائریکٹر
نے مجھے کنڈیشن کیا۔ کیونکہ ایسے خوفناک کتوں کے
آگے کھڑے ہونا ہی بہت ہمت کی بات ہے اور اگر
آپ چھینے آگے تو وہ تو آپ کی طرف لپکیں گے ہی نا۔
اور میں جب کتوں کے سامنے جاتی تو بھاگ کر واپس
آ جاتی دو تین بار ایسا ہوا۔ تو مجھے خود احساس ہوا کہ ایسا
نہیں ہونا چاہیے۔ اور پھر ڈائریکٹر نے بھی کہا کہ آپ
سیریس ہو جائیں۔ میں نے نہ کہا کہ جو کتوں کی رسی کو
پکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بھی ہاتھ تھک گئے تھے۔“

تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ تو ہمارے کام کا حصہ ہے۔ ہر کوئی پر لہکتا نہیں ہوتا اور کوئی ہمیں بتائے گا تو ہم پر لہکتے ہوں گے۔ خود سے تو نہیں ہو سکتے نا۔ تنقید سے تو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

”شہرت، دولت، عزت، کیسی لگتی ہے یہ دنیا؟ برائیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں؟“

”سچ پوچھیں تو مجھے تو اس میں زیادہ اچھائیاں ہی نظر آتی ہیں۔ مجھے اس فیلڈ میں آئے ہوئے کوئی بہت لمبا چوڑا زمانہ نہیں ہوا۔ مگر آپ دیکھیں کہ کم عرصے میں میں نے کافی اچھے سیریلز کیے ہیں اور کافی اچھے سیریلز انڈر پروڈکشن ہیں۔“

”کامیابی کا کیا کر ہے؟“

”بس یہی کہ اپنی حدود، اپنی روایات، بیویں، عزت و احترام کرتے رہیں۔ سب آپ کے نزدیک آئیں گے۔ اصل میں اچھی تعلیم و تربیت بھی اس فیلڈ میں بہت کاؤنٹ کرتی ہے۔ آپ کا کردار آپ کا بیوی

اچھا ہونا چاہیے، برائی اور اچھائی کی طرف انسان دوسروں کو خود راغب کرتا ہے۔ اتنے مضبوط کردار کے ہو جائیے کہ کوئی آپ کو میلی آنکھ سے نہ دیکھ سکے۔ بس پھر آپ کامیاب ہیں۔“

”یعنی! آپ نے کہا کہ اداکاری ایک مشکل کام ہے تو کبھی اس فیلڈ میں آکر بچھتاوا ہوا؟“

”ارے نہیں بالکل بھئی نہیں۔ سیدھی سادی اداکاری تو سب ہی کر لیتے ہیں، مگر مزہ تو مشکل کام میں ہے۔ بس مجھے ”آپ کی کنیز“ میں کتوں والے سین میں مشکل ہوئی تھی، مگر جب میں نے سوچا کہ کتوں کو تو پکڑا ہوا ہے اور مجھے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا تو میں نے پھر آسانی اس سین کو کر لیا۔ مجھے یاد ہے کہ ڈرامہ سیریل ”تھکن“ میں مجھے بچہ مار پڑتی تھی مگر میں نہیں گھبرائی تھی۔ ”خوشی ایک روگ“ اور ”میری دلاری“ میں رونے کے سین حقیقی ہوتے تھے۔ میں بچ بچ روئی تھی۔ میں تو ہر کردار کو اپنے اوپر طاری کر کے کرتی ہوں

”واقعی۔۔۔ اور اس میں شک نہیں کہ آپ کی اداکاری میں دن۔۔۔ دن نکھار آتا جا رہا ہے۔ اس فیلڈ میں آنے کا خیال کیسے آیا؟“

”بس اتفاق ہے۔۔۔ ہوا یہ کہ میری بہن این سی اے میں پڑھتی تھیں۔ اور کالج میں میڈیا سے تعلق رکھنے والے لوگ اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ تو بڑی بہن کے ایک کالیک نے بتایا کہ لاہور میں ایک ڈرامہ بن رہا ہے اور اس کے ڈائریکٹر کو نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ تو میں نے ایسے ہی شوق شوق میں تھوڑا کام کر لیا۔۔۔ تو جب انہوں نے دوبارہ اپنے نئے سیریل کا آغاز کیا تو پھر مجھ سے رابطہ قائم کیا۔۔۔ اور میں نے ہاں کر دی۔ وہ ڈرامہ سیریل ”تھکن“ تھا اور اس میں میرا کردار اچھا خاصا اسٹرائٹ تھا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ اس کردار میں میری پرفارمنس دیکھ کر کراچی کے معروف ڈائریکٹر محسن مرزا نے مجھے کال کی اور ڈرامہ سیریل ”خوشی ایک روگ“ کے لیے مجھے لیڈ رول آفر کیا۔ اور

آپ کو تو پتا ہی ہے کہ یہ سیریل کتنا ہٹ گیا تھا اور آپ نے بھی اس سیریل کو دیکھ کر مجھے فون کیا تھا۔“

”بالکل مجھے یاد ہے۔ اور آپ کا سیریل تھکن بھی یاد ہے جس میں آپ کا نمٹو رول تھا۔ اس کے بعد نمٹو رول کی ہی پیشکش ہوئی ہوگی؟“

”میرا لک کہ ایسا نہیں ہوا؟ جبکہ میں بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ اب مجھے ایسے ہی رول ملیں گے، مگر مجھے ”خوشی ایک روگ“ میں بہت ہی معصوم اور دکھی لڑکی کا رول ملا۔۔۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس سیریل نے بلکہ میرے اس رول نے مجھے بہت زیادہ شہرت دی اور پھر تو آفرز نہ ختم ہونے کا ایک سلسلہ چل پڑا اور الحمد للہ کہ آج میں اس فیلڈ میں کافی کامیاب جا رہی ہوں۔“

”ماشاء اللہ۔۔۔ تعریف نے مغرور کیا؟۔۔۔ اور کسی نے تنقید بھی کی؟“

”اللہ نہ کرے کہ میں کبھی مغرور ہوں میں تو اپنے رب کا ہر دم شکر ادا کرتی رہتی ہوں۔ اور ایسا نہیں ہے کہ لوگ صرف تعریف ہی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی

”کہ حقیقت کا رنگ آئے۔“

”اصل زندگی میں اس کا اثر ہوتا ہے؟“

”بہت ہوتا ہے۔ گھر والے ناراض بھی ہوتے ہیں۔ چڑچڑے رول کر کے مزاج بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اسی گھٹی ہیں کہ ایسے رول مت لیا کرو گھر میں بھی ایسی ہی رہتی ہو۔ اب تھوڑے لائٹ کامیڈی رول کروں گی تو اس کا بھی مزاج پر اثر پڑے گا پھر میرے خیال سے گھر والے خوش ہو جائیں گے۔“

”فیلڈ کے بارے میں تو بہت باتیں ہو گئیں۔“

اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟“

”جی ضرور۔ میرا نام یعنی زیدی ہے جس کا مطلب

لکی (Lucky) اور بلیس (Bless) ہے اور میرے نام

کا اثر میری شخصیت پر بھی ہے اور واقعی میں ہر لحاظ

سے لکی ہوں۔ شکر الحمد للہ۔ میں 3 جولائی 1989ء

کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ والدہ ہاؤس وانف ہیں جبکہ

والد زمین دار ہیں اور چونکہ وہ اپنا زیادہ وقت زمینوں پر

گزارتے تھے تو امی نے ہماری تربیت کی۔ ہمارے

گاوں کا نام ”عارف والا“ ہے اور پڑھائی کے لیے ہم

سب لاہور میں شفٹ ہوئے۔ ہم تین بہنیں اور

ایک بھائی ہے اور میرا نمبر تیسرا ہے۔“

”بہن اور بھائی بھی ہیں اس فیلڈ میں؟“

”نہیں جی۔ کسی کو شوق ہی نہیں ہے حالانکہ

میری بہنیں بہت پیاری ہیں۔ بڑی بہن کو تو آفرز بھی آ

چکی ہیں مگر ان کا رجحان ہی نہیں ہے اس طرف۔ اور

ہاں یہ بھی بتا دوں کہ ہم اردو اسپیکنگ ہیں۔ مگر ہماری

تعلیم و تربیت پنجاب میں ہوئی اس لیے لگ بھی ویسا ہی

آگیا۔“

”تعلیم مکمل ہو گئی تمہاری؟“

”جی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میرا سٹریز مکمل ہو

چکا ہے اور اس سال میری کاتوگیشن ہے اور انٹیر

ڈیرنگ میں میں نے ماسٹریز کیا ہے اور مجھے پڑھائی سے

بہت لگاؤ ہے۔ میں نے اپنی مصروفیات کو اپنی پڑھائی پر

حالی نہیں ہونے دیا۔“



”شادی نہیں کرنی کیا؟“

”بالکل کرنی ہے اور امی کی تو بس یہی خواہش ہے کہ

یعنی کی شادی جلدی سے ہو جائے۔ کوئی اچھا سالز کا

یعنی کو پسند آجائے۔ جبکہ میں چاہتی ہوں کہ میری

زندگی اچھی گزرتی رہی اور اللہ ہمیشہ میرے حق میں

بہتر کرے۔ اور میں یہ بات بڑے فخر سے کہوں گی کہ

میں نے زندگی میں جو چاہا وہ حاصل کیا۔ اللہ مجھ پر ہمیشہ

سے ہی بہت مہربان ہے۔“

”مزانج کی کیسی رہیں؟“

”ملا جلا رجحان ہے۔ غصہ بھی آتا ہے اور ہنس مکھ

بھی ہوں۔ غصے کا اظہار بول کر کرتی ہوں اور جہاں

نہیں بول سکتی اپنے آپ کو بے بس سمجھتی ہوں وہاں

مجھے پھر رونا آ جاتا ہے۔“

”غصہ کن باتوں پر آتا ہے؟“

”مخصوص نہیں ہے کہ یہ بات ہوگی تو غصہ آئے

گا۔ یہ نیچرل عمل ہے۔ کوئی بھی بات دل کو لگ

جائے تو دکھ بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ اور

ایک بات پر تو ہمیشہ غصہ آتا ہے جب میں دیے ہوئے

ٹائم پر پہنچ جاتی ہوں تو پھر کوئی دوسرا ٹائم پر کیوں نہیں

آتا۔ بس ایک۔ خالی ہے مجھ میں کہ میں اپنے کام میں
بہت زیادہ ہنہ کچھو کچھ ہوں۔“
”شہرت نے کبھی پریشان کیا؟“
”شہرت اور پریشانی؟۔ بالکل بھی نہیں۔“

شکر ہے کہ میری پہچان
ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے ہے۔ ورنہ پہچان تو برے
کاموں سے بھی ہوتی ہے۔ جب لوگ ہمیں پہچان کر
ہمارے پاس آتے ہیں تو آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ
مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے اور میں اپنے رب کا کتنا شکر
ادا کرتی ہوں۔“

”فارغ وقت ملتا ہے تو کیا کرتی ہیں؟“
”اب تو فارغ وقت بہت ہی کم ملتا ہے۔ مگر آپ
یہ سن کر یقیناً حیران ہوں گی کہ مجھے ڈرائنگ کا بھی
شوق ہے اور میں شاعری بھی کرتی ہوں۔ مگر میری
شاعری میری ڈائری اور مجھ تک ہی ہوتی ہے۔ ڈرتی
ہوں کہ پتا نہیں کسی کو پسند آئے گی یا نہیں۔ کہانیاں
لکھنے کا بھی شوق ہے۔“

”تو اصلاح کرو الیا کرو۔ اور اپنے سارے شوق
اداکاری کی نذر نہ کر دینا؟“

”اصلاح۔۔۔ وہ تو امی کر دیتی ہیں۔ کیونکہ میری امی
”شبانہ زیدی“ خود بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ اور ایسا نہیں
ہو گا کہ سب مجھ اداکاری کی نظر ہو جائے۔“

”اور گھرداری؟“
”میں ہوم آکناکس کالج کی تعلیم یافتہ ہوں۔ اندازہ
لگائیں کہ گھرداری میں کیسی ہوں گی مجھے بہت شوق
ہے گھرداری کا۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنا اچھا لگتا تھا
کھانا۔ سب کچھ آتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ لڑکی کو
سب کچھ آنا چاہیے اور۔“

”ناکہ پرانے گھر جا کر مشکل نہ ہو؟“
”قہر۔۔۔“ امی بھی یہی کہتی ہیں۔ اور ٹھیک کہتی
ہیں وہ بھی تو ایک طرح سے جاب ہوتی ہے اور بڑی ذمہ
داری ہوتی ہے۔“

”گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملتا؟“

”سب سے۔۔۔ میں جب اس فیلڈ میں آئی تو مجھے
ایسا لگا کہ میرے والد جو کہ غصے کے کانی تیز ہیں ناراض
ہوں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے بھی مجھے بہت
سپورٹ کیا۔ اور بچوں کو کسی معاملے میں سپورٹ کرنا
ماں باپ کے پیار کا اظہار ہوتا ہے۔ اور میری دادی
جان جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے کام کو بہت پسند
کرتی تھیں اور بہت تعریف کرتی تھیں۔ اور ہاں
مزے کی بات بتاؤں کہ صرف میری مائی اس بات کے
خلاف تھیں کہ میں اس فیلڈ میں آؤں۔ یہ بھی ان کا
پیار ہی تھا۔ خیر ج میں مجھے اپنے گھر والوں سے بہت
پیار ملا اور مل رہا ہے۔“

”اور جناب کرکٹ ورلڈ کپ شروع ہونے والا ہے
فروری میں۔ لگاؤ ہے کرکٹ سے؟“

”بالکل ہے جی۔ اور جب اپنے میچ ہوں تو دلچسپی
بڑھتی جاتی ہے۔ مگر جب ہم ہارتے ہیں تو پھر ساری
امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں اور بہت افسوس ہوتا
ہے۔ تو اپنی ٹیم کو کتنا چاہوں گی کہ پلیز جم کر کھیلے گا اور
سب کی امیدوں پر پورا اترے گا اور صرف اور صرف
پاکستان کو نظر میں رکھ کر کھیلے گا۔“

”اور کچھ کہنا چاہیں گی؟“
”جی۔ میں بس اپنے۔۔۔ اے یہ دعا کرتی ہوں کہ اللہ
تعالیٰ ہمیشہ مجھے توفیق دے کہ میں دوسروں کے کام
آؤں اور میرے ارد گرد جو لوگ ہیں ان کے دل کبھی
بھی میری وجہ سے نہ ٹوٹیں اور نہ ہی وہ دکھی ہوں۔“
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے یمنی زیدی سے
اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے
ہمیں وقت دیا۔





شادی مبارک ہو

مرہا جاوید ہرشیان احمد

اسیہ مذاقی

”ارے بد تمیزی ہے۔ لو بھلا دو سروں کے گھر میں
داش روم میں جا کر منہ دھوؤ اور مجھے تو ایٹن کی مہک ہی
بری لگتی ہے۔“ (تو منہ نہ دھوؤ۔ ٹشو سے صاف کر لو
بھئی۔)

مایوں کا چھوٹا سافنکشن مہا کے چھوٹے چچا تنویر
کے گھر پر تھا۔ انہوں نے لان میں پیلا شامیانہ لگا کر
پھولوں اور لائٹوں سے سجایا تھا۔ گھر کے ہی قریبی عزیز
تھے یعنی مہا کے چچا، چچیاں، پھوپھیل، کزنز اور ہم
جیسے غریب الوطن گاہور اور ایبٹ آباد کی سردی کھا کر
کراچی کے متوازن موسم کا طف لے رہے تھے۔

مہا۔ ہماری بھانجی نمبر چار۔ اعلا تعلیم یافتہ بہترین
فونو گرافر۔ کسی اعلا درجے کی ماڈل سے برہہ کر سٹڈل
اور دراز قند مجھے کراچی آئے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ آ

بارے مہا کی مایوں کی رسم 19 دسمبر کو ہو گئی۔
بڑی تیاری تھی۔ ایٹن بینڈیاں، پیلے کپڑے۔ ایک
خاص ماحول۔ مجھے تو شادی کی رسموں میں یہ رسم بہت
پسند ہے۔ شادی کا آغاز۔ روٹھے ہوؤں کو منانا آسان
کہ چپکے سے ایٹن پیچھے سے آکر لگا دیا۔ ادھر سے بھی
ہنستے ہوئے یہی کارروائی کی گئی۔

ساری لڑائی یا اختلاف ایٹن نے مٹا دیا۔ البتہ چہرہ
بھی رنگ گیا تو کوئی بات نہیں۔ دوستی کی بنیاد مضبوط
ہونی چاہیے۔ ہاں کبھی کبھی منے منائے لوگ بگڑ جاتے
ہیں کہ بھئی اتنی محنت سے کیا ہوا میک اپ خراب بلکہ
ستیاس کر دیا۔

”کون بینڈو تھا جس نے ایٹن ایجاد کیا۔ لوجی! ناک
کلن میں بھئی ایٹن بھر گیا۔“ یہ بھی ہوتا ہے۔

رنگ دوپٹے۔ پہلے دولہا دوستوں اور بھائی کے نرغے میں دوپٹے کے زیر سایہ لائے گئے۔ اسٹیج بہت اچھا سجایا ہوا تھا۔ مہمانوں کے ہمراہ کام دار دوپٹے کی چھاؤں میں نمودار ہوئیں۔ کزنز ان سے آگے گولڈن روشن لائینیں لیے ہوئے تھیں۔ جدت ایک جدت اور۔ یعنی مہما کے زیور ساتھ پٹی بھی لگائی تھی۔ واہ زبردست، اچھا انتظام تھا۔ بھرپور روشنیاں مقصوریں بنتی رہیں۔

ہم نے تو اپنی جگہ سے ہٹنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ بھٹی کرسی بہت پارائی ہوتی ہے۔ پل میں چھن جاتی ہے۔ تپا سیدار۔ میٹھی دہی پھلکیوں اور شوراب سے تواضع ہوئی۔ پھر کھانا ہوا۔ کب رسم ہوئی۔ کیا ہوا۔ خبر نہیں۔ کرسی چھوڑنے کی امت نہ کی۔ بس شور شرابہ ہوتا رہا۔ خیر گاجر کا حلوہ، گرم جلیبیاں آرہی تھیں۔ اچانک یاد آیا۔

ابٹن کی رسم کے لیے سحدیہ (مہما کی بھابھی) نے جو گلاب جامنیں بنائی تھیں وہ تو ہم نے چکھی تک نہیں تھیں۔ اس لیے مہندی پر حلوہ، جلیبی کو ہاتھ نہ لگایا۔ گھر جا کر سحدیہ کی گلاب جامن کھانے کے شوق میں۔ البتہ پتا چلا کہ قلفہ بھی تھا۔ جس سے ہم محروم رہے۔ وہ تو کھایا جاسکتا تھا۔

گھر آ کر گلاب جامنوں کی فرمائش کی۔ اچھا ہوا کہ وقت پر یاد آگیا، ورنہ وہ بھی نہ ملتیں۔ کیونکہ ہمارے کھانے ہی سب ختم۔ ابٹن کے لیے مہما کی چچی ٹکٹ میڈے کی پینڈیاں بنا کر لائی تھیں۔ اور پھوپھی زبیری نے گلاب جامنیں بنائی تھیں۔ ہر سمت میٹھا پن۔ بیکم انور کا وال کا حلوہ الگ۔

دولہا کا جوڑا بھیجنا بھی ایک مرحلہ۔ بے حد نفاست کے ساتھ سجا بنا کر۔ خوب صورتی اور مہارت سے باسکٹ کی آرائش کی گئی۔ اس میں پینڈیاں، مٹھائی، چاکلیٹ رکھ کر ساتھ ہی شیشے کے بڑے بڑے کپ سنہری روپہلی لیس سے آراستہ کر کے اس میں ڈرائی فروٹ بھر کر سمہیا نے بھیجے گئے۔

کر پہلے مہما کا سوٹڑ بنایا۔ دولہا کے لیے لاہور میں بلکہ ایسٹ آف میں ہی بنا لیا تھا۔ پھر مونگ کی پینڈیاں بنائیں۔ رسم کے لیے سوچی کی پینڈیاں زیادہ تعداد میں۔

موسم بے حد خوشگوار ہے۔ بون دستا کی گیارہویں منزل تمہینہ کا نیا فلیٹ۔ اپنی وسعت اور کشادگی کے ساتھ مہمانوں کو با آسانی سمونے کو تیار۔

دوپہر میں عائشہ لاہور سے آئیں۔ یہ ہمارے تایا سید ہاشمی فرید آبادی (آکا جان) کی نواسی ہیں۔ امریکی شہری ہیں۔ لاہور آئی تھیں ہمارے چچا سید مطلبی فرید آبادی کے پڑپوتے کی شادی میں۔ جوا شفاق احمد قدسیہ بانو کی پوتی سے ہوئی ہے۔ ایک پنتھ دو کالج کے محاورے کو ج بٹانے کراچی مہما کی شادی کے لیے آ گئیں۔

رسم ہو چکی تھی تو سلمہ (بھانجی نمبر ایک) اپنی امی اور مومالی، رمانہ (مسنز انس) کے ہمراہ آئیں۔ حسب معمول جواز لیٹ تھا۔ علی ارسلان کے گھر سے آئی تھیں تیار ہو کر۔ مسنر ارسلان اور ان کے بیٹے بھی تھے کھانا ہو رہا تھا تو یہ لوگ پہنچے۔ ابٹن والے دن کے لیے ایک گلوکار کی خدمات حاصل کی گئی تھیں لیکن اس سے پہلے پشاور کے المناک سانحے نے سب کو رلا دیا تھا۔ دل چیر دیے تھے قوی المیہ۔

مہما کے ابا جاوید نے وہ پروگرام کینسل کر دیا۔ اتنے بڑے درو ناک المیے کے بعد کس دل سے خوشیاں منائی جاتیں۔ ہر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

مہمانوں نے تو بس رسما مہما کے ابٹن لگایا۔ بھائیوں نے دل کھول کر اس کے منہ پر ابٹن کا پلاسٹر کر دیا۔ نہ جانے کس بات کا بدلہ لیا تھا بے چاری سے۔ موقع نہ تھا کہ لڑتی۔ (اور ضرور لڑتی)

مہندی تو بڑے پیمانے پر ڈیفنس کے بل لان میں مشترکہ تھی۔ وہ ملتی نہیں کی جاسکتی تھی۔ تمہینہ نے مہندی کی مناسبت سے بہت خوب صورت ڈریس مہما کا بنوایا تھا۔ کام دار اور نچ کلر کی لمبی قمیص۔ سبز خوش

دکن

ماہنامہ دکن
فروری 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا

اداکار "علی عباس" سے شامین رشید کی ملاقات

اداکارہ "سورین حسینی" کبھی ہیں "میری ہوس سنیے"

"آواز کی دنیا سے" اس ماہ مہمان ہیں "عاطف مظہر"

اس ماہ "مقدس رہاب" کے "مقابل ہے آئینہ"

"اک ساگر ہے زندہ گن" نضیر سعید کا سلسلے وار ناول

"زادانے و فنا" فرمین اظفر کا سلسلے وار ناول

"دریچہ محبت" شفیق انوار کا مکمل ناول

"محبت، خواب، سہرا" صدف رحمان کیلانی کا مکمل ناول

"خالا، سالا اور اوپر والا" فاخر گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر

"جو دل چاہے" نازیر جمال نیر کا ناول

"چلو سنگ ہمارے" عائشہ ناز علی کا ناول

"توبہ" ام طلحہ رکان کا ناول

نور عین، عفت جیا، طوبی احسن، نظیر فاطمہ اور سوبر اللک کے افسانے

اور مستقل سلسلے

ان شعائرے سے ساتھ کریں کتاب

کریں کتاب

"کچن گارڈننگ"

کریں کے ہر شمارے کے ساتھ ایچو سے مفت پیش خدمت ہے۔

ادھر سے بھی مہا کا شادی کا جوڑا مٹھائی اور پھولوں سے سجا کر بانٹنے والی مٹھائی بھی چھوٹی ڈھکن دار باسکٹوں میں سلیقے سے رکھ کر مہا کی ساس شہانہ چھوٹے بیٹے کے ہمراہ لائیں۔

شادی 22 دسمبر کو کلفٹن کے پام ایمرلڈ مار کی نزد دولین مال میں منعقد ہوئی۔ پھولوں کی بہار ہر سمت نظر آئی۔ رنگ برنگے موسمی پھولوں کے گلدستے بہار کی نوید دے رہے تھے۔

سسرال سے سرخ غرارہ سوٹ اور رونی کاسیٹ آیا تھا۔ خالفتہ "روایتی دلہن۔ دولہا شایان بھی شیر والی میں پھولوں کے ہار کے ساتھ مشرقی دولہا بنے ہوئے تھے۔ ارمان تو پورے کرنے تھے والدین کے بھی اور اپنے بھی۔ کھانا بہت ہی زبردست اور مختلف تھا بے حد لذیذ۔ صبح بھی صبح کوئیٹ سے آگیا تھا۔ پچھلے دنوں ہی یہ صاحب شادی میں باندھے گئے ہیں۔ دلہن مہم بھی اپنے کام کے سلسلے میں کراچی آئی ہوئی تھی۔ وہ پانی میں ٹھہری ہوئی تھی۔ غیر بھی وہیں چلا گیا تھا۔

ان دونوں کی موجودگی سے سب کو خوشی ہوئی۔ مجھے تو ایک پرس دے کر صوفے پر بٹھادیا گیا۔ سلامیاں بٹور کر برس میں رکھنے کی ذمہ داری بلکہ باندی کے ساتھ کہانی اب یہاں سے ہلنا نہیں ہے۔ گفت بھی وہیں رکھے جا رہے تھے۔ پھر تو تمام خواتین یعنی کہ عزیز خواتین اپنے اپنے برس اور شالیں میرے پاس رکھ رکھ کر بے فکر ہو کر چلی گئیں۔ اسٹیج بھی بہار دکھا رہا تھا۔ لگتا نہ تھا کہ یہ موسم خزاں ہے۔ تصویریں بنتی رہیں۔

نکار پر بہت اچھی دعا ہوئی۔ اللہ دولہا دلہن کو اپنی امان میں رکھے۔ خوشیوں کے ساتھ۔ سب کی امیدیں پوری کریں آمین۔ اور اے اللہ تمام پاکستان کے لوگوں کی حفاظت کرے۔ ان کی جان اور آل اولاد کی بھی اللہ حفاظت کرے۔ آمین تم آمین۔ دہشت گردوں سے ملک کو پاک کر دے۔ آمین۔ رخصتی قریباً ایک بجے ہوئی۔ اللہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔ آمین۔

لینڈنہ کرسک۔ واپس کراچی چلا گیا۔ بھاکم بھاگ سفیان پھر ایرپورٹ بیگم کو وصول کرنے پہنچے۔ کراچی ایرپورٹ پر انہیں اگلے دن کی فلائٹ کی نوید سنائی گئی۔ بچے تو خوش۔ ہم لوگ اگلے دن ان کے گھر پہنچے۔ سو رہی تھیں بے فکری خاتون۔ جگا کرا نہیں سمجھایا پارو اب آج تو تم چلی ہی جانا۔ پیارے سفیان کو مزید سزا نہ دے۔

مل ملا کر واپس آئے۔ تمینہ نے کچھ دیر بعد فون کیا۔ ان کا جواب آیا۔ آج کی وہ فلائٹ نہیں ملی۔ اور ہمیں مختلف لوگوں سے ملنے کو کہا گیا۔ ہم نے خوب چیخ پکار کی تو اب وہ ہمیں اسلام آباد بھیج رہے ہیں۔ (یقیناً) پارو نے سب کو نچ کر دیا ہو گا۔ اس لیے کسی طرح پیچھا چھڑانے کے لیے روانہ کر دیا۔ اب وہ اگلے دن بس سے لاہور جائیں گی۔ یوں تو سب ہی مہمانوں کی فلائٹ لیٹ ہوئی۔ مگر ہاسٹم پچارہ جو تین بجے کی فلائٹ سے جانے کے لیے ایک بجے گھر سے چلا گیا۔ اسے پی آئی اے والوں نے ہر آدھے گھنٹے بعد روانگی کا جھانسنے دے کر ایرپورٹ پر بٹھائے رکھا۔

ہم سب مہمان کے چچا انور کے گھر دعوت اڑا رہے تھے وہ پچارہ جہاز کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر ساڑھے گیارہ بجے روانہ ہوا جہاز۔ کیا اس وقت دھند نہ تھی؟ کیا یہ بہانہ تھا۔ جہازوں کی کمی اور خرابی کا؟ پی آئی اے کے خسارے کی چھوٹی سی وجہ معلوم ہو گئی۔ حماقت۔ جی۔ جب ہر سال دھند ہوتی ہے۔ تو شام کی فلائٹ ختم کر کے صبح اور دوپہر ہی کی کیوں نہیں کر دیتے؟

نہ مسافروں کو پریشانی ہو۔ نہ اسٹاف پر مسافروں کے زبانی حملے۔ بلکہ ہاتھ پائی بھی۔ کیا صحیح فیصلہ کرنے کا اور اک نہیں یا جرات کی کمی؟

اب گھر میں سناٹا ہے۔ مختتم اور سعدیہ لاہور گئے ہیں بیٹی زمل کو لے کر سعدیہ کی کزن کی شادی میں۔ زمل کی رونق لاہور چلی گئی۔ ماشاء اللہ بہت دلچسپ بچی ہے۔



اگلے دن مختتم اور سعدیہ ناشتائے ک۔ بہن کی سسرال گئے۔ یہ آرام کا دن تھا۔ (ہمارے لیے) تمینہ تو انتظام میں مصروف تھیں۔ بچا ہوا کھانا ماسیوں، چوکیداروں، ڈرائیوروں وغیرہ کو بانٹنے کا کام۔ تھوڑا کھانا اپنے لیے انر زور میں پارو کے ہاں بھجوایا۔ کچھ پڑوسیوں کو بھی بھیجا۔ اس کے اگلے دن مہا کی چھوٹی پچھوفا خمرہ کے گھر برائے پر بلایا گیا تھا۔ بہت اچھا کھانا تھا۔ گھر آ کر ولیمہ کی تیاری۔ خاصی گہما گہما رہی۔

ولیمہ پڑا اے ایف میوزیم کے کنونشن ہال میں تھا۔

کہ بہت ہی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ مہا کا ولیمہ کا جوڑا بھی سسرال سے آیا تھا۔ شاہانہ (ساس) نے دونوں جوڑوں میں اپنے ارمان نکالے تھے۔ بہت شاندار لباس تھے۔ ماشاء اللہ شادی تو مکمل ہو گئی۔ سب ہی مطمئن اور خوش تھے لیکن دوسرے شہروں سے آنے والوں کو وہاں ہی۔ مشکل۔ پنجاب دھند میں لپٹا ہوا تھا۔

علی سفیان آفاقی کی علالت کے باعث وہ اور لبنی نہیں آ سکے۔ تھے۔ ان کی بڑی بیٹی نادیرہ ملتان سے لاہور اپنے پاپا کی تیمارداری کے لیے چلی گئی۔ بیٹی بیٹے کو شادی میں راجی بھیج دیا۔ اب ان دونوں کو ملتان لے کر جانا پارو کی ذمہ داری تھی جو بچوں کی خالہ ہیں۔ نادیرہ نمبر وہ مانجی ہیں پارو نمبر تین۔

شادی میں یعنی نے ہم سے پوچھا۔ ”آپ نے دو بھانجیوں کا ذکر تو خوب کیا ہے۔ دو کاکم۔ انہیں سلمہ اور پارو سے ملوایا کہ دونوں کے ہی ذکر زیادہ تھے۔ اب سنئے ملتان جانے کے لیے بچوں کو لے کر ایرپورٹ پہنچ گئیں پارو بیگم۔

ملتان میں دھند بہت تھی۔ فلائٹ کینسل۔ اگلے دن لاہور والی فلائٹ کی بکنگ ہو گئی۔

وقت پر سفیان علی پارو کو ایرپورٹ لے گئے۔ جہاز روانہ ہو گیا تو گھر آ گئے۔ (اتفاق کہ پارو کے والد علی سفیان آفاقی شوہر سفیان علی) لاہور سے لبنی نے یہاں داماد بنیان کو فون کر کے بتایا کہ جہاز دن دس پر

دستکی دستکی دستکی

شاہین رشید



آصف، ملک ریاض

”کسے ہیں آصف ملک ریاض صاحب؟“

”الحمد للہ بالکل ٹھیک۔“

”ایک بات بتائیں کہ آپ کی پروفائل پہ آپ کا

نام Acif لکھا ہے۔ تو ایسا کیوں ہے؟“

”یوں سمجھئے کہ یہ تھوڑی یونیک نیس ہے جب میں کالج میں انٹر کا طالب علم تھا تو ان دنوں ناموں کو بڑے اسٹائشنز اور از میں لکھا جاتا تھا تو مجھے اس بات میں زیادہ کشش محسوس ہوئی کہ میں اپنا نام C کے ساتھ لکھا کروں۔ تو میرے ڈاکومنٹس میں تو میرا نام Asif ہی ہے۔“

”کسی نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ کی انگریزی کمزور

ہے؟“

”فقہہ“ بہت سارے ایس ایم ایس آتے ہیں اور میرے سننے والے ہیں تو ان کو میں نے وضاحت بھی کر دی ہے پھر میں نے اس پہ تھوڑی سی ریسرچ بھی کی تو مجھے پتا چلا کہ Vowel کے بعد آپ کوئی بھی لفظ استعمال کر سکتے ہیں اور C کا استعمال بھی غلط نہیں ہوگا تو یہ انگریزی کے حساب سے غلط نہیں ہے اور پھر میرے سننے والوں نے بھی اسے پسند کیا تو میں نے Acif ہی رہنے دیا۔“

”آپ کی آواز جیسا کہ میں پہلے بھی کہ چکی ہوں کہ بہت عمدہ ہے، گو کا لڑ تو بہت آتی ہوں گی؟“

”بالکل جی۔۔ آواز کی وجہ سے بہت پسند لرتے ہیں میرے چاہنے والے اور میرا اسٹائل بھی کچھ ایسا ہے کہ سب ہی پسند کرتے ہیں اور آج کل جو شووز کر رہا ہوں وہ بہت پسند کیے جا رہے ہیں۔“

”کیا شووز ہیں آج کل آپ کے؟“

”آج کل میرے ویک اینڈ کے شو ہیں۔ ویک اینڈ ٹائمٹ شوالور سنڈے کو چل آؤٹ شووز ہوتے ہیں۔ تو بڑا مزا آتا ہے ایک ماحول بنالینا۔ تو ایسے پروگراموں میں آواز کا اتار چڑھاؤ لوگوں کو بہت متاثر کرتا ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ نوجوان آپ کو زیادہ پسند کرتے ہیں؟“

”جی ہاں۔ لیکن میری آواز سن کر کم عمر نوجوان

سمجھتے ہیں کہ شاید میں تم سے اوپر کا نوجوان ہوں اور جب میں لوگوں کو اپنی بیچ عمر بتاتا ہوں تو وہ حیران ہو جاتے ہیں۔ کوئی مانتا ہی نہیں کہ میں پچیسویں سالگرہ مٹا کر چھبیسویں میں داخل ہوا ہوں۔ اور مزے کی بات یہ کہ میں تصویر میں بھی اٹھائیں انٹیس کا ہی لگتا ہوں۔“

”کچھ لوگ اپنی شخصیت کی بدولت کماتے ہیں اور

کچھ آواز کی بدولت تو آپ کے پاس دونوں چیزیں ہیں تو اسکرین پر بھی آجائے؟

”جیسے اداکاری کا بھی شوق ہے اور میرا ارادہ بھی ہے کہ میں اسکرین پر آؤں۔ تو ان شاء اللہ بہت جلد ریلی کروں گا ڈراموں کے لیے۔ ویسے اسکول اور کالج کے زمانہ میں تو اپنا ہر شوق میں نے پورا کیا۔“

”آپ کی شکل معروف فنکار ہمایوں سعید سے بھی ملتی ہے تو آپ بہت جلد اپنی جگہ بنالیں گے۔ ماڈلنگ کا بھی شوق ہے؟“

”بے شک میری شکل ان سے ملتی ہے اور مجھے بہت لوگوں نے کہا بھی ہے مگر میں جگہ بناؤں گا تو اپنی شخصیت سے اپنے لپلٹ سے گور ماڈلنگ کا شوق نہیں ہے مجھے اگر ٹی وی پر آیا بھی تو یا تو بیشیٹ ”ہوسٹ“ کے یا پھر اداکار کے۔ اور ہوسٹ بنوں گا تو کسی رات کے پروگرام کا، کیونکہ صبح صبح میرے لیے بہت مشکل کام ہے۔“

”یہ نوجوانوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے صبح صبح دیر تک سوتے ہیں اور رات دیر تک جاگتے ہیں۔“

”یہ تو خیر ایک کامن سی بات ہے۔ دور میں اپنے شوز میں بھی لوگوں کو اور نوجوانوں کو جگا تا اور ہموڑ مارتا ہوں۔ لیکن خود بھی انہی میں سے ہوں۔ سنڈے کو بارہ ایک بجے شو کرنے جانا اور سنڈے کی فینڈ خراب کرنا اور سٹوڈے ٹائٹ شو کر کے گھ جانا مشکل کام ہے۔ مگر شاید ہم نوجوانوں کے خون میں یہ بات سرکولٹ کر چکی ہے کہ صبح اٹھنے کو نوجوان جرم سمجھنے لگ گئے ہیں کہ یہ کوئی ایسا کام ہے جو غلط کر رہے ہیں۔ ہمیں نہیں کرنا چاہیے اور میری والدہ تو اس حوالے سے

بہت سخت ہیں۔ وہ صبح گھڑی کا ٹائم پیچھے کر کے مجھے جگاتی ہیں۔ کہ نونج گئے اٹھ کر دیکھو تو اٹھ بجے ہوتے ہیں۔ تو ان کے اٹھانے کا اپنا انداز ہے۔ اور میں بھی ٹائمنگ کا بہت خیال رکھتا ہوں۔“

”کامیابی کی پہلی سیڑھی وقت کی پابندی ہے۔ کیونکہ جو وقت کو ضائع کر دیتے ہیں وقت انہیں ضائع

کر دیتا ہے۔ کیا خیال ہے؟“

”جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن شکر ہے کہ میرے کام پر اس ناگوئی اثر نہیں ہوا۔ ہمیشہ وقت سے پہلے پہنچ جاتا ہوں۔“

”ریڈیو کی کمائی سے گھر چل سکتا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔ ریڈیو تو بس ایک شوق ہے۔ اس لیے میں جاب بھی کرتا ہوں اور ڈراموں کی ڈبنگ بھی کرتا ہوں اور برٹا شکر ہے کہ اچھا خاصا کمالیتا ہوں۔“

”وہ کون سا ایسا ٹائم ہوتا ہے جب لوگ بہت زیادہ ریڈیو سنتے ہیں اور کون سا ایسا ٹائم ہے جب لوگ بالکل نہیں سنتے یا کم سنتے ہیں؟“

”دو باتوں کی وضاحت کر دوں ایک تو یہ کہ لوگ ریڈیو سن کب رہے ہیں اور دوسری یہ کہ ریڈیو سننے کے بعد فیڈ بیک دینے کی پوزیشن میں کب ہوتے ہیں اب جو چھ سے آٹھ بجے والے اور آٹھ سے دس والے شو ہوتے ہیں ان میں لوگ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ یعنی ستر فیصد لوگ اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں یا گھر آ رہے ہوتے ہیں۔ وہ لوگ سن ضرور رہے ہوتے ہیں لیکن وہ فیڈ بیک نہیں دے پاتے فیڈ بیک ملتا ہے رات دس بجے سے شروع ہونے والے پروگراموں کا جو رات تین سے چار بجے تک جاری رہتے ہیں۔ سنڈے کے شو میں فیڈ بیک زیادہ آتا ہے اور سٹوڈے سے ڈیل فیڈ بیک آتا ہے۔ تو آئیڈیا ہو جاتا ہے کہ لوگ توجہ سے سن رہے ہیں۔“

”دوران شو کن باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے؟“

”دوران شو ان باتوں کا خیال رکھیں کہ آپ سے کوئی ٹیکنیکل غلطی نہ ہو جائے مطلب یہ کہ ایک

وقت میں آپ کے سامنے تین ایل سی ڈی پڑی ہیں آپ کے سامنے پٹل ہے آپ کو کمرشل ٹائم پہ چلانے ہیں۔ آپ کو اذان ٹائم پہ چلانی ہے۔ نوزوالے کو ٹائم دیتا ہے یہ چیزیں ٹیکنیکل ہیں اور اس کے لیے آپ کے دماغ کا حائر ہونا بہت ضروری ہے۔ چھوٹی



سی بھی غلطی آپ سے ہو گئی تو آپ کے لیے مشکل ہو جائے گی اور آپ کے لیے ہینڈل کرنا تھوڑا مشکل ہو جائے گا۔

”پرہائی میں کیسے تھے آپ اور پریکٹیکل لائف میں کب آئے؟“

”میسٹر تک تو اے ون گریڈ آتے تھے پھر انٹر میں گریڈ نیچے۔ آئے اور گریجویشن میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اور شاید ایسا اس لیے ہوا کہ میں نے کم عمری میں ہی جاب شروع کر دی تھی یعنی انٹر کے بعد ہی انٹر کے رزلٹ سے پہلے ہی۔ مجھے احساس ذمہ داری تھا اس لیے میں فارغ نہیں بیٹھا۔“

”شادی؟“

”میری والدہ کا تو خیال تھا کہ بائیس تیس سال کی عمر میں شادی ہو، بانی چاہیے مگر اب دو ربذل چکا ہے۔ اس لیے استیجاش ہونے کے بعد ہی شادی کرنی چاہیے۔“

”کھانے پینے کا شوق ہے؟“

”کھانے پینے کا شوق ہے۔ مگر بچپن سے تربیت ایسی تھی کہ جو کچھ ملے ہسی خوشی کھاؤ۔ اور جس حال میں جو بھی ملے کھاؤ۔ اور جو بھی ملے پہنوا اس لیے خخرے نہیں کرتا۔ اور اس لحاظ سے میرے گھر والے بھی لگی ہیں کہ میں نے کبھی خخرے نہیں دکھائے۔“

”فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟“

”فارغ وقت اب تو خیر ملتا ہی نہیں ہے۔ بس ایک لیپ ٹاپ ہوتا ہے گھر میں ہوتا ہوں۔ میوزک سے اور گھیلوں کی دنیا سے لگاؤ ہے۔ کرکٹ سے بہت اچھا تعلق رہا۔ بہت میچ جیتے فاسٹ باؤلر تھا۔ مگر اسے جاری نہیں رکھا سکا۔ اگر پریکٹس میں رہتا تو شاید بہت اچھا فاسٹ باؤلر ہوتا اور آل راؤنڈر بھی ہوتا۔ اگر کم

عمری میں جاب نہ کرتا تو پھر کرکٹ میں ہوتا۔“

یا سرہ رضوی

”ہیلو جی۔ کیا حال ہے؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔ آپ کیسی ہیں۔“

”آپ کی دعا ہے۔ ملکہ عالیہ میں دیکھ رہی ہوں ماشا اللہ بہت اچھا پر فارم کر رہی ہیں ہمیشہ کی طرح۔ کیسا ریسپانس مل رہا ہے؟“

”بس جیسا ہمیشہ ملتا ہے کہ جی بہت اچھا کر رہی ہیں۔ بہت پسند آ رہا ہے آپ کا کام۔ ایسے ہی اچھے رول کرتی رہے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”آپ کو خود کو کیسا لگ رہا ہے؟“

”مجھے اچھا لگ رہا ہے اور میں وہی رول کرتی ہوں جو مجھے اچھے لگتے ہیں۔ ورنہ عام سیدھے سادے رول تو بہت ملتے ہیں۔ مگر میں انکار کر دیتی ہوں کہ میں نے ڈراموں کی تعداد نہیں بڑھائی بلکہ اپنے آپ کو دوسروں سے منفرد کھانا ہے تاکہ لوگوں کو میرا کام یاد رہے۔“

”بالکل جی۔ یہ کوالٹی تو آپ میں ہے۔ اس لیے تو آپ کا سیریل ”من کے مولیٰ“ بہت پسند کیا گیا اور آپ کے سیریل ”مجازی خدا“ کو بھی لوگ نہیں بھولے کہ اس میں بھی پر فارمنس بہترین تھی؟“

روپ دھارا ہوا ہے۔ سب اصلی والی سمجھ رہے تھے۔ مگر کسرے وغیرہ دیکھ کر انہیں اندازہ ہوا کہ یہ گاؤں والی نہیں ہے بلکہ شر سے آتی ہے۔

”پھر تو خوب آؤ بھگت ہوئی ہوگی؟“

”جی جی۔ گاؤں کے لوگ بہت مخلص اور مہمان نواز ہوتے ہیں بہت اچھے دن گزرے ان کے ساتھ۔

بہت محبت دی سب۔ نہ۔“

”آپ خود بھی تو راسٹر ہیں۔ کیا لکھنا اچھا لگتا ہے۔

سوپ سیریل یا پھر سیلی فلم؟“

”میں سیلی فلم کو ہی پسند کرتی ہوں اور میں راسٹر بھی

سیلی فلم کی ہی ہوں۔ مجھے اچھا لگتا ہے کہ کوئی ایک ہی

نشست میں بیٹھ کر ہر ڈرامہ دیکھ لے۔ آج کل

زندگی اتنی مصروف ہو گئی ہے کہ سیریل کے لیے بھی

لوگوں کے پاس وقت نہیں ہے تو سوپ کے لیے تو

بالکل بھی ٹائم نہیں ہے۔ مگر چونکہ یہ دونوں طرح کے

ڈرامے تو اتر کے ساتھ رہے ہیں تو ٹائم ہے نالوگوں

کے پاس سب ہی تو دیکھتے ہیں۔“

”آپ کا ملکہ عالیہ بھی تو دیکھا گیا۔ کافی لمبا چلا تھا وہ

بھی اور من کے موتی بھی کافی لمبا گیا؟“

”وہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ لوگوں کے پاس ٹائم

ہے تو لوگ دیکھتے ہیں۔ میں تو اپنی پسند کی بات کر رہی

ہوں کہ مجھے فلم بنانا اچھا اور دیکھنا پسند ہے۔“

”مصروفیات میں اگر تو نظر انداز ہوتا ہو گا؟“

”نہیں جی۔ بچپن سے ہی گھر گھر ہستی کی عادت

ڈال دی تھی ماں نے اس لیے مصروفیات کے باوجود

گھر داری میں حصہ ضرور لے لیتی ہوں۔ بہت اچھا پکا

لیتی ہوں۔ اور یہ ان کی تربیت ہی تو تھی کہ جب

امریکہ بڑھنے لگی تو وہاں اپنے گھر کے سارے کام خود

کرتی تھی۔“ مطلب تعلیمی قابلیت؟“

”ہیومن ریسورس کی ڈگری کے لیے امریکہ گئی اور

ماس کیونیکیشن کے لیے برطانیہ گئی تھی۔“

”پھر تو آپ کو خاص مائٹرن ہونا چاہیے تھا؟“

”ہاں۔ تھوڑی مائٹرن ہو گئی تھی۔ مگر پھر یہ سب

کچھ اپنی نیچر کے خلاف لگا۔ بس اسی لیے اپنی طبیعت

پہ لوٹ آئی۔ مجھے اس طرح ساڈرنا اچھا لگتا ہے۔“

”اے جی۔ دونوں سیریل ایک دوسرے سے بہت

مختلف تھے اور جس زمانے میں یہ سیریل ایک ساتھ

چلے میرے لیے بہت فائدے مند رہے کہ لوگوں کو

اندازہ ہو گیا کہ یا سروس میں کام کرنے کی کوالٹی بھی ہے۔

اگر وہ سیدھے سادھے کردار کر سکتی ہے تو مائٹرن کردار

بھی کر سکتی ہے۔“

”سگریٹ بھی خوب پی آپ نے مجازی خدا میں

مشکل ہوئی یا۔؟“

”یا۔ کیا؟ ایسا کچھ نہیں ہے کہ مجھے عادت ہے۔

زندگی میں ایک آدھ کش تو ہر کوئی لگا لیتا ہے۔ شروع

شروع میں تھوڑی کھانسی اور گلے میں خراش ہو جاتی

تھی۔ پھر ٹھیک ہو گیا۔ ویسے سگریٹ نوشی کے سین

زیادہ نہیں تھے۔“

”من کے موتی“ اور اب ملکہ عالیہ۔ دونوں میں

انتہائی سہل رول۔ کیوں؟“

”کیوں کی کوئی بات نہیں۔ دونوں رول میرے

حساب سے اچھے تھے۔ اور مجھے اندازہ تھا کہ یہ پسند کیے

جائیں گے اس لیے میں نے انہیں کرنا پسند کیا۔ بس

کرداروں میں جان ہونی چاہیے۔ سیدھے اور مائٹرن

سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تو ڈرامہ سائن کرتے وقت آپ کردار کو اہمیت

دیتی ہیں۔ راسٹر اور ڈائریکٹر کو نہیں؟“

”ایسا کچھ نہیں اچھا ڈائریکٹر ہمیشہ اچھی اور بہانہ دار

کہانیاں پر ہی کام کرتا ہے اس لیے اندازہ ہوتا ہے

کہ کام اچھا ہو گا۔ میں ڈائریکٹر کے علاوہ سب سے

پہلے اپنا کردار دیکھتی ہوں اور پھر سائن کرتی ہوں۔“

”میں نے دیکھا ہے کہ اتنی شہرت کے باوجود آپ

سپورٹنگ رول بھی کر لیتی ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ

ہے؟“

”اس لیے کر لیتی ہوں کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا

کہ یہ سپورٹنگ ہے یا لیڈنگ ہے۔ بس جو کردار

میرے دل کو اچھا لگتا ہے وہ میں کر لیتی ہوں۔ آپ

ابھی سیدھے رول کی بات کر رہی تھیں تو میں نے ایک

سیلی فلم میں گاؤں کی ایک لڑکی جو کھلونے بیچتی ہے کا

رول بھی کیا ہے اور کوئی پہچان نہیں سکا کہ میں نے

محبت و دلگی

خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ حارث نے اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ حارث کو منمناتا سا سلام کر کے گھر کے اندر داخل ہوئی۔

”اماں ذرا پڑوس تک گئی ہیں۔ تم بیٹھو میں اماں کو۔“

حارث نے ہانپہ کے سلام کا جواب دے کر اسے آگاہ کرنا چاہا تھا مگر وہ اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر بول پڑی تھی۔

”کیا کہا آپ نے؟“ خالہ جان گھر پر نہیں ہیں۔“ خوف زدہ سالچہ اور انداز ایسا جیسے کہ ابھی واپسی کے لیے دوڑ لگا دے گی۔

”اماں اپنا سیل فون ساتھ لے گئی ہیں۔ میں انہیں کال کر کے بلا لیتا ہوں“ قریب ہی گئی ہیں۔ پانچ منٹ میں آجائیں گی۔“

ہلکا پھلکا بخار اور معمولی سا فلو۔ آفس سے پھٹی کرنا بند تو نہ تھا لیکن وہ اپنے موڈ کا کیا کرتا۔ کبھی کبھار تو بندے کو اپنے دل کی بات ماننا ہی پڑتی ہے نا۔

اور آج ایسا ہی دن تھا۔ وہ رات کی بھرپور نیند کے بعد صبح اٹھ کر ایک بھرپور ناشتا کر چکا تھا اور اب بہت اطمینان سے اخبار کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اماں پڑوس میں اپنی کسی جاننے والی کی عیادت کو گئی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ڈور بیل بجی تھی۔

”جبریت ہے“ اماں اتنی جلدی آگئیں۔“ حارث اخبار میز پر رکھ کر گیٹ کھولنے گیا تھا۔ آنے والی اماں نہ تھیں۔ اماں کی گھبرائی بو کھلائی سی عزیز از جان بھانجی صاحبہ گیٹ کھلنے کے انتظار میں کھڑی ہاتھ کی انگلیاں مروڑ رہی تھیں۔ دوسری جانب اپنی خالہ جان کے بجائے ان کے سپوت کو دیکھ کر محترمہ کی گھبراہٹ میں

ناؤلٹ





Copied From Web

حادث نے اسے بے حد رسانیت سے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر چھایا تذبذب ابھی بھی کم نہ ہوا تھا۔ حادث نے اس کے ساتھ مزید داغ کھانے کے بجائے لاؤنج میں چار جنک پر لگا اپنا موبائل فون اٹھا کر اماں کو فون کر دیا۔ محترمہ کی تسلی کے لیے اسپیکر بھی آن کر بیٹا تھا۔

”ہانیہ آئی ہے۔ اچھا اچھا۔ بٹھاؤ میری بچی کو۔ میں دو منٹ میں آئی بس۔“

خالہ کی آواز سن کر ”بچی“ خود ہی صوفے پر ٹک گئی تھی۔ حادث اس کی مزید تسلی کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ جانتا تھا ہانیہ اس کی گھر میں موجودگی کی توقع نہ کر رہی ہوگی۔ ہر دس پندرہ دن بعد وہ اپنی خالہ کے پاس اپنے دکھڑے رونے آتی تھی۔ لیکن چھٹی والے دن آنے سے گریز ہی کرتی تھی۔ اماں کی زبانی اسے ہانیہ کی آمد کا علم ہوتا اور نہ صرف اس دن بلکہ اس سے اگلے دن بھی اماں کی زبان پر اپنی بھانجی کا ہی تذکرہ رہتا۔

”بے چاری بچی جی کا بوجھ ہلکا کرنے آجاتی ہے میرے پاس۔ آیا اور بھائی صاحب نے کیسا لاڈلوں میں پالا تھا۔ تینوں بھائی بھی جان چھڑکتے تھے۔ ماں باپ کا تو چلو اللہ کے پاس سے بلاوا آیا، چلے گئے لیکن گلوڑ مارے بھائی، اپنی آنکھیں اور کان اپنی بیویوں کے پاس گروی رکھ دیے۔ کم بخت ماریوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔ بے چاری ہانیہ کل۔“

اماں کے پاس تو سنانے کو اور بھی کچھ ہوتا تھا لیکن حادث کو ہانیہ کے گلوڑ مارے بھائیوں اور کم بخت ماری بھابیوں کے تذکرے سے چنداں دلچسپی نہ تھی، پھر بھی اسے اماں سے اکثر ہانیہ نامہ سننا پڑتا تھا۔

ہانیہ اماں کی مرحومہ بہن کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی۔ خالہ، ناناو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور اب وہ اپنے بھائیوں اور بھابیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کے حالات اتنے بھی قابل رحم نہیں تھے۔ اچھا پہنتی اوڑھتی تھی۔ گھر کے کاموں کا بھی بوجھ نہ تھا۔ چھوٹی پھوٹی معمولی باتیں جو گھروں میں ہوتی جاتی ہیں،

ہانیہ کو بہت دل گرفتہ کر دیتی تھیں۔ وہ حساس تو ہمیشہ سے تھی۔ ماں باپ کے گزرنے کے بعد ضرورت سے زیادہ زود رنج ہو گئی تھی۔ کسی بھی چھوٹی سی بات پر پیروں کڑھتی تھی اور جب ضبط کا پیمانہ بالکل لبریز ہو جاتا تو دل کا غبار ہلکا کرنے کے لیے یہاں اماں کے پاس آجاتی۔ رونے دہونے کا طویل سیشن ہوتا۔ اماں اسے چپ کرواتیں۔ ڈھیروں دلا سے دیتیں۔ کچھ نصیحتیں کرتیں۔ دوسرے الفاظ میں ہانیہ اماں سے کتھار سس کروا کر واپس اپنے گھر کی راہ لیتی۔

افشاں آپا یا یعنی آپا سسرال سے میکے آئی ہوتیں تو وہ بھی اماں کے ساتھ مل کر ہانیہ کو ڈھیروں ڈھیر تسلیاں دیتیں۔ حادث کے علاوہ سب گھر والوں کو ہانیہ سے دلی ہمدردی تھی۔ خیر اس کے ساتھ کوئی ایسا خاص بیر حادث کو بھی نہ تھا۔ لیکن جو مسئلے لے کر محترمہ یہاں آتی تھیں اور گھر والوں کو بھی جن باتوں کی وجہ سے ہانیہ بے چاری پر ترس آتا تھا۔ حادث کو ان باتوں پر سوائے ہنسی کے کچھ نہ آتا۔

مثلاً ”ہانیہ کی گھر کی سہیلی کی شادی تھی۔ توفیق بھائی کو دو تین دن پہلے سے یاد دہانی کروا رہی تھی کہ وہ مقررہ وقت پر گاڑی سمیت گھر پر رہیں۔ مقررہ وقت پر توفیق بھائی گھر پر ہی تھے، لیکن شوہر کی شکل دیکھ کر نازو بھا بھی کو یاد آگیا کہ آرتھو انہوں نے اپنی بہن کی نند کا نومولود بیٹا دیکھنے جانا ہے۔ بچے کی پیدائش کو سولہ روز گزر چکے تھے۔ اگر نازو بھا بھی ایک دو دن بعد مبارک باد دینے چلی جاتیں تو یہ فرق پڑ جاتا۔ اس کی گھر کی سہیلی کی شادی کا فنکشن مرس ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ وہ تو شمس بھیا کو اس کی بے چاری سی شکل پر ترس آگیا اور وہ اپنی پھینچر سی بایک پر اسے مینج ہال چھوڑ آئے۔ واپسی کسے ہوئی، وہ الگ الگ داستان تھی جو ہانیہ بی بی نے چچیکوں سے روتے ہوئے سنائی اور اماں دوپٹے سے اس کی آنکھیں پونپھتی رہیں۔“

شادی کے بعد یہ گھر کی سہیلی ہانیہ سے ملنے گھر آئی۔ ہفتے بعد اس نے سیاں کے ساتھ بیرون ملک چلے جانا تھا۔ نازو بھا بھی اور شمس بھا بھی گھر پر تھیں۔ دونوں

سہیلی سے ملنے تک نہ آئیں۔ ملازمہ کے ہاتھ ڈرائنگ روم میں دو گلاس کولڈ ڈرنک بھجوا دی۔ گلاسوں میں اتنی برف ڈال دی تھی کہ کولڈ ڈرنک بالکل شربت بن گیا۔ (یہ ہانیہ کی ہی اصطلاح تھی) اور اسی شام نازو بھابھی کے بہن، بہنوئی گھر آئے تو طرح طرح کے لوازمات سے پوری میز سج گئی۔ بلکہ

انہوں نے شامی کباب تلنے کو ہانیہ سے ہی کہا اور شامی کباب تلتے ہوئے گھی کا ایسا چھینٹا کھائی پر پڑا کہ اچھا خاصا آبلہ بن گیا اور جب ہانیہ مہمانوں سے سلام دعا کرنے گئی۔ بھابھی کی بہن نے اس کی اسٹڈیز کے متعلق ایک دو سوال پوچھے تو نازو بھابھی نے مہنگائی کا رونا شروع کر دیا۔ درپردہ وہ ہانیہ کو سنانا چاہ رہی تھیں کہ اس کے تعلیمی اخراجات کی وجہ سے گھر کے خرچوں میں کیسی تنگی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

اور چھوٹی بھابھی شاپنگ پر گئیں تو رسا "ہانیہ سے بھی پوچھ لیا کہ اسے کچھ چاہیے تو ہمیں۔ اس کا ہینڈ بیگ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ اس کا اسٹریپ بھی بس ٹوٹنے ہی والا تھا تو اس نے بھابھی سے کہا کوئی مناسب قیمت والا ہینڈ بیگ لے آئیں اور چھوٹی بھابھی جن کی چوائس کا ایک زمانہ گزریا تھا وہ اس کے لیے ایسا بد رنگا اور بد وضو بیگ اٹھالا میں کہ ہانیہ کبھی حیرت سے بھابھی کا منہ دیکھتی اور کبھی بیگ کا۔ اور رات کے کھانے کے بعد چھوٹی بھابھی کے کمرے سے چھوٹے بھیا کے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ خاصے کنجوس تھے اور بیوی سے اس فضول خرچی کے بارے میں باز پرس کر رہے تھے تو چھوٹی بھابھی خرچے کی وضاحت دیتے ہوئے بار بار ہانیہ کے ہینڈ بیگ کا ہی ذکر کرتی رہیں۔ ہانیہ اس وقت کو کوستی رہی جب اس نے ہینڈ بیگ کی فرمائش کی تھی۔ ایک دفعہ جب اسے بخار ہوا تو وہ دو دن تک بھیا کے میڈیکل یا کس میں سے بخار کی ٹیبلٹ لے کر کھاتی رہی۔ بھابھیوں اور بھائیوں میں سے کسی کو خیال تک نہ آیا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس ہی لے جایا جائے۔ وہ تو شکر ہے کہ دو دن بعد

بخار خود ہی اتر گیا۔

اسی طرح جب شہلا بھابھی کے سب سے چھوٹے فتنے مطلب بیٹے نے اس کی اہم اسائنمنٹ پھاڑ دی اور اس نے غصے میں بھیجے کو ایک چمٹا (طمانچہ) رسید کر دیا تو بظاہر تو شہلا بھابھی کچھ نہ بولیں مگر وہ دن تک ان کا موڈ آف ہی رہا۔

اسی طرح کے درجنوں قیسے تھے جن کو سناتے ہوئے ہانیہ بی بی پر رقت طاری ہو جاتی اور اماں لاڈلی بھانجی کو سینے سے چمٹا کر ڈھیروں ڈھیر تسلیاں دیتیں اور پھر اگلے دو دن تک حارث کے سامنے اماں آب دیدہ ہو کر بھانجی کی باتیں دوہراتی رہتیں۔



دونوں بہنوں کی شادیوں کے بعد اماں سارا دن چپ رہ رہ کر آکتا جاتی تھیں۔ جب وہ آفس سے گھر واپس آتا تو اماں اسے کھانا بعد میں دیتیں دن بھر کی رپورٹ پہلے دیتیں۔ اسے اماں کا تنہائی کا بخولی احساس تھا۔ دو سال پہلے اماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اماں بہت تنہا ہو گئی تھیں۔ دونوں بہنیں اپنے گھر بار کی تھیں۔ پندرہ بیس دن بعد میکے کا چکر لگنا۔ ماں کے سامنے سسرال والوں کی ڈھیروں ڈھیر غیبتیں کر کے واپس اپنے گھر کی راہ لیتیں، لیکن آج کل بہنوں کے ہاتھ ایک اور موضوع لگ گیا تھا۔ وہ جب بھی میکے آئیں حارث کی شادی کا ذکر چھیڑ دیتیں اور اپنی ان نندوں دیورانوں، جیٹھانیوں جن سے ان کی ایک دن نہ بنی تھی ان ہی کی بیٹیوں کا نام حارث کے لیے تجویز کرتیں۔ شکر ہے اماں اس معاملے میں حارث کی ہم خواہش تھیں۔

"ساری زندگی جن عورتوں کی تیزی طراری کے قیسے تم مجھے سناتی رہی ہو اب ان کی بچیوں کو حارث کے لیے منتخب کر رہی ہو۔ جب ماں میں اتنی تیزی طراریں تو بچیاں کون سی سیدھی اور معصوم ہوں گی۔ نہ بھئی مجھے اور میرے بیٹے کو بخشو تم۔"

ہے یہ بات ہمارے ذہن میں کیوں نہ آئی۔" افشاں آیا
نے فوراً "سے پشتر تائیدی دوشدے ڈالا۔

"تمہارے ذہنوں پر تمہاری سسرالی بچیاں چھائی
ہوئی تھیں۔ بتاؤ تو سہی ان میں سے کوئی میری ہانیہ کے
پاسنگ بھی ہے۔" اماں نے نقا خزانہ لےجے میں استفسار
کیا۔

"قار گاڈ سیک اماں! آپ اپنی رونی صورت والی
بھانجی کو میرے لیے باندھنا چاہ رہی ہیں۔" حارث کو
ماں کی بات سن کر گویا کرنٹ لگا تھا۔

"بس مجھے اسی چیز کا خدشہ تھا۔ اسی لیے اتنے دن
سے یہ خواہش اپنے دل میں دبا رکھی تھی۔ سمجھاؤ اپنے
بھائی کو ہانیہ سے اچھی لڑکی اور کہاں ملے گی اسے۔"
اماں نے بیٹے کو ناراضی سے دیکھا تھا۔

"ہاں تو اور کیا حارث! بتاؤ تو سہی۔ کیا کی سے ہانیہ
میں مشکل و صورت لاکھوں میں ایک پڑھی لکھی
سیدھی سادی بھولی بھالی اور سب سے برہ کر ہماری
انہی۔ آپ کا انتخاب سو فیصد درست ہے اماں! بس
پہلی فرصت میں توفیق بھائی وغیرہ کے ہاں جا کر ہانیہ کا
رشتہ مانگ لیتے ہیں۔" افشاں آیا تو ہتھیلی پر سرسوں
جمانے کے چکر میں تھیں۔

"کمال کرتی ہیں آیا آپ! میں کہہ رہا ہوں مجھے
ہانیہ پسند نہیں اس امیچور لڑکی سے مجھے ہرگز شادی
نہیں کرنی۔ کوئی ڈھنگ کی لڑکی ڈھونڈنی ہے تو
ڈھونڈیں ورنہ یہ کام میں خود کر لوں گا۔" حارث کو
غصہ ہی آگیا۔ اس کی زندگی کا سب سے اہم معاملہ اور
اس کی رائے کو کوئی اہمیت دینے کو ہی تیار نہ تھا۔

"اچھا خفا کیوں ہوتے ہو۔ بتاؤ تو سہی کیا کی ہے
ہانیہ میں۔ تمہیں وہ کیوں اچھی نہیں لگتی۔" یعنی آیا
نے اسے بچکار کر پوچھا۔

"میں نے جب بھی اسے دیکھا ہے روتے ہوئے
ہی دیکھا ہے۔ میرے لیے کیا وہی رونے دھونے والی
لڑکی رہ گئی ہے؟ اس نے بگاڑ کر پوچھا۔

"تم اس کے معروضی حالات تو دیکھو۔ ماں باپ سر

"جیسی سیدھی اور معصوم ہو آپ چاہ رہی ہیں وہ
آج کے دور میں تو ملنے سے رہی۔ جن لڑکیوں کا ہم ذکر
کرتے ہیں وہ ہمارے سامنے ملی پڑھی ہیں۔ ان کے
مزاج اور عادتوں سے ہم بخوبی آگاہ ہیں۔ تھوڑی بہت
تیزی طرارتا تو کس میں نہیں ہوتی اماں!" افشاں آیا
بہت رسائیت سے ماں کو مخاطب کرتیں۔

"ہاں تو اور کیا اماں! باجی بالکل صحیح کہہ رہی ہیں۔
الوینہ، نوشابہ، لائبہ اور زرمینہ چاروں بچیاں ہماری
آنکھوں کے سامنے ملی پڑھی ہیں پھر حارث ہمارا
اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارا تو میکہ ہی اس کے دم سے ہے
کیا گارنٹی ہے کہ غیروں میں سے کوئی لڑکی لائیں گے
تو وہ اس گھر میں ہمارا کبھی کبھار کا آنا بھی برداشت
کر پائے گی۔ اپنی دیکھی بھالی لڑکی کو بھابھی بنائیں گے تو
ہمارا اور ہرے بچوں کا وجود بخوشی گوارا کرے گی۔"
یعنی آیا نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"تو کیا ضروری ہے کہ تمہاری سسرالی بچیوں میں
سے ہی کسی کو ہو بتاؤں۔ تمہیں قرب و جوار میں کوئی
اور ایسی لڑکی نظر نہیں آرہی جو دیکھی بھالی بھی ہے۔
سیدھی اور معصوم بھی اور تمہارے بچوں سے بہت
پیار بھی کرتی ہے۔" اماں ذرا معنی خیز انداز میں مسکراتی
تھیں۔

یعنی آیا اور افشاں آیا نے چونک کر اماں کو دیکھا۔
چونکا تو حارث بھی تھا۔ ابھی تک تو وہ ماں بہنوں کی بحث
سے لطف لے رہا تھا لیکن اماں نے اس بار جو فقرہ بولا
تھا اس میں کس ہستی کی طرف اشارہ تھا۔ وہ چند لمحوں
میں ہی اس اشارے کو پا گیا تھا لیکن ہو سکتا ہے اسے
سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ اس نے بے یقینی سے ماں کو
دیکھا تھا۔

"ہانیہ کی بات کر رہی ہیں آپ؟" یعنی آیا نے
حیرت سے استفسار کیا۔

"ہاں میں ہانیہ کی ہی بات کر رہی ہوں۔ بولو کوئی
اعتراض ہے تو؟" اماں نے مسکرا کر بیٹیوں کو دیکھا۔

"اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ حیرت

تھیں۔ بیٹے پر آیا غصہ بلا وجہ بیٹیوں پر نکل رہا تھا اور
فرہاں بردار بیٹیاں چپ چاپ ماں کی ڈانٹ سنے لگیں۔



حادثہ کو خدشہ تھا کہ اماں دوبارہ یہ موضوع ضرور
پھینٹیں گی، لیکن صد شکر اس دن کے بعد اماں نے اس
کے سامنے ہانسیہ کا نام نہیں لیا تھا اور اب تو کافی دنوں
سے محترمہ کی آمد بھی نہیں ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور
پر اسے کبھی کبھار ہانسیہ کا خیال آجاتا تھا۔ اماں اور
بہنوں کی بات یاد کر کے چھم سے محترمہ کا سراپا ذہن
کے پردے پر لہراتا، مگر اگلے ہی پل وہ سر جھٹک کر ہانسیہ

کے تصور بھی ذہن سے جھٹک ڈالتا۔

اور پھر ایک دن ہانسیہ صاحبہ گھر آہی گئی تھیں۔ آج

خواتین ڈائجسٹ

نمبر 37 - اردو بازار، کراچی

دستِ کوثر

نوزیہ یاسمین



قیمت - 750/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021

برہن نہیں۔ بھائی، بھابھیاں اپنی زندگیوں میں مگن۔
گھر میں کوئی ایسا فرد نہیں جس کے ساتھ وہ اپنے دل
کی بات شیئر کر سکے۔ کوئی چھوٹا بہن بھائی بھی نہیں
جس سے لڑ جھگڑ کر دل کی بھڑاس نکال سکے۔ یہاں
اماں کے پاس آکر وہ اپنا جی ہلکا کرتی ہے ورنہ ایسی بات
تھوڑی ہے کہ وہ ہر وقت روٹی دھوتی رہتی
ہے۔ ”افشاں آپا نے بھی لاڈلے بھائی کو بہت پیار سے
سمجھایا تھا۔

”کوئی اور بات کریں آیا! جب میں نے کہہ دیا نہیں
تو بس نہیں۔“ اس نے اکتا کر ان کی بات کاٹی۔

”رہنے دو افشاں! جب اس نے نہ کر دی ہے تو وہ
کبھی ہاں میں نہیں بدلے گی۔ اپنے لیے اپنی پسند کی
لڑکی یہ خود تلاش کر لے گا۔ تم دونوں اپنے گھریلو کی
ہو اور میں نے بھی کتنے دن جی لیتا ہے۔ جیسے مرضی
لڑکی پسند کرے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اماں بیٹے
کی ہٹ دھرمی پر آب دیدہ ہو گئی تھیں۔ حادثہ جی
میں کچھ شرمندہ آؤ ہوا لیکن جانتا تھا ماں بہنیں اسے
قائل کرنے کو اور بھی بہت سے جذباتی اور نفسیاتی
 حربے استعمال کر سکتی ہیں، سو اس وقت یہاں سے چلے
جاتا ہی بہتر ہے۔

”میں داؤد کی طرف جا رہا ہوں۔ کل وہ بائیک سے
سلب ہو گیا تھا۔ اچھی خاصی چوٹیں آئی ہیں۔ اس کا
حال پوچھ آؤں۔“ اس نے اپنے قریبی دوست کا نام
لیا۔ ماں بہنیں ایک دوسرے کو دیکھ کر اور دل مسوس کر
رہ گئیں۔ حادثہ، لاکھ فرہاں بردار سہی مگر یہ سچ تھا کہ
کوئی بھی اس کی مرضی کے خلاف اس سے کوئی کام نہ
کروا سکتا تھا۔

”تم دونوں کو سی جلدی پڑی ہوئی تھی بھائی کی
شادی کی۔ نہ روز، روز ایسے دے رشتے لے کر آئیں تو
کا ہے کو میں ابھی ہانسیہ کا نام لیتی۔ بڑا شیئر ہا بیٹا ہے
میرا۔ بہت طریقے سلیقے سے قائل کرنا تھا مجھے اس کو
موقع محل دیکھ کر بات چھیڑتی۔ تم دونوں کی وجہ سے
سب کچھ چوہٹ ہو گیا۔“ اماں اب بیٹیوں پر بگڑ رہی

بھی اتفاق سے حارث کے آفس کا آف تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ پر آفس کا کوئی کام نمٹانے میں مصروف تھا جب دروازے کی بیل بجی۔ اماں شاید واش روم میں تھیں۔ حارث گیٹ کھولنے گیا تو گھبراہٹ ہو کھلائی کیا ہانیہ دروازے پر موجود تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک رکٹنے والا رکشے سے گردن باہر نکال کر اسی جانب متوجہ تھا۔

”حارث بھائی! میں ہینڈ بیگ میں پیسوں والا پرس ڈالنا بھول گئی، پلیز اسے کرایہ دے دیں۔“ بے تحاشا شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے حارث کو مخاطب کیا۔

”عجب بھلکڑ لڑکی ہے۔“ وہ دل میں صرف سوچ رہی تھی۔

”اے اے، ہی مل اس کی بے چاری سی شکل دیکھ کر اسے ترس آ گیا تھا۔“

”تم چلو اندر۔ میں اسے کرایہ دیتا ہوں۔“ حارث نے اسے نرمی سے مخاطب کیا اور رکشے والے کو کرایہ دے کر تب وہ لاؤنج میں سے گزرا تو صوفے پر بیٹھی ہانیہ پر نگاہ پڑی۔

وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسائے سر جھکا کر جانے کس سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ اسے حارث کی آمد کا احساس تک نہ ہوا تھا۔ حارث اپنے کمرے کی طرف جانا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر وہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس لڑکی کو اس کی ماں اس کا جیون سر بھی بنانا چاہتی تھیں اور حارث کے انکار پر وہ یہ خواہش دوبارہ زبان پر نہ لائی تھیں مگر ان کی خاموشی سے نفی بھی حارث سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔

”کیا اماں کی خواہش پوری کرنے کو وہ ہانیہ سے شادی پر راضی ہو سکتا ہے۔“ اس نے ہانیہ پر اک نگاہ ڈالتے ہوئے خود سے پوچھا تھا۔

وہ خوب صورتی کے مروجہ پیمانے پر پوری اترتی تھی۔ دودھ ملائی سی رنگت، ستواں ناک، قد رتی گلابی ہونٹ، متناسب سر کیا۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی۔ حارث نے فراخ دلی سے تسلیم کیا، لیکن اس کی غیر متوازن شخصیت، بلا کی زودرنج، بھلکڑ اتنی کہ بنا

پیسوں کے گھر سے نکل پڑی، غیر حاضر دماغی کا یہ عالم کہ حارث اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا اس کا چہرہ تک رہا تھا اور ہانیہ کو اس کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ جانے کن سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی وہ۔

”تمہاری اسٹڈیز کیسے جارہی ہیں ہانیہ!“ حارث نے اسے مخاطب کیا۔ وہ جیسے ایک دم چوٹی تھی۔

”جی حارث بھائی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“

”تمہاری پڑھائی کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ کیسی جارہی ہیں تمہاری اسٹڈیز۔“ اس نے دوبارہ اپنا سوال دوہرایا تھا۔

”پڑھائی ٹھیک جارہی ہے حارث بھائی! خالہ کو بلا دیں گھر پر ہی ہیں نا؟“ غجلیت میں اس کے سوال کا جواب دے کر اماں کے بارے میں پوچھا۔ حارث سخت بد مزہ ہوا۔ ہانیہ لڑائی اس گھر میں صرف اپنی خالہ سے ملنے آئی تھی، لیکن خالہ کے بیٹے نے اسے مخاطب کرنے کی غلطی کر رہی لی تھی تو ایک دو باتیں کرنے میں کوئی مضائقہ بھی نہ تھا۔

”تم بیٹھو، میں اماں کو بھیجتا ہوں۔“ سنجیدگی سے کہہ کر وہ اٹھ گیا تھا۔ سامنے سے ہی اماں بھی آرہی تھیں۔ وہ انہیں ہانیہ کی آمد کا بتا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں اماں اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ بنا کچھ کہے انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل پر دھراٹھو کا ڈبا اٹھایا تھا۔

”اگلے مہینے کے سا ان میں چار ڈبے فالٹو منگوا لیجئے گا۔ آپ کی بھانجی گھر کے سارے ٹشو استعمال کر لیتی ہے۔“ اس نے اماں کو مخاطب کیا، وہ کچھ نہ بولیں بس میٹھے پر تکیھی نگاہ ڈال کر ٹشو کا ڈبا لیے واپس پلٹ گئی تھیں۔

”جانے آج کیا ستم ٹوٹا ہے محترمہ کی ذات پر۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں سوچا تھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا، لیکن آج جانے کیوں کام پر توجہ ہر تکتا نہ ہو رہی تھی۔ طبیعت پر بھی عجیب کسل مندی سے طاری تھی۔ اماں تو اپنی

بھانجی کے پاس سے گھنٹہ بھر سے پہلے کیا ہی اٹھتیں، اس نے خود اپنے لیے چائے بنانے کی سوچی۔ لاؤنج میں اب اماں اور ہانیہ نہ تھیں۔ اماں شاید اسے اپنے کمرے میں لے گئی تھیں۔

حادثہ نے اپنے لیے کیتلی میں چائے چڑھائی تو جانے کیسے اخلاقیات اور مہمان داری کا تقاضا یاد آگیا۔ اماں اور ان کی بھانجی کے لیے بھی چائے بنائی۔ خود ٹرے میں کپ سجا کر لے جاتا تو اسے اچھا نہ لگا۔ اپنے مک میں ہائے ڈال کر وہ اماں کے کمرے کی طرف گیا۔ سوچا تھا ہمیں کہہ دے کہ چائے بنی ہوئی ہے۔ لیکن میں سے جا کر لے لیں، مگر اماں کو یا آواز بلند پکارنے سے پہلے ہی وہ ٹھنک کر رکا تھا۔ کمرے میں سے موصوفہ کی زور زور سے رونے کی آواز آرہی تھی اور اماں اسے چپ کروانے کی کوشش میں ناکام ہوئے جا رہی تھیں۔

”حد ہوتی ہے۔ یہ لڑکی بھی بلاوجہ اماں کو پریشان کرتی ہے۔ کوئی معمولی سی بات ہوگی اور یوں رونادھونا ڈال رکھا ہے۔“ حادثہ کو از حد کوفت ہوئی۔

”ہانیہ میری بچی! بتا تو سہی ہوا کیا ہے۔ کب سے روئے جا رہی ہے۔ پہلے تو کبھی اتنا نہیں روئی۔ ہلکان کر لیا ہے خود کو مجھے بتا تو سہی ہوا کیا ہے؟“ اماں کی آواز نے مارٹ کو وہیں کھڑے رہنے پر مجبور کر دیا۔ فطری تجسس آڑے آیا کہ محترمہ کیا جواب دیتی ہیں۔ ”نانازو بھابی نے میرے لیے اپنے بھائی کا رشتہ دیا ہے خالہ!“ بے تحاشا روتے ہوئے اس نے آخر بتا دی ڈالا۔

”تو میری چند! اس میں یوں رونے کی کیا بات ہے۔ اس لڑکی میں بچیوں کے رشتے آتے ہی ہیں۔“

اماں نے اسے پکارا تھا۔ حادثہ کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ جو لڑکی رشتہ آنے پر ایسا واویلا مچا رہی تھی۔ اس کی ذہنی حالت کے کیا ہی کہنے۔ اور اماں ان محترمہ کو اس کے پلے باندھنا چاہ رہی تھیں۔

”آپ کو نہیں پتا خالہ! نازو بھابی کا بھائی ایک نمبر کا

لوفر اور آوارہ ہے۔ ویسے تو اس نے ایم بی اے کیا ہوا ہے۔ جب بھی اچھی ہے، لیکن وہ بہت ہی لوز کریکٹر بندہ ہے اور نازو بھائی کو اپنے لفٹے بھائی کے لیے میں نظر آگئی۔ ان کے خاندان میں کوئی اس شخص کو لڑکی دینے کو تیار نہیں اور میرے بھائی آنکھوں دیکھی مکھی نگنے کو تیار ہیں۔“ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

”مجھے کس نے بتایا کہ وہ ایسا لڑکا ہے۔“ اماں نے تحمل اور رسوائیت سے دریافت کیا۔

”شہلا بھابی اور چھوٹی بھابی کی باتیں سنی تھیں۔ انہیں سب پتا ہے شہزادے، متعلق۔ پتا تو توفیق بھائی کو بھی ہے، ظاہر ہے وہ ان کا سگا سالا ہے، لیکن ان کے منہ میں تو نازو بھابی کی زبان ہے۔ افسوس مجھے شمس بھیا اور چھوٹے بھیا پر ہے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ شہزاد کس ٹائپ کا لڑکا ہے اور اس کی باتیں میں نے ان کی بیویوں کی زبانی ہی سنی ہیں تو پہلے تو دونوں بھابیوں مگر گئیں پھر چھوٹے بھیا بولے کہ شادی سے پہلے لڑکوں میں تھوڑی بہت ایسی ایسی عادتیں ہوتی ہی ہیں۔ شادی کے بعد سب سدھر جاتے ہیں۔ لڑکا بڑھا لکھا ہے۔ برسر روزگار بھی اور کیا گارنٹی ہے کہ کسی اور جگہ سے رشتہ آئے گا تو لڑکا بہت شریف اور سلجھا ہوگا۔ یہ تو نازو بھابی کا بھائی ہے اس لیے اچھی بری عادتیں سامنے آگئیں اور شمس بھیا بولے کہ کیوں کہ نازو بھابی ہمارے گھر کی بہو ہیں تو شہزاد کے گھر میری پوزیشن مستحکم ہوگی۔ وہ لڑکے ہمارے دباؤ میں رہیں گے۔ آپ خود بتائیں خالہ کیا یہ معقول وجہ ہے میرا وہاں پر رشتہ کرنے کی اور نازو بھابی جیسی خاتون کبھی کسی کے دباؤ میں آسکتی ہیں۔ جیسی وہ ہیں ویسا ہی ان کا خاندان ہے۔ میں تو ان کے گھر میں جا کر جیتے جی مرجاؤں گی اور پھر وہ لفٹنگا شہزادے۔ اف! میں مرجاؤں گی خالہ! مگر اس سے شادی نہیں کروں گی۔“

رو رو کر ہانیہ کا گلا بیٹھ گیا تھا اور کمرے سے باہر کھڑے حادثہ کو اب اس کی باتیں اور رونا بچکانہ نہ لگ رہا تھا۔ جب کسی کی زندگی داؤ پر لگی ہو تو واویلا مچانا حق ہے۔ اس وقت اپنی کزن پر اسے ترس بھی آ رہا تھا

وہ بلک بلک کر روئی تھی اور کمرے سے باہر کھڑے
حادث کی کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ اشتعال کی شدید لہر
نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جس لڑکی کا رونا دھونا
اسے ہمیشہ بچکانہ لگتا تھا۔ اس کے آنسو آج برواشت
سے باہر تھے۔ وہ اس کی سگی خالہ زاد تھی۔ کسی شخص
کی یہ جرات کیسے ہوئی کہ وہ اس کے گھر جا کر
ہراساں کر آئے۔

حادث کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس شہزاد کا جاکر منہ
اڑوڑے۔ وہ بھول گیا کہ وہ اماں کے کمرے کے باہر
کیوں کھڑا ہے۔ وہ اماں کو کہا کہ آیا تھا۔ اماں کو
پکارے بغیر واپس پلٹ گیا۔

پتا نہیں ہانیہ کی واپسی کب ہوئی تھی۔ بہت دیر بعد
اماں اسے کھانے کے لیے بلائے آئی تھیں۔ ہانیہ
جا چکی تھی۔ کھانے کے دوران وہ منتظر رہا کہ اماں ہانیہ
کے متعلق کوئی بات کریں گی۔ اس کے ٹگوڑ مارے
بھائیوں اور کم بخت ماری بھابیوں پر ضرور لعنت
ملا مت کریں گی، لیکن خلاف معمول اماں آج ہانیہ کے
بارے میں ایک لفظ نہ بولی تھیں، لیکن ان کے چہرے
پر چھایا اضطراب اور پریشانی حادث کی نگاہوں سے مخفی
نہ رہائی۔

”کیا بات ہے اماں! آپ، کچھ پریشان لگ رہی
ہیں؟“ اس نے ہاں کو کرید لیا۔ جواب میں کچھ نہ بولیں۔
بس ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بیٹے پر شکوہ کناں سی
نگاہ ڈالی۔

”اتنی ناراضی سے کیوں دیکھ رہی ہیں کچھ تو
بولیں۔“ وہ جانے ماں کے لبوں سے کیا سننے کا متمنی
تھا۔

”بولوں تو تب تا میرے بولنے کا کچھ فائدہ ہو۔ کھانا
کھاؤ بیٹا! کوئی بات نہیں ہے۔ نہیں ہوں میں
پریشان۔“ اماں دھیرے سے بولی تھیں۔

حادث چپ چاپ ماں کو تکتے گیا۔ شدید شرمندگی
نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اماں اس کی ہٹ
دھرمی سے واقف تھیں، اسی لیے نہ صرف اپنی
خواہش سے دست بردار ہو گئی تھیں بلکہ اب اسے

اور دلی ہمدردی بھی محسوس ہو رہی تھی۔
”تم ایک بار توفیق سے بات تو کرو۔ وہ تمہارا بڑا بھائی
ہے۔ تمہارے باپ کی جگہ پر ہے۔ تمہاری بات کیوں
نہ سنے گا۔ وہ کبھی تمہاری مرضی کے بغیر تمہاری زندگی
کا فیصلہ نہیں کرے گا۔“ اماں بہت خوش فہم تھیں یا
پھر انہیں بھانجے کی فطرت کا اندازہ ہی نہ تھا۔ ہانیہ
انہیں بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

”چلو شاباش۔ یوں خود کو ہلکان مت کرو۔ یہ پانی
پیو۔“ اماں غالباً اسے پانی کا گلاس تمہاری تھیں۔
”پرسوں شہزاد ہمارے گھر آیا تھا خالہ!“ ہانیہ نے
رندھی ہوئی آواز میں مزید کچھ بتانا چاہا۔

”اس کی بسن کا گھر ہے۔ آگیا ہو گا پھر کیا ہوا۔“
اماں نے اس کی پوری بات سنی ہی نہ تھی۔

”ٹھیک ہے خالہ! اس کی بسن کا گھر ہے اور وہ پہلی
بار نہیں آیا، تا رہتا ہے اور میں ہر بار کوشش کرتی
ہوں کہ اس کا سامنا نہ کروں۔ مجھے اس کی گندی
نگاہوں سے اتنی الجھن ہوتی ہے کہ میں آپ کو بتا
نہیں سکتی۔ پرسوں بھی میں اس کی شکل دیکھتے ہی کچن
میں گھس گئی اور پتا ہے خالہ! تھوڑی دیر بعد وہ میرے
پیچھے کچن میں ی چلا آیا۔“ وہ بتاتے بتاتے پھری بری
طرح رو پڑی۔

”نہیں! اتنے قریب دیکھ کر گھبرا گئی۔ میں نے
اس سے کہا کہ آپ کو کچھ چاہیے تو بتائیں۔ کہنے لگا۔
تمہارا ساتھ چاہیے۔ میرا دلغہ کھوم گیا خالہ! میں نے
اس سے کہا کہ وہ شرافت سے باہر جا کر بیٹھے، ورنہ میں
آواز دے کر بھائی کو بلالوں گی۔ وہ زور سے ہنسا، پھر
میری لٹ پکڑ کر کھینچی کہنے لگا جانتا ہوں تم اڑی دکھا
رہی ہو، لیکن یاد رکھو جتنا مرضی انکار کرو دو لہن بن کر
میرے ہی گھر آنا ہے پھر گن گن کر بد لے لوں گا، پھر وہ
چلا گیا خالہ! اے مجھے لگا کہ میرے ماں باپ آج ہی مرے
ہیں۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے گھر میں نہیں
بلکہ کسی گلی یا بازار میں کھڑی ہوں۔ بے سائبانی کا جو
احساس مجھ پر حاوی ہو رہا تھا، میں چاہوں بھی تو آپ کو
نہیں بتا سکتی۔“

ہانیہ کے حالات بتانے سے بھی اسی لیے گریزاں تھیں کہ ان کی نگاہ میں یہ بے کار تھا۔



دونوں اور دو راتیں اس نے مسلسل سوچا تھا۔ ہانیہ کو سوچتا تو ترس اور ہمدردی کے طے جملے جذبات دل میں ابھرتے۔ اماں کی حکم عدولی اور اپنی ہٹ دھرمی یاد آتی تو شرمندگی کا احساس بیدار ہوتا۔ یہ طے تھا کہ اماں کا دل دکھا کر وہ خود بھی کبھی مطمئن اور خوش نہ رہ سکتا تھا۔ گزرے بہت سے دن اس حقیقت کا بین ثبوت تھے۔

ہانیہ اماں کا انتخاب تھی۔ اس کی شخصیت کچھ ناپختہ تھی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ انسان میں بروہاری اور سمجھ داری آتی جاتی ہے۔ جو کام کوئی اس سے زور زبردستی سے نہ کروا سکتا تھا وہ بس خود بخود ہی ہو گیا۔ ہانیہ کے لیے دل قائل ہو گیا اور اس فیصلے پر دماغ مطمئن ہو گیا۔ اب اماں کو خوش کرنے کا مرحلہ باقی تھا۔

چھٹی والے دن افشاں آیا اور یعنی آیا آئیں تو اس نے بہت معصوم سے انداز میں ماں بہنوں کو مخاطب کیا تھا۔

”آپ لوگوں نے ایک بار میری شادی کا ذکر کیا اور پھر یہ تذکرہ ہی بھول گئے۔ جانتے ہیں نا، میں کتنا شرمیلا ہوں۔ اس دن سے انتظار کر رہا ہوں کہ دوبارہ یہ ذکر چھیڑیں تو میں اپنی پسند بتاؤں۔“

”مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ یہ کسی لڑکی کے چکر میں ہے۔“ یعنی آیا کا صدمے سے برا حال تھا۔ شریف اور معصوم سا بھائی خود ہی کسی لڑکی کو پسند کر لے گا، کم از کم یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔

”تم اپنی پسند ناؤ۔ ہم رشتہ لے جائیں گے۔“ اماں نے پرسکون اور ہوار لہجے میں بیٹے کو مخاطب کیا۔

”جی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ لوگ جلد از جلد وہاں رشتہ لے لے جائیں کیوں کہ اس لڑکی کا ایک پروپونل آیا ہوا ہے میں ہرگز نہیں چاہتا کہ اس کے گھر

والے کسی اور کو ہاں کر دیں۔“

”تمہارے آفس میں کام کرتی ہے نا؟“ افشاں آیا نے یقین بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”کب سے پسند کرتے ہو۔ اسے اور اتنے دنوں سے یہ بات ہم سے کیوں چھپائی؟“ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی یعنی آیا نے خفگی سے پوچھا تھا۔

”یہ سب سوال بے معنی ہیں۔ تم مجھے اس لڑکی کا نام بتاؤ، میں کل ہی رشتہ لے جاؤں گی۔“ اماں کا وہی ٹھنڈا اٹھار انداز تھا۔ حارث نے محبت سے مسکرا کر اماں کو دیکھا۔

”لڑکی کا نام پتا بتاؤں گا تو مجھے دو جوتے تو نہیں لگا میں گی۔“ اماں جواب میں کچھ نہ بولی تھیں بس حیرانی سے بیٹے کو دیکھا۔

”سیران مت ہوں اور کوئی غلط گمان بھی دل میں نہ لائیں۔ کسی ایسی ویسی لڑکی کے، مرنے نہیں بھیجوں گا آپ لوگوں کو، لڑکی بہت بھولی بھالی ہے، سیدھی سادی اور معصوم بھی۔ بس اسے بات بات پر روتا۔“

”میں تجھے واقعی دو جوتے لگاؤں گی حارث! سیدھی طرح لڑکی کا نام بتا۔“ اماں نے اسے گھورا تھا۔

”آپ سب کی پیاری ہانیہ اور کون۔“ وہ مسکرایا۔

”مگر ہانیہ قبول ہے تو اس روز ڈرا سے بازی کی کیا ضرورت تھی؟“ افشاں آیا نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے اس کے شانے پر زور دار دھپ رسید کیا۔ وہ محض سر کھجا کر مسکرا دیا تھا۔

”اور تجھے کس نے بتایا کہ ہانیہ کا کوئی اور رشتہ آیا ہوا ہے؟“ اماں کو اچانک اس کی ذرا دیر پہلے کی گئی بات یاد آئی۔

”کہیں تم نے اس روز ہانیہ کی باتیں تو نہیں سن لیں۔“ اس کے جواب کا انتظار کیے بیٹا اماں نے ایک اور سوال داغا۔

”ہاں، لیکن ایسا غیر ارادی طور پر ہوا۔ میں تو آپ دونوں سے چائے کا پوچھنے گیا تھا۔“ حارث نے جھٹ رضاحت دی۔ اماں کچھ لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔

میں یہ سب کچھ حارث کی ماں ہونے کے ناتے نہیں کہہ رہی۔ بھلے سے تم ہمیں ہانیہ کا رشتہ نہ دو، لیکن میں شہزاد سے بھی ہانیہ کی شادی نہیں ہونے دوں گی۔ ہانیہ کی ماں زندہ نہیں تو کیا ہوا؟ اس کی خالہ ابھی زندہ ہے، میرے ہوتے ہوئے کوئی اس کے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا۔“

اماں کا جذباتی پن عروج پر تھا۔
”کیسی باتیں کرتی ہیں آپ خالہ جان! ہمیں ہانیہ کے لیے حارث سے اچھا لڑکا اور کہاں سے ملے گا۔ جب تک کوئی اور رشتہ نہیں تھا ہم شہزاد کے پروپونل پر غور کر رہے تھے، لیکن کوئی حتمی فیصلہ تو نہیں کیا تھا نا۔ آپ بالکل مناسب وقت پر آگئیں۔ ہمیں یہ رشتہ بخوشی قبول ہے۔“

ہانیہ کے چھوٹے بھیا نے انہیں مخاطب کیا تھا۔
”تم خاموش رہو نازو! جب ہم تینوں بھائیوں نے فیصلہ کر لیا ہے تو تمہارے بولنے کی کوئی گنجائش نہیں۔“ اور نازو بھابھی واقعی ایک منٹ میں خاموش ہو گئیں۔

”اگلے مہینے ہانیہ کے فائنل پیپرز ہیں خالہ! اس کے بعد آپ لوگ کوئی بھی مناسب تاریخ رکھ کر اسے رخصت کروا کر لے جائیں۔“

توفیق کے الفاظ سے اماں پر شادی مرگ طاری ہو گئی تھی اور ٹھیک دو ماہ بیس دن بعد وہ ہانیہ کو حارث کے سنگ رخصت کروا کر لے آئی تھیں۔



ہانیہ کا گھبراہٹ بولکھلایا ساروپ حارث کے لیے نیا نہیں تھا۔ لیکن گھبراہٹ اور بولکھلاہٹ کے ساتھ آج اس کا شرمایا، شرمایا ساروپ اتنا انوکھا اور دلکش لگ رہا

”کہیں ایسا تو نہیں حارث کہ تو ہانیہ پر ترس کھا کر اس سے شادی پر راضی ہوا ہے۔“ اماں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”افوہ اماں! اب آپ بال کی کھال تو مت اتاریں۔ آپ کی تسلی کے لیے بتا رہا ہوں کہ یہ فیصلہ میں نے اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور دل و دماغ کی آمادگی کے ساتھ کیا ہے۔“ اس نے ماں کے ہاتھ تھام کر انہیں یقین دلایا تھا۔ اماں کی آنکھیں جھلملا گئیں۔ انہوں نے بے ساختہ بیٹے کی پیشانی چوم لی۔

”اللہ تجھے سدا خوش رکھے میرے بچے۔“
”آمین، آمین۔ اب باقی باتیں بعد پر اٹھار کھیں اور چلیں ہانیہ کے گھر۔“ یعنی آپا تو فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

”ہاں تو اور کیا۔ آج ہم دونوں بہنیں اتفاق سے اکٹھی آئی ہیں تو بس پھر چلے چلتے ہیں ہانیہ کے گھر۔ نیک کام میں دیر کیسی۔ چلیں اماں اٹھیں۔“ افشاں آپا بھی بہن کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بہنوں کی اس درجہ عجلت پر حارث کو ہنسی آگئی۔

”بہن! مابعد میں۔ پہلے مٹھائی کا ڈبا اور کچھ پھل لا دو۔ خالی ہاتھ رشتہ مانگنے چھوڑی جائیں گے۔“ اماں کی خوشی کا عجیب سی عالم تھا۔

”جو حکم جناب کا۔“ وہ منستے ہوئے اٹھ گیا۔
اور پھر سارے مرحلے گویا پلک جھپکتے میں طے ہوئے۔ ہانیہ کے بھائیوں نے خالہ زاد بھائی کو شرف قبولیت بخش دی تھی۔ شروع میں توفیق بھائی نے کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تھا اور وہ یہ یقیناً ”نازو بھابھی کی آنکھوں کے اشارے پر کر رہے تھے، لیکن اماں نے بنا کسی لحاظ کے ان کی طبیعت صاف کر دی۔

”تم بار بار اپنے سالے کے رشتے کا جو حوالہ دے رہے ہو ذرا بتاؤ۔ وہ میرے حارث کے پاس تک بھی ہے۔ اس کے کرتوتوں کی وجہ سے چار جگہ تو اس کی سنگینیاں ٹوٹی ہیں۔ کچھ تو خوف خدا کرو توفیق! بڑا بھائی تو باپ کی جگہ پر ہوتا ہے۔ صرف اپنی بیوی کی باتوں میں اگر جانے نہ بولتے ہانیہ کے ساتھ یہ ظلم کر رہے ہو اور

تھیں۔ اب شادی کے بعد اماں اسے دھیرے دھیرے گھر کے کام سکھا رہی تھیں۔ وہ بہت دل جمعی اور شوق سے اماں کے ساتھ چکن کے کاموں میں حصہ لیتی تھی۔

آج اماں کسی رشتہ دار کی عیادت کرنے گئی تھیں۔ پہلی بار کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری صرف ہانیہ کے کندھوں پر تھی۔

”بتائیں نا حارث! کیا بناؤں کھانے میں۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا۔“ مسئلہ اتنا بڑا نہ تھا لیکن وہ کافی پریشان لگ رہی تھی۔

”اتنی سُنشن کیوں لے رہی ہو۔ دو تین پیاز کاٹو۔ اس میں دو تین انڈے پھینٹ لو اور مزیدار سائیلیٹ بنا لو۔ روٹی میں بازار سے لے آؤں گا۔“ حارث نے مسئلے کا فوری حل نکالا تھا۔

”آپ سے تو مشورہ مانگنا بھی فضول ہے۔“ وہ ذرا خفا ہوئی اور حارث کو اس کا یہ خفگی بھرا انداز بھی بہت بھلا لگا تھا۔

”کیا کہیں گی خالہ جان پہلی بار مجھے اکیلی کو کچھ بتانا پڑا۔“ تو آلیٹ بنا کر کام چلا لیا۔ کونڈھنگ کی چیز بتائیں حارث! وہ اپنے مسئلے میں ہی الجھی ہوئی تھی۔

”اچھا یہ بات ہے۔“ حارث کو جیسے بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے سر ہلایا۔

”پھریوں کرو چکن بریانی بنالو۔ چکن فریزر میں ہوگا ورنہ بتاؤ میں مارکیٹ سے لاؤں گا۔“

”چکن بریانی۔“ ہانیہ نے تھوک نگلا۔ ہانیہ جیسی نو آموز کک کو بریانی کا نام سننے میں پسینہ آ گیا تھا۔

”پکٹ والی بنا لو یا ر! ترکیب اس پر لکھی ہوگی۔“ حارث اس کی شکل دیکھ کر مسئلہ پا گیا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ بنالوں کی۔ ایسی مشکل بھی نہیں۔“ اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔ حارث نے

بہت مشکل سے مسکراہٹ ضبط کی تھی اور پھر اس نے واقعی چکن بریانی بنالی تھی۔ اماں جب گھر آئیں تو کھانا بالکل تیار تھا۔

”خوشبو بتا رہی ہے کہ بریانی بنی ہے چلو بیٹا! جلدی

تھا کہ حارث کا اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو دل نہ چاہ رہا تھا۔ شاید وہ مشہور زمانہ محبت جو نکاح کے دو بولوں کے ساتھ مشروط ہوتی ہے وہ اس کے دل میں بھی جنم لے چکی تھی۔ لیکن ان الوقت وہ محبت اور وارفتی کا اظہار کر کے ہانیہ کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ نہ کرنا چاہتا تھا۔

حارث چاہتا تھا کہ سب سے پہلے ان دونوں کے درمیان اپنائیت اور دوستی کا رشتہ استوار ہو۔ وہ ہانیہ کی غیر ضروری جھجک اور بوکھلاہٹ ختم کرنا چاہتا تھا اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے دوستانہ رویے سے ہانیہ کی جھجک میں خاطر خواہ کمی ہوئی تھی بلکہ شادی کے بعد ایک دن ہانیہ نے مسکراتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا۔

”مجھے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ آپ اتنے فرینڈلی اور ہنس مکھ ہوں گے۔ پہلے تو آپ مجھے بہت خشک مزاج اور سنجیدہ ثابت ہوئے تھے لیکن آپ تو بہت سو فٹ سچر کے مالک ہیں۔“

”مجھے بھی ہرگز اندازہ نہ تھا کہ تم مسکرا کر بات کرتے ہوئے اتنی پیاری اور من موہنی لگو گی۔ پہلے تو ہمیشہ تمہیں روئے پر کمر بستہ دیکھا تھا۔“ حارث اسے دیکھ کر مسکرایا تھا اور وہ پیاری سی لڑکی اس ذرا سی بات پر ہی بری طرح شرمائی تھی۔

”اچھا مجھے بتادیں کہ کل آفس کے لیے آپ کے کون سے کپڑے پریس کروں پھر شام کے کھانے کی تیاری کروں لی۔“ حارث کی جذبے لٹائی نگاہوں کے سامنے بیٹھنا ہانیہ کے لیے آسان نہ تھا۔ اس نے جھٹ موضوع بدلا تھا۔

حارث مسکراتے ہوئے اٹھا اور وارڈوب سے کپڑے نکالنے لگا۔ ہانیہ ایک ذمہ داری بوی اور سو بننے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ حارث کو اس کی ایسی کوششوں پر ہنسی بھی آتی اور پیار بھی۔

گھریلو کام کاج میں وہ خاصی آٹاری تھی۔ بھابیوں اس سے اوپر نیچے کے تو درجنوں کام کروا لیتی تھیں۔ لیکن کریڈٹ لینے والے ذمہ داری کے کام بھی اس کے سپرد نہ کرتیں اور کو کنگ تو اس سے کبھی نہ کروائی

کڑے مراحل سے گزر رہی ہے۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکلنے کو بے تاب، ہوئے جارہے تھے۔
 ”اچھا اماں! یہ بتائیں نسرین باجی کے شوہر کی طبیعت اب کیسی ہے۔ اسپتال سے کب ڈسچارج کیا انہیں۔“
 اس نے گفتگو کا موضوع بدلا تھا۔ اماں مریض کی طبیعت کا احوال دینے لگیں۔ ہانیہ نے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر خود پر قابو پایا اور جس وقت وہ برتن سمیٹ کر کچن میں گئی تو حارث ماں کو جتائے بغیر نہ رہ پایا۔

”کیا تھا جو آپ دو بول تعریف کے بول دیتیں۔ اتنا چھوٹا سا تول ہے اس کا۔“ ماں نے بغور بیٹے کو دیکھا۔ پھر ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
 ”وہ میری بھانجی ہے۔ ماں اس کے بچپن میں ہی رخصت ہو گئی۔ اب اسے طریقہ سلیقہ سکھانا میری ذمہ داری ہے۔ ویسے اپنی بھانجی کی حمایت میں تمہارا بولنا مجھے اچھا لگا ہے۔“ اماں نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

”آپ کی بھانجی اتفاق سے میری بیوی بھی ہے۔“
 ماں کے انداز پر اسے ہنسی ٹٹنی تھی۔ اماں بھی منظور انداز میں مسکرا دیں۔

اماں واقعی اپنی بھانجی کو جی جان سے چاہتی تھیں۔ لیکن اسے طریقہ سلیقہ سکھانے کی کوشش میں معمولی سا جھجھوتا بھی نہ کرتی تھیں۔ جہاں غلطی ہوتی، بر ملا ٹوک دیتیں۔ ایسے میں حارث بغور ہانیہ کے تاثرات دیکھتا۔ خجالت اور خفت سے اس کا راجاں ہو رہا ہوتا۔ حارث کو لگتا کہ وہ اب روئی کہ تب، لیکن بہت جتن کر کے وہ اپنے آنسو کنٹرول کرتی لیتی۔ اپنی حساس طبیعت بیوی کے یہ بن روئے آنسو حارث کو اپنے دل پر گرتے محسوس ہوتے۔

وہ جانتا تھا کہ شادی سے پہلے ہانیہ اماں کے پاس محض اس لیے آئی تھی کہ اپنے گھر والوں کے خلاف جو چھوٹے چھوٹے شکوے شہایت اس کے دل میں جمع ہوتے وہ انہیں اماں کو سنا کر اپنے دل کا غبار نکال لیتی تھی۔ شادی کے بعد رونے کے لیے اسے اماں کا کندھا

سے دسترخوان لگاؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔ میں ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں۔“ اماں نے چادر اتار کر نہ کی۔
 ”جی خالہ جان! میں بس دسترخوان لگا ہی رہی ہوں۔“ ہانیہ نے مستعدی سے جواب دیا تھا اور بہترین خوشبوداری برائی جب دسترخوان پر رکھی گئی تو اماں اور حارث نے پہلی نگاہ برائی پر ڈالی اور دوسری ہانیہ کے چہرے پر۔

”چاول کھلے نہیں رہے۔“ ڈش میں نکالے گئے چاول واقعی آپس میں کھتم کھٹا لگ رہے تھے۔ یہ برائی سے زیادہ چھڑی لگ رہی تھی۔ ہانیہ نے دھیرے سے برائی کی پہلی برائی خود ہی گنوا دی۔

”کھلے کلمے نہیں ہیں تو کوئی خاص مرچھائے ہوئے بھی نہیں ہیں۔ اور ذائقہ تو زبردست ہے۔“ حارث نے پہلا نوالہ لے کر اس کی حوصلہ افزائی کرنا چاہی تھی اور اپنی سی بات سن کر ہی ہانیہ کے چہرے پر رونق آگئی۔

”تعریف میں مبالغے سے کام مت لو حارث! ورنہ ہانیہ کی کوکنگ میں مزید بہتری نہیں آئے گی۔“ اماں بیٹے کو ٹوکے بنا نہ رہ پائیں۔ حارث کو ہرگز اندازہ نہ تھا کہ اماں اچانک یوں بول پڑیں گی۔ وہ واقعی چند لمحوں کے لیے خاموش سا ہو گیا۔

”برائی کی خوشبوداری اچھی ہے بیٹا! لیکن اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں۔ کمال پیکٹ کے مسالے کا ہے۔ چاول بواکیل کرتے وقت تمہیں معمولی سی کسر رکھنی چاہیے تھی۔ وہ کسر دم لگنے کے وقت برابر ہو جاتی۔ تم نے چاول زیادہ ابال لیے اس لیے تمہ لگانے کے بعد دم پر چاول گھل کر ٹوٹ گئے۔ پہلی بار بنائی ہے، ایسا ہو جاتا ہے۔ اگلی بار اس چیز کا دھیان رکھنا۔“ اماں نے اسے نرمی سے ہی مخاطب کیا تھا۔ لیکن وہ بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

”آئندہ خیال رکھوں گی خالہ جان!“ اس نے مرے مرے لہجے میں یقین دلایا۔ حارث بغور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے میں مصروف تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کی حساس طبیعت بیوی اس وقت ضبط کے

راضی ہوا ہے۔ کبھی کہتی تھیں ہانیہ پر ترس کھا کر رضامندی دی ہے۔ جانے شادی کے بعد خوش رہ پائے گا یا نہیں۔ میں اور انشاں دونوں ہی آپ کو سمجھاتے تھے کہ سارے خدشے ذہن سے جھٹک ڈالیں۔ ہانیہ ماشا اللہ ایسی پراری اور من موہنی لڑکی ہے کہ حارث کے دل پر راج کرے گی اور دیکھ لیں، کتنی جلدی ہماری پیش گوئی پوری ہوئی۔“ عینی تپا مسکراتے ہوئے اماں سے مخاطب تھیں۔

”ہاں اللہ کالا کھلاکھ شکر ہے۔ میرا انتخاب درست ثابت ہوا۔ میری ہانیہ کے آنے سے تو گھر میں اجالا سا بکھر گیا ہے۔“ اماں کے لہجے میں ہانیہ کے لیے بے تحاشا پارائڈ آیا تھا۔

”ایک منٹ اماں! کیا خیال ہے میں ہانیہ کو بھی بلالوں۔ محبت کے غائبانہ اظہار کے بجائے یہ تعریفیں اس کے منہ پر کر ڈالیں۔ خوش ہو جائے گی وہ بھی۔“ حارث نے مسکرا کر اماں کو مخاطب کیا۔

”یہ لڑکا تو باؤلوں جیسی باتیں کرنے لگا ہے۔ سمجھتا ہے میں ہانیہ کے منہ پر اس کی تعریف نہیں کرتی۔“ اماں اس بار تھوڑی سی خفا ہوئی گئی تھیں۔

”ہانیہ کی تعریف اماں کیوں کریں۔ اب یہ ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔“ عینی آپا نے شرارت سے اس کا کان کھینچا تھا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ انہیں کیا بتانا کہ وہ تو یہ ذمہ داری بخوشی نبھانے کو تیار تھا لیکن اس کی شادی تو چھوٹی مولی کے بودے سے ہوئی تھی۔ جب ذرا سا رومانٹک ہونے لگتا زوجہ محترمہ پر شرم اور گھبراہٹ طاری ہونے لگتی۔ وہ بلاشبہ چند ہی دنوں میں ہانیہ سے بے تحاشا محبت کرنے لگا تھا، لیکن محبت کی یہ شدتیں ہانیہ پر عیاں کرنے کے بجائے فی الحال تو وہ اس سے دوستانہ اور بے تکلفا نا تعلق قائم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ حارث کی خواہش تھی کہ ہانیہ یہ حقیقت تسلیم کرے کہ حارث صرف اس کا شوہر ہی نہیں بلکہ قابل اعتبار اور مخلص دوست بھی ہے۔ وہ ہر بات حارث سے بلا جھجک کہہ ڈالے لیکن شاید ہانیہ

میسر نہ تھا کیونکہ اکثر و بیشتر اسے اماں کی باتوں پر ہی رونا آتا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی حارث سے اس بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس کے دل کا حال بتا جاتے۔

”تھوڑی سی تورعایت دے دیا کریں۔ آخر بھانجی ہے آپ کی۔ آہستہ آہستہ سارے کام سیکھ ہی جائے گی۔“

اس روز بھی جانے ہانیہ سے کیا گڑبڑ ہوئی تھی کہ اماں نے اسے پورے آدھے گھنٹے کا لیکچر دے ڈالا۔ وہ جی خالہ جی غالہ کرتی رہی تھی اور جب وہ منظر سے ہٹی تو حارث نے اماں سے ”ہاتھ ہولا“ رکھنے کی استدعا کی تھی۔

”آہستہ آہستہ نہیں۔ ماشا اللہ ہانیہ نے گھر کے کام بہت جلدی سیکھ لیے ہیں۔ جو تھوڑی بہت کسر ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔ میں ہوں نا اس کی رہنمائی کے لیے۔“ اماں نے کمال اطمینان سے جواب دیا۔

کوئی اور اماں ہوتی تو بیوی کی حمایت پر بیٹے اور بہو سے بدظن ہو جاتی لیکن اماں کو تو حارث کی باتیں سن کر خوب ہی لطف آیا تھا۔ اگلے روز عینی آیا آئیں تو انہیں بھی مسکرا کر حارث کی باتیں بتائی تھیں۔

”کہاں شادی کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ کہتا تھا، روتی بسورتی لڑکی کو آپ میرے پلے باندھنا چاہ رہی ہیں اور اب ایسی کاپا پٹی ہے صاحبزادے کی کہ ہانیہ کو کچھ سمجھانے بھی لگوں تو اس سے برداشت نہیں ہوتا۔“

اماں ہانجی کے لیے بیٹے کی محبت دیکھ کر نہال ہوئے جا رہی تھیں۔ حارث ہانیہ کے سنگ خوش تھا۔ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اپنے انتخاب پر اماں مطمئن اور مسرور تھیں۔ یہ خوشی اس وقت بھی ان کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

”تو میں آپ سے یہ ہی تو کہتی تھی کہ ایک بار ہانیہ کو گھر آ لیں دیں۔ اس کا جادو آپ کے بیٹے کے سر چڑھ کر بولے گا۔ آپ کو خواہ مخواہ ڈٹے ستاتے تھے کہ حارث صرف آپ کی ناراضی کے خوف سے اس رشتے پر

کروے کہ وہ ہانیہ کی دلی کیفیات سے بخوبی آگاہ ہے۔
اس کی خواہش ہے کہ ہانیہ اسے صرف اماں کا بیٹا نہ
سمجھے بلکہ اپنا شوہر اور اپنا قابل اعتماد دوست بھی سمجھے۔
شادی کے بعد آنسو بہانے کے لیے اسے خالہ کا کندھا
میسر نہیں تو کیا ہوا خالہ کا بیٹا تو ہے، جواب اس کا شریک
حیات ہے۔



اماں یعنی آیا کے سر کی عیادت کو گئی تھیں۔
انہوں نے حارث کو آفس فون کر کے گھر جلد آنے کی
تاکید کی۔

اس نے جلد از جلد آفس کے کام نمٹائے تھے پھر
باس سے چھٹی لے کر گھر کی راہ لی۔ ہانیہ کچن میں
مصروف تھی۔ حسب توقع وہ حارث کو دیکھ کر حیران
ہوئی۔

”آج آپ اتنی جلدی آگئے۔ خیریت تو ہے؟“ اس
نے استفسار کیا۔

”اماں نے فون کر کے کہا تھا میری بہو گھر پر اکیلی پور
ہو رہی ہے، فوراً“ اس کے پاس پہنچو۔ میں نے حکم کی
فوری تعمیل کی اور دوڑا چلا آیا۔“

حارث نے شکستگی سے مسکراتے ہوئے جواب
دیا۔ ہانیہ بھی مسکرا دی تھی لیکن اس کی آنکھوں نے
اس مسکراہٹ کا ساتھ نہ دیا تھا۔ حارث کو آج بھی وہ
بہت سمجھی سمجھی اور پشمرہ لگی تھی۔

”تم جلدی جلدی اپنے کچن کے کام سمیٹو اور بیڈ
روم میں آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

حارث اسے نرمی سے مخاطب کرتا کچن سے چلا
گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ چائے کا کپ لیے بیڈ روم
میں آئی تھی۔

”یہ لیجئے چائے۔ بسکٹ ختم ہو گئے۔ آج خالی
چائے پر گزارا کرنا پڑے گا۔“ وہ چائے کا کپ سائیڈ
ٹبل پر رکھ کر پھر جانے کے لیے مڑی تھی۔

”تم کہاں جا رہی ہو۔ یہاں آؤ بیٹھو میرے پاس۔“
حارث نے اسے پکارا تھا۔

ابھی اسے یہ رتبہ دینے پر تیار نہ تھی۔
وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہا تھا کہ ہانیہ بہت چپ
چپ اور کھائی کھوئی سی ہے۔ حارث جانتا تھا کہ اس
گھر میں اسے کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا لیکن چھوٹی چھوٹی
شمار باتیں آنکھی ہو کر اسے پریشان کر رہی تھیں اور
اصل مسئلہ ہی یہ تھا کہ وہ یہ باتیں کسی سے نہ کہتی
تھی۔

اماں گھر کے کاموں میں اس کی چھوٹی سی کی جانے
والی غلطی نظر انداز کرنے پر تیار نہ تھیں۔ اس روز بھی
ہانیہ دودھ کی پیملی چولہے پر رکھ کر بھول گئی۔ بھول
چوک انسان سے ہی ہوتی ہے مگر اماں نے اسے پندہ
منٹ کا لیکچر دے ڈالا تھا۔

”رزق کی قدر کرنی چاہیے بیٹا! کل تم گوشت کی
ہانڈی چولہے پر رکھ کر بھول گئیں۔ آج سیر بھر دودھ
ابال دیا۔ اور میں دیکھ رہی ہوں کہ آج کل تم کچھ
اجبھی، ابجھی اور پریشان ہو کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ
ہانیہ۔“ ایک لمبے سے لیکچر کے اختتام پر اماں نے
قدرے نرم لہجے میں استفسار کیا تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہے خالہ جان!“ ہانیہ نے پلکیں
جھپک جھپک کر آنسو جھلکنے سے روکے تھے۔

حارث بس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس لمحے اسے
کتنا ترس آیا تھا ہانیہ پر۔ سب کچھ کہہ سنا کر اماں اسے
پوچھ رہی تھیں کہ مسئلہ کیا ہے۔ کیا اماں کو اندازہ نہ تھا
کہ وہ کتنی زود رنج اور حساس ہے۔ اس کی آنکھوں
میں آنسو لانے کے لیے تو کوئی معمولی بہانہ ہی درکار
ہوتا تھا اور یہاں اماں صبح شام کسی نہ کسی بات پر اسے
لائن حاضر کیے رکھتیں۔ بے شک اماں کی نیت برائی نہ
تھی۔ وہ اسے مکمل گریہستن کے روپ میں دیکھنے کی
تمننی تھیں لیکن انہیں اپنی عزیز از جان بھانجی کی
حساس طبیعت کو تو پیش نظر رکھنا چاہیے تھا نا۔ پر یہ
بات اماں کو کون سمجھاتا۔

ہاں یہ بات ہانیہ کو سمجھائی جاسکتی تھی اور حارث یہ
ہی چاہ رہا تھا کہ کوئی مناسب موقع میسر آئے تو وہ ہانیہ کو
بہت بار اور رسائیت سے اس حقیقت سے آگاہ

”کو کچھ نہ بتاؤں گا۔“ بات کے آخر میں وہ مسکرایا تھا۔
 ”خالہ کا یہاں کیا ذکر؟“ ہانیہ کے آنسوؤں میں
 روانی آگئی تھی۔

”خالہ کا ذکر کیسے بنا جی کا بوجھ کیسے ہلکا ہو گا ڈیر
 رائف!“ حارث اٹھ کر ڈرینک ٹیبل تک گیا تھا۔ ٹشو
 کا ڈبا اٹھا کر ہانیہ کے پاس رکھا اور پھر اس کے بالکل
 برابر میں بیٹھ گیا۔

”میں مانتا ہوں ہانیہ! اماں تمہارے ساتھ اکثر
 زیادتی کر جاتی ہیں۔ تم گھر کے کاموں میں ابھی پوری
 طرح ایکسپرٹ نہیں ہوئیں۔ آہستہ آہستہ تم سب
 کاموں میں ماہر ہو جاؤ گی لیکن اماں فی الحال تمہاری
 معمولی سی غلطی بھی نظر انداز کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔
 تم یقیناً ان کے اس رویے پر ڈس ہارٹ ہو جاتی
 ہو۔ میں بہت بار اماں کو سمجھا چکا ہوں لیکن اماں
 تمہیں بہو سمجھتیں تو کچھ رعایت دیتی نا۔ وہ تو روز اول
 سے تمہیں بیٹی سمجھتی ہیں۔ وہ بیٹی جس کی اپنی ماں اس
 کے بچپن میں اللہ کو پیاری ہو گئی اور اب اسے طریقہ
 سلیقہ سکھانے کی ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر
 ٹانڈ ہو گئی۔ یقین کرو ہانیہ! اماں تم سے بے تحاشا محبت
 کرتی ہیں۔ وہ تمہاری پیٹھ پیچھے تمہاری بہت تعریفیں
 بھی کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ تمہارے آنے سے گھر
 میں۔“

وہ بات کرتے کرتے رکا تھا۔ یک دم خیال آیا تھا کہ
 یہ وقت اماں کی صفائیاں پیش کرنے کا نہیں ہے۔ ان
 باتوں کے بعد تو شاید ہانیہ شرمندگی کے مارے اماں کے
 خلاف ایک لفظ بھی نہ بول سکتی جبکہ حارث چاہتا تھا کہ
 وہ اپنے دل میں جمع چھوٹی سے چھوٹی شکایت ہر طرح
 کے شکوے کا کھل کر اظہار کر دے۔ یہ سمجھانے کا
 نہیں سننے کا موقع تھا۔ واحد طریقہ جس سے ہانیہ کے
 جی کا بوجھ ہلکا ہو سکتا تھا۔

”تمہیں پتا ہے یعنی تپا اور افناں آپا جب بھی میکے
 آتی ہیں اماں کے سامنے اپنے سرال والوں کی
 ڈھیروں ڈھیر برائیاں کر کے اپنے جی کا بوجھ ہلکا کر کے
 واپس اپنے گھر کی راہ لیتی ہیں۔ چھوٹے بڑے مسئلے ہر

”سنگ برتنوں سے بھرا پڑا ہے حارث! برتن دھونے
 جارہی ہوں آپ کو کچھ اور چاہیے تو بتائیں۔ نمکو
 لادوں؟“ اس نے عجلت بھرے انداز میں پوچھا تھا۔
 ”مجھے تمہارا کچھ وقت چاہیے۔ عنایت کرو گی۔“
 حارث اس بار قدرے خفا ہوا تھا۔ ہانیہ اس کے انداز پر
 حیران تو ہوئی تھی مگر خاموشی سے بیڈ کے سرے پر ٹک
 گئی۔ حارث چند لمحوں تک اسے خاموشی سے دیکھتا
 رہا۔

”تم جانتی ہو مجھ سے شادی کرنے کا تمہیں سب
 سے بڑا نقصان کیا ہوا ہے؟“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے
 بعد حارث نے استفسار کیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی اس کے
 انداز پر حیران ہو رہی تھی یہ بات سن کر مزید حیران
 ہو گئی۔

”آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں حارث؟“ اس نے
 حیران نگاہیں حارث پر گاڑ کر پوچھا تھا۔
 ”شادی سے پہلے تم اپنا ہر دکھ سکھ یہاں اماں سے
 آکر کہہ دیا کرتی تھیں۔ شادی کے نتیجے میں بھانجی
 خالہ کا رشتہ ختم ہو گیا اور ساس بہو کا رشتہ استوار
 ہو گیا۔ اور یہ اس شادی کا سب سے بڑا نقصان ہے۔“
 حارث نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے اسے مخاطب
 کیا تھا۔

”آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں خالہ کی بھانجی نہیں
 رہی بلکہ۔۔۔ بہو بن گئی۔“

”نہیں نہیں ہرگز نہیں۔ میں تمہیں بالکل دوش
 نہیں دے رہا۔ میرا کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ
 تمہیں ایسا لگنے لگا ہے کہ اماں اب تمہاری خالہ نہیں
 بلکہ صرف ایک ساس بن کر رہ گئی ہیں۔“ حارث نے
 وضاحت دی۔

”پتا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“ ہانیہ نے
 بے چارگی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی
 تھیں۔

”آج ان آنسوؤں کو بننے سے مت روکو ہانیہ!
 اپنے جی کا سارا بوجھ میرے سامنے ہلکا کر لو۔ بنا جھجکے تم
 اپنی ہر فہلنگ مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ بیوی! میں اماں

گھر میں ہوتے ہیں ہانیہ! بد قسمتی سے تمہارے میکے میں کوئی ایسا شخص نہیں جس کے سامنے تم اپنے جی کا بوجھ ہلکا کر سکو۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جمع ہو کر تمہارے اندر کی گھٹن کو بہت بڑھا دیں گی۔ میں چاہتا ہوں تم مجھ پر مکمل اعتبار کرو۔ بھول جاؤ میں اماں کا بیٹا ہوں۔ اماں سے یا یعنی آپا وغیرہ سے جو بھی شکایت ہو، تم بلا جھجک مجھ سے ہر طرح کی بات کر سکتی ہو۔ ہاں آئندہ میں تمہاری آنکھوں میں گلابی ڈورے نہ دیکھوں۔ جانے چھپ چھپ کر کہاں روتی ہو اور کتنا روتی ہو۔ آئندہ صرف میرے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانے ہیں۔

آئی سمجھیں بات۔“

حارث نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اوپر کی۔ ہانیہ کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ حارث نے بہت پیار سے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

”خالہ جان سے مجھے ہرگز کوئی شکایت نہیں۔ میں انہیں خالہ کہہ کر مخاطب تو کرتی ہوں لیکن میں انہیں اپنی ماں ہی سمجھتی ہوں۔ پتا نہیں آپ اتنی دیر سے مجھے کیا سمجھا رہے ہیں۔ میرے پلے ایک لفظ نہیں پڑا۔ اگر میں چھپ چھپ کر روتی ہوں تو اس کی وجہ خالہ جان نہیں آپ ہیں حارث! صرف اور صرف آپ۔“ وہ پھر بری طرح رو پڑی تھی۔

”بھئی؟“ حارث کو تو جیسے کرنٹ سا لگا تھا۔ اس نے بے یقینی سے زوجہ محترمہ کو دیکھا۔

”جب مجھے پسند نہیں کرتے تھے تو خالہ جان کے دباؤ میں اگر شادی کی ہامی کیوں بھری۔ کیوں جوڑا ایک ان چارہ رشتہ؟“ وہ روتے روتے پوچھ رہی تھی۔

”تم سے کس نے کہا یہ سب؟“ حارث سٹٹا گیا تھا۔

”میں نے خود سنی تھیں اس روز آپ لوگوں کی باتیں۔ یعنی آپا کہہ رہی تھیں کہ آپ نے محض خالہ جان کی ناراضی کے خوف سے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ خالہ جان اور یعنی آپا خوش ہو رہے تھے کہ ان کا انتخاب درست ثابت ہوا اور آپ میرے سنگ خوش ہیں۔ جبکہ میں تو اس دن سے شاک کی حالت میں ہوں۔“

میرے تو وہ ہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ کسی دباؤ میں آکر مجھ سے شادی پر راضی ہوئے ہیں۔ حالانکہ مجھے یہ بات بہت پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔ آپ پہلے دن سے میرے ساتھ دوستانہ گفتگو استوار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دوستی دوستی کا راگ لاتے رہے اور میں آپ کی محبت و ابرفتگی اور التفات کو ترستی رہی۔ میں آپ کی بیوی تھی حارث! اور آپ مجھے کسی نا سمجھ اور کم عقل دوست کی طرح ٹریٹ کرتے رہے۔ میں خود کو مطمئن کرنے کے لیے لاکھ توجیحات دیں، لیکن پھر میری ساری خوش فہمیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ میں نے آپ لوگوں کی باتیں سن لیں۔ میں زبردستی آپ کی زندگی میں شامل کی گئی۔ یہ انکشاف مجھے کس اذیت میں مبتلا کر گیا، آپ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔ میری نگاہوں میں میری ذات دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی۔ اس سے تو اچھا تھا میرے بھائی میری شادی شہزاد کے ساتھ۔“

”اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ حارث نے بے تحاشا خفا ہوتے ہوئے اس کی بات کالی۔ وہ چپ تو ہو گئی مگر آنسو اب بھی مسلسل اس کے گال بھگور رہے تھے۔ حارث نے گہرا سانس اندر کھینچا تھا۔ صورت حال اس کی توقع کے بالکل برعکس نکلی تھی۔

”تم جس بے یقینی کی کیفیت میں ہو پتا نہیں میری وضاحت کو قبول کرو گی یا نہیں لیکن اب تمہیں چپ ہو کر میری بات سنا ہو گی۔ فار گاڈ سیک آنسو بہانا بند کرو۔ یہ آنسو میرے دل پر گر رہے ہیں۔“ حارث نے بے چارگی سے اسے مخاطب کیا تھا۔

”ہاں یہ سچ ہے کہ جب اماں نے پہلی بار میرے سامنے تمہارا نام لیا تھا تو میں نے فوراً ہی انکار کر دیا تھا۔ جانتی ہو کیوں؟“ حارث نے پوچھا۔ ہانیہ نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے حارث کو دیکھا تھا مگر حارث کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

”میرے انکار کی وجہ تمہارے یہ ہی آنسو تھے مسز!“ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے حارث نے نشو کے ڈبے سے نشو نکال کر ہانیہ کو تھمائے تھے۔

ہانیہ نے رندھی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا۔
”کیا کہوں جو کہنے لگا تھا اس سے تم نے منع کر دیا۔“

”مجھے بس ملائیں مت حارث! اتنی بے وقوف اور کم عقل نہیں ہوں میں۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”بے وقوف تو میں ہوں۔ شادی کے بعد سے اب تک اسی کوشش میں لگا رہا کہ ہمارے درمیان ایک دوستانہ سا تعلق استوار ہو جائے۔ تم مجھ پر اعتماد کرو۔

مجھ سے تمہاری جھجک ختم ہو جائے۔ اپنے دل کی ہر بات تم صرف میرے ساتھ شہر کرو۔ میں سوچتا تھا تمہاری زندگی میں پر خلوص رشتوں کی کمی رہی ہے۔

اپنے شوہر کو تم اپنا سب سے پر خلوص دوست مان لو۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں تم سے ڈھنگ سے اظہار محبت بھی نہ کر سکا اور اظہار محبت کرتا بھی تو کیسے۔

ذرا سا رومانٹک ہوئے۔ لگتا تھا تو تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی تھیں۔ میں حیران ہوتا تھا کہ میرے دل میں تمہارے لیے اتنی بے تحاشا محبت اچانک کیسے پیدا ہو گئی لیکن میں اپنی محبت اور وارفتگی ظاہر کرنے کے بجائے پہلے انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ بتاؤ ذرا! اس روئے زمین پر مجھ سے بڑا گھامڑا اور کون ہو گا۔ اور جس کے لیے یہ سب کچھ کیا؟ آج اسی کی عدالت میں پیشی بھگتنا پڑ گئی۔

اس معزز شخصیت سے میری التماس ہے کہ شک کی عینک اتار کر صرف ایک بار میری آنکھوں میں جھانک لے مگر اسے واقعی ان آنکھوں میں محبت کا ٹھکانا نہیں مارتا سمندر نظر نہیں آ رہا تو میں۔ ابھی اسی وقت اسے اچھے سے آئی اسپیشلسٹ کے پاس لے کر جانے لگا ہوں۔“

”آپ واقعی مجھ سے محبت کرتے ہیں حارث!“ کس بے یقین لہجے میں وہ استفسار کر رہی تھی۔

حارث کو اس پر ٹوٹ کر ہنسا آیا تھا۔

”کون سی زبان میں کہوں کہ تو تمہیں یقین آئے گا۔“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ہانیہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

”مجھے کئی برسوں سے میں تمہارے ایک ہی روپ سے واقف تھا۔ اور وہ روپ یہ ہی رونے دھونے والا تھا۔ ایک روتی بسورتی لڑکی سے شادی کا میرا قطعاً کوئی ارادہ نہ تھا۔“

”تو کسی نے کن پوائنٹ پر تو مجبور نہیں کیا تھا آپ کو۔ نہ کرتے مجھ سے شادی۔“ اس بار ہانیہ تنک کر بولی تھی۔ حارث نے بہت مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

”مجھے کوئی کن پوائنٹ پر مجبور کر بھی نہیں کر سکتا مسز! میں ذرا دلہری ٹائپ بندہ ہوں۔“ حارث نے اسے باور کروایا تھا۔ ہانیہ بس اسے خفگی سے دیکھتی رہ گئی۔

”جس طرح تم نے ہماری باتیں سن کر یہ کھڑا گ پھیلایا۔ اس طرح ایک دن میں نے بھی اتفاق سے تمہاری اور اماں کی باتیں سن لی تھیں۔ وہی دن تھا جب تم اماں کو شہزاد کے رشتے کے متعلق بتا رہی تھیں۔ اس روز تمہارے آنسو میری غیرت پر تازیانہ بن کر لگے۔ میرا بس نہ چل رہا تھا کہ میں شہزاد کو شوٹ کروں۔ اماں بھی تمہاری وجہ سے بہت اپ سیٹ تھیں لیکن میرے ایک بار کے انکار کے بعد اماں نے دوبارہ میرے سامنے تمہارا نام تک نہ لیا تھا جو کام مجھ سے کوئی زور زبردستی نہ کروا سکا۔ وہ بس خود بخود ہی ہو گیا۔ تم اسے ہمدردی کا نام دے لو یا فرماں برداری کا۔ سہر حال میں نے اماں کو تمہارے لیے ہاں کہہ دی تھی۔“

”مانیتے ہیں! آپ کہ یہ صرف ہمدردی پس فرماں برداری تھی۔ مجبوری کا نہ سہی مگر یہ ہمدردی کا بندھن ہے نا۔“ ہانیہ کی ہچکیاں پھر شروع ہو گئی تھیں۔

”ہاں نکاح سے پہلے تک یہ ہی صورت حال تھی۔“ حارث نے فراخ دلی سے تسلیم کیا۔

”اب یہ مت کہہ دیجئے گا کہ نکاح کے بعد آپ کو مجھ سے محبت بھلا ہو گئی ہے۔“ وہ روتے روتے بول اٹھی تھی۔ حارث لب بھینچ کر اسے خفگی سے ٹکٹا رہا۔

”اب کیوں خاموش ہو گئے۔ بولتے کیوں نہیں؟“

”مانیتے ہیں! آپ کہ یہ صرف ہمدردی پس فرماں برداری تھی۔ مجبوری کا نہ سہی مگر یہ ہمدردی کا بندھن ہے نا۔“ ہانیہ کی ہچکیاں پھر شروع ہو گئی تھیں۔

”ہاں نکاح سے پہلے تک یہ ہی صورت حال تھی۔“ حارث نے فراخ دلی سے تسلیم کیا۔

”اب یہ مت کہہ دیجئے گا کہ نکاح کے بعد آپ کو مجھ سے محبت بھلا ہو گئی ہے۔“ وہ روتے روتے بول اٹھی تھی۔ حارث لب بھینچ کر اسے خفگی سے ٹکٹا رہا۔

”اب کیوں خاموش ہو گئے۔ بولتے کیوں نہیں؟“

کے سر و سپاٹ رویوں کو سہتہ سہتہ جب میں تھکنے لگتی، تو یہاں خالہ کے پاس آگرا۔ پنہ جی کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ ماں باپ کے بعد میرا گھر میرے لیے صرف ایک سرائے بن چکا تھا۔ اپنے ہی گھر میں اجنبیوں اور مہمانوں کی طرح رہنا کتنا تکلیف دہ امر ہے اس کا اندازہ کوئی اور شخص لگا ہی نہیں سکتا۔ ”ہانیہ تھکے لہجے میں بولی تھی۔

”چلو! اپنے تکلیف دہ ماضی کو بھول جاؤ۔ اللہ نے مجھ سے محبت کرنے والا شوہر عطا کر کے کیا تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ نہیں کر دیا۔“

”آپ سے شادی کے بعد مجھے ماں جیسی خالہ کی شفقت بھری چھاؤں ہمیشہ کے لیے میسر آگئی۔ میری اصل خوش نصیبی یہ ہے جناب!“ ہانیہ نے اس بار مسکرا کر بتایا تھا۔

”تو جب ماں جیسی خالہ تمہارے کسی کام میں ماؤں کے انداز میں نقص نکالتی تھی تو تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجنے لگتے تھے؟“ حارث کو بروقت یاد آیا تو پوچھ بیٹھا تھا۔

”صرف اور صرف آپ کی وجہ سے۔ خالہ جب بھی مجھے کچھ سمجھانے لگتیں۔ آپ مجھے ایسے غٹنگلی باندھ کر گھورنے لگتے کہ خفت کے مارے میرا برا حال ہو جاتا۔ میں سوچتی تھی کہ آپ اپنے دل میں مجھے پھوڑ سمجھ رہے ہوں گے بس مجھے اسی لیے رونا آنے لگتا تھا۔“

”لو جی! یعنی کہ یہ تصور بھی میرے ہی کھاتے میں درج تھا۔“ صدے اور افسوس سے حارث کا برا حال ہونے لگا۔

”غلط فہمی تھی حارث! اب تو ختم ہو گئی نا۔“ ہانیہ نے اسے تسلی دی۔ حارث اسے مصنوعی غٹنگلی سے گھورنے لگا تھا۔

”چھا اب ایسے ناراض ہو کر تو مت گھوریں۔ رامس! آئندہ آپ کے خلاف کوئی غلط فہمی دل میں نہیں پالوں گی۔ جو بھی بات ہوئی سب سے پہلے آپ سے شیئر کروں گی۔ آخر آپ میرے بہترین دوست

”ہاں بتا: نظر آگئی محبت یا واقعی چلیں کسی آئی کلینک پر؟“ حارث نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

”مگر یہ اظہار پہلے کر دیتے تو میں کیوں اتنے دن پریشان رہتی۔“ ہانیہ کو محبت پر یقین آیا سو آیا ساتھ ہی پھر سے رونا بھی آگیا۔

”ذرا سی احریف پر تو تم ہیرہوٹی بن جاتی تھیں۔ رومانس جھاڑنے لگتا تو جانے کیا حال ہوتا تمہارا۔“ حارث اسے شادی کے ابتدائی دن یاد دل رہا تھا۔

”تو نئی نوپا دلہنوں کو شرم تو آتی ہی ہے نا اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ شوہر ڈھنگ سے اظہار محبت بھی نہ کر پائے۔“ حارث اس شکوے پر بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔

”میری دلہن اب بھی نئی نوپا ہی ہے۔ وہ مطمئن رہے اب اس کا شوہر اس سے محبت بھی کرے گا اور اظہار محبت بھی۔ کہو تو ایک غزل سنا کر اظہار محبت کی شروعات کروں؟“ وہ شریر ہوا تھا۔

”بس کریں اب!“ ہانیہ کے ہونٹوں پر شرمگین سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

”شروع کیا نہیں اور ابھی سے بس کروں۔ پھر میرے خلاف ایک اور چارج شیٹ تیار ہو جائے گی۔“ وہ ہنساتا تھا۔ ہانیہ بھی جھینپ کر ہنس پڑی۔

”چلو شکر۔ ہے آج ہم دونوں کی غلط فہمیوں کا خاتمہ ہوا۔ تم مجھ سے بدگمان تھیں اور میں سوچے بیٹھا تھا کہ شاید تم اماں کی باتوں پر ڈسٹرب رہتی ہو۔ میں سوچتا تھا جیسے تم اپنے گھر والوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل گرفتہ ہو جاتی تھیں اماں کی باتیں بھی تمہیں ویسے ہی پریشان کرتی ہیں۔“

”آپ مجھے بہت امپجور سمجھتے تھے حارث! مجھے اپنے گھر والوں کی جن چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا آتا تھا وہ بے شک آپ کے لیے معمولی ہوں لیکن مجھے ان کے جن رویوں کو مسلسل بھگتنا پڑ رہا تھا وہ سنا کسی بھی نارمل انسان کے لیے آسان نہیں تھا۔ میری بھابھیاں مجھے صرف ایک بوجھ تصور کرتی تھیں۔ ان

سی غزل یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو آج شب اسے اپنی بیوی کو سنا کر یا قاعدہ اور بھرپور اظہار محبت کرنا تھا۔ کیونکہ ہانیہ کا شکوہ بجا تھا۔ اظہار کے بنا محبت ادھوری تھی۔ اب اسے محبت بھی کرنی تھی اور ساتھ ہی اس کا بھرپور طریقے سے اظہار بھی۔ ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کہ محبت کے با اس کی زندگی ادھوری تھی بالکل ادھوری کیونکہ محبت ہی تو زندگی ہے۔



ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
ذرد موسم	راحت جمیں	750/-
زندگی ایک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فاطمہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فاطمہ افتخار	600/-
پھلاں دے رنگ کالے	فاطمہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوہا ہے	فاطمہ افتخار	300/-
میں سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرتا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
رخم کو ضد تھی سیمائی سے	نوزیہ یاسمین	250/-
اموس کا چاند	جسری سعید	200/-

ناول منکوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچہ - 30/- روپے

منکوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار کراچی۔

فون نمبر: 32216361

بھی تو ہیں۔" ہانیہ نے اسے مسکرا کر مخاطب کیا تھا۔
"ہرگز نہیں۔ دوستی والی پیشکش محدود مدت کے لیے تھی۔ اب میں تمہارا شوہر ہوں۔ پہلے تم نے میرا دوستانہ روپ دیکھا تھا۔ اب میری محبتوں کی شدتیں بھی دیکھنی پڑیں گی اور اگر تم نے۔"

"میں سب کچھ دیکھ لوں گی حارث! پہلے ذرا بچن دیکھ لوں۔" اخیر دھلے برتنوں کا انبار جمع ہے اور شام کے کھانے کے لیے کچھ بھی بنانا ہے۔ "ہانیہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ حارث نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ اپنے پاس ٹھایا تھا۔

"تمہارا یہ شرمایا، بوکھلایا سا روپ میرے ہوش اڑا دیتا ہے، جان من! پتا نہیں چند ہی دنوں میں کیسا جاو کر دیا مجھ پر۔ ہر وقت ہر گھڑی صرف تمہارے خیالوں میں ہی کھویا رہتا ہوں۔" حارث کی محمور لہجے میں کی جانے والی سرگوشی اس کی وارفتگی، ہانیہ اپنے دل کی دھڑکن کو سنبھالنے میں ناکام ہوئے جارہی تھی۔

"مجھے آپ کی محبت کی صداقت بدل سے یقین آگیا ہے حارث! لیکن دوستی والی پیشکش کی مدت تھوڑے عرصے کے لیے اور بڑھادیں پلیز۔"

وہ دھیرے سے گویا ہوئی تھی۔ اس کی پلکوں کی لرزش ادیب گالوں پر بکھرتی لالی اس کی دلی کیفیت کا پتا دے رہی تھی۔ حارث محفوظ انداز میں مسکرایا تھا۔

"صرف ایک ڈانٹ لاگ سن کر یہ حالت ہوئی ہے۔ یہ تو اظہار محبت کی ابتدا ہے بیوی! اس نے اسے شہر انداز میں چھیڑا۔

"آج کے لیے یہ ہی بہت ہے۔ بس میں اب کھانا بنانے جا رہی ہوں۔" وہ یک لخت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑاتی تیزی سے کمرے سے باہر نکلی تھی۔ حارث کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ بکھر گئی۔ ماں کی فرماں برداری کا کیا خوب صورت اور حسین انعام ملا تھا اسے۔ اس کا روالا ارواں اپنے رب کا شکر گزار تھا۔ بہت مطمئن انداز میں وہ بیڈ پر چھموراز ہو گیا۔

اب وہ آنکھیں موندے دل ہی دل میں رومانیک

حکیم کاپٹن

ڈیکوریشن میں کوہستان کے حوالے سے چمکیلے ریپرز میں سجا کر وہ تحائف تیار کیے تھے جن پر لکھے نام ان لوگوں کے تھے جن کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ یہاں کون سی سی آئی ڈی لگی تھی جو اصل بات جان سکتی۔ چیٹنگ میں نمبروں ٹائی بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ تمام موبائل نیٹ ورکس کے تمام ایس ایم ایس اور کال پیکیجز سے جتنا فائدہ اٹھا سکتی تھی اٹھا دن دینی رات چوگنی کے محاورے پر عمل کرتے ہوئے

اتنے فرینڈز بنا چکی تھی کہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس کی سحر طراز باتوں میں گرفتار دوستوں میں سے اگر نصف نے بھی گلاب کا ایک ایک پھول بھیجا تو وہ یقیناً ”شرط جیت جائے گی۔“

اب اتنے پاور فل ایونٹ پر رازی نے ایک دن پہلے شریک ہونے سے معذرت کر لی۔



”ہاؤ سلی یو آر رازی“ تم ویلنٹائن پارٹی میں آنے سے کیسے انکار کر سکتے ہو؟“ ٹائی نے اتنی دل گرفتگی اور اچنبھے سے کہا۔ گویا کوئی گمراہ رہنما کا فرض روزہ بنا کسی عذر کے چھوڑ دے تو یہ سن کر کسی واعظ کو بھی اتنی تکلیف نہ ہوگی جتنا ویلنٹائن ڈے پر نہ آنے کا سن کر رازی کے گروپ فرینڈز پر گزر رہی تھی۔

”میں جانتا ہوں یہ پارٹی میں آنے سے کیوں انکار کر رہا ہے۔“

نعمان نے رازی کی مسلسل خاموشی پر نکتہ اٹھایا۔ وہ رازی کے بالکل سامنے بیٹھا تھا اور باقی تمام دوست

رازی نے ریزن دیا تھا یا مذاق کیا تھا۔ ساتوں نفوس کو ورطہ جبر میں ڈال دیا تھا۔ ربیعہ کو لگا اس نے کچھ غلط سنا ہے۔ ہالہ اور خولہ ایک دوسرے سے تصدیق کرنے لگیں۔ عباد اور نعمان کے قمقمے پھوٹ پڑے تو ٹائی کی انھری بڑی زوردار تھی۔ لو فریت میں نمبروں ناؤر نے ریٹیوں کا طوفان مچا دیا۔

یونیورسٹی فیلڈز نے مل کر ویلنٹائن ڈے کے لیے اسپیکل پروگرام بنایا تھا۔ اور ٹائی کے گھر میں اکٹھے ہو کر سلیپرٹ کرنے کا پروگرام پیچھلے سات دن سے ان کے درمیان زیر بحث تھا۔ سب سے زیادہ ایکسٹرنٹ اس دن کے حوالے سے وہ شرط تھی جس میں آٹھوں دوستوں نے مل کر طے کیا تھا کہ اس ویلنٹائن پر جس کو سب سے زیادہ سرخ گلاب پھولوں کے گلدستے اور تحائف ملیں گے وہ ورنر ہوگا۔

اس شرط کے حوالے سے عباد اور ناؤر نے اپنی درجن کے حساب سے موبائل فون گرل فرینڈز کو تیار کر رکھا تھا۔ دونوں میں سے ہر ایک کا دعوا تھا کہ زیادہ تحفے وہ حاصل کرے گا۔ دوسری طرف نعمان اور ربیعہ نے تو پہلے سے ہی بکے آرڈر کر رکھے تھے شرط جیتنے کے لیے پیچھلے دو ماہ کی ساری جیب خرچی وہ اس ایڈونچر پر صرف کر چکے تھے۔ بھلا کسی کو کیا خبر ہوتی کہ پھول کسی نے دیے ہیں یا انہوں نے خود خریدے ہیں۔ ادھر خولہ اور ہالہ صرف پیدائش میں جڑواں نہ تھیں۔ عادات اور سوچ بھی یکساں تھیں دونوں نے پیچھلے کئی دن کی نیند برباد کر کے اپنی استعمال شدہ جیولری سوٹ پیس اور گھبر رہی موجود قدرے بہتر حالت میں موجود

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



نعمان اپنی طرف سے بڑی پتے کی بات لایا تھا۔ مگر کسی نے اس کی اس بات کو اہمیت نہ دی۔
 ”یار لاسٹ ٹائم دادو نے مجھے سر پرانز کیا تھا۔ اس بار مجھے انہیں سر پرانز دینا ہے۔ میں تیرہ فروری کی رات کو پا کھتن چلا جاؤں گا۔ تاکہ چودہ فروری کا سورج جب طلوع ہو تو میری دادو سب سے پہلے میرا چہرہ دیکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے بڑا تحفہ ان کے لیے ویلنٹائن ڈے پر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“

دونوں کے درمیان رازی کی خاموشی اور نعمان کے اچانک تجسس پھیلانے پر سب نے ایک ساتھ رازی کی طرف سے گردن گھما کر نعمان کی طرف موڑی جیسے ریڈار گھومتا ہے۔
 ”کیونکہ اس کو کسی نے لفٹ ہی نہیں کرائی اور گلاب کا پھول کیا۔ اسے تو کوئی گلاب کی پتی بھی نہ دے۔ یہ شرط ہارنے کے خوف سے بھاگنے کے چکر میں ہے۔“

ماما نے بھی خوب ناک چڑھا کر رائے زنی کی۔ اب وہ کیا بتاتی کہ سیلیبریشن تو ہوتا ہی تھی۔ دیگر احباب تو تھے ہی۔ مگر رازی کے بنائے کا دل کہاں خوش ہوتا تھا؟ رازی نے نہ صرف خود ویلنٹائن کی شکل تبدیل کر دی تھی۔ بلکہ ان سب کو بھی منثورہ دیا تھا کہ شرط کے انداز کو قدرے ترمیم کے ساتھ رکھا جائے۔ گلاب کے پھول بکے کے ساتھ گلدستہ دعا بھی ایڈ کیا جائے جو اس دن سب سے زیادہ دعاؤں کا ذخیرہ اکٹھا کرے گا وہی ورنہ ہوگا اور دعاؤں کا خزانہ ان بزرگوں کے پاس ہے جنہیں ہم کھنڈرات کہہ کر خود سے دور کر دیتے ہیں۔



”میری دادو، تایا ابو کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ لاہور شفٹ ہو جانے کے بعد میرا ان سے کئی سالوں سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ بابا کب جا کر ان سے مل آتے تھے۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ فن پر ان کی مٹھاس بھری آواز دل کو اچھی لگتی تھی۔ مگر اتنی نہیں کہ دوڑ دوڑا چلا جاؤں۔ مگر لاسٹ ایر وادول کے ہاتھوں مجبور اپنے پوتے کا چہرہ دیکھنے کے لیے چانک چلی آئیں۔ انہیں ویلنٹائن کے بابت کچھ خبر نہیں۔ وہ کوئی تحفہ یا پھول نہیں لائی تھیں۔ ہاں اتفاق تھا کہ جب وہ میرے سامنے آئیں تو کیلنڈر پر چودہ فروری کھلکھلا اٹھی تھی۔ میرے ہاتھوں میں تحائف کا ڈھیر تھا جو میرے فریڈز کے لیے تھا۔ مگر وہ بوسہ جو میری پیشانی پر ان کیپکپاتے ہونٹوں نے دیا۔ بائے گاؤ دنیا کا کوئی تحفہ اس لمس سے قیمتی نہ تھا۔ کوئی سیلیبریشن اس ایک Hug سے بڑھ کر نہ تھی جو دادو کی نحیف بانہوں میں میں نے منائی۔ یوم وفا اگر منانا ہے تو اس مقدس رشتوں سے مناؤ، سچی خوشی پائے گے۔“

رازی انہیں قائل کرنے کے درپے تھا۔ جن کے چہرے کے زاویے قطعاً دیکھنے کے لائق نہ تھے۔ ”میرے خیال میں رازن تمہیں تبلیغی جماعت جو اس کر لینی چاہیے۔“

نادر نے تمام ٹریکچر کو پھونکوں سے اڑاتے ہوئے

رازی نے ویلنٹائن پارٹی میں شرکت کی جو وجہ بتائی تھی۔ وہ بلاشبہ سب کے لیے حیرت سے کم نہ تھی۔ ویلنٹائن جیسا حسین ورومانوی دن جسے ظاہراً ایک دھڑکن رکھتے دو دلوں کے وصال کا دن کہا جاتا ہے۔ مگر درپردہ شرم و حیا حدود و قیود سے ماوراء غیر اخلاقی حرکتوں کے، داؤ پیچ کا دن ہے اور منانے والے وہ جو عشق کے ہجر و وصال کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہوتے ہیں۔

ویلنٹائن کے بابت ایسی سوچ رکھ کر پروان چڑھنے والی نئی نسل کے لیے دادی اور پوتے کے مابین ایسی کسی سرگرمی کا ہونا باعث حیرت نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔



”مانی کی بات ہے مانی ڈیر آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“

وہ پارہ صفت طبیعت کی مالک تھی۔ سکون سے بیٹھنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کے باعث من پسند لائف گزارنے کے تمام حق رکھتی تھی۔ عید شب برات اسے یاد ہونہ ہو نیو ایر اور ویلنٹائن ڈے پر اس کا جوش و خروش ویدنی ہوتا تھا۔ فادر ڈے پر بابا کو شرف ملاقات بخشی تھی تو مدر ڈے پر ماما کو لفٹ کرائی تھی۔ بزنس میں اچھے فادر اور ویلیفیر ایکٹو بیسز میں مصروف ماما کے لیے یہی بہت تھا۔ مگر اس نئے سال کی ویلنٹائن پر کیا عجب ہوا کہ مانی منہ سر پیٹے روم بند کیے بیٹھی تھی۔ ماما کی تشویش بجا تھی۔

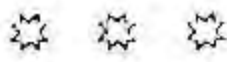
”ماما! اس اسٹوڈنٹ رازی نے سارا پروگرام خراب کر دیا۔ ویلنٹائن منائے گا اپنی دادو کے ساتھ، کتنی اسٹوڈنٹ سی بات لگتی ہے یہ۔“

مانی بھڑک رہی تھی۔ رازی کی حرکت کا سن کر ماما کو بھی حیرت ہوئی۔ ویلنٹائن ڈے پر بوڑھوں کا کیا کام۔ ”اس وقیر نوی کو رہنے دو، یہ کنویں کے مینڈک نہ خود خوش ہو۔ تے ہیں نہ دوسروں کو ہونے دیتے ہیں تم اپنی سیلیبریشن کرو۔“

طنز یہ کہا۔

۔۔۔ فضول وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی اسٹڈی پر توجہ دو۔“

ماما بیک وقت دونوں کو اس فضول موضوع سے دور کرنے کی غرض سے گویا ہوئیں۔ بھلا جنہیں شادی کی ابتدا سے ہی مکھن میں سے باں کی طرح نکال دیا تھا۔ آج اتنے سالوں بعد ان کا تذکرہ چہ معنی دار ہے۔



”رازی! تم اب تک اپنا ضد پر اڑے ہو یا ر! صرف پانچ گھنٹے رہتے ہیں ویلنٹائن ٹائم اشارت ہونے میں۔ کل کا دن کتنی موج مستی کا ہو گا۔ تم اپنی دادو کو کسی اور دن سر پر انڈے دینا۔ ان کے لیے تو سارے دن ہی ویلنٹائن ہیں۔ 14 فروری کو ضائع مت کرو۔“ ثانی اس دن کے واک آؤٹ کے بعد آج پھر گروپ ڈسکشن میں شامل ہوئی تھی اور سب کی طرح اسے سمجھانے کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔

”دادو نہیں جانتیں 4:14 فروری کیا ہے؟ میں تو جانتا ہوں اور میں اپنا ویلنٹائن ڈے شاندار بنانا چاہتا ہوں۔“

”دادو سے لپٹ کر؟“

ہالہ نے اس کے انوکھے ثنوق پر چوٹ کرتے ہوئے بات مکمل کی۔ اس کی بات پر منہ بسورتے سب کے ہنسنے نکل پڑے۔

”آف کورس! کیا ہی منک تمہارے گلاب کے کانڈی پھولوں میں ہوگی جڑ میری دادو کے ٹیچ میں ہے۔“

رازی اگر انہیں قائل نہیں کریا رہا تھا تو یہ کوشش ان ساتوں کی بھی کامیاب نہ ہو رہی تھی۔

”بٹ رازی! اگر گرینڈ پیرٹس نہ ہوں تو پھر۔“

عباد کے سوال نے سب کو چونکا دیا۔ وہ اب تک کے تمام مباحثے میں محض خاموش تماشا تھا۔ اس کی کشمکش کا اصل کیا تھا۔ اب سامنے آیا تھا۔

”سو واٹ! ایسے رشتے کبھی مرتے نہیں زندگی میں نہیں ملے تو اس ویلنٹائن پر ایک کلی ان کی قبر پر رکھ

”وفا گرے ہوئے پھولوں میں نہیں یارو۔۔۔ ان بزرگوں میں ہی ملے گی۔ تمہارے قیمتی پھول کا حق دار ہر ایر اغیرہ نہیں بلکہ وہ ہیں جو تمہاری اصل تمہاری پہچان ہیں۔ محبت سڑکوں پر نہیں اینوں سے رابطوں میں ملتی ہے۔ سلی ہوئی کلیوں کے خفے تمہیں کیا لطف دیں گے، جو ان بوڑھے لبوں سے نکلی دعا میں تمہیں دیں گی۔“

رازی پر کسی طنز و تحقیر کا اثر نہیں تھا۔ وہ اپنی کسے جارہے تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ نسل نوموم کی مانند ہوتی ہے۔ جس سانچے میں ڈھالو ڈھل ہی جاتی ہے۔



”پاپا! آپ کے پیرٹس کہاں ہیں؟“
ثانی کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ ناشتے کی میز پر شادو نادر ہی اکتھا ہوتے اس کے ماں باپ کو حیرت زدہ کر دیا۔ ثانی عیسیٰ موج مستی میں مگن لڑکی سے ایسے استفسار کی امید ہی کب تھی؟
”کیا بات ہے ثانی! تمہیں بھی رازی والا وائرس تو نہیں لگ گیا۔“

”او نو ماما! میں تو بس جسٹ فار انفارمیشن پوچھ رہی تھی۔“

پاپا جو رازی والے قصے سے واقف تھیں۔ طنز یہ بولی تھیں۔

”ثانی! آپ کے دادا ابو کا انتقال ہو گیا ہے اور دادی ماں گاؤں میں رہتی ہیں اکیلی۔“

پاپا کے اچھی خاصی سوچ بچار کے بعد مختصر جواب دینے پر ثانی نے اچھے ”اکیلی؟“ کہا۔

”نہیں! ایک غریب فیملی کو ساتھ رکھا ہوا ہے۔ انہی کے مسائل میں الجھی رہتی ہیں۔“

پاپا کا ہر سوال کا جواب دینا ماما کو اچھا خاصا کھٹک رہا تھا۔ اوپر سے پاپا کی جھکی نگاہیں ہلکی سی پشیمانی کا عکس انہیں غصہ دلانے کے لیے کافی تھا۔

”آپ آفس سے لیٹ ہو رہے ہیں اور ثانی

رہا۔ ایصالِ ثواب کے لیے ایک بار درود پاک پڑھ لیتا۔
 سب سے ایسٹ ویلنٹائن تمہاری ہی ہوگی۔“
 ”اٹس انف رازی! تمہارا لیکچر اب میری برواشت
 سے باہر ہے۔“
 ثانی اس نئے سبق پر آگ بگولہ ہو کر ایک بار پھر
 واک آؤٹ کر گئی۔

”آج کے دن کا ونر کون ہے؟“

رات گئے اکٹھے ہوئے، والے دوستوں نے شرط
 کے حوالے سے دریافت کیا۔ نہ تو نعمان اور ربیعہ نے
 خود ہی سے خریدے بکے نکالے، نہ تادور اور عباد کی
 فیک فرینڈز نے تحائف کے انبار بھجے۔ نہ ہالہ اور
 خولہ خود ہی سے بنائے گفٹ، سامنے لائیں۔ پھر شرط
 کس بات کی اور ونر ہونے کا کیا جواز؟

”اگر تم لوگ وہ نشانِ محبت دیکھنے کی صلاحیت
 رکھتے ہو جو میری دادو نے بوسوں کی صورت مجھے گفٹ
 کیے ہیں تو یقیناً ونر میں ہی ہوں۔“

رازی نے اپنی ماتھے، گال، ناک، ٹھوڑی کو انگلی
 سے چھو کر تباخہ سے کہا۔

”نہیں۔ اگر میرا چہرہ تمہیں وہ خوشی دکھا سکتا ہے
 جو میرے دادا دادی کو آج کی صبح میرے ان کے پاس
 جا کر سلام پیش کرنے سے حاصل ہوئی تو ونر میں ہوں
 گا۔“

تادور کے لہجے میں جی خوشی کی جھلک چھپائے نہ
 چھپتی تھی۔

”نہیں۔ وہ ایک پھولوں کا بار جو میں اپنے مرحوم
 دادا دادی کی قبر پر چڑھا کر آیا ہوں۔ اس کا مقابلہ کوئی
 نہیں کر سکتا۔ شرط تو میں ہی جیتا ہوں۔“

عباد کو معلوم نہیں پتھر کی قبر سے سکون و محبت کو
 کون سے خزانے ملے تھے کہ اس کا چہرہ سورج کی مانند
 دمک رہا تھا۔

”تم لوگوں کے پاس صرف الفاظ ہیں جو نظر نہیں
 آتے۔ لیکن دیکھو! میرے پاس ثبوت ہے کہ شرط
 میرے ہاتھ سے کہیں نہیں گئی۔“

ربیعہ نے سو روپے کا مڑا تزا بوسیدہ نوٹ سب کی
 نگاہوں کے سامنے لرایا۔ سب بن کے جان گئے کہ

”رازی! میرے دادا دادی ہمارے ساتھ ہی گھر کے
 ایک روم میں رہتے ہیں۔ میں نے انہیں آخری بار
 کب سلام کیا تھا۔ مجھے تو یاد بھی نہیں۔ اصل میں امی
 ان سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتیں اور ابو
 نے بھی کبھی اصرار نہیں کیا۔“

تادور ماحول کے زیر اثر آتے ہوئے ان کا ذکر کرنے
 لگا۔

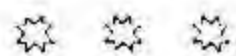
”تو دیر کس بات کی ہے۔ اس ویلنٹائن پر لپٹس
 ڈاؤٹ! رازی نے فوراً حل پیش کیا۔“

”بٹ رازی! میری وہ درجن بھر گرل فرینڈز کا دل
 ٹوٹ جائے گا۔ جن کے ساتھ میں نے کل ویلنٹائن
 منائی ہے۔“

نعمان نے خباثت سے برانداز میں کہا۔ لیکن اس
 کی بات میں بھی متفق ہونے کی جھلک ملتی تھی۔

”درجن کے قریب فیک فرینڈز کے لیے تمہارے
 پاس ٹائم ہے۔ صرف چند منٹس رسیل رشتوں کے
 لیے نہیں نکال سکتے۔ اگر انہوں نے تم میں اپنی تربیت
 کے رنگ نہ بھرے ہوتے تو آج تم رنگ رلیاں منانے کے
 لائق نہ ہوتے۔“

یہ لیکچر رازی کے نہیں ہالہ کے لبوں سے نکلا تھا۔
 سب دم سادھے اس کی صورت دیکھنے لگے۔ رازی
 نے باقاعدہ تالیاں بجائیں۔ ہالہ کی جزواں خولہ کیا سوچ
 رکھتی تھی۔ کہنا ضروری نہ تھا۔ وہ دونوں اور ان کی
 سوچ ایک دوسرے کا پرتو تھی۔



14 فروری کلینڈر کا ایک عام سادہ کس من
 چلے دل جلے سر پھرے نے اسے ”محبوبوں کا دن“ بنا



نہیں تھے۔ اسی لیے رازی نے فوراً "ٹانی کے پیارے" رابطہ کیا۔

"ہاں بیٹا! ٹانی کے دل میں نجاہ نے کیا سمائی؟ وہ آج صبح اپنی دادی ماں سے ملنے گاؤں چلی گئی ہے۔"

ٹانی کو کس لمحے ہدایت کے تحفے نے سرفراز کیا کہ وہ بھی اس نئی ویلنٹائن کی سلیبیشن کا حصہ بن گئی۔

سب کی خوشی دیدنی اور فطری تھی۔ سیمٹال بچ رہی تھیں۔ تالیاں پیٹی جا رہی تھیں۔ خوشی کے نغمے گائے جا رہے تھے۔ ٹانی کے عمل نے سب کے دل کے شگوفے کھلا دیے تھے۔ نہ کسی نے زبان سے کچھ کہا، نہ بحث و تکرار ہوئی اور ایک سرپھری "من موحی" نئی تہذیب کے رنگوں میں رنگی، ٹانی خود بخود اس ویلنٹائن کی فلاح قرار پا گئی تھی۔

ایک بند کمرے میں آٹھ نفوس نے ویلنٹائن کا ایک نیا انداز ایجاد کیا تھا۔ اگر اللہ نے چاہا تو ایک دن ساری دنیا اس پر عمل پیرا ہوگی۔ خوشیوں کے مواقع جتنے ہوں، کم ہیں، مگر ہر تہوار تہذیب و اقدار کے جہاز میں ہو تو پچی خوشی تخلیق پاتی ہے۔



قیمت - 300 روپے

مکتبہ اربعہ کاہلہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
فون نمبر: 32735021
37، اردو بازار، کراچی

چائے کا ایک کپ پلانے پر دادا نے پوتی کو انعام الفت سے نوازا تھا۔

"ہمارے دادا دادی نہیں ہیں مگر آج تایا ابو اور پھپھو کے لیے کیک اور بکے لے جاتے ہوئے ہم نے محبت و روابط کو ایک نیا موڑ دیا ہے۔ ہم سے جیت کے دکھاؤ۔"

بالہ اور خولہ نے تقاضے سے فرضی کالر جھاڑ کر سب کو دیکھا۔ کوئی شک نہیں کہ وڑ کھلائے جانے کے بہت قریب تھیں وہ دونوں۔

"ہرگز نہیں۔ تم نے کوئی تیر نہیں مارا میرے گرینڈ پیرنس نہیں۔ پایا اکلوتے ہیں ان کے کوئی بہن بھائی نہیں۔ میں نے آپ پر اس گفٹ اپنے پڑوسی احسن صاحب کو پیش کیا۔ اب جتاؤ انعام کی رقم کہاں سے؟"

نعمان کو درجن کے حساب سے کم عقلوں کو گفٹ بانٹتے ایک کار خیر کا خیال آتا یقیناً "آئندہ کے لیے مثبت نتائج سامنے لے کر آئے گا۔"

"بٹ رازی! اپنی نہیں آئی۔"

ربیعہ نے اچانک اس طرف توجہ مبذول کرائی تھی مگر یہ بات تو سب ہی کے دلوں میں کھب رہی تھی۔ وہ ان کے گروپ کی سب سے دل عزیز ممبر تھی۔ اس موقع کے لیے تو سب سے زیادہ برجوش بھی وہی تھی مگر اس انوکھی ویلنٹائن پر سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوئی۔ سب اس کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگے۔

رازی کو نمبر ڈائل کرتے دیکھ کر سب جان گئے کہ وہ ٹانی کو فون مار رہا ہے۔

"ہیلو آئی! رازی بات کر رہا ہوں۔ ٹانی کہاں ہے؟" ٹانی کا موبائل مسلسل آف جاتا دیکھ کر اس نے اس کی ماما کا نمبر ملایا تھا۔

"محترم واعظ صاحب! وہ آپ کے کمرے پر زیادہ ہی کنسٹیوٹ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنی ماما کے کمرے کو بھی انور کر دیتی ہے۔"

چبا چبا کے بولتی آئی مزید بات کے موڈ میں نہ تھیں۔ عمران کے کمرے چند الفاظ روکے جانے لائق



وزیر اطلاعات سے رابطہ کیا تو انہوں نے ہم سے بات کرنے سے ہی انکار کر دیا۔

ناظرین! ہماری ہمیشہ کوشش رہی کہ دونوں اطراف کا نقطہ نظر آپ تک پہنچائیں۔ ہم نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے آج بھی سب سے پہلے نیوز بریک کی اور ہر لمحہ بدلتی ہوئی صورت حال کی مکمل خبر فوج کے ساتھ آپ تک پہنچائی۔ ناظرین! وفاقی وزیر اطلاعات نے ہم سے بات کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیا یہ آزادی اظہار کی نفی نہیں ہے۔ حالانکہ ہم دونوں اطراف کا نقطہ نظر واضح طور پر آپ تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں اسکرین پر مناظر۔ حکومت کی جانب سے کوئی عہدیدار اس حوالے سے بات کرنے کو تیار نہیں۔ ”میزبان اپنے چینل کی پالیسی کے مطابق حکومت کو رگید رہا تھا۔

صبا نے اگلا چینل بدلا۔ پیلا چینل آگیا تھا۔ یہاں کی میزبان بہت روانی سے کہہ رہی تھی۔

”ناظرین! حکومت صبر و تحمل اور برداشت سے کام لے رہی ہے اور پُر تشدد مظاہرین کو آپ اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ کیسے وہ اٹھیاں اور ڈنڈے اٹھائے ہوئے ہیں اور توڑ پھوڑ میں مصروف ہیں۔ وفاقی وزیر اطلاعات نے اب سے کچھ دیر پہلے ہم سے بات کی ہے جس میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ حکومت قانون ہاتھ میں لینے والوں کے خلاف کارروائی کرے گی۔ عوام کے جان و مال کی حفاظت ہماری اولین ترجیح ہے۔ تشدد و ہتھیاری اور دھونس کے حربے استعمال کرنے والے جان لیں کہ ہم ڈرنے والے نہیں۔ احتجاج

نیا، چینل پر میزبان بول رہا تھا۔

”ناظرین! موجودہ صورت حال کے بارے میں ہم نے حکومتی موقف جاننے کے لیے وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ہم سے بات کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اپوزیشن کا موقف آپ کے سامنے ہے۔ آپ اسکرین پر مناظر دیکھ سکتے ہیں کہ پُر امن مظاہرین پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں ہم تازہ ترین اطلاعات سب سے پہلے آپ تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کو بتاتے چلیں کہ اپوزیشن پارٹی کے ترجمان نے اب سے کچھ دیر پہلے ہم سے بات کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ہمارے آرکنان کامل طور پر پُر امن ہیں اور احتجاج کرنا ہمارا بنیادی حق ہے۔ ایسے میں حکومتی رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایک طرف حکومت جمہوریت کے راگ الاپتی ہے، اور دوسری طرف کھلم کھلا ریاستی دہشت گردی کی جا رہی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت نے سازش کے ذریعے ہمارے پُر امن مظاہرین پر تشدد کرنے کی کوشش کی، لیکن عوام نے ان کی سازش کو ناکام بنادیا ہے تو حکومت اوجھے ہتھکنڈوں پر اتر آئی اور پولیس پُر امن مظاہرین پر پل پڑی۔ پولیس کو ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا موجودہ حکومت کا شیوہ رہا ہے۔ یہ کہنا تھا اپوزیشن پارٹی کے ترجمان کا۔

انہوں نے مزید کہا کہ پولیس گردی کے ذریعے حکومت عوام کی آواز کو دبا نہیں سکتی اور دوسری طرف ناظرین! ہم نے حکومتی موقف جاننے کے لیے وفاقی

نے مزید کہا کہ اپوزیشن پارٹی کے ایڈر مسلسل عوام کو اشتعال دلارہے ہیں۔

ناظرین! نازہ ترین خبر آپ تک پہنچائیں کہ مظاہرین پولیس پر پھراؤ کر رہے ہیں۔ انہوں نے ڈنڈے اٹھا رکھے ہیں۔ مشتعل مظاہرین اس سے پہلے

آپ کا حق ہے لیکن قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی۔ پولیس اپنے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے کارروائی کرے گی۔ سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے والوں سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا۔ یہ کہنا تھا وفاقی وزیر اطلاعات کا۔ ناظرین! انہوں



Copied From Web

کچھ گاڑیوں کی توڑ پھوڑ کر چکے ہیں۔ جس کی فوج آپ اس وقت اسکرین پر دیکھ سکتے ہیں۔ حکومتی موقف آپ کو ایک بار پھر بتاتے چلیں کہ وفاقی وزیر اطلاعات نے کہا ہے کہ حکومت صبر و تحمل اور برداشت کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ تشدد کی راہ اپنانے والوں کو اپنے انجام سے ڈرنا چاہیے۔ پاکستانی عوام ایسے طرز

سیاست کو رد کرتے ہیں۔ اپوزیشن پارٹی کو ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھنا چاہیے۔

پیلا چینل اپنی پالیسی کے مطابق اپوزیشن پارٹی کو رگید رہا تھا۔

صبا کے ماتھے پر فکر مندی کی لکیریں اور گہری ہو گئی تھیں۔

”ابا یہ کیا بنے گا۔“ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی بھی پھیل گئی تھی۔ ”ملک کے حالات۔“

سوال ادھر اسی رہ گیا اور وہ یاسیت سے کسی غیر مرئی نقد کو دیکھتی چپ سی ہو گئی۔ بھلا کیا بولے۔ یہ تو ایک روایتی سا گھساٹا سا جملہ ہو گیا ہے کہ ملک کے حالات اب بدلیں گے۔ کیا بنے گا۔ اب تو پوچھتے ہی حیا آتی ہے۔ ڈر لگتا ہے، خوف آتا ہے کہ کیا پوچھ رہے ہیں۔ لیکن پاس ہی بیٹھے ابا اسکرین سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

انہوں نے نی وی اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ہر چینل کی اپنی پالیسی ہوتی ہے نا۔ پیلا چینل اپنی پالیسی کے مطابق کام کرتا ہے اور خوب خوب کما رہا ہے۔ پیلا چینل اپنی پالیسی کو فالو کرتا ہے۔ وہ بھی خوب چل رہا ہے۔ ایسے ہی تم بھی سوچ لو، بلکہ ہر وہ شخص جسے یہ سوال تنگ کرتا ہے۔ ملک کے حالات والا سوال کرنے والا بھی اپنی ایک پالیسی بنالے اور پھر اس پر کام شروع کر لے۔ پھر اور کچھ نہ بھی بدلاتو وہ ایک شخص ضرور بدل جائے گا۔ اپنی پالیسی بناؤ اور شروع ہو جاؤ۔ ادھر ادھر نہ دیکھو وقت سونے ہیروں، جواہرات، سے بہت بہت زیادہ قیمتی ہے۔ اسے ایک دھن میں ایک

مقصد میں لگاؤ۔ پھر تمہیں یہ سوال تنگ نہیں کرے گا۔ سارا دن تم یہ نیلے پیلے ہرے چینل دیکھ کر اپنا سونے جیسا وقت سیاہ کر دیتی ہو۔ یہ ایک بات ہی سیکھ لو ان سے پالیسی بنانا اور اس پہ چل پڑنا۔“ ابا شاید اس کے فارغ رہنے سے زیادہ ہی عاجز آئے بیٹھے تھے۔

صبا بھی پاکستان کے ڈھیر سے لوگوں کی طرح حی وی اور انٹرنیٹ کی ڈی ہوئی تھی۔ اس نے ابا کی ساری

گفتگو کو ذہن میں جما کر رکھنے کی سعی کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ وہاں ارادے کی مضبوطی کی جگہ تھی لیکن اس کی اپنی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی تھی۔ بے حوصلگی تھی جسے ابا نے پڑھ لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس پر ہر تھوڑے عرصے بعد ایسے ڈریشن کے دور آتے ہیں کہ وہ ٹوٹ سی جاتی ہے۔

ایسے میں وہ اکثر باتوں سے اس کا کتھارس کرتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اب وہ اس ذہنی روپر قابو پائے۔ کوئی راستہ اپنائے، کوئی مقصد بنے، بس فارغ نہ رہے۔ وہ ایک بار پھر مضبوط لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

”تم اپنے حصے کا کام کرو، اپنے حصے کی شمع جلاؤ“ جب تک ایسا نہیں کرو گی تب تک ایسے ہی چیزوں پر تم کڑھتی رہو گی۔ کبھی ملک کے حالات پر روؤ گی، کبھی معاشرے میں ہونے والی نا انصافی پر کڑھو گی۔ کبھی گھریلو جھگڑے تمہیں پاؤں کڑھیں گے۔ کبھی دوسروں کی خود غرضی تمہیں گھانٹل کر دے گی۔ کیونکہ یہ چینلز تو صرف پیسہ کما رہے ہیں۔ رہی حکومت تو حکومت اور اپوزیشن دونوں کچھ نہیں کریں گے۔ جو کرنا ہے عوام نے ہماری نوجوان نسل نے کرنا ہے۔

خود کو پہچانو۔ اگر ہر شخص اپنے حصے کا چراغ جلا لے تو چاروں طرف روشنی پھیل جائے گی۔ اندھیرے کو مٹانے کے لیے آگے بڑھنا پڑے گا۔“

انہوں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ صبا کو محسوس ہوا کہ ان کے ہاتھ کے لمس کا سکون اس کے اندر داخل ہو رہا ہے۔



نظیر قاطرہ



پنجابی کی ایک مشہور کہاوت ہے ”کوئی رکھ دی
کدی گلانہ ہوئے۔“ (کبھی کوئی اکیلا اور تھانہ ہو۔)
بالکل سولہ آنے درست ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ کلا
پتر یعنی اکلوتا بیٹا بھی کسی کانہ ہو۔ خاص طور پر وہ بیٹا جو
سات بیٹیوں سے چھوٹا ہو۔



Copied

”وہ کہتے ہیں شادی کے بعد تم لوگ اپنے شوہروں کی ذمہ داری ہو، باپ اور بھائی کی نہیں۔ تمہارے شوہر جتنا کماتے ہیں تم لوگ اسی میں گزارا کرنا سیکھو۔“

”ابا تو ہمیں ویسے ہی ایک آنکھ دکھنا پسند نہیں۔“ بڑی آپا نے لمحوں میں ابا کی ساری محبتوں کو بھلا دیا۔ ”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ شادی سے پہلے کیسے تم لوگوں کو لاؤ اور چاؤ سے رکھا ہوا تھا۔ ہمیشہ انہوں نے تم لوگوں کو اچھا کھلایا، اچھا پہنایا اور اپنی حیثیت کے مطابق اچھے گھروں میں تم لوگوں کی شادیاں کی۔ برے بھلے وقت میں بہن بھائی ہی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں مگر تم لوگوں نے تو روز کا تماشا ہی بنا لیا تھا۔ اسی لیے تمہارے ابا نے یہ قدم اٹھایا ہے۔“ اماں نے ایمان داری کی اتنا کر دی۔

”تو سرمد کے کون سے بچے ہیں جن پر اسے خرچ کرنا ہے؟“ چھوٹی آپا بھی تنک کر بولیں۔ ”بھی نہیں ہیں نا۔ شادی کریں گے تو بچے بھی ہو جائیں گے۔ بس تم لوگ اس کی کمائی پر نیت نہ لگایا کرو۔“ بات بنتی نہ دیکھ کر ساتوں نے خاموشی اختیار کر لی۔



میری سب بہنوں کی شادیاں بھرے پرے گھروں میں ہوئی تھیں۔ جہاں وہی ساس، نندوں کی روایتی چپقلش عام تھیں۔ جب گھر میں میری شادی کا ذکر شروع ہوا تو ساتوں باری باری آکر اپنے سرریلوں کے مظالم سناتے ہوئے یوں رو میں کہ سیلاب کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ وہ تو ابا کی دھاڑ نے انہیں چپ کر دیا، ورنہ تو شاید سارا گاؤں ان کے آنسوؤں میں بہہ جاتا۔

قصہ یہ تھا کہ ان سب کی کوئی نہ کوئی نند کنواری تھی اور ہر کوئی یہ چاہتی تھی کہ میری شادی اس کی نند سے ہو، تاکہ وہ اس کی نند بن کر گن گن کر بدلے لے سکے اور اپنے سرریلوں کو ناکوں پہنے چبوا سکے۔ بہنوں کو روتے دیکھ کر میرا دل چاہا کہ میں ساتوں کی نندوں

میں سرمد ہوں۔ فضل داد کا اکلوتا سپوت میرے بچپن سے لے کر اب تک جب کہ میرے دونوں بیٹے بھی شادی کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، بہنوں کے ہاتھوں میری کیسے کیسے درگت بنی ہے۔ مت بوچھیں۔ بچپن میں میرا منہ چوم چوم کر میرے چہرے کا گوشت، تنک گھسایا۔ آج تک میرے چہرے پر ماس نہیں آیا۔ سارا سارا دن مجھے گود میں اٹھائے پھرتیں کہ میرے ساتھ کے لڑکے فٹ بال کے پیچھے بھاگنے لگے تو میں نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھا۔ وہ بھی اللہ بھلا کرے میری دادی کا جنہوں نے رولا مچا کر مجھے ان کی گودوں سے نیچے اتروایا۔



جب تک میں جوان ہوا، میری ساتوں بہنیں شادی شدہ ہو چکی تھیں۔ جب میں نے کماتا شروع کیا تو سمجھو میری بہنوں کی لائری نکل آئی۔ وہ اپنی بہت سی ضرورتوں کے لیے میری تنخواہ کا برا حصہ لے اڑتیں۔ اس کے لیے انہوں نے باقاعدہ باریاں لگا رکھی تھیں۔ جیسے ہی میری تنخواہ آتی، میری وہ بہن جس کی اس مہینے باری ہوتی، اپنے کسی مسئلے کے ساتھ آ موجود ہوتی۔ کسی کی چھت چمکنے لگتی، تو کسی کی پانی والی موٹر جل جاتی۔ بس طرح قیام پاکستان سے پہلے پنجاب گورا صاحب کے نزدیک ”فروٹ گرین باسکٹ آف انڈیا“ تھا۔ بالکل اسی طرح میں اپنی بہنوں کے لیے ”فروٹ باسکٹ آف فضل ہاؤس“ تھا۔

ابا کو جب ان کی اس کارروائی کا ادراک ہوا تو وہ کمر کس کر میدان میں آگئے۔ تنخواہ ملتے ہی میری ساری تنخواہ اپنے قبضے میں لے لیتے اور مجھے خرچا دے کر باقی بچت کے خزانے میں ڈال دیتے۔ یہ بات میری بہنوں کو بہت ناگوار گزری۔

”اماں! کبھی کبھی تو ہمیں لگتا ہے کہ ہم ابا کی سوتیلی بیٹیاں ہیں۔ کیا تھا جو سرمد ہماری تھوڑی بہت مدد کرتا تھا۔ ہم نہیں ہیں اس کی۔ حق بنتا ہے ہمارا اس پر۔“ بہنوں نے ہاتھ نہچا نہچا کر اماں سے شکوہ کیا۔

نقص نکالیں گی۔ مگر وہ بھول گئی تھیں کہ ابا ان سب کے باپ ہیں۔ اس وقت ان کو منہ کی کھانا پڑی۔ جب ابا نے بری بنانے کی ذمہ داری ان کو دی ہی نہیں۔ وہ شہر جا کر نادیا (میری منگیترا) کے ہاتھ پر پیسے رکھ آئے کہ اپنی مرضی سے کپڑے خرید لے۔ چیز کے ابا ویسے ہی بہت خلاف تھے۔ اپنی بیٹیوں کو تو انہوں نے حسب حیثیت چیز دیا تھا کہ جہاں ان کی بیٹیاں پیادہ ہی گئی تھیں وہاں کے لوگوں کی سوچ ابا جیسی نہیں تھی۔ مگر اپنے بیٹے کی دفعہ تو وہ اپنی من مانی کر سکتے تھے، سو انہوں نے کی۔ گھر میں اللہ کے فضل سے ہر چیز موجود تھی۔ ابا نے میرے کمرے میں نیا فریج، قالین اور پردے ڈالوا کر کمرہ شادی تک ہلاک کر دیا۔

”اے سرمد! تو۔۔۔ تو ابھی سے ہم بہنوں کو بھول گیا ہے۔ بیوی کے آنے کے بعد تو ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے ہی نکال دے گا۔“ میں دفتر سے واپس آ کر ابھی موٹر سائیکل کھڑی کر رہا تھا جب صحن میں بیٹھی آپاٹسو بہانے لگیں۔

”آپا! میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔“ میں فوراً ان کے پاس جا بیٹھا۔

”ہاں اب تو تیری آنکھوں میں تیری ہوتی سوتی بستی ہے۔ ہم تجھے کہاں نظر آئیں گے۔“ میری وضاحت پر ان کے دکھ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مزید وضاحتوں پر ان کے دکھ نے ایک سو اسی کی اسپید پکڑ لی جسے بریک ابا کی کھنکھارنے لگائی۔

اسی طرح گرم سرد حالات کا سامنا کرتے ہوئے شادی کا دن آن پہنچا۔ میں بہت ڈرا ہوا تھا۔ آپاؤں کے رویے نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ آئندہ میرے ساتھ کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ میری بارات جانے لگی تو ساتوں باگ پھڑائی۔ کے بجائے باگ کے ساتھ لٹک ہی گئیں جس پر گھوڑی نے برا مانا کر ادھر ادھر اچھلتا شروع کر دیا۔ گھوڑی کے اچھلنے سے ڈر کر جو باگ لیں تو باگ پھڑائی۔ ”باگ پھڑائی“ میں بدلی اور میں نیچے گرنے سے بال بال بچا۔ خیر ان کے ہر خرے اور خرابی منصوبوں کے باوجود نادیا میرے ساتھ

سے شادی کر لوں سب کا بھلا ہو جائے گا۔ مگر ایسا میں صرف سوچ ہی سکتا تھا کہ اول تو چار سے زیادہ کی اجازت نہیں تھی اور دوسرے ابا کو ان جنجال پوروں سے لڑکی اپنے گھر نہیں لانی تھی۔ سو میں اور اماں جب آپاؤں کی دل جوئی کرتے کرتے جذباتی ہونے لگتے ابا میدان میں آ کر ان کو وہ کھری کھری سناتے کہ ان کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔

ان سب کی امیدوں پر سو فیصد پانی اس وقت پھرا جب ابا شہر گئے اور اپنے گزن کی پڑھی لکھی سلجھی ہوئی بیٹی سے میری بات کی کر آئے۔ اماں کو تو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا ارمان تھا، سو وہ ابا کی خوشی میں شریک ہو گئیں۔ آپاؤں کو خبر ہوئی تو انکھی آکریوں رو میں جیسے خدا نخواستہ کسی کی موت ہو گئی ہو۔ ان کو دیکھ کر پھر جو ابا کو جلال آیا تو پورا گھبرا گیا۔

”تم لوگ کیا میرے گھر نحوست پھیلانے آ گئی ہو۔“ میرے اکلوتے پتر کی شادی طے ہوئی ہے اور تم لوگوں نے رونا پیٹنا ڈال دیا ہے۔ چلو نکلو، شام تک مجھے تم میں سے ایک بھی یہاں نظر نہ آئے۔ اگر تم لوگ میرے پتر کی شگن میں خوشی خوشی شریک ہونا چاہو تو منگنی میں آنا ورنہ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ادھر کا رخ کرنے کی۔ رخنہ ڈالنے والوں کی میں ٹانگیں توڑ دوں گا۔“

ابا سے کچھ بعید نہ تھا وہ واقعی ٹانگیں توڑ کر ہاتھوں میں پکڑا دیتے۔ اس دھمکی کے بعد سب نے اپنے آنسو تو پونچھ لیے لیکن میری بیوی مطلب ہونے والی سے دل ہی دل میں ہیرا ماندہ لیا اور اسے آٹھ آٹھ آنسو رلانے کا تہہ کر لیا۔

میری منگنی سے شادی تک انہوں نے میری بیوی کو تنگ کرنے کے جو منصوبے بنائے ان میں سے ایک آدھ کبھی کبھار میرے کانوں میں پڑ جاتا تو میں حقیقتاً ”پریشان ہو جاؤں کہ مستقبل میں کیا ہو گا۔“

بدلیہ لینے کے نوالے سے انہوں نے جو فہرست بنا رکھی تھی اس میں پہلے نمبر پر یہ تھا کہ وہ اس کی بری کے لیے ایک سے ایک گھٹیا جوڑا خریدیں گی۔ دوسرے نمبر پر اس کے جینز کی چیزوں میں سب سب کے

آیا ہوں۔“ ابا نے روٹیوں والا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

”دیکھا اماں! اپنے شوہر کو تیرے لیے تو تیل توڑ کر دہرا نہ کیا اور اب بہو کے لیے روٹیاں بازار سے لے آئے۔ ہمارے ہوتے ہوئے گھسی بازار کی روٹی نہ کھائی ابا نے۔“ منجھلی آپا نے اماں کو بھڑکایا۔

”تیرے ابا کے لیے وہ روٹی گھر پر ہی بنائے گی۔“ اماں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

”اماں! تو بھی۔“ سب کی سب اماں کے یوں پارٹی بدل لینے پر تڑپ گئیں۔

”ہاں تو وہ دوسرے بتی سے ہے۔ سالن اور میٹھا اس نے گھر پر بنالیا۔ اب تم ساتوں اکٹھی آگئی ہو۔ ساتوں کے کل ملا کر اکیس تو بچے ہیں۔ وہ کیسے اتنی روٹیاں پکائے۔ خود تو تم میں سے کوئی اٹھ کر پانی بھی نہیں پیتی، مگر ہم تو اس کا خیال کریں گے نا، آخر کو وہ ہمارے بیٹے کی اولاد کو جنم دینے والی ہے۔“ اماں کی گنتی پر سب سے چھوٹی آپا بھڑک گئیں۔

”توبہ اماں! تو تو گن گن کرتا نہ لگی۔ اب ہم بوجھ ہو گئے۔“ ساتوں کے آنسو پلکوں پر آن رکے۔ ساتوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ کسی ایک کے آنسو گالوں پر پھسلیں تو ان کے آنسو بھی آزاد ہوں۔

”تم بیٹیاں ہو اس گھر کی بوجھ کیوں؟ پردھیو! اس کا بھی تو خیال کرنا چاہیے نا آخر وہ بھی انسان ہے۔ جب تک وہ فارغ نہیں ہو جاتی تم لوگ ایک ایک کر کے آیا کرو۔ اگر اکٹھی آؤ تو پھر کام مل کر کر لیا کرو۔“ ساتوں کے آنسو بیک وقت گالوں پر پھسلے اور سسکیاں ہونٹوں کی قید سے آزاد ہو گئیں۔

”تم لوگوں کو کیا ہوا؟“ ابا کمرے میں آئے ان کو دیکھ کر ساتوں کے بہتے آنسو یوں خشک ہوئے جیسے بھارت نے ڈیم بنا کر ہمارے دریاؤں کو خشک کر دیا ہے۔

”کچھ نہیں ابا! ایسے ہی دادی مرحومہ یاد آ رہی

رخصت ہو کر آگئی۔“

”او کڑیو! اب اور کوئی رخصتہ ڈالنا۔ نادیا کو کمرے میں چھوڑ کر آؤ، تھک گئی ہوگی۔ تھوڑا آرام کر لے۔“ ابا کو بہو پر بڑے لاڈ آ رہے تھے۔ وہ سب منہ بسور کر اسے کمرے میں چھوڑ آئیں۔



نادیا بہت اچھی لڑکی ثابت ہوئی۔ ابا تو ویسے ہی اس پر جان چمڑکتے تھے۔ اماں بھی اس کے ساتھ بڑا مکمل مل کر رہتی تھیں، مگر جب ان کی بیٹیاں آجائیں تو اماں کے ایسے کان بھرتیں کہ ان کی بہو کی نادیدہ خامیاں بھی نظر آنے لگتیں تو وہ طنز کا ایک آدھ تیرہ سا ہی دیتیں۔ نادیا نے سمجھ داری سے حالات کا تجزیہ کر کے لائحہ عمل اپنایا تھا۔ لہذا جب ایسی صورت حال پیش آتی تو وہ خاموش ہو جاتی۔ بعد میں اماں کو اپنے طرز عمل پر افسوس ہونے لگتا کہ انہوں نے ناحق زیادتی کی۔ اپنی زیادتی کی تلافی میں وہ اور میٹھی ہو جاتیں اور نادیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی۔ آہستہ آہستہ اماں نے اس صورت حال پر قابو پالیا۔ بیٹیوں کی باتیں سن لیتیں، مگر بہو کو کچھ نہ کہتیں۔ کہتیں بھی کیوں نادیا نے کبھی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

”ہم آجائیں تو تیری بیوی کی جان نکلنے لگتی ہے۔ دو بچ رہے ہیں، ابھی تک سب بھوکے بیٹھے ہیں۔ کھانے کا کوئی نامہ نشان نہیں ہے۔“ آپا نے میری کلاس لی۔

”نامہ سب اپنے ہاتھ پیر اپنے گھروں میں چھوڑ آتی ہو، جو خود اٹھ کر کچھ نہیں کر سکتیں۔ نادیا کی کچھ مدد ہی کرو۔“ چاری کب سے اکیلی لگی ہوئی ہے۔“ نادیا جب سے امید سے ہوئی تھی ابا کے لاڈ اور بڑھ گئے تھے۔ اب بھی میرے بولنے سے پہلے ان کی جھڑکی سنائی دی تو وہ جو چارپائی پر آڑھی تر چھی پڑی ہوئی تھیں۔ یوں اٹھیں جیسے سانپ دیکھ لیا ہو۔ ابا کو گھر سے باہر جاتے دیکھ کر ہی تو انہوں نے دل کی بھڑاس نکالنا چاہی تھی، مگر نجاب نے وہ واپس کیسے آگئے تھے۔

”نادیا پتہ! بس کرا اب یہ روٹیاں میں تنور سے لے

بھاگ کر برآمدے میں پہنچے۔ ہمارا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس سے پہلے، کہ صورت حال کو سمجھتے۔

”ہائے ابا۔ ہائے ابا“ کر کے، روتی ہوئی آپا کے منہ سے ”ہائے ابا۔۔۔“ کی زوردار آواز نکلی۔ ابا کی لاشی دور سے ان کے بازو پر بڑی تھی اور تکلیف کی وجہ سے ان کا راگ۔۔۔ بنی بن بدل گیا تھا۔ ”کیا مجال ہے کہ دو گھڑی آرام کر لے بندہ۔ میں سو رہا تھا، مرا نہیں تھا۔“ ابا نے کڑے تیوروں سے کہا۔ ”ہائے ابا! سو رہے تھے تو بتا نہیں سکتے تھے۔ لے کے میرے اتنے آنسو ضائع کرا دیے۔“ انہوں نے بازو سہلایا۔ گویا انہیں ابا کے زندہ ہونے کی خوشی سے زیادہ اپنے آنسوؤں کے ضائع ہونے کا غم ہوا تھا۔ ”نا۔۔۔ اب میں کیا اپنے سرہانے بینر لگوالوں کہ میں سو رہا ہوں، مرا نہیں۔ حد ہوتی ہے بے وقوفی کی۔“ ابا اٹھ کھڑے ہوئے۔



ہمارے ہاں پہلے بیٹے کی ولادت ہوئی تو ابا خوشی سے اللہ کے حضور جھک گئے۔ مٹھائی بانٹی۔ میرے بیٹے کی ساتوں پھپھیاں ایک ایک ماشے کی سونے کی انگلیاں لائیں اور بدلے میں آدھے آدھے تولے کے جھمکوں کی فرمائش کروی۔ ابا تو سنتے ہی بھڑک اٹھے۔

”تم لوگ اپنی لائی ہوئی مندریاں واپس لے جاؤ۔ تم لوگوں کے لیے دو ڈھائی لاکھ روپے کہاں سے لائے جائیں۔“ ابا نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا مگر ابا اس دفعہ بیٹیوں کے ساتھ تھیں۔

”بھری پری سسرال میں رہتی ہیں۔ بھائی کے بیٹے کی دوائی تو بنتی ہے نا، آدھے تولے کی ناسی، کچھ ہلکا پھلکا ہی سہی، پر سونے کی چیز ان لوگوں کا حق بنتی ہے۔“ سو مرتے گیانہ کرتے جیسے، تیسے پورا کیا گیا۔ جب میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو بڑی آپا نے ایک نیا شو شاپھوڑ دیا۔

تھیں۔ ”آپا نے بات سنبھالی۔

میں ابا کی صحت اور درازی عمر کی دعا مانگا کرتا تھا کہ وہی تھے جو میری اتھری بہنوں کو قابو کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے کسی بات پر نادیہ کی حمایت کی تھی۔ جس پر ساتوں نے میرے اتنے کان کیپنے کہ مجھے یقین ہو گیا کہ آج یا تو میرے کان الگ ہو کر ان کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے یا باپا بھئی کی طرح چٹکھے کی صورت تو ضرور ہی اختیار کر لیں گے۔ اس کے بعد میں نے توبہ کی تھی کہ ان کے سامنے کبھی نادیہ کی طرف داری نہیں کروں گا۔ جب بھی میں ابا کی غیر موجودگی میں بہنوں کے ہتھے چڑھ جاتا تو اپنی بیوی کے بارے میں ان کی لن ترانیاں جب سادھ کر سنتا رہتا۔ بعد میں نادیہ سے معذرت کرتا تو وہ ہنس کر ٹال دیتی۔

”کوئی بات نہیں ویسے بھی بڑے بڑے کانوں والا سر مد مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔“ وہ کہتی اور ہم دونوں ہنس پڑتے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا کہ نادیہ عام عورتوں کی طرح انارست نہیں تھی۔ وہ بہت سمجھ دار تھی۔ اسے معلوم تھا اپنی نندوں کو کیسے قابو کرنا ہے سو وہ کامیابی سے ان کے ساتھ نباہ کر رہی تھی۔



تیسرے نمبر والی آپا کو بات کا جتنکڑ بنانے میں کمال حاصل تھا۔ ایک دن وہ گھر آئیں تو ابا برآمدے میں کچھی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے سفید صاف سے منہ زحانہ رکھا تھا۔ انہوں نے سلام کیا تو جواب نہ دیا وہ پنج مار کر زمین کرنے لگیں۔

”ہائے ابا! ہاں ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہائے! دیکھو سب اپنے اپنے مزوں میں ہیں۔ ہائے دیکھو! دونوں میاں بیوی دن ہاڑے اپنے کمرے میں گھس کر بیٹھے ہیں اور میرا ابا اکیلے پڑا پڑا مر گیا۔ ہائے ابا۔۔۔ ہائے ابا۔“

انہوں نے مجھے اور نادیہ کو یوں لتاڑا جیسے ملک الموت ہم دونوں کے پاس آیا تھا اور ہم نے اسے ابا کی جان نکالنے کی اجازت دے دی ہو، میں نادیہ اور ابا

بھانجیوں کے بارے میں ہی سوچتا، آخر بہنوں کا بھائیوں پر بہت حق ہوتا ہے مگر بات دراصل یہ تھی کہ ان سب کی بیٹیاں ایک سے بڑھ کر ایک شوخیاں اور زبان دراز تھیں۔ روپیٹ کر میٹرک ایف اے کیا اور سمجھو تعلیم مکمل۔ باقی کا سارا وقت گھر بیلو سیاستوں اور چغل خوری میں گزرتا۔ میری آپاؤں کا کہنا تھا کہ ان کی بیٹیاں اپنی چنڈال پھینکھوں پر گئی ہیں اور ان کی نندوں کے خیال میں پوری کی پوری اپنی ماؤں پر بڑی تھیں۔ ایسے موقع پر میری بہنوں کی نندیں پنجابی کی یہ کہاوٹ با آواز بلند دہراتی تھیں۔ ”کک دابی تے مل اتے دھی“ (جیسی ماں ویسی بیٹی)

شکر ہے رب تعالیٰ کا کہ میرے بیٹے مجھ پر نہیں بلکہ اپنے دادا پر پڑے تھے۔ معاملہ فہم اور نڈر۔ جب میری بہنوں کا تقاضا حد سے بڑھنے لگا تو ابانے اپنے پوتوں کے ساتھ ایک خفیہ میٹنگ کی جس کے بارے میں مجھے بہت بعد میں خبر ہوئی۔

☆ ☆ ☆

اچانک میرے بیٹوں کی محبت اپنی پھوپھیوں کے ساتھ دن بدن بڑھنے لگی۔ وہ ان کے ساتھ رازداری سے کھسر پھسر کرتے۔ میں پانادیہ جاتے تو خاموش ہو جاتے۔ یہ صورت حال مجھے اور نادیہ کو ہولانے لگی۔

”سرمد! اپنے بیٹوں کو کنٹرول کرو۔ اگر انہوں نے اپنی کسی پھوپھی زاد کو پسند کر لیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔“ وہ آنسو پونچھتی اور میں خاموش رہتا اور دل ہی دل میں نادیہ سے کہتا کہ اگر ایسا ہو گیا تو اسے اپنی جان دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آپاؤں کی راج دلا ریوں نے اس کی جان خود ہی نکال لی تھی۔ میں اور نادیہ جل جل کر خاک ہو رہے تھے اور ابا کا اطمینان دیدلی تھا۔

مجھے حیرت کا شدید ترین جھٹکا بلکہ جھٹکے تب لگنا شروع ہوئے جب چھ ماہ بعد باری باری بڑی بیٹیوں بہنوں نے اپنی ان بیٹیوں کی منگنیاں اپنی سسرال میں

”وے سرمد! جس طرح اماں کے گھر پہلے سات بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں، پھر بیٹا تو مجھے لگتا ہے کہ اسی طرح تیرے گھر پہلے سات بیٹے ہوں گے، پھر بیٹی۔ اس لیے بچوں میں زیادہ وقفہ نہ رکھنا۔“ یہ سن کر نادیہ سچ میں بے ہوش ہو گئی۔ آپا کی بات سے ڈر کر جو اس نے فل اسٹاپ لگایا تو نندوں کے طعنوں اور اماں کی نصیحتوں کے باوجود ”بچے دو ہی اچھے“ کی پالیسی پر کار بند رہی اور ہمیشہ کی طرح ابا کی سپورٹ تو اسے حاصل تھی ہی۔

☆ ☆ ☆

میں اسی طرح اپنی بہنوں سے درگت بنواتا رہا اور میرے بیٹے موسیٰ اور ہارون اپنے تعلیمی مدارج طے کرتے رہے۔ جب میرے دونوں بیٹے آگے پیچھے انجینئرنگ، یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو میری آپائیں جو میری درگت بناتے وقت پکی اتحادی ہوتی تھیں ان میں پھوپھو پڑنا شروع ہو گئی۔

وجہ فکری میرے بیٹے۔

”جی۔ آپ ٹھیک سمجھے، میری ہر بہن یہ چاہتی تھی کہ میں اپنے بیٹوں کے لیے اس کی بیٹی لوں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میری سب بہنیں مجھ سے بڑی ہیں تو ان کی بیٹیاں میرے بیٹوں کی ہم عمر کیسے ہو سکیں۔ تو اطلاقاً عرض ہے کہ میری ہر آپا کے بچوں کی تعداد سات سے آٹھ عدد ہے۔ لہذا ان کے آخری دو دو بچے میرے بیٹوں کے ہم عمر یا ان سے تھوڑے چھوٹے تھے۔

لہذا اب ہر کسی کی یہ کوشش تھی کہ وہ میرے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائے۔ اس چکر میں وہ ایک دوسری کی وہ دہرائیاں بیان کرتیں کہ میں گنگ ہو جاتا۔ وہ سب شاید یہ بات بھول گئی تھیں کہ ہمارے ابا ابھی زندہ ہیں جنہوں نے کبھی میرے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دی تو میرے بیٹوں کے ساتھ بھلا کیسے ہونے دیں گے؟ ہمیں چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہتا۔ میں اپنے بیٹوں کے لیے سب سے پہلے اپنی

”رہخانہ اور عالیہ پھپھو سے ہم نے کہا کہ آپ یقین کریں ہم نے خود سنا وہ امی سے کہہ رہے تھے کہ عالیہ اور رہخانہ کی بیٹیوں سے شادی کروا کر وہ ان کے باپوں سے بدلہ لیں گے جو ان کا ادھار لے کر کھا چکے ہیں۔“ میں ابھی ابا سے بات کرتی ہوں۔ ”میری بات پر رہخانہ پھپھو اٹھنے لگیں تو موسیٰ نے پکڑ کر بٹھالیا اور کہنے لگا۔ کیا کرتی ہیں پھپھو آپ نے یہ سب ان سے پوچھا تو پھر وہ ہمارا آپ سے ملنا بند کروں گے اور پھر آپ کو اندر کی خبریں ملنا بند ہو جائیں گی۔“ ہارون نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ اس طرح کی برین واشنگ کر کر کے ہم نے یہ کام کروایا ہے۔ دونوں نے کالرا کڑائے۔

”پریشا! وہ میری بہنیں ہیں، تم لوگوں کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ میرا دل عجیب سا ہو رہا تھا۔ آخر میں ان کا اکلوتا بھائی تھا۔

”ہم جانتے ہیں بھائی، بہنوں کا ملن ہوتے ہیں لیکن اس مان کے نام پر بھائیوں کی کھال تو نہیں کھینچنی چاہیے نا۔ اپنے حق کا شور مچانے کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔“ موسیٰ اور ہارون نے تسلی دینے کے انداز میں میرے ہاتھ دبائے۔

”بابا! آپ پریشان نہ ہوں۔ اب ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اب کوئی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ ہارون نے لاڈ سے کہا۔

”اور نہ ہی اب کوئی آپ کے کان کھینچ کر لمبے کر سکتا ہے۔“ نادیا نے لقمہ دیا تو سب کا بلند تقہرہ پڑا۔

اباجی ہمیشہ کہتے تھے کہ میرا پترا کیلا ہے اور اکیلی تو لکڑی بھی نہیں جلتی، اس لیے میں ہر معاملے میں اپنے پتر کے ساتھ کھڑا ہوتا ہوں اور اب اباجی نے میرا ساتھ دینے کے لیے اپنے دونوں پوتوں کو تیار کر دیا تھا۔ مجھے ان پر ٹوٹ کر ہیار آیا۔ دارا کے تربیت یافتہ دونوں پوتے میرے دائیں بائیں یوں سارا بن کر کھڑے تھے۔ کہ مجھے لگا میرا اکلوتا پن ہمیشہ کے لیے کہیں جا چھپا ہے۔

کردیں بہن کے لیے وہ موسیٰ اور ہارون کو داماد کی حیثیت سے پسند کر چکی تھیں۔ اس کے بعد باقی چاروں بھی بہانے سے سنا گئیں کہ وہ بھی عن قریب اپنی بیٹیوں کی بات اپنے سرسالی رشتہ داروں میں کی کر دیں گی۔ میں جو اس مسئلے کو لے کر بہت پریشان تھا، اس کا پلٹ پر حیران رہ گیا۔

”اباجی! یہ تپاؤں کو کیا ہوا؟“ ہم سب رات کو اکٹھے بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ اماں جلدی سونے کی عادی تھیں سو وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

”تو ساری عمر لگا رہتا تو بھی اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا تھا اور میں تیرے ساتھ کوئی زیادتی ہوتے دیکھ نہیں سکتا۔ یہ میرے دونوں شیر بالکل مجھ پر گئے ہیں۔ ان سے پوچھ لیتا میں سوئے جا رہا ہوں۔“ ابا نے موسیٰ اور ہارون کے کندھوں کو تھکی دی۔

”بابا! دونوں نے اپنی بائیں میرے گلے میں ڈال دیں۔“

”اف! بہت ایکٹنگ کرنا پڑی ہم دونوں کو۔“ موسیٰ مسکرا رہا تھا۔

”حالانکہ آپ اور امی ہم سے ناراض رہنے لگے تھے کہ کہیں ہم پھپھو بیٹیوں کے داماد نہ بن جائیں۔“ ہارون اماں کے برابر جا بیٹھا۔

”مگر یہ سب ہوا کیسے؟“ نادیا ابھی تک حیران تھی۔

”داوانے یہ مشن ہم دونوں کے سپرد کیا تھا۔ سو ہم نے پلان بنایا۔ جب بھی کوئی پھپھی یہاں آئیں ہم ان سے خوب محبت جتاتے اور ان سے کہتے پھپھو آپ اتنی اچھی ہیں۔ ہمارا بس چلے تو آپ کی بیٹی سے شادی کریں، مگر آپ ہماری امی کو تو جانتی ہیں نا، اول تو وہ مانیں گی نہیں اور مان بھی گئیں تو آپ کی بیٹیوں پر ظلم

ڈھا کر آپ سے بدلہ لے لیں گی اور آپ تڑپ تڑپ کر ختم ہو جائیں گی اور داوا کو بھی آپ جانتی ہیں وہ تو شروع سے امی کی ہی سائیڈ لیتے ہیں۔ وہ سر ہلانے لگتیں۔

لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے۔“ موسیٰ سانس لینے کو رکا تو ہارون شروع ہو گیا۔



حصہ اول

راستوں کا راہی بن گیا۔ ہلسا دینے والی دھوپ میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک فائرنگ شروع ہو گئی اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ اس نے کوئی پروا نہ کی کہ اب اسے اس زندگی کی خواہش ہی کب تھی۔

پھر نجانے کیسے اس نڈھال وجود میں اتنی طاقت آگئی کہ اس نے بھاگتے ہوئے ایک حملہ آور کو پکڑ لیا۔ پولیس بھی وہاں پہنچ گئی اور انہیں گرفتار کر لیا۔ سیٹھ ار مغالی نے اس کا شکریہ ادا کیا مگر وہ نقاہت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔

شام کو سیٹھ ار مغالی اسے دیکھنے اسپتال آئے تو اس کے متعلق جاننا چاہا مگر اس کے لب چپ کے قفل نہ توڑ سکے۔

”تم بتاؤ زین! میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

پہلی بار اس نے منہ کھولا کہ اسے ایک وقت کا پیٹ بھرنے کے لیے ڈکری چاہیے۔ سیٹھ ار مغالی نے اسے اپنے ساتھ راہ لیا تھا۔ وہ ایک ہی دفعہ نہیں مرنے چاہتا تھا بلکہ قطرہ قطرہ زہرا اپنے وجود میں اتارنا چاہتا تھا۔ اپنے ہی وجود پر سانس میں تنگ کرنا چاہتا تھا۔

رات وہ ایک ہوٹل پر روکھی سوکھی کھا کر بان کی تنگی چارپائی پر لیٹ جاتا۔ تب دعا حساب کتاب لینے آجاتی۔ وہ اسے اپنی مجبوریوں کی داستان سناتا، مگر ہر روز وہ اس سے ناراض چلی جاتی اور بان کی چارپائی کانتوں کا بستر بن جاتی۔ اس کے نوکیلے کانٹے ساری رات اس کے وجود کو لہو لہو کرتے اور وہ روتے روتے سو جتنا نجانے کب نیند اسے اس اذیت سے چھٹکارا دلائے گی۔ مگر

وہ گھر، ماں باپ اور دولت سب کچھ چھوڑ آیا۔ وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو کے جگہ جگہ لاوارثوں کی طرح بڑا رہنا چاہتا تھا۔ وہ خود کو فنا کر دینا چاہتا تھا۔ وہ دعا کی طرح مٹی ہو جانا چاہتا تھا۔ اس مٹی میں ہی رمل جانا چاہتا تھا۔ جس میں وہ اپنی دعا کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر چکا تھا۔

اس کا ہارا ہوا وجود تھا اور ایک ایسا سفر تھا جس کی کوئی منزل نہ تھی اور نہ ہی کچھ حاصل۔ بے سست





Copied From Web

اب سکندر اس بگڑے بچے کی طرح ہو گیا تھا جو اپنا پھینکا ہوا کھلونا کسی کے ہاتھ میں دیکھ کر چھین لیتا ہے۔
 ”جاؤ۔۔۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ دعا کوئی میرے نام کی جانے والی جائیداد نہیں ہے، جو تم یہ قربان کرو۔۔۔“
 زین نے سختی سے کہا تو وہ چٹھاڑنے لگا۔

”تم جانتے نہیں ہو زین مجھے۔ میں چھین لیتا ہوں۔ مجھ سے مت ٹکراؤ، کرچی کرچی ہو کے یوں بکھرو گے کہ ساری عمر بیٹھنے میں گزر جائے گی۔ یہ ریت کے گھروندے سمندر کی لہروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے زین ابتسام!“ وہ اس کے سامنے آ کے بولا۔
 اس کا انداز گفتگو ہمیشہ سے جارحانہ تھا۔ زین البتہ بہت محتاط رہتا تھا۔

ان کے درمیان زر کا مسئلہ تھا اور نہ زمین سا بٹھی تھی کہ ابانے سکندر اور زین کے حصے کی جائیداد ان کے نام کر دی تھی۔ اماں کو اعتراض تو ہوا مگر وہ کچھ نہ کر سکیں۔ وجود زن وجہ فرما دینے چلا تھا۔

”یہ کھٹیا پن کی انتہا ہے سکندر۔ میری اور اس کی شادی ہونے والی ہے۔“ یہ وہ واحد مقام تھا جہاں زین نے بھی ہتھیار اٹھا لیے تھے۔ حالانکہ وہ اس مزاج کا نہ تھا۔

”وہ بہت بڑی غلطی کر رہی ہے۔ تم میں سے ہی کیا پسند کیے جانے والا۔ ایک بزنس اور ڈرپوک شخص۔ دیکھ لیتا زین ابتسام! میں اس بار بھی تم سے وہ چھین لوں گا جو تمہیں چاہیے۔“ سکندر نے اس کی صلح جو فطرت کا تمسخر اڑایا۔

زین چپ چاپ وہاں سے نکل گیا سکندر کا قہقہہ دور تک اس کا پیچھا کرتا رہا۔

اور اگلے دن روتے ہوئے دعا اس کے پاس آئی اور اچانک ہی اس کے ساتھ آن لگی حالانکہ دونوں کے درمیان محبت ہونے کے باوجود ایک حد تھی۔

”دعا۔۔۔ تم ٹھیک تو ہونا۔ پلیز بتاؤ ہوا کیا ہے۔“ وہ گھبرا گیا۔

”زین! اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ پلیز مجھے لگتا ہے تم سب کچھ بھول گئے ہو۔ سکندر کی فطرت اس

سوتے ہی ماضی بھیا نک انداز میں سامنے آ جاتا تھا۔ ایک ایک جملہ ایک ایک مرحلہ ایک ایک لمحہ حساب لیتا تھا۔ ماضی۔ اے میرے ماضی۔ مجھے اپنی اذیت سے آزاد کر دے۔ میرا دامن چھوڑ دے۔ وہ چلاتا مگر بے سود۔



وہ بھی روایتی سی کہانی کا روایتی کردار تھا۔ سوتیلے رشتوں کی آگ میں جلتا رہا۔ وہ اس آگ کو بھڑکانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ کب تک اس آگ پر مانی ڈال ڈال کر بجھاتا۔ وہ تھا اس آگ کو نہیں بجھا سکتا تھا۔

سکندر ہمیشہ اس سے مقابلے پر رہتا تھا۔ سوتیلی ماں نے قدم قدم پر اپنا زہر پلا رنگ دکھا کر ثابت کر دیا کہ وہ زین کی سوتیلی ماں نہیں۔ جن کی وجہ سے اس کی اماں تربت تربت کر قبر میں اتر گئیں۔

زین نے ایک ایک دن اذیت میں کاٹا۔ کوئی من پسند چیز اس کے ہاتھ میں سکندر نہ رہنے دیتا۔ وہ اس کا جھکا سر دیکھ کر فالتحانہ انداز میں قمقمے لگاتا تو زین کا دل چاہتا کہ اہاں سے بھاگ جائے مگر کہاں۔ جان نہ پاتا۔ لیکن ارب کے وہ جو چھینتا چاہتا تھا وہ زین کی متاع حیات تھی۔ اس کے لیے اس نے لڑنے کا ارادہ کر لیا۔
 ”زین! میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ کچلے جاؤ گے۔“ سکندر بدگلائی سے اس کے سامنے آ کے بولا۔

زین حیرت سے اسے دیکھنے لگا اس نے کسی اور کی محبت میں خود دعا سے منگنی ختم کی تھی۔ لیکن یہ جاننے کے بعد کہ دعا اور زین ایک دوسرے سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں تو سکندر کے دل میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ جیسے زین نے جبراً ان دونوں کو جدا کیا ہو۔

دعا تو نجانے کب سے زین کی محبت میں گرفتار تھی، لیکن اس کے فیصلے کو دل سے تسلیم کرتے ہوئے سکندر کے لیے رضامندی دے دی تھی۔ اب جب رب نے ان دونوں کو نواز ہی دیا تھا تو کیسے منہ موڑ لیتے۔ لیکن

اماں نے سکھایا ہے۔ ”وہ جانتا تھا کہ ماں کے نام لیتے ہی وہ بھڑک اٹھتا تھا۔“

”انہوں نے مجھے جو سکھایا ہے، اسی وجہ سے میں اب تک تمہیں برداشت کر رہا ہوں۔“ زین نے دعا کا ہاتھ تھاما اور جلدی سے وہاں سے نکل گیا۔

”دعا پلیرز۔ خود کو سنبھالو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”تمہیں یقین ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ جانور ہے۔ وحشی درندہ ہے۔ یہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔

”اچھا میں تائی اماں سے بات کرتا ہوں تاکہ کم از کم نکاح پہلے ہو جائے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔“ زین نے کہا۔ تو وہ چیپ ہو گئی۔

اسی شام زین نے اقسام انیس سے تمام حالات گوش گزار کیے۔ وہ پریشان ہو گئے۔ حرکتیں تو وہ بھی اس کی دیکھ رہے تھے۔ انتہائی بد لحاظ اور بد تمیز ہو گیا تھا۔ ان سے بھی بد تمیزی کر جاتا۔

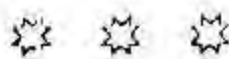
زین نے انہیں اس بات پر رضامند کر لیا کہ اس کے نوٹس میں لائے بغیر وہ دونوں نکاح کر لیں اور رخصتی کے بعد وہ دونوں ملک ہی چھوڑ جائیں گے۔ انہوں نے اسی وقت ہی امریکا، ان ملایا اور بھائی جان سے بات کی۔

خفیہ طور پر سب طے کیا گیا اور تین دنوں کے اندر ہی نکاح ہو گیا۔ بھائی جان نے آپ ہفتے کے اندر آنے کا وعدہ کیا۔

”ابو۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ آپ کی وجہ سے مجھے زندگی میں پہلی خوشی ملی ہے۔“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی باپ سے شکوہ کر ہی ڈالا۔

”بہت شرمندہ ہوں تم سے میرے بچے۔ مجھے معاف کر دو۔ میں۔ اپنی نالائقی کی سزا سکندر کی صورت بھگت رہا ہوں۔“ انہوں نے سر جھکا کر کہا۔

زین خاموش ہو گیا۔



کی کمینگی تمہیں کچھ یاد نہیں ہے۔“ اس کا نازک سا وجود زین کے بازوؤں میں ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔

”سکندر کو دیکھو۔ وہ کتنی ذالمت اتر آیا ہے۔“

”دعا۔ تم پلیرز اسے انور کر دیا کرو۔ اس کے منہ بالکل نہ لگنا کہنے دو اسے بکو اس۔ جلد ہی نکاح کر لوں گا۔ پلیرز اس وقت اس سے قطعاً مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کرنا میری خاطر۔“ اس نے سمجھانا چاہا۔

”زین! وہ بہت تنگ کرتا ہے۔“ اس کی بھیگی بھٹی گئی۔

”تھوڑی برداشت کا مظاہرہ کرو میری خاطر۔ ہم شادی کے فوراً بعد اسلام آباد شفٹ ہو جائیں گے۔“ وہ اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا۔

”اور کوشش کرنا کہ تمہارا اس سے سامنا نہ ہو، کیونکہ انسان انسانیت کی حدوں سے نکل جاتا ہے تو وہ انسان نہیں رہتا اور نہ ہی اس کے نزدیک رشتوں کی کوئی اہمیت رہتی ہے۔“

”تو پھر۔ کیا ہو گا زین؟“ آنکھوں میں اُمڑتے آنسوؤں کو رگڑتے ہوئے پوچھا۔

”ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔ چلو آؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔ اندھیرا ہونے والا ہے۔“ جو نہی وہ کمرے سے نکلے، سکندر نے راستہ روک لیا۔

”اوہ۔ آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔“ وہ دعا کے گرد چکر لگاتے ہوئے خباثت سے مسکرایا۔

”چلو دعا۔“ زین اسے لے کے آگے بڑھنے لگا تو پھر وہ سامنے آگیا۔ زین نے دعا کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ ڈر رہی تھی۔ وہ حریفانہ نظروں سے دعا کو دیکھنے لگا۔

”سکندر! تامل کرو کہ سنبھلنا مشکل ہو جائے۔“

”کتنی شرافت سے میں تم سے دعا کو مانگ رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو۔“ وہ بے عیثی کی آخری حدوں پر تھا۔

”تم بھائی کی خاطر اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے۔ بھائی پر ایک لڑکی کو ترجیح دے رہے ہو۔ کیا یہی تمہاری

اس پر نظر ڈالنے سے پہلے وہ اس رب کے سامنے جھک گیا، بس نے یوں نوازا تھا کہ پورا وجود ایک ترنگ میں آگیا تھا۔

وہ خواب آنکھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے اسے دیکھ رہا تھا۔ سرخ خوب صورت جوڑے میں وہ زین کے جذبول کی طرح دھب رہی تھی۔

عجب سرور کی سی کیفیت تھی۔ اتنی آسانی سے محبت مل گئی۔ زندگی اس قدر خوب صورت ہو گئی۔ جذبات سے بو بھل ہو کر زین نے اس کا ہاتھ تھاما ہی تھا کہ سرے کا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ باہر ایک شور سا جھج گیا تھا۔ زین گھبرا گیا۔ دعا فوراً بند سے اٹھی۔

”کون؟“ زین نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا تو سامنے سکندر کے ساتھ چہرے ڈھانے تین بندے تھے، جو اسے دھکا دیتے ہوئے اندر آگئے۔ زین کو سنبھالنے کا موقع ہی نہ مل سکا انہوں نے زین کو پکڑ لیا۔

”سکندر۔ رک جاف۔ سکندر خدا کے لیے۔ رک جاؤ۔“ زین دھاڑ رہا تھا مگر اتنی دیر میں شیطان اپنا کھیل کھیل چکے تھے۔

لکھواں میں سکندر نے تیزاب کی پوری بوتل دعا پہ اندھیل دیا تھی۔

”کہہ تھا تمہیں کہ یہ سرخ جوڑا نہیں پہنے گی۔ تم نہیں سمجھے میری بات۔ تمہاری وجہ سے اس کی زندگی گئی۔“

وہ اپنا مکروہ کھیل کھیل کر تیزی سے نکل گئے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ تڑپ رہی تھی۔

زین خود کو چھڑانے میں ناکام ہو گیا تو تڑپ تڑپ کر رونے لگا تھا۔

چھوٹی ماں بے ہوش ہو کر گر گئیں۔ اباجان یوں بے بسی سے بیٹھے تھے کہ جیسے فریاد کر رہے ہوں اللہ کے نام پر۔ میرا گھر۔ میرے بچے۔ میری دعا۔ اللہ اے اللہ۔

وہ شیطان اپنا کام کر کے بھاگ گئے تو زین دعا کو

بازوؤں میں اٹھا کر یا گلوں کی طرح اسپتال پہنچا مکروہ چلی گئی۔ کوئی بھی شکوہ نہ کیا۔ بغیر۔

ایک طوفان زین کی زندگی میں آیا اور ایک قیامت مائی اماں کے اوپر ٹوٹی تھی۔ اکلوتی اولاد کی موت قیامت سے کم تھی؟

زین جب چاہ دعا کو دیکھے جا رہا تھا۔ جس کا چہرہ تو سامنے نہ تھا مگر ایک سفید چادر میں اس کے ہونے کا احساس تھا۔

اس ظالم نے زین سے اس کی دعا کو آخر چھین ہی لیا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر گر گیا۔ چھوٹی ماں آگے بڑھیں تو اس نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ابو نے صرف بے بسی سے دیکھا۔ سب کچھ تو انہیں کالٹا تھا۔

اگلے دن پولیس نے مختلف جگہوں پر چھاپے مار کر سکندر کو ایک دوست کے گھر سے گرفتار کر لیا۔



وقت نے تو بہر حال گزرنا تھا۔ وہ کیا جانے کہ کس کا کیا کیا لٹ گیا تھا۔

طوفان آکر گزر گیا۔ پیچھے کیا بچا ہی ہوئی۔ کس کس کا جہان لٹ گیا۔ کون بین کر رہا تھا۔ کس کی ممتا تڑپ رہی تھی۔ دکھ درد۔ مایوسی۔ حزن و ملال اور اداسی کے اس کھیل میں وقت نے اپنی دوڑ لگائی ہوئی تھی۔ آنسو آنکھوں سے رواں تھے اور وقت اپنی رفتار کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

ایک۔ دو۔ تین۔ بار۔ چوبیس۔ اور پھر چالیسواں۔ دنیا والوں نے اپنی ساری رسومات ختم کر دیں۔

تایا جان نے اپنی واپسی کی فلائٹ بک کروالی۔ اس بار بھی وہ تنہا ہی جا رہے تھے۔ زین ان کی طرف آگیا۔

”تایا جان۔“ ان کی آواز کا بھیگا پن زین سے چھپا نہ رہا۔

”تایا جان! آپ واپس جا رہے ہیں؟“

”اب یہاں میرے لیے بچا ہی کیا ہے۔“ وہ ہارے

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت: 120/- روپے

سوہنی ہیرائل 12% بیوٹی بکس کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف 120/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے 400/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھجئے گئے ہمارا پتہ

بیوٹی بکس، 53-ا، نگر نیب مارکیٹ، سیکٹہ فور، ایم اے جناں روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات ہمیں ہیٹر آفل ان حکمرانوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53-ا، نگر نیب مارکیٹ، سیکٹہ فور، ایم اے جناں روڈ، کراچی

کتبہ بھران ڈاکسٹ، 37 اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 327.35021

ہوئے لہجے میں بولے۔
”تائی اماں بالکل تنہا ہو گئی ہیں۔ کیسے رہیں گی وہ اب۔ کیا وہ آپ کے ساتھ نہیں جاسکتیں۔؟“
”نہیں۔۔۔ جب تک اس احساس گناہ سے آزاد نہیں ہو جاتا کہ میری وجہ سے ایک آباد گھرا جڑا تھا۔ ایک معصوم دودھ پیتی بچی کو ماں کی ممتا سے میری وجہ سے دور ہونا پڑا۔“ وہ چلا اٹھے۔

”معاف نہیں کر سکتے کیا آپ۔۔۔ دکھ کی اس گھڑی میں ایک دوسرے کے دکھ کے ساٹھی بن جائیں۔ تکلیف کا احساس کم ہو جائے گا۔“

”نہیں زین۔ ہم دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے اس بات کا اندازہ مجھے دعا کی پیدائش کے کچھ دن پہلے ہی ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے دھوکا کھایا تھا۔ وہ جھوٹ کے ساتھ میری زندگی میں آئی تھی صرف دولت کی ہوس میں۔ ممتا جیسے جذبے کی تذلیل کر کے۔ میں نے اسے دولت دے دی۔ اس سے زیادہ کی نہ اس کی خواہش تھی اور نہ طلب۔ اگر مجھے پہلے علم ہو جاتا تو میں اولاد جیسی نعمت کبھی اس کی گود میں نہ ڈالتا۔ دیکھ لیا تم نے۔ کیا ہوا میری اولاد کا انجام۔ دیکھ تم نے۔ بد قسمت عورت۔ خود بھی نامراد رہی اور مجھے بھی بے سکون رکھا۔ کالے اب اس اذیت بھری زندگی کو۔“ وہ سختی سے بولے پھر وہ نہیں رکے۔

تیا جان۔ کے جانے کے بعد وہ ان کی طرف آیا تو وہ تنہا بیٹھی گھری سوچوں میں گم تھیں۔

”تائی اماں۔ بہت شرمندہ ہوں آپ سے۔ آپ کی بیٹی کی حفاظت، نہیں کر سکا۔ اس درندے کو پہچانتے ہوئے بھی اس کا اعتبار کر بیٹھا۔“ وہ ان کا ہاتھ تھام کر رو پڑا۔

”زن۔ میرے بچے۔ میرے رب نے۔ تو کیا جانے، گس پکار میں مجھے یہ سزا دی ہے۔ نہ تیرا قصور تھا۔ نہ میری بچی دعا کا۔ قصور وار تو صرف میں تھی۔ یہ میرا سزا ہے۔ اللہ تیرے زخم کا مداوا کرے۔ میرے زخموں کا کوئی مرہم نہیں ہے۔ میں

کے دکھوں کا؟“ وہ زخمی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔
 ”یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اگر آپ میں
 ہمت ہے تو اس ماں سے جاکر بھیک مانگیں، جس نے
 سہاگ کے جوڑے میں اپنی بیٹی کا جھلسا ہوا وجود دیکھا
 ہے۔ میں جانتا تھا کہ میں بہت کمزور انسان ہوں۔
 رشتوں کے جنگل میں پھنس کر کمزور پڑ جاؤں گا تو وہ کم
 از کم اپنی بیٹی کا مسخ چہرہ نہیں بھولیں گی۔“
 چھوٹی ماں مایوس لوٹ گئیں۔

وہ رات بہت بھاری تھی۔ وقت لمحہ لمحہ بھڑکتی آگ
 کی مانند اسے جھلسا جھلسا کر گزر رہا تھا۔ وہ رات بہت
 طویل تھی۔ گزر کے نہ دے رہی تھی۔
 اباجان۔۔۔ چھوٹی ماں اور زین ابسام پر قیامت کا
 وقت تھا۔

فجر کی اذان کی آواز کانوں میں گونجی تو چھوٹی ماں کے
 صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

ماں کی فریادیں آسمانوں کو چھونے لگیں۔ ان کی
 چیخیں زین کے دل میں لگ رہی تھیں۔
 زین بے چین ہو کر گھر سے نکل آیا۔

آنسو یوں رواں ہوئے کہ اسے لگا وہ ان میں بہہ
 جائے گا۔ کاش وہ بوڑھے، ماں باپ کو اس کھودینے کی
 اذیت سے بچا لیتا جس سے وہ گزرا تھا۔

بہت دیر بعد پتا نہیں کہاں کہاں گھوم کر وہ مردہ
 قدموں سے واپس آیا تو منظر اس کی توقع کے عین
 مطابق تھا۔

میت کے سامنے چھوٹی ماں رو رہی تھیں۔ سفید
 چادر میں لپٹا بے بس وجود دیکھ کر ایک لمحے کو اس کے
 قدم لڑکھڑا گئے۔

اباجان کی نظر زین پر پڑی تو لڑکھڑاتے ہوئے اس کی
 جانب بڑھے۔ مگر وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”جو کچھ ہوا وہ عین انصاف ہے مگر کیا کروں کہ میں
 اور بے چین ہو گیا ہوں۔ مجھ سے سکندر کا یہ روپ
 دیکھا نہیں جا رہا۔ میں۔۔۔ ایک دفعہ پھر میں ہی ہارا
 ہوں۔“ وہ وہیں میت کے پاس بیٹھ گئے۔

چھوٹی ماں کے بیڑا جاری تھے اس نے محسوس

نے خود اپنی دہانہ ٹھکرا دی تھی پھر کیسے توقع کرتی کہ رب
 پھر مجھے نو آزدے گا۔“

وہ کھوئی کھوئی بول رہی تھیں۔ دعا ان کی اکلوتی اولاد
 تھی۔ اس کی موت اور موت بھی ایسی کہ ایک زمانہ رو
 دے۔ ماں پرانی نہ ہوتی تو کیا ہوتی۔

ہرٹی وی چینل پر اس کی خبر چلی تھی۔ اعلا حکام نے
 بھی اس خبر کا نوٹس لے لیا تھا۔ اس کا مقدمہ سپیدی
 کورٹ میں چلائے جانے کا حکم تھا۔



زین کے اندر عجیب سی وحشت نے بسیرے ڈال
 دیے تھے۔ اباجان صدیوں کے مریض بن گئے۔ چھوٹی
 ماں اس سے نظرس نہیں ملاتی تھیں۔ وہ خود بھی فاصلے
 پر رہتا تھا۔ وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر دعا سے
 شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ وہ ہر تاریخ پر عدالت جاتا۔ ہر بار
 سکندر کا پیغام ملتا کہ ایک بار زین اس سے مل لے، مگر
 اب وہ اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ اب اس
 کے پاس کھونے کو کچھ نہ بچا تھا مگر دعا کی۔۔۔ موت کا
 وہ بدلہ ضرور لینا چاہتا تھا۔

چھ ماہ کے اندر مقدمہ اپنے انجام کو پہنچا اور سکندر کو
 سزائے موت کا حکم ہوا۔

اب اس کی زندگی کی آخری امید زین تھا۔ ہر طرف
 سے اس کی اپیل مسترد ہو چکی تھی۔ صدر نے بھی سزا
 کا حکم بحال رکھا۔ جس صبح اسے پھانسی ہوئی تھی۔ اس
 رات چھوٹی ماں جھولی پھیلائے اس کے سامنے
 آئیں۔

”زین۔۔۔ جھولی پھیلا کر تم سے اپنے بیٹے کی زندگی
 کی بھیک مانگنے آئی ہوں۔ میں جانتی ہوں اس کا جرم
 ناقابل معافی ہے مگر میں ماں ہوں۔ میرا دل کٹ رہا
 ہے۔ میرے کلیجے پر چھریاں چل رہی ہیں۔“

”وہ بھی تو ماں ہی تھی جس نے اپنی بیٹی کو کتنے
 ارمانوں کے ساتھ مسخ جوڑے میں رخصت کیا تھا۔
 اس کی اذیت کا اندازہ ہے آپ کو۔ کوئی ازالہ ہے اس

”زین سوری۔“ وہ رو رہی تھی۔

”تمہارے حق میں بہتر ہے کہ چپ رہو ورنہ میں یہیں گاڑی چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔“ وہ دہاڑا۔

سحر خاموش ہو گئی کہ اس سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ ایسا کر بھی گزرتا۔ وہ شرمندگی سے رو پڑی۔

”میں آخری دفعہ تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ تم پتھر سے سر پھوڑ رہی ہو۔ تمہاری کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔“ وہ پتھر لیے لہجے میں بولا۔

”کچھ احساس ہے تمہیں کہ تم کس کی محبت کو ٹھکرا رہے ہو۔ میں سیٹھ ار مغالی کی بیٹی۔ ان کی ساری جائیداد کی اکلوتی وارث۔ سب کچھ میرا ہے۔ اور میں۔“

”محترمہ! ایک بات یاد رکھیے گا تمہارے باپ کی بے پناہ دولت اور تمہاری یہ خوبصورتی میرے لیے بے وقعت ہے۔ میری زندگی میں دولت کی کبھی کمی نہیں رہی۔ تم نہیں جانتیں میں کون ہوں۔ سوائے کام سے کام رکھا کرو۔“ اس نے نہایت سرد مہری سے کہا۔

”زین۔“ سحر کی آواز گلے ہی میں گھٹ کے رہ گئی۔

”میں اس سے زیادہ نہ سمجھ کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی سننا چاہتا ہوں۔“ وہ ہاتھ اٹھا کے بولا اور جلدی سے گاڑی اشارت کر کے ریورس گینر میں ڈال دی۔

سحر اس کے بعد لب بھی نہ کھول سکی۔ ہوش اس کی آواز پہ آیا۔

”اتریں۔“ سر اٹھایا تو گاڑی گھر کے وسیع و عریض کارپورج میں کھڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے اسے اپنی حیثیت سے آگاہ کرنے والا گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

وہ مردہ قدموں سے اتری اور گھر کے اندر بڑھ گئی۔ وہ وہاں سے سیدھا سیٹھ ار مغالی کے آفس آگیا۔ گاڑی کی چابیاں ان کے سامنے میز پر رکھ دیں۔

”سر! میں ذہنی طور پر اس قابل نہیں کہ ڈرائیونگ کر سکوں۔“

کیا۔ وہ خود بھی رو رہا ہے۔

کیا فارغ ایسے ہوتے ہیں۔ بکھرے اور ٹوٹے ہوئے۔

زین جانتا تھا کہ اس نے کچھ بھی غلط نہیں کیا تھا مگر دل مضطرب، کاکیا کرتا۔ جواب بھی پرسکون نہیں تھا۔

سکندر اپنے ہاتھوں سے دفنایا تو کئی مواقعوں پر بولے جا، والے اس کے تلخ جملے کانوں میں گونجنے لگے۔

وہ تو غرور کی اونچی مسند پر بیٹھ کے اسے اپنے قدموں کی خاک کتا تھا آج خود ہی خاک کا ڈھیر بن گیا تھا۔

اس دشت کی سیاہی میں چھ ماہ گزر گئے۔ موبائل نمبر بدل لیا، اپنی حالت بدل لی، زندگی بدل لی تاکہ کوئی اسے نہ پہچان سکے۔ وہ اپنی شناخت سمیت کھو جائے۔

اچانک اسورت حال بدل گئی۔ وہ جو کسی کی محبت میں تڑپ رہا تھا، کوئی اس کی محبت میں تڑپنے لگا۔ اسے حیرت تھی کہ اس حلیہ میں بھی اس پر کسی کا دل آسکتا ہے۔

عام سا شہرین زدہ کئی بار کا دھلا ہوا لباس۔ کئی دنوں بعد یاد آتا تو ٹیوٹا لیتا ورنہ کوئی فکر بھی نہ ہوتی۔ سیٹھ ار مغالی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی جس کا وہ ڈرائیور تھا۔ اسے یونیورسٹی لاتا لے جاتا تھا۔ اس کے بدلے بدلے تیور وہ کئی دنوں سے محسوس کر رہا تھا۔ اب وہ صاف صاف اظہار برائت آئی تھی۔

”پلیز زین۔“ کیوں نہیں سمجھتے ہو تم۔“ سحر نے بے بسی سے اس پتھر کو دیکھتے ہوئے کیا۔

مگر زین اتنی پر سکون انداز میں ڈرائیونگ کرتا رہا جیسے ان دونوں کے علاوہ بھی گاڑی میں کوئی تیسرا موجود ہو جس سے آخر مخاطب ہو۔

”زین۔“ سحر کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اسے کندھے سے پکڑ کے جھنجھوڑ ڈالا۔ جھٹکا لگنے سے گاڑی لہرا کے، فٹ پاتھ سے جا ٹکرائی۔ سحر گھبرا گئی۔

زین نے جھٹکے سے سر گھما کر اسے دیکھا۔

”تم نے خود ہی آفس جاب سے انکار کیا تھا وگرنہ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ تم اپنے معیار کا کام کرو۔ تمہارے پاس اتنی ڈگریاں ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

زین خاموش رہا۔ سیٹھ صاحب جانتے تھے وہ آفس میں کام نہیں کرنا چاہتا وہ تقریباً ”روزہ“ اس سے اصرار کرتے تھے مگر نہیں کیوں وہ ٹال دیتا تھا۔ اب بھی سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اتنا ضرور وہ جانتے تھے کہ کوئی کرب ہے۔۔۔ جو اندر اندر ہی اسے کاٹا رہتا ہے۔

”زین۔۔۔ تم یہاں آفس میرے ساتھ آ جاؤ اور بی بی کے ساتھ میں اختر کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔“ کچھ دیر بعد سیٹھ ارمغانی نے دھیرے سے کہا تو اس نے مزید سر جھکا لیا گویا اسے ان کا یہ فیصلہ منظور تھا۔

لیکن اگلے دن جب اختر یونیورسٹی سے سحر کو لینے گیا تو غمتانی ہوئی باپ کے۔۔۔ آفس چلی آئی۔

”ار۔۔۔ بیٹا۔ کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اتنے غصے میں ہو۔“ انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

”ڈیڈ! مجھے اختر کے ساتھ یونیورسٹی نہیں آنا۔“ وہ اپنی بات برہنہ کر رہی۔

”بیٹا! زین اب راضی نہیں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی ڈیڈ! میری گاڑی زین ہی ڈرائیو کرے گا۔“

”اچھا تم بیٹھو۔ میں زین کو بلوا کے تمہارے سامنے ہی بات رتا ہوں۔“ انہوں نے انٹرکام پہ زین کو اندر بھیجنے کا کہا۔

زین کچھ دیر بعد اندر آیا۔ سیٹھ ارمغانی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”زین! سحر کی خواہش ہے کہ گاڑی تم ہی ڈرائیو کرو۔“

”سر! اپنی ذہنی حالت کے پیش نظر میں نہیں سمجھتا کہ میں یہ ذمہ داری اٹھایاؤں گا۔ پلیز۔۔۔“

”زین دراصل اختر نے ایک دو دفعہ گاڑی مار دی تھی۔ اسی لیے سحر ڈر رہی ہے اس کے ساتھ۔۔۔“

”سر! آپ کوئی نیا ڈرائیور رکھ دیں ان کے لیے۔“

زین نے بہترین مشورہ دیا۔

”ڈیڈ! ہر کسی پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔“ سحر نے کہا تو زین کا دل چاہا کہ اس کا سر توڑ دے۔

”ٹھیک ہے سر مگر ایک شرط پر۔“ وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

”وہ کیا ہے؟“ اس کی بات پر سحر کی دھڑکنوں کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔

”آپ سحر بی بی سے کہہ دیں کہ وہ گاڑی میں خاموش بیٹھیں گی۔ یہ بہت بولتی ہیں۔ میں ڈسٹرب ہوتا رہتا ہوں۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں سحر کی شکایت کر دی۔ سیٹھ ارمغانی کچھ نہ سمجھے مسکرا دیے مگر سحر اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر شرمندہ ہو گئی۔ کہنے کو تو زین نے کہہ دیا مگر اب اسے شرمندگی ہو رہی تھی۔ سحر کی شرمندگی دیکھ کر۔ اس نے سیٹھ ارمغانی کے ٹیبل سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں۔

گاڑی کی طرف بڑھا مگر سحر نے ”سوری زین“ کہہ کر چابی اختر کے حوالے کر دی۔

زین کو خوشی ہوئی کہ اسے سنبھلنے کا سلیقہ تھا۔

گاڑی گیٹ سے نکلی تو وہ مجھے دل سے اپنی سیٹ پر آ گیا۔



”انیس! مجھے امید ہے میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔“

اس سے معافی مانگے بنا تو مجھے موت بھی قبول نہیں۔“

چھوٹی ماں ایک۔ بیٹے کی موت اور دوسرے کی جدائی میں تڑپنے لگیں۔

”کتنا ظلم کیا میں نے زین کے ساتھ دعا کے ساتھ۔ کیا میرے لیے بخشش کا کوئی راستہ ہو گا۔“ وہ سوال کرتیں اور کوئی جواب نہ پاتیں۔ کیونکہ بہت سے سوالات کے جوابات ان کے اپنے اندر ہی مل جاتے تھے۔

”پتا ہے انیس! مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی جب سوتی ہوں یوں لگتا ہے جیسے تیزاب کی بارش میرے وجود پر برس رہی ہے۔ میں سو نہیں پاتی۔ مجھے بے

خوشیاں سنبھالی نہیں جاتیں۔ تم تو اتنی نازک سی ہو کہ ایک کانٹے کی چھین بھی نہ سہہ سہاؤ۔“ اس کی خاموشی کے باوجود وہ پوتا رہا کہ وہ جانتا تھا کہ اس سے تھوڑی زیادتی ہو گئی تھی۔

”سحر! میں نے کسی کو بہت شدت سے چلایا تھا۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں کہ وہ میرے لیے کیا تھی۔ تم بہت اچھی ہو مگر مجھے اب کسی اور کی تمنا نہیں رہی۔“ اس نے اپنی خوبصورت آنکھوں کو بے رحمی سے رگڑ ڈالا کہ آنسو اس کے دل کی کیفیت کا بھرم نہ توڑ ڈالیں۔

”میں آج بھی اس کی محبت کو اپنے وجود کا حکمران پاتا ہوں۔ اس کی محبت نے مجھے سکھایا ہے کہ کسی کو تکلیف دینا محبت کرنے والوں کو زیب نہیں دیتا۔ اسی لیے مجھے تمہیں ہرٹ کر کے افسوس ہو رہا ہے۔“ وہ چپ رہی۔ کافی دیر خاموشی رہی۔

”سحر۔“ زین نے چونک کر بیک دیو مرر میں دیکھا۔ پھر اس کے ہوش گم ہو گئے۔ وہ پچھلی سیٹ پر بے ہوش پڑی تھی۔

”اومائے گاؤ۔“ وہ گھبرا گیا۔ اس نے سائیڈ میں گاڑی روکی اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کے اسے پکارنے لگا۔ اس کے گال تپتے پھرتے۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو قریبی اسپتال لے آیا۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور ایک ٹیسٹ لکھ کر دیا۔ یہاں تک سب ٹھیک تھا مگر اچانک ڈاکٹر نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

”فکر کی کوئی بات نہیں آپ کی مسز بالکل ٹھیک ہیں۔ ان فیکٹ شی از بریڈمنٹ۔“ ڈاکٹر صاحبہ مسکراتے ہوئے بتا کے چلی گئیں۔ زین کی حالت ابتر ہو گئی۔

”تو یہ تھی اپنے باپ کے غریب ملازم کو پٹانے کی وجہ سے۔“ اس نے غرا کر کہا۔

”زین۔“ اس نے بمشکل آواز نکالی۔

”باس۔“ اس نے ہاتھ اٹھائے اسے کچھ بھی بولنے سے روکا۔ سحر کی تورور ہی تھرا اٹھی۔

خوابی کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ میں یوں ہی سسک سسک کر رہی رہی ہوں۔ میں تڑپ تڑپ کر مرنا چاہتی ہوں جیسے دعاؤں کے تکلیف سہی۔ جو میرے لیے سکندر کی پھانسی کے پھندے سے کئی گنا زیادہ اذیت ناک ہے۔ لیکن ایک بار زین مل جائے تو۔۔۔ ہلکی سی امید ہے کہ شاید۔۔۔ وہ مجھے معاف کر دے۔“

انیس ابقسام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مغرب کی نماز کو چل دیے۔ واپسی میں وہ زبردستی بھابھی کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر ان کی کوششوں سے پہلی دفعہ بھائی جان نے بھابھی سے فون پر بات کی۔

”میں نے آپ سے دھوکا کیا۔ مجھے معاف کر دیں۔“ وہ رو پڑیں۔

”میں نے بہت سے لوگوں کی زندگی برباد کی۔ آپ کی اپنی اور اس شخص کی جس نے میرے سہارے کھڑا ہونا چاہا۔ اپنی اولاد کو جو عورت پھینک آئے۔ اس کی زندگی میں مسرتوں کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو مجھے میری بے عاقبتی نہیں ہونی۔“

”ایک دفعہ اپنی بیٹی کے پاس ضرور جانا معافی مانگنے۔“ ان کا اتنا کہنا تھا کہ سسکیاں روکنا ناممکن ہو گئیں۔

”میں آپ کی اجازت کی منتظر تھی۔“

”اجازت ہے۔“ اور رابطہ ٹوٹ گیا۔

”سحر آئی ایم سوری۔۔۔“ گاڑی سیدھے روڈ پر ڈالتے ہوئے، اس نے بیک دیو مرر سے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی۔ آج آخر چھٹی پر گیا تو۔۔۔ سیٹھ ار مغانی میٹنگ میں تھے۔ انہوں نے اپنے پی اے کے ذریعے کسی کو سحر کو پک کرنے کا پیغام بھیجا تو زین نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور خود لینے چلا گیا۔

سحر نے جبر سے اسے دیکھا۔

”سحر! یقین کرو کہ میں بہت چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا انسان ہوں۔ مجھ سے اپنے ساتھ چلنے والے لوگوں کی

سامنے ہوں۔ وہ میری اکلوتی اولاد ہے۔“ وہ سر جھکا کے بولے تو زین کو لگا کہ جیسے کسی شکاری نے جال پھینک دیا ہو۔

”یہ ممکن نہیں ہے سہ۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے فوراً انکار کیا۔

”کیا تمہیں کوئی اور پسند ہے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ میں کسی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں اب کوئی رشتہ نہ بنا سکتا ہوں اور نہ نبھا سکتا ہوں۔“ اس نے ہر بات صاف صاف بتائی۔

”سحر بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمہیں بھی سنبھال لے گی۔“

”جو خود کو نہ سنبھال سکے، وہ بھلا کسی کو کیا سنبھالے گا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی بیان پھسل گئی۔

”کیا مطلب ہے؟“ وہ ابھی۔

”میرا مطلب ہے میں خود کو اگر نہیں سنبھال پارہا تو اور کیسے کسی کو سنبھال سکتا ہوں۔“ اس نے فوراً بات بنائی۔

”فیصلہ کرنے میں کچھ وقت لے لو میٹا۔ اور فیصلہ کرنے سے پہلے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ بھی سن لو۔“ وہ خاموش رہا۔

”میں بھی تمہاری طرح بہت تنہا تھا زین اور آج تک ہوں۔ مجھے میرے علاقے سے صرف اس لیے نکال دیا گیا کہ میں نے اپنی مرضی سے شادی کر لی تھی۔

میں بہت پرہیزگار نہیں تھا۔ صرف بی۔ اے کیا ہوا تھا۔ اور میری بیوی ایم۔ اے انگلش تھی۔ اس کی خاطر سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ سارا خاندان چھٹ گیا۔ پنچایت

نے میرے خاندان کو علاقہ بدر ہونے کا حکم دیا۔ مگر میرے باپ نے اپنا آبائی گاؤں اور گھر چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ میں بھی جوالی کے نشے میں چور تھا۔ محبت کا نشہ بھی سرچڑھ کی بول رہا تھا، سو اپنے بوڑھے

والدین اور ایک بہن کو چھوڑ کر اکیلا ہی اپنی پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ شہر آیا۔ وہ ایک اچھے پرائیویٹ

”تم سو۔ نے کچھ منہ میں لے کے سدا ہو کس۔“ خوبصورت ہوا۔ تم نے بار بار بتانے کی کوشش کی۔ کسی اور کو بھی بتایا ہو گا اور وصول بھی کیا۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔“ وہ ڈاکٹر کی رپورٹ والا لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔

”تم تو بہری سوچ سے بھی بڑی چیز نکلیں۔ کمال بازی کھیلنی جا ہی میرے ساتھ تم نے۔ واہ داد دینی پڑے گی مجھے تمہاری ذہانت کی۔“ وہ تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔

”زین، رپورٹ صحیح نہیں ہے۔“ اس نے بولنے کے لیے بمشکل خود کو جمع کیا۔

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنا گر سکتی ہو۔ بہر حال اب اٹھو۔ گھر جانا ہے۔“ وہ کہہ کے باہر نکل گیا۔

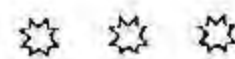
وہ بمشکل اٹھی اور باہر تک آئی۔ دماغ بری طرح چکرارہا تھا۔ وہ کاؤنٹر پہ مل ادا کر کے پلٹا تو آگے برہہ کے اسے تھا کہ وہ گرنے ہی والی تھی۔ انسانیت اور ارد گرد کے لوگوں کی نظروں کی وجہ سے بھی اسے تھما نپڑا۔

”زین پلیز۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ یقیناً ان سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔“ راستے میں اس نے ایک بار پھر بولنے کی کوشش کی۔

”پلیز پپ ہو جاؤ۔ مگر اتنا ضرور سوچو کہ تمہارے باپ کی عزت نیلام ہو جائے گی۔ اسے کچھ لوگ اس شہر میں پہچانتے ہیں۔“ زین اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔ لفظ چہا چہا کے بولا۔

گاڑی جب پورچ میں رکی تو سیٹھ ار مغانی نے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے سحر اور زین کو آتے دیکھا۔ ایک خیال ان کے ذہن میں کوندا۔

”اگر سحر کو زین اچھا لگتا ہے تو واقعی وہ اچھا بھی ہے۔ کیا برائی ہے اگر وہ سحر کا سا بھی بن جائے۔ سحر میری اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔ لیکن کیا وہ مان بھی جائے گا۔“ یہ سوال انہیں الجھن میں ڈال گیا۔



”زین! میں اپنی بیٹی کی خواہش کے لیے تمہارے

کی شخصیت کی عمارت زمین بوس ہو گئی۔ کتنے ماں اور بھروسے کے ساتھ وہ اس شخص کے ساتھ بات کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی ایک شریف اور باکردار لڑکی ہے اور اس کی تربیت انہوں نے کی ہے۔ شرمندگی سے سر جھک گیا۔

نظریں تک ملنا محال ہو گیا۔ وہ سینہ مسلتے ہوئے ادھر ادھر بے چینی سے پھرنے لگے۔

”سر! آپ سحر سے پوچھ دیجیے اس آدمی کا نام۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔“ زین نے ان کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔

”زین! میں نے اگر اس کی پسند پر سر جھکا لیا تھا تو اللہ اور رسول کے نزدیک اس کی مرضی کو اس کا حق سمجھ کے مگر میں اتنا بے غیرت تو نہیں ہوں کہ اس کی رسوائی کو گلے لگا لوں گا۔ تم پوچھ لو اس سے اس شخص کا نام اور رخصت کرو اس کے ساتھ۔“ انہوں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”سر! ہوش سے کام لیں۔“

”ہوش سے۔ ہوش سے۔ کام لوں۔ میں۔ جس نے تمام عمر بیوی کی بے وفائی پر آنسو ضبط کیے رکھے کہ میرے سامنے سحر بھی جینے کی آس۔ اس نے یہ صلہ دیا۔ میری تمام عمر کی ریاضتوں کا یہ صلہ دیا اس نے۔ میں زندہ نہیں چھوٹوں گا اسے۔ مار دوں گا اسے۔“ وہ دیوانوں کی طرح اس کے کمرے کی طرف بڑھے۔ زین نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

”میں اسے جان سے مار دوں گا۔ اسے زندہ دفن کروں گا۔“ وہ دوبارہ اٹھے مگر پھر ٹوٹ کر بیٹھ گئے۔

”سینے سے شرابو ہو رہے تھے۔ دل پر بھاری بوجھ پڑا تو طبیعت بگڑنے لگی۔“

”سر! پلیز خود کو سنبھال لیں۔“

”کیسے سنبھالوں خود کو۔ کتنا تماشا لگے گا۔ کیا یہ بات چھپ سکتی ہے۔“ وہ سینے کو بری طرح مسلنے لگے۔

”ماتھے پر سینے کے قطرے، نمودار ہوتے دیکھ کر زین

ادارے میں نوکری کرنے لگی۔ میں آگے بڑھنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ مجھے پتا ہی نہ چلا کہ اس نے راستے بدل لیے۔ اسے ایک دولت مند شخص مل گیا۔ اس نے مڑنے کے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس سے کیا کیا چھٹ گیا۔ بچی۔ میں۔ جس نے اس کی خاطر سب کچھ ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب تنہا ہوا تو ماں باپ کی طرف بھاگا۔ وہاں ہبا کے پتا چلا کہ وہ تو میرے بعد قبر میں اتر گئے۔ آج میرے پاس دولت ہے لیکن میں خالی ہاتھ ہوں۔“ وہ چند لمحوں کے لیے رکے۔

زین نے دکھ سے انہیں دیکھا۔

”میں صرف اس انتظار میں ہوں کہ میں سحر کو محفوظ ہاتھوں میں دے دوں۔“ وہ آس بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔

”سر! اس کے لیے آپ کو ایک مضبوط شخص ہی ڈھونڈنا چاہیے۔ میں تو بہت کمزور سا انسان ہوں۔“ وہ زنج ہوا۔

”میں نے ہر ممکن طریقے سے اپنی بیٹی کی اچھی تربیت کی ہے۔ پھر بھی وہ کی رہی جاتی ہے جو ایک سال کی تربیت میں ہوتی ہے۔ وہ مجھ سے قریب ہے مگر پھر بھی فاصلہ ہے۔ میں جانتا ہوں۔“ انہوں نے اقرار کیا۔

”آئی ایم سوری سر۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”زین! وہ ایک شریف اور باکردار لڑکی ہے بیٹا۔ اس کے نزدیک یہ دولت اور آسائشیں سب ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔“ وہ بول رہے تھے اور پردے کے پیچھے کھڑی ستر کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔

”سر! آپ اپنی بیٹی کو مس جج کر رہے ہیں۔“ سحر کے پسینے چھوٹ گئے۔

”کک۔ کیا مطلب۔“

”مطلب۔ آپ اسی سے پوچھیں گا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”زین! کھل کے بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم۔“

اس نے ڈاکٹر کی رپورٹس انہیں تھما دیں۔ وہ بڑھ کے نہ کوئی طوفان آیا تھا اور نہ زلزلہ لیکن سیٹھ ارمغانی

نے ایک لمبے کی تاخیر نہ کی اور انہیں اسپتال لے گیا۔
”مکاسا انجانا کا انیک ہے۔“ ڈاکٹر نے بتایا تو سحر کی
سکی نکلی۔ وہ نہ چلتے ہوئے بھی اپنے ڈیڈ کے لیے
تکلیف کا باعث بن گئی تھی۔



رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب چھوٹی ماں کی
آنکھ کھل گئی۔ انہیں سکندر کا جیل کا وہ مکھن وقت اور
وہ درود کر رہے دعا میں مانگتا۔ اس کی آواز کا وہ درود
جوان کا دل کاٹتا تھا۔ سنائی دینے لگیں۔

”اماں! زین سے کہیں۔ ایک دفعہ آکر مجھ سے مل
لے۔ مجھے معاف کر دے۔ بس ایک بار۔ آخری بار
۔ اعتبار کر لے۔ معاف کر دے۔ بس آخری بار“
سلاخوں کے اس پار وہ تڑپ رہا تھا اور ماں بے بس
تھی۔

”میں اپنے مقام سے گرا ہوں۔ انسانیت کو رسوا
کیا۔ اسی لیے تو سجدے میں گرا ہوں۔ گڑ گڑا رہا
ہوں۔ معاف کر دے۔ بخش دے۔ رحم
کر دے۔ کہ تیرے پاس تو طاقت ہے۔ تو تو عالی
مقام ہے۔ مجھ ناچیز کا گناہ بخش دے یا مجھے پل صراط
پر چلا کر میں یا ڈوب جاؤں یا پار لگ جاؤں۔ میرے
رب۔ مجھ سے یہ دودھاری تلوار کی اذیت نہیں سہی
جاری یا تو راضی ہو جا یا اسے منانے کے لیے کوئی
راستہ دکھا دے۔ مجھے اشارہ دے میرے رب۔ مجھے
راہ دکھا۔ مجھے اس اذیت سے نکال۔ مجھے بخش
دے۔“ وہ روتے ہوئے سجدے میں گر گیا تھا۔

”دعا سے کہو اماں۔ اس کی قبر پر لے کر چلو۔ اس
سے کہو۔ وہ بھی معاف کر دے۔ یا اللہ میں کس کس
کا گناہ گار ہوں مجھے بچالے یا اللہ اماں زین۔“

وہ چیختے چیختے نڈھال ہو جاتا تھا۔ عارفہ بیگم اس کی
دیوانوں والی حالت پر روتیں۔ تڑپتیں۔ زین سے
ہاتھ جوڑ جوڑ کر کہتیں کہ ایک دفعہ جا کر اس سے مل لو
۔ مگر وہ نہ ملا۔ نہ معاف کیا۔

وہ بھنا معاف کرتا بھی تو کیوں۔ سزاوار کو اپنے کیے

کا خمیازہ تو بھگتنا پڑتا ہے۔ اللہ نے بھی ہاتھ کے بدلے
ہاتھ، آنکھ کے بدلے آنکھ۔ جان کے بدلے جان کہا
ہے۔ وہ دشمن بن کر بھلے بچھ بھی کر جاتا مگر بھائی کے
روپ میں اس نے جو کیا، وہ ناقابل معافی ہے۔ زین
صاف انکاری ہو گیا تھا۔

وہ انھیں اور وضو کر کے سکندر کی بے چین روح
کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ نفل تہجد وظیفے۔



”زین! یہ دیکھو میرے جڑے ہاتھ۔ میری
کھوکھلی عزت کا پاس رکھ لے۔ میں مر جاؤں گا۔ میری
نام نہاد عزت کا بھرم رکھ لو۔ میں پہلے اس کی ماں کے
ہاتھوں رسوا ہوا اور اب بیٹی نے مجھے جینے کے قاتل
نہیں چھوڑا۔ نجانے کیوں مجھے لگتا ہے تم میرا مان رکھ
لو گے۔“ سیٹھ ار مغالی اسپتال سے واپس آئے تو اس
کے آگے بے بسی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

”زین ایک بے بس اور مجبور باپ تمہارے آگے
اپنی عزت کی خاطر ہاتھ جوڑتا ہے۔“ انہوں نے
حقیقتاً اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

”زین! صرف نکاح کر لو۔ بھلے ساری زندگی میرے
گھر پر بیٹھی رہے۔ میری عزت بچا لو زین۔ اس مجبور
باپ کی عزت رکھ لو۔ جو سب کچھ کھو کے بنائی ہے۔
اچھے تھے وہ لوگ جو پیدا ہوتے ہی ان جیسیوں کو
دفن کر دیتے تھے۔“ ان کی بے بسی زین سے برداشت
نہ ہو سکی۔

”سر ٹھیک ہے۔ میں سحر سے شادی کے لیے تیار
ہوں۔ شاید اسی طرح۔“ وہ نجانے کیا بولنے چلا تھا کہ
دروازے میں کھڑی سحر لرزتی آواز نے اسے ہوش
دلا دیا۔

”نہیں۔ ڈیڈ۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔
ورنہ میں خود کو مار دوں گی مگر۔“ وہ ہلکی نقاہت زدہ آواز
میں بول رہی تھی۔

”یکو اس بند کر۔ ایک گناہ دنیا میں کر لیا اور موت
بھی ایسی ہی چننا چاہتی ہو جو حرام ہو۔“ سیٹھ ار مغالی

دونوں کے درمیان ایک بار پھر آگئی۔ دماغی طور پر دونوں اپنے اپنے عملوں پر برسرِ پیکار تھے۔ وہ دھیرے سے اٹھا اور اسے دونوں کندھوں سے تھام لیا، لیکن وہ اپنی کیفیت سے باہر نہ آسکی۔

”سحری۔ سوری۔ مجھے تمہارا پردہ رکھنا چاہیے تھا۔ سیٹھ صاحب سے شیئر نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ زین نے کہا تو وہ سوچ کے دائرے سے باہر نکلی۔ آنکھیں کھول کے زین کو دیکھا۔

اس کی گرفت سے خود کو نکال کے انتہائی سرد مہری سے بولی۔

”آپ نے کیا غلط کیا۔ ایک سچی بات ہی تو بتائی ڈیڈ کو۔“

”کبھی نہ مگرنا کوئی کمال نہیں ہوتا بلکہ مگر کے سنبھل جانا کمال ہوتا ہے، اور مجھے یقین ہے تم سنبھل جاؤ گی۔“ زین کے الفاظ گولی کی طرح اس کے وجود میں پیوست ہو گئے۔

”تو کیا مجھے ایک دفعہ کرنا ہو گا اپنا کمال دکھانے کے لیے۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

”اور نہیں۔ جتنا مگرنا تھا گر چکی ہو۔ کافی ہے۔“ زین کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط قائم رکھا۔

”اللہ آپ کو اس نہیں کے بدلے بہت بڑا اجر دے گا۔ آپ نے جہاں اتنا لیا ہے ایک درخواست اور مان لیں۔“

”اپنے بیان پر قائم رہیے گا۔ اس رشتے کو نکاح تک ہی محدود رکھیے گا۔“

”بے فکر رہو۔ تم میرے گھر میں رہتے ہوئے بھی مجھے محسوس نہیں کروں۔ اس رشتے کا ایک ہی مقصد تھا جو تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اس کے بعد خود کو آزاد کروالینا۔“ وہ چلا گیا۔

نیرس پہ سگریٹ پہ سگریٹ پیتے زین کو دیکھ کر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ زین نے اس کی گمرانی پہ ایک آدمی کو لگا دیا جو فلیٹ

نے انتہائی غصے سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی کہ ڈیڈ کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ مزید کوئی بات کرتی۔

”سر!۔ ماویٰ سے نکاح کر دیں۔ میں تیار ہوں۔“ زین نے سر جھٹکا کے صرف اتنا کہا۔

”زین! تم ہر بار میری زندگی میں فرشتہ بن کے آئے ہو۔ ایک بار میری زندگی اور اس بار میری عزت بچا رہے ہو۔ میں تمہارے احسانات کا حق کیسے ادا کر پاؤں گا۔“

”سر! احسانات کسے بے کاری زندگی ہے۔ چلیں کسی کے کام تو آگئی۔“ وہ تلخی سے بولا اور کمرے سے نکل گئے۔

سحر بالکل چپ تھی۔ لبوں کو سی لیا تھا۔ جس کو پانے کے لیے ایوانی ہوئی جا رہی تھی۔ اب جب مل رہا تھا تو ارمانوں نے کفن اوڑھ لیا تھا۔

کچھ آرمی لوگوں کی موجودگی میں وہ زین کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ اس نے سفید رنگ کا خوب صورت لباس پہنا تھا۔ نکاح کے بعد اسے زین کے ساتھ بٹھایا گیا تو سحر کی دوستوں نے اپنی سی کوشش کر کے وہاں شادی کا ماحول کر ڈالا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی زین کی نظریں اس کی کلاسیوں میں پڑی سلور اور سفید چوڑیوں کی اداسی بھری کھنک میں الجھ رہی تھیں۔

وہ کمرے میں آیا تو وہ یک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ وہ بیڈ کے کنارے رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔ دونوں کی نظریں جھکی تھیں۔ مکمل خاموشی۔ گہرا سکوت۔

”تمہیں سب بھول جاؤ۔ جو بھی ہوا۔ وہ تمہارا اور تمہارے اللہ کا معاملہ ہے۔ میں بھی ایک بہت گنہگار سا شخص ہوں۔ پتا نہیں اس رشتے کو نبھانا بھی پاؤں گا کہ نہیں۔ سحر آئی ایم سوری۔ میں صرف یہ رشتہ کاغذ کی حد تک باندھ رہا ہوں۔ امید ہے تم سمجھو اور اس مسئلے سے فارغ ہو کے اگر الگ ہونا چاہو تو بھی مجھے منظور ہو گا۔“ وہ پتھر کا بت بنی رہی۔

”مجھ سے زیادہ کس نے بے گناہی کی سزا سہی ہوگی۔“ وہ لمبی ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔

”اس کا بدلہ پھر آپ نے مجھ سے لے لیا۔“
”مجھے عادت نہیں ہے بدلہ لینے کی۔ میں نے ہمیشہ ہار مانی ہے۔ اب بھی چاہتا ہوں کہ تم بھی سب بھول کر اپنا خیال رکھو۔“

”اپنا خیال رکھوں کس کے لیے؟ کسی کو میری ضرورت نہیں ہے حتیٰ کہ میرے باپ کو بھی نہیں۔“
”تھوڑی سی بھی اگر شرم ہے تمہارے اندر۔ اپنے گناہ پر نادم ہو تو مزید گناہ کے راستے پر نہ بڑھو۔“
زین کو اس کی ڈھشائی پر آگ اُلک گئی۔

”نہیں ہے میرے اندر تھوڑی سی بھی شرم۔ بچ دی ہے میں نے۔“ وہ چلائی تو زین کا مضبوط مردانہ ہاتھ اس کے چوہہ طبق روشن کر گیا۔ وہ چکر اکر رہ گئی۔ کمرے میں سحر کی آنکھوں سے پر سات جاری تھی اور باہر اس کے وجود میں آگ لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ اپنی دعا کی قبر پر بیٹھ کر زندگی گزار دے۔ باور بن جائے اور وہیں موت اس پر مہربان ہو جائے۔ وہ بہت تھک گیا تھا۔

کے ارد گرد ہی رہتا تھا۔ زین کو ڈر تھا کہ وہ بچے کو کوئی تکلیف نہ پہنچا دے۔ دن گزرتے جا رہے تھے وہ اس فلیٹ میں قید ہو کے رہ گئی اس نے کبھی باہر جانے کی ضد نہ کی۔ وہ خود ہی اسے سیٹھ اور مغالی سے ملوانے لے جاتا۔



زین کبھی کبھی خود سے لڑلڑکے تھک جاتا تھا تو سارا غصہ سحر پر ہی اتارتا۔ کچھ ایسا کہ جاتا جو سحر کے جسم کو آری سے کاٹ ڈالتا۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

ملازمہ اسے اکثر بتاتی کہ وہ بہت ہی کم کھانا کھاتی ہے۔ دودھ وغیرہ بھی نہیں لیتی تھی۔
ملازمہ نے ہی اطلاع دی کہ بی بی کی طبیعت خراب رہنے لگی ہے۔ پیٹ میں بہت زیادہ درد ہوتا ہے۔ وہ بہت گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔

اس وقت بھی اس کے اندر طوفان پھا تھا۔ تباہی مچی تھی۔ اٹھا اور اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ بستر پہ

لیٹی تھی۔ زین کو آتے دیکھا تو جلدی سے سیدھی ہو کے بیٹھی اور چادر اپنے گرد لپیٹی۔

”صبح تیار رہنا۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا ہے۔“

”مجھے کسی کو نہیں دکھانا۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔

”تب دکھا دیا تھا جب اسے چھپانے کا وقت تھا۔ اب تو بے خوف ہو کر جانا چاہیے کہ اس بچے پر کوئی انگلی نہیں اٹھائے گا۔“

”میں تب بھی خود نہیں گئی تھی۔“
”کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم کہ تم پر ظلم ہوا ہے۔“

”جہاں آنکھیں دیکھتے ہوئے بھی لوگ مایینا اور کان سنتے ہوئے بھی ہرے ہو جائیں جہاں رشتوں کو بے اعتباری کی نذر کر دیا جائے وہاں کوئی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کیسے سزا سے بچ سکتا ہے۔“

سستی بلا لکڑی



شرہ بخاری

قیمت - 300/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی - فون نمبر: 32735021

گھبرائے لگا۔ اس کے اندر کا غبار برہا تو وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

اس وقت بھی وہ درد کی شدت سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔

”سحری کیا ہوا ہے تمہیں۔ اومائی گاڈ۔“ وہ اسے گاڑی تک لایا اور اسپتال پہنچایا۔

ڈاکٹر زین نے مکمل چیک اپ کے بعد ٹیسٹ لکھ کے دیے۔

ڈاکٹر زین نے رپورٹس اسے تھمائیں اور بتایا کہ کم خوراک سے پیٹ میں درد ہے۔ اس نے خود

ریگننسی کا کہا تو ڈاکٹر نے اس سے انکار کیا کہ ایسی کوئی بات ہے۔

”لیکن ڈاکٹر صاحب۔“ زین کی آواز پھٹ گئی۔ ایک آسمان ٹوٹا تھا۔ کڑکتی ہوئی بجلیاں زین کو بھلا

گئیں۔ یہ سب کیا ہوا ہے۔ وہ الجھن میں پھنس گیا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا کہ کہیں اس نے بچہ مار تو

نہیں ڈالا۔

”کیا کیا ہے تم نے بچے کے ساتھ۔؟“ اگلے دن وہ اس کے سر پر کھڑا تھا۔

”کیا تم نے بچے کو۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”لیکن تمہاری اسپتال کی رپورٹ۔ جب تمہیں اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ بولے اور ایسے پوچھے۔“

”ار! کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کے بولی تو

زین پریشان ہو گیا۔

”کب لیں تم تو بالکل پہلے جیسی ہی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ۔“ وہ اس کی ظاہری اور جسمانی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تو وہ افسردگی سے

مسکرا دی۔

”ڈاکٹر نے تمہارے سارے ٹیسٹ کیے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔“

”دوبارہ معلوم کریں۔“

”ڈاکٹر کو چھوڑو۔ تم بتاؤ مجھے۔“

”ڈاکٹر کو کیسے چھوڑوں۔ رہی میری گواہی تو اس کا کیا اعتبار۔ تب نہیں مانی گئی تو اب کیوں۔ اب

صرف انتظار کریں اس وقت کا آپ بھی اور میں بھی۔ جب میری گود میں بچہ آئے گا۔“

زین نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

”دیکھو سحری۔ مجھے مزید دست الجھاؤ۔ میں بہت ٹوٹا ہوا انسان ہوں۔ مجھے سچ بتاؤ کیا یہ کوئی غلط فہمی

تھی۔“

”غلط فہمی۔ زین۔ کیا یہ لفظ مناسب ہو گا۔ کسی کی عزت و وقار انا گردار اعتبار۔ سب داؤ پہ لگ گیا اور آپ پڑے میں ایک لفظ غلط فہمی کو رکھنا چاہ رہے ہیں۔“

”تو کیا یہ۔“ سحر کو اس کی آواز کا کھوکھلا پن صاف سنائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی ہو جانے والے حادثے کی واضح تحریر بڑھی جاسکتی تھی۔

”جی۔ ایسا کچھ اس وقت بھی نہیں تھا زین! جب آپ نے میرے باپ کے سامنے مجھے ذلیل کیا تھا۔ مجھ پر میرے بے داغ کردار پر تہمت لگائی تھی۔ میں آپ کو معاف نہیں کروں گا۔ نہ آپ کو اور نہ سینٹھ

ار مغانی کو۔ کیا حق تھا آپ دونوں کو مجھے بے عزت کرنے کا۔“ وہ چلانے لگی۔

”تمہارے سامنے ہی تو اس اسپتال میں ڈاکٹر نے یہ سب کہا تھا۔“ زین نے اسے کندھوں سے تھامنا چاہا تو وہ جھٹکے سے اس سے دور ہوئی۔

”اسی اسپتال سے ایک دن بعد فون بھی آگیا تھا‘ معذرت کا کہ انہوں نے غلطی سے سائہ ٹائی لڑکی کی رپورٹ مجھے دے دی تھی۔“

”سحری۔“ اس نے سخت بے بسی سے اسے پکارا۔

”اگلے ہی دن میں نے شہر کے چار اسپتالوں سے ٹیسٹ کروائے تھے زین۔ یہ لیس۔ میں جانتی تھی کہ مجھے ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ وہ پانکھوں کی

طرح اپنے بگ کی جانب دوڑی اور زپ کھول کے اندر سے فائل نکالی اور پتھر بنے زین کے سامنے میز پر رکھ دی۔

”یہ دیکھیں وہ رپورٹ جو آپ نے وصول کی تھی۔ پڑھیں اس پر لکھا نام۔“

”تم نے بتایا کیوں نہیں۔“ زین نے فائل کی طرف دیکھے بناٹھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

”کیونکہ کسی نے مجھے بتانے کا موقع ہی نہیں دیا اور نہ ہی پوچھا۔ بس سزا سادی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی اور چہرہ دوسری جانب موڑ لیا۔

”آئی ایم سوری سحر۔ آئی ایم ریلی ویری سوری۔“ زین کے وجود میں یک دم ایک ہلچل سی مچ گئی۔ اسے لگا ایک دفعہ پھر اس کی دعا تیزاب سے جل رہی ہو مگر اب کی بار زین کا وجود آزاد تھا۔ کسی کے ہاتھوں کے شکنجے میں نہیں تھا۔ اس بار اس نے جلایا تھا کسی سکندر نے نہیں۔

وہ دونوں آمنے سامنے تھے دونوں جل رہے تھے۔ دونوں ہی۔ وہ بے اعتباری کی آگ میں اور وہ ندامت کی آگ میں۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اپنا قول نہ بھولے گا۔ وہ زیادہ ہو گا۔“ وہ اسے کیا یاد دلانا چاہ رہی تھی۔

”کیا مطلب۔ کلب کون سا قول۔“ اس کا دل کانپا کہ وہ یک دم بہت اجنبی سی بن گئی تھی۔

”آپ نے کہا تھا کہ جوں ہی میں بچے سے فارغ ہو جاؤں گی اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکوں گی۔ اب میں فارغ ہو گئی ہوں۔ کیا میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہوں؟“

”سحر۔ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ آئی ایم سو سوری۔“ وہ بے تحاشا شرمندہ تھا۔

”اب شرمندہ ہونے سے کوئی فائدہ ہے نہ نقصان۔ بس مجھے آزاد کر دیں۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔ امید ہے آپ کو اعتراض نہیں ہو گا۔“ وہ کھڑکی سے

باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

”معاف نہیں کر سکتی ہو۔“

”میں فیصلہ کر چکی ہوں۔“

”سحر! میری بات سنو۔ میں واقعی شرمندہ ہوں۔“

”آپ نے کہا تھا کہ آپ اپنے قول سے نہیں پھرتے۔“ وہ چیخ گئی۔

”تم بھی جس محبت کی دعوے داری کر رہی تھیں، اس سے پیچھے ہٹ رہی ہو۔“

”ایک عزت بچانے کے لیے معاہدہ کیا گیا تھا اور اب اس معاہدے کی مدت ختم ہو گئی ہے۔“ وہ چیخ پڑی۔

”پاگل مت بنو سحر۔ میں مانتا ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی نا انصافی ہوئی ہے تمہارے ساتھ، لیکن اس کی سزا خود کو دینا عقل مندی تو نہیں، میں نے غلطی کی، میں سزا سننے کو بھی تیار ہوں۔“

”مجھے کسی کو کوئی سزا نہیں سنانی۔ بس میرا فیصلہ کر دیں۔“ وہ کمرے میں چلی گئی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ خیال آنے پر وہ دوبارہ اس کے کمرے میں گیا تو وہ نہیں تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح سیٹھ ار مغالی کے پاس پہنچا۔ حسب توقع وہ وہیں تھی۔ اس کا سانس بحال ہوا۔

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے زین۔ میں اس کی ماں کے کیے کی سزا اے سنا بیٹھا۔ اسے موقع

ہی نہیں دیا، کیوں اتنا بے رحم ہو گیا تھا میں۔“ اب وہ موقع دینے کو تیار نہیں تھی۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ اس کے ساتھ نہیں رہنا۔ وہ اس کے کمرے کا دروازہ بجاتا رہا مگر وہ نہ کھلا۔

زین ایک دفعہ پھر ہارا تھا۔ ایک اور مات مقدر ہوئی۔ اب کے اس میں کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔

اس بار وہ اپنے ہی ہاتھوں ہارا تھا اور اس باریوں ٹوٹا کہ دوبارہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں تھی۔

وہ کچھ سننے اور ماننے کو تیار نہ تھی یہاں تک کہ سیٹھ ار مغالی کی بھی۔

رات بستر بر آئی تو نظروں کے سامنے زین کی تصویر گھوم گئی۔ اسنے ظالم لگتے تو نہیں تھے تم۔ پھر کیوں زین۔ کیا یہ محبت کا بدلہ تھا۔ شرمندگی بھرے چند جملے۔ ندامت۔ اور تھوڑی سی مزاحمت کہ سحر مت جاؤ اور پھر یہ کہہ کے راستے سے ہٹ جانا کہ میرے مقدر میں صرف ہارنا ہی لکھا ہے۔ سب کچھ تو میری مرضی پر چھوڑ دیا ہے زین۔ تو پھر میں نے محبت کی۔ جنگ لڑی اور جیت بھی لی۔ یہ میرا دعوا ہے۔ جھٹکا کر دکھاؤ۔ اب لیکن میری ضد ہے کہ باقی کی جنگ تم لڑو۔ دریاہ دامن کے ساتھ اب بھی میں ہی قدم برہاؤں کیا۔ یہ زیادتی نہیں ہے میرے ساتھ زین۔ ایک دفعہ زین۔ صرف ایک دفعہ مجھے اذن سفر تو دو۔ میں تو کسب سے تیار ہوں۔ میرا اسباب سفر تو میرا محبت بھرا مال ہے جس کو صرف تمہاری تمنا ہے۔ وہ روٹی رہی۔ سلکتی رہی۔ تڑپتی رہی۔



وہ تینوں سیٹھ ار مغانی کے محل نما گھر آ گئے۔ سیٹھ ار مغانی انہیں دیکھ کر پتھر کے بت بن گئے۔ "زینت۔! ان کا سر جھکا رہا۔" "یہ تلخ اور کڑوی حقیقت ہے کہ تم میرے سامنے کھڑی ہو۔" وہ تلخی سے گویا ہوئے۔ "تم تو سب کچھ مجھ سمیت جہنم میں جھونک گئی تھیں۔ پھر آج میری دلہن تک کیسے آنا ہوا۔ کیا یہ دیکھنے

کہ اس آگ میں جلے وجود کیسے زندگی گزار رہے ہیں تو دیکھو۔ یہ ہے وہ بچی جس کو تم پھینک کر چلی گئی تھیں۔ اس کے کردار پر وہ داغ لگا جو جرم اس نے نہیں کیا اور تم کتنی گنہگار تھیں مگر سزا سے زندگی گزار رہی ہو۔ تم نے تو کوئی سزا نہیں سہی سزا تو میں اور میری بیٹی سہا رہے ہیں۔" سیٹھ ار مغانی گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھے۔ انیس اقسام نے زینت بی بی کے پھر وجود کو تقام

رکھا تھا۔ عارفہ بیگم آگے بڑھیں اور سحر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر صوفے تک لے آئیں جہاں زینت بی بی سر جھکائے آنسو بہا رہی تھیں۔ ماں اور بیٹی ملیں تو آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ "میری بچی۔ مجھے معاف کر دو۔ اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دو۔" انہوں نے اسے خود سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ بالکل خاموش تھی۔ "سحر بچی۔ کچھ تو بولو۔" زینت بی بی نے اس کے پتھر وجود کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ ہنوز خاموش رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلی گئی۔

وہ کیسے اس عورت کو قبول کر لیتی جو اسے اور اس کے ڈیڈ کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ وہ مایوس ہو کر چلی گئیں تو ڈیڈ اس کی طرف آ گئے۔ "سحر وہ تمہاری ماں ہے۔ مت ٹھکراؤ اسے۔ معاف کر دو۔"

"ڈیڈ! پلیز مجھے مجبور نہ کریں۔" اس نے چہرہ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "بیٹا۔ سب اللہ پر بھروسہ کرو۔ وہ بہت کرب سے گزر رہی ہوگی۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ ممتا کبھی نہیں مرتی۔" "ڈیڈ! میں آپ سے کرب کا اندازہ بھی کر سکتی ہوں۔"

"سحر! میاں بیوی کا رشتہ دنیاوی رشتہ ہوتا ہے۔ توڑا جاسکتا تھا، سو اس نے توڑ دیا، لیکن تم سے جو رشتہ ہے وہ نہ تم توڑ سکتی ہو اور نہ وہ۔ خونی رشتہ ہے تمہارے اور اس کے درمیان۔" "رشتے جذلوں سے پروان چڑھتے ہیں ڈیڈ۔ اور ان جذلوں کو انہوں نے اپنے پناؤں تلے روند دیا ہے۔" "تمہاری جنت ان ہی قدموں کے نیچے ہے۔ بستر ہوگا

کرو۔“ عارفہ بیگم نے روتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

”میں نے کبھی بھی آپ کو گنہگار نہیں سمجھا اماں۔ سکندر نے جو کچھ کیا اس کے ساتھ مٹی ہو گیا۔ آپ کیوں اس کی وجہ سے شرمسار ہو رہی ہیں۔“ زین نے ان کے جڑے ہاتھ تھام لیے۔

”میں نے ہر لمحہ خود کو تمہارے لیے تڑپتے دیکھا ہے زین بیٹا۔ میں نے سکندر کی موت کو دل سے قبول کر لیا ہے، مگر تمہاری جا الٹی میرے دل کے لیے ناقابل قبول ہے۔ وہ گھر تمہاری آمد کا خطرہ ہے اور میں نے تمہیں ساتھ لے کر ہی جانا ہے۔ مجھے یقین ہے تم میرا مان نہیں توڑو گے۔“ وہ بے بند تھیں۔

”اماں۔“

”زین! میں تمہاری اذیت کا اندازہ کر سکتی ہوں۔ سکندر سے مجھے محبت تھی، مگر اس کی درد بھری موت کی اذیت میں اپنے دل میں تنسوس کرتی ہوں، اس کا دکھ مجھے کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ میری عمر بھر کی پونجی تھا سکندر۔ لٹ گئی، لیکن جو خزانہ اب میرے ہاتھ لگا ہے تمہاری محبت کی صورت، وہ انمول ہے۔ اب اسے میں لٹنے نہیں دوں گی۔“ وہ آنسو بھری آواز میں بولیں۔

زین نے نظریں جھکا لیں۔ وہ جانتا تھا کہ ان کو اس عمر میں جدائی کی اذیت دینا مٹا سب نہ تھا۔

زین نے ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمولیا۔ پھر تو وہ ان کے ساتھ لگ کر اتنا رویا کہ خود ان دونوں کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ان دونوں نے اللہ کے بعد فمد کا ڈھیروں شکر ادا کیا کہ جس کی بدولت وہ زین تک پہنچ پائے تھے۔ فمد نہ منت لی بی کے بھائی کا بیٹا تھا اور پولیس ڈپارٹمنٹ میں تھا۔



”کہیں سکون نہیں ملا تائی اماں! اس لیے لوٹ آیا ہوں۔“ تائی اماں کے گلے لگتے ہوئے اس نے اپنی ہار تسلیم کر لی۔

کہ تم سب کچھ بھول کر اس کے دکھ میں شریک ہو جاؤ۔“

”ڈیڈ۔“ وہ ان سے لگ کر رو دی۔ دونوں کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔



ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک۔ دروازہ بجا تو وہ بمشکل اٹھا اور دروازہ کھولا، مگر سامنے چھوٹی ماں اور نحیف اور کمزور سے کڑے ابا جان کو دیکھ کر ساکت ہو گیا۔

”آپ۔“ زین نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں تھام لیا۔

”زین میرے بچے۔ ہمیں ضرورت ہے تمہارے سہارے کی۔“ وہ پیلے پڑے زین کے چہرے کو دیکھ کر تڑپ گئے، جو پچھلے تین دن کے بخار کی وجہ سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔

”مگر مجھے تو خود ضرورت ہے سہارے کی ابا جان۔ کیسے سہارا بن سکتا ہوں میں کسی کا۔“

”ہم اتنے عرصے سے دیوانوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہیں تمہیں۔“ انیس ابسام اس کے ساتھ لگ کر بولے۔

”میں نے سب کو معاف کر دیا ہے۔ پلیز آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔ آزاد چھوڑ دیں مجھے۔ مجھے میری

زندگی جینے دیں۔ میں یہاں بہت سکون میں ہوں۔ زندگی میری خواہش کے عین مطابق ہے۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اگر تمہیں ہمارے ساتھ رہنا منظور نہیں تو اپنی تائی اماں کا سہارا بن جاؤ۔“

”تائی اماں۔“ وہ حیران ہوا۔

”بھابھی بہت تنہا ہو گئی ہیں۔ بیٹی مل تو گئی ہے، مگر معاف کرنے کو تیار نہیں۔ انہیں کچھ نہیں ملانہ زندگی سے اور نہ رشتوں سے۔“ چھوٹی ماں نے کہا تو زین نے سر جھکا لیا۔

”زین! مجھے معاف کرو۔ اپنی گنہگار ماں کو معاف

جو بہتے دریا پر چلا جائے تو وہ بھی خشک ہو جائے۔“ وہ خود سے مایوس تھا۔

”اب صرف چند قدموں پر خوشی تمہاری منتظر ہے جان۔ اب ان شاء اللہ یہ کالی رات کٹ جائے گی۔“ وہ اس کا ہاتھ چومتے ہوئے بولیں۔

”تو اسے منالے میرے بچے! اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”نہیں مانتی تائی اماں۔ بہت کوشش کی ہے۔“ وہ ہار مانے بیٹھا تھا۔ ”میں اسے واپس لاؤں گی۔“ وہ بولیں۔

”کبھی نہیں آئے گی۔“ اس نے مایوسی سے سر نفی میں ہلایا۔

”نہیں زین! عورت کا دل بہت نرم ہوتا ہے۔ وہ جس سے محبت کرتی ہے اس سے ضد تو لگا سکتی ہے مگر اس سے جدا ہونے کا تھوڑا بھی نہیں کرتی۔“ تائی اماں نے کہا تو وہ سر ہلا کر مسکرا دیا۔

”بتا ہے زین! میں سوچ رہی تھی کہ ایک دفعہ پھر تمہیں آزمائش میں ڈالوں گی۔ اپنی دوسری بیٹی کے لیے تمہارے آگے جھولی پھیلاؤں گی۔ مگر۔“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”تائی اماں! کیا اس کی شادی نہیں ہوئی ابھی۔“ زین نے پوچھا۔

”نہیں۔ تب ہی تو اپنے گھر میں تھی۔“

”اللہ بہتر کرے گا۔ اللہ نے ہر ایک کے حصے کی خوشیاں رکھی ہوتی ہیں۔ بس وقت کا انتظار صبر سے کرنا چاہیے۔“

”بے شک ایسا ہی ہے اور ان شاء اللہ تمہارے حصے کی خوشیاں بھی بہت جلد تمہارے دامن میں ہوں گی۔“ وہ دعا میں دیئے لگیں تو اس نے آمین کہا۔

کمرے میں آیا تو بے چینی سے سگریٹ پر سگریٹ پینے لگا۔ پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

”ہیلو۔ سحر۔“ بے تابی سے پکارا۔

”جی بول رہی ہوں۔“ دھیمی سی آواز کانوں میں

”زین! تیرے ساتھ تیرے ماں باپ کی دعائیں تھیں۔ تو خوش قسمت ہے میرے لال۔“ اسے اپنے

کنزور سے بازوؤں میں چھپا کے وہ کتنی دیر روتی رہیں۔

”تائی اماں! خوش قسمت میرے جیسے ہوتے ہیں کیا۔ جو ساری زندگی ادھورے رہتے ہیں جن کی

جھولی میں صرف ناکامیاں ہوتی ہیں۔“ وہ اپنے خالی ہاتھوں پر نظریں جمائے مایوسی سے بولا۔

”نہیں میرے بچے! ایسے نہیں کہتے۔ وہ رب کسی کو اس کی ہمت اور طاقت سے زیادہ نہیں آزماتا۔

اس نے تیرے حصے کی خوشیاں اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں۔“ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولیں۔

وہ اداسی سے مسکرا دیا۔

وہ تائی اماں کو اپنے ساتھ لے آیا تھا اب تنہا نہیں تھیں۔ اباجان نے زین کو بتایا کہ انہوں نے تائی اماں کے پہلے شوہر سے رابطہ کر لیا۔ ہے اور اب ان کی بیٹی

بھی جلد ہی مان جائے گی۔

”تائی اماں! ایک اقرار کرنا چاہتا ہوں۔“ سرجھکا کر بات کرنے کی ہمت کی۔ کئی دفعہ ہمت باندھتا کہ تائی

اماں کو اپنی شادی کے متعلق بتائے۔ پھر چپ رہ جاتا۔

”بووا میرے بچے۔“

”میں نے دعا کی محبت سے بے وفائی کی ہے۔ کسی اور سے شادی کر لی ہے۔“ تائی اماں کے دل کو دھچکا تو

لگا، مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

”یہ بے وفائی نہیں ہے اللہ کی رضا میں راضی ہونا ہے۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ کیا سب جانتے ہیں۔

بھائی جان اور بھابھی۔“

”صرف آپ کو بتا رہا ہوں۔“ اس نے وہ بارت جو اپنے ماں باپ سے بھی چھپا رکھی تھی۔ انہیں اپنے اوپر بیٹنے والی ساری اذیت بتا دی۔

”اوہ۔“

”تائی اماں! میری نہ کوئی دعا قبول ہوئی اور نہ میرے مقدر میں کوئی چمک دار سحر ہے۔ میں وہ سیاہ بخت ہوں

ہے کہ آپ کی بیٹیاں بہت بد قسمت ہیں۔“
انہیں اقسام اور عارفہ بیگم نے دونوں ماں بیٹی کو تنہا
چھوڑ دیا۔

اس وقت زین کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا
تو ابا جان نے بتایا کہ تمہاری مائی ماں کی بیٹی آئی ہوئی
ہے۔ مل لو۔ وہ ان کی طرف آیا تو دروازے میں ہی کھڑا
رہ گیا۔ اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے سحر کو
وہاں دیکھ کر۔ سحر مائی ماں کی بیٹی۔

دعاے سحر۔ زین کو یاد آیا۔ یہی نام نکاح کے دن
مولوی صاحب نے لیا تھا۔

”آفس بیٹا! باہر کیوں کھڑے ہو۔ آؤ میں تمہیں
اپنی بیٹی سے ملواؤں۔“ مائی ماں کا نظر اس پر پڑی تو
منکراتے ہوئے اسے پکارا۔

”دعا! یہ میرا بیٹا۔ زین۔“ مائی ماں کے کہنے پر وہ
مڑی اور پتھر کی بن گئی۔
”آپ کا بیٹا۔“

”سحر۔“ زین نے بے یقینی سے اسے پکارا۔
”زین۔ تم جانتے ہو سحر کو۔ تو کیا یہ ہی وہ
سحر۔ وی۔“ وہ بھی الجھ گئیں۔

”جی مائی ماں! یہ سحر ہے میری بیوی۔“ زین نے
جھٹ اقرار کیا۔

مائی ماں کا چہرہ خوشی سے تھما اٹھا۔ ان کے چہرے
کے خوشی کے رنگ دیکھ کر سحر کچھ بول بھی نہ سکی۔

”ایک منٹ۔ میں اپنے بچوں کے لیے شکرانے
کے نفل ادا کر آؤں۔“ مائی ماں جن بوجھ کر درمیان
سے ہٹ گئیں کہ دونوں کے درمیان موجود برف کی

دیوار ان کے ایک اور رشتے کی نوید بن کر پکھل جائے۔
وہ سر جھکائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ چہرے پر بھرپور
سنجیدگی تھی۔ زین نے اس کا ہاتھ تھاما، مگر وہ مکمل بے
نیاز تھی۔

”معاف کرو۔ پلیز۔ میری جھبلی میں یہ سوچ کر
خوشیاں ڈال دو کہ تم میرے دل کی خوشی ہو۔ میری
زندگی کی ایک مدھم سی امید۔ بہت غلط کیا تمہارے

گو نجی۔

”میں جانتا ہوں میرے جرم کو معاف کرنا آسان
نہیں، مگر تمہیں مجھ سے محبت بھی تو ہے۔ یا وہ بھی
میری سیاہ بختی۔ ہار گئی ہے۔“

وہ خاموش رہی۔ آنسو دامن کو بھگوتے رہے۔
”سحر۔ پلیز۔“

”زین! میرے مقدر میں تو ماں کا ہی پیار نہیں تھا
اور کسی کا کیا ملتا؟ میں نے تسلیم کر لیا ہے کہ آپ میرا
مقدر نہیں ہیں۔ زبردستی میں آپ کی زندگی میں
داخل نہیں ہو سکتا۔“

”کیا تم ہی چاہتی ہو کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے۔“

”میں کیا چاہتی ہوں اس بات کو چھوڑیں۔ جو آپ
چاہتے ہیں وہ کریں۔ میرے ساتھ آج تک جو کچھ ہوا
کیا وہ میں نے چاہا تھا۔“ اس نے روتے ہوئے فون بند
کر دیا۔



”سحر۔ مجھے معاف کرو میں بہک گئی تھی۔ نفس
کی غلام ہو گئی تھی میں نے محبت اعتبار رشتے۔ سب
کو رسوا کیا، لیکن ممتا کی تڑپ قدم قدم پر میرے ساتھ
رہی۔ میں نے اپنی بچی کا نام تمہارے نام پر رکھا اپنے
شرمندہ متا کے جذبے کی تسکین کے لیے، لیکن مجھے
سزا مل گئی جس رشتے کی قدر نہ کر سکی وہ پھر بھی مجھے
نصیب نہ ہوا۔“ وہ بے بسی سے رو رہی تھیں۔ سحر
سینٹھ ارمغانی کے اصرار پر ان سے ملنے بالآخر آہی گئی
تھی اور اب ان کے ساتھ لگ کر آنسو بہائے جاری
تھی۔

کتنا بڑا درد ان کے نام ہوا تھا۔ ان کی ممتا کی تڑپ
سب کو جھلسا رہی تھی۔ کچھ درد ایسے ہوتے ہیں جن کا
کوئی درماں نہیں ہوتا۔ کچھ زخم تمام عمر مندمل نہیں
ہو پاتے۔

”سکون تو آپ کی اس بیٹی کو بھی نصیب نہیں ہوا۔
تقدیر نے قدم قدم پر وہ چوٹ لگائی کہ یہ تسلیم کرنا پڑ رہا

لگے گا سیٹ ہونے میں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
وہ مسکرایا۔

”میری جان۔۔۔ میری زندگی کی ایک ہی خواہش باقی ہے کہ میں اپنے بیٹے کے چہرے پہ سکون اور بھرپور خوشی دیکھ سکوں۔ بہت دھک ملے ہیں تمہیں۔ اب ایک ہی صورت میں سکون میں پاسکوں گا جب اپنے بیٹے کی زندگی میں خوشیاں دیکھوں گا۔“ ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”بہت پیاری بچی ہے۔ مجھے اس میں دوسری دعا کا چہرہ نظر آیا ہے اور وہ تمہاری مائی اماں کی بھی دل کی تمنا ہے۔ ان کا سکون ہے، جو ان کی دعا کے ساتھ ہی کھو گیا تھا۔“

زین نے مسکرا کر ان کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

”جاؤ میری بیٹی کو اس کے گھر چھوڑ کر آؤ۔“ انہوں نے سحر کو اپنی ماں سے ملنے بھیجا تھا اور وہ زین کے ساتھ لوٹ رہی تھی۔ جب ساری بات ان کے گوش گزار کی گئی تو انہوں نے زین کو گلے لگا لیا۔

سکون کی ایک لہر نے ان کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا۔



اگلے دن سب، مائی اماں سمیت اسے لینے پہنچ گئے۔ اماں نے اس کے لیے جلدی جلدی جو ہوسکا خرید ڈالا۔ سیٹھ ارغوانی کے چہرے پر خوشی تھی۔

”سیٹھ صاحب، ہم سحر کو اپنی بیٹی بنا کر لے جا رہے ہیں۔۔۔ خواب میں بھی آپ اسے یاد کریں گے تو ہم اسے آپ کے پاس بھیج دیں گے۔“ چھوٹی ماں سحر کو پیار کرتے ہوئے بولیں۔

سیٹھ ارغوانی نم آنکھوں سے مسکرا دیے۔

وہ رات اپنے دامن میں ستاروں کی بارات لے کر آئی تھی۔ ہر طرف روشنی تھی۔ محبتوں کی بارش نے دونوں کے وجود کو بھگودیا۔ عجیب سا سرور تھا۔ نشہ

ساتھ۔۔۔ دراصل میرے ساتھ کبھی اچھا ہوا ہی نہیں جو میں کسی کے ساتھ اچھا کرتا۔“

”زین۔۔۔“ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس سے لگ کر روئی چلی گئی۔ خود زین کے آنسو اس کے بالوں میں گر رہے تھے۔

”بہت برا کیا ہے آپ نے میرے ساتھ۔۔۔ بہت برا۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”سحر! جرم ناقابل معافی ہو تو الفاظ لبوں پر نہیں آتے۔ اسی لیے تم سے معافی مانگنے کے بجائے اپنے رب کے سامنے گڑگڑاتا رہا ہوں۔ یقین جانو میں نے اولاداً وہ سب نہیں کیا تھا۔“ وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”اللہ کو منالینا آسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو معاف بھی کر دیتا ہے۔ لیکن زین! بندوں کے درمیان حساب کتاب بہر حال بندوں کے درمیان ہی ہوتا ہے میرا اور آپ کا حساب کتاب ابھی باقی ہے۔“ وہ نظریں ملائے بنا بولی۔

”ہر حساب کتاب کے لیے تیار ہوں۔ بہت ندامت اور شرمندگی ہے میرے دامن میں۔ بتا حساب لیے تو مجھے بھی سکون نہیں ملے گا۔“

”زین میں بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ رو پڑی۔ زین نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیر اور مضبوط کر ڈالا۔ مائی اماں نے اندر آنے سے پہلے گلا صاف کر کے اپنے آنے کا اشارہ دیا۔ وہ جلدی سے الگ ہوئی۔ ان کے شاداب چہرے مائی اماں کے دل کا گلشن مرکا گئے۔ فوراً ان دونوں پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکی۔ ڈھیروں دعائیں دیں۔

زین اسے ابا جان اور چھوٹی ماں کی طرف لے آیا۔ ”زین بیٹا۔ اللہ نے بہت کرم کر دیا ہے۔“ ایا زین کو گاہ لگا کر بولے۔

”اب وقت ضائع مت کرو۔ اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرو۔“

”ابا۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ بس تھوڑا وقت

پیارے بچوں کے لئے

قصص الانبياء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل
ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ
اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ حضرت محمد ﷺ
کا شجرہ مفت حاصل کریں۔

قیمت - 300 روپے

بذریعہ ذات منکوانے پر ڈاک خرچ - 50 روپے

بذریعہ ذات منکوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

تھا۔ محسوسات اور جذبات کی عجیب سی دنیا تھی کہ
قدم بہکنے لگے تھے۔

محبت کی پناہوں میں بیٹھی نیند آئی۔ اذان کی آواز پر
وہ اٹھا تو سحر بند پر نہیں تھی۔

یہ سوچ کر کہ وہ اماں ابا کی طرف گئی ہوگی۔ زین نماز
کے بعد سیدھا وہاں پہنچا، جہاں اس کے قدم پہنچ کے
لڑکھرائے۔ اس منی کے ڈھیر پہ کوئی اس سے پہلے ہی
ہاتھ اٹھائے، ہتھیلیوں کو آنسوؤں کی برسات سے بھگو
رہا تھا۔ کون تھا۔ وہ الجھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور اس سائے کے سامنے
آن کھڑا ہوا مگر دعائیں مگن وجود نے اس کی جانب ایک
نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا۔ زین کی سائیس رکنے لگی
تھیں۔

”سحر تم یہاں۔۔۔“ زین نے حیرت سے دو قدم آگے
بڑھتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتی۔ زین کو کندھے پر
دیاؤ محسوس ہوا تو وہ پلٹا۔ چھوٹی ماں اس کے سامنے
تھیں۔ رویا رویا چہرہ۔
”اسے میں لالی تھی۔“

زین کی حفاظت میں سحر کو دے کر وہ پلٹ گئیں۔
”آپ کو برا تو نہیں لگا میں آپ سے اجازت کے
بغیر گھر سے نکلی۔“ سحر نے پوچھا تو زین نے اسے
کندھوں سے تھام لیا۔

”سحر۔ میری آدمی زندگی اس مٹی کے ڈھیر کے
نیچے اور آدمی تمہاری پناہوں میں ہے۔ نہ اس سے
ناراض ہو سکتا تھا۔ نہ کبھی تم سے۔ میری تو اب یہی
دعا ہے کہ تم خوش رہو۔“

زین نے مسکرا کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور جذب دل
سے دعا مانگنے لگا۔

اور دعائیں تو یوں ہی منظور ہوتی ہیں۔ اس کے
لیے صرف رب کو درکھٹکانا پڑتا ہے۔ بے شک
نوازنے والی ذات ایک ہی ہے۔ آزمائش تو وہ اپنے
محبوب بندوں کے نہیب میں ہی لکھتا ہے۔



لوٹنے کا کوئی ذکر کیا تھا اور نہ ہی لوٹنے کا کوئی ارادہ تھا۔ وہ پہلا دن تھا۔ ننازیہ امی کو کھانے کی ٹرے دینے آئی تو اسے دیکھ کر منہ بنا کے چل دی۔ پھر وہ خود ہی سمجھ گئی کہ اب چھٹی۔ وہ چھوٹے بھائی تیریز کی بیوی تھی جو گھر کی اوپری منزل پر رہتا۔ اس کی تاکید تھی کہ امی کو کھانا وقت پر دینا مگر جب وہ نہ ہوتا تو خیر امی اس کی دست نگر بھی نہ تھیں۔ اب ان کے لیے بہت کچھ پھوڑ کر گزرے تھے۔ تابندہ آتی تو خود ہی امی کا چولہا چوکی سنبھال لیتی۔ ورنہ سوکھے منہ بیٹھی رہتی۔ تیریز آتا تو رسمی حال احوال لے کر کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ مانو دونوں میاں بیوی نے اپنی دنیا الگ بنا رکھی تھی۔ عرصہ ہوا تھا تیریز کو گھر اور گھر کے معاملات سے لاتعلقی اختیار کیے ہوئے۔ بڑا بھائی فیملی سمیت دینی میں مصمم تھا۔ چھوٹی رخشندہ خالہ کے گھر بیاہ کر اسلام آباد گئی تھی۔ امی سے وہ ہر ممکن دامن بچاتی رہتی تھی۔

”مگر تابہ۔۔۔“ بات ان پر کھل ہی گئی۔ تب ہی گھنٹہ بھر اسے بیٹھ کر سمجھایا۔ زندگی دھوپ چھاؤں کا نام ہے اور یہ کہ وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ آج نہیں تو کل نور کو اچھی نوکری مل ہی جائے گی۔ مگر امی سے کچھ بھی کہنا سننا بے کار تھا۔ انہوں نے کبھی اس کی بات سنی تھی نہ سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ تابندہ کیسے کہتی کہ حالات کی تنگی اور ذلت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ الماس کے مزارع کے سبب اس کا ایک ایک پل وہاں پہاڑ بن کے گزرتا ہے۔ اس پر مستزاد تنویر کی مجرمانہ خاموشی۔ وہ آٹھ سالوں سے حالات بدلنے ہی کی تو

تابندہ نے جلدی جلدی وال میں بگھار دکھایا اور دوسری پتیلی میں کڑکڑاتے گرم مسالے اور تیزبخت میں ہیکے ہوئے چاول جھونک کر پانی بر بھایا۔ دیکھی میں چمچ چلاتے ہوئے اس کے گداز خوب صورت باتوں کی سرخ چوٹیاں چھن چھن بج رہی تھیں۔ قریب کھڑی اس کی سات سالہ بیٹی عرشہ نے حسرت سے اک نظر اسے دیکھا تھا۔ اس نے تابندہ کی شادی کی تصاویر دیکھی تھیں۔ آٹھ سال پہلے وہ کتنی من مہنی کوئل سی ہوا کرتی تھی۔ مگر اب جیسے نئی حالات کی دھوپ نے اس کا رنگ و روپ کھلادیا تھا۔ وجود پر سر تپایا سیت کا بسیرا تھا۔ انہیں نانی کے گھر آئے ہوئے ہفتہ بھر ہوا تھا اور اس ہفتہ بھر میں اپنے گھر سے نہ کوئی رابطہ نہ واسطہ۔ چند کلیاں چھوڑ کر اس کا دودھیال تھا۔ جہاں اس کے پیلا تھے اور آتش فشاں جیسا میزاج رکھنے والی الماس پھپھو جو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔

تابندہ نے میکے آتے ہی ہمیشہ کی طرح سارے کاموں کا بوجھ اٹھالیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک جتی رہتی۔ یہاں وہاں سے کام ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال لیتی۔ ٹھنڈی امی کے اس سوال سے بچنے کے لیے کہ ”تم گھر کب جاؤ گی یا یہ کہ اتنے دن ہو گئے تنویر نے مڑ کر خبر بھی نہ لی۔ آخر بات کیا ہے؟“

امی پر اس کی تلخ زندگی کا ہر پہلو خوب روشن تھا۔ اس لیے ہولتیں۔ مگر یہ بھی تھا کہ کسی بھی وجہ کو لے کر وہ کبھی مسکھٹا کر نہیں بیٹھی تھی نہ دکھڑے روتی۔ شاید اسی لیے تنویر بھی اس کا فیصلہ بدل جانے کا منتظر تھا جو وہ چلتے وقت سنا کر آتی تھی۔ اس نے امی سے



منتظر تھی۔ یوں میکے کی دہلیز پر آکر بیٹھنا ہوتا تو کاہے کو
 ولد رجینی، انکرا می کہاں سنتی تھیں۔
 تنویر سے تائبندہ کی شادی تنویر کی ایک طرفہ محبت کا
 شاخسانہ تھی۔ تنویر نے اسے راستے میں کہیں آتے
 جاتے دیکھا تھا اور پھر رشتہ لے کر امی کے پاس آپہنچا۔
 تنویر تعلیم یافتہ، خوش شکل، مہذب، خاندانی تھا۔ امی کو
 بھلا اور کیا درکار تھا۔ اپنی شادی کے لیے اپنی ماں، بہن
 کی مخالفت کو واضح کرتے ہوئے اس نے بالا ہی بالا
 سارے معاملات طے کیے تھے۔ اگر جھوٹ بولا تو
 صرف اپنی جاب کے متعلق۔ شاید اس وقت خود اسے
 بھی امید تھی کہ اچھی جاب جلد یا بدیر مل ہی جائے
 گی۔
 بعد ازاں اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے
 ہوئے تائبندہ سے معافی مانگ لی تھی۔ وہ تائبندہ کو پانے
 کے لیے کچھ جھوٹی سچی کہہ گیا تھا تو یہ اس کی چاہت ہی
 کھلائی جاسکتی تھی۔ مگر بات کہنے میں صرف زبان ہلتی

اس کے لیے بوجھ بن گئے تھے۔ وہ ہر آئے گئے کے سامنے رونا۔ لے کر بیٹھ جاتی۔ تنور کو برا بھلا کہتی۔ تابندہ میں کیڑے نکالتی۔ بچیوں کی جھوٹی سچی شکایتیں، وہ بھی علی الاعلان!

گو کہ گھر کا نظام اس نے ساس کی زندگی میں بھی سنبھال رکھا تھا۔ وہ کبھی جب تک زندہ رہیں، حالات معمول پر رہے۔ اولاً، ہی انہوں نے تابندہ کے کانوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ اگر عافیت درکار ہے تو الماس کے سامنے آف، نہیں کرنی، ورنہ تم نہیں یا یہ نہیں۔ تابندہ آج بھی اس ہدایت پر کار بند تھی مگر۔

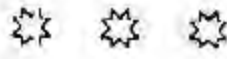
الماس کی لغت میں نسل کا لفظ درج ہی نہیں تھا۔ وہ صفائی کی رسیا تھی۔ تعطیل کے دن اس کا سارا وقت صفائی دھلائی، جھاڑیوںچھ میں گزرتا۔ ایسے میں بچیوں کی معمولی سی کوٹاہی بھی اسے آگ بگولہ کر جاتی تھی۔ فطرتاً، خاموشی و تنہائی پسند تھی، اسی حساب سے حد بندیاں تھیں۔ لی وی مت چلاؤ۔ اندھیرا رکھو، یہ وہ۔ تابندہ ہر ممکن احتیاط برتی، مگر بچے پھر بچے ہوتے ہیں۔ بھولے سے بھی اس کے کمرے تک آجاتے تو پونی پکڑ کر باہر نکال دیتی۔ گھر کی ہر چیز پر اس کا قبضہ تھا اور یہ احسان کہ اس کی ملکیت ہے۔ تنور پر کچھ ہاتھ لگتا تو کر لیتا، نہیں تو نیہ سہی۔ اسے فکر بھی نہ تھی۔ روٹی تو چل ہی رہی تھی اور اس روٹی کی قیمت کتنی بھاری چکانی پڑتی تھی۔ یہ کوئی تابندہ کے دل سے پوچھتا۔

الماس کا پارہ ہمہ وقت آسمان پر رہتا تھا۔ کچن میں جاتی تو برتن اٹھا، اٹھا کے پختی۔ ہر وقت درپردہ اسے سنائی رہتی تھی۔ طعنہ، ملامت، طعنہ اسے اپنے عہدے کا غرور، کمائی کا زعم تھا۔ ٹپ ٹاپ سے رہتی۔ شاہانہ زندگی گزارتی۔ آفس کی گاڑی میں ٹھہرے سے بیٹھ کر جاتی۔ بچیاں ترستیں تو والدین کی تنگ دستی، دست نگر ہونے کے طعنے۔ تنور کہتا کہ وہ شروع ہی سے ایسی ہے، جس کا جان کو آجائے، اس کا خون پی جاتی ہے، گویا اس معاملہ میں وہ خود کہیں قصور وار ہی نہ تھا۔

ہے، جبکہ عمل میں ساری زندگی بھی رگڑی جاسکتی ہے۔ تنور فطرتاً، سہل پسند اور شاہانہ مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کا اندازہ تابندہ کو بہت جلد ہو گیا تھا۔ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ ساس کے حکم پر سسرال چلے آئے تھے اور تب اسے معلوم ہوا کہ تنور کی شادی کے لیے ساس و منہ کا اختلاف، بجایا تھا۔ تنور نے بھی ایک دھیرا کم اکراماں کے ہاتھ پر نہ رکھا تھا۔ سارا گھر الماس کی کمائی پر چلتا تھا جو اپنی مضبوط پوزیشن کی وجہ سے گھر بھر پر حاوی تھی۔ جب تک ساس زندہ رہیں، انہوں نے معاملات سنبھالے رکھے۔ الماس کی تنخواہ بھی ان ہی کے ہاتھ میں آتی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہتری کو شش کی کہ کسی طرح الماس ٹھکانے لگ جائے، مگر اس کے مزاج بہت اونچے تھے۔ خیر، بینک میں افسر بھی، کسی رنڈوے، دوہا بنو کے لیے آمادہ بھی ہو جاتی تو کم از کم تعلیم یافتہ، باحیثیت تو ہوتا۔ مگر الماس جیسی کچلے طبقہ کی ڈھلتی عمر قبول صورت لڑکی کو بیانیے کوئی اعلا گزشتہ آفسر تو آنے سے رہا۔ سوان کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ تنور اعلا جاب یا کسی کاروبار کے خواب دیکھتا تو یہ خواب بھی پورے ہوتے نہ نظر آتے؟

اس کے مقدر میں لو کے ہزار گھونٹ تھے، جو میٹے آٹھ سال گزرے تھے کہ ساس نے دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کے کانوں میں یہ بات پھونک دی تھی کہ اسے صرف، شکر کے ساتھ وقت گزارنا ہے۔ وہ خود تو خاصی بے ضرر سی تھیں۔ جب تک حیات رہیں، ان برابر کرم بن کر چھائی رہیں۔ اس نے بھی ہمیشہ ہمبر و شکر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا تھا۔ ان کی زندگی میں آئے والی کا بھاؤ معلوم بھی نہ ہوا تھا۔ شاید زندگی اسی خاموشی سمجھوتے کی نذر ہو جاتی، اگر جو الماس کا چہنچہا چلا تا وجود نہ ہوتا۔ تنور اسی رفتار پر ڈھنگی پر قائم تھا۔ انہوں نے الماس سمیت سب کچھ سنبھال رکھا تھا، مگر ساس کے گزرنے کے بعد تو جیسے حاکمیت ہی الماس کے تصرف میں آگئی تھی اور پل پل اسے کچو کے دینا اس کا چلن ٹھہرا۔ ماں کے گزرنے کے بعد تو وہ سب

وہ اور تنور چپ سے رہتے تھے۔ مگر بچیاں۔ اور اب اس نے ٹھان لی تھی کہ یہ اذیت و ذلت بھری زندگی اس کی بچیوں کا نصیب نہیں بنے گی۔ وہ محتاج ہے نہ نااہل۔ اسے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر نئی زندگی کی شروعات کرنی ہے۔



اس صبح ای سودا سلف لینے ٹمپس تو اس نے بستر سمیٹ کر جلدی جلدی صفائی ستھرائی کی اور بچن کا کام ٹمٹایا۔ کچھ کپڑے دھلنے کو پڑے تھے۔ واشنگ مشین میں گھما کر نتھارے اور رسیوں پر پھیلانے کے بعد تخت پر سلائی مشین رکھ کر جھاڑ پونچھ کے بعد تیل ڈالا۔ نوکری اتنی جلدی تو ملنے نہ رہی۔ تب تک کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔

”مما! عرشہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔“
”ہم گھر کب جائیں گے؟“ وہ ایک حساس وزمہ دار بچی تھی۔ اس کی پڑھائی کا خرچ ہوا تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر تابندہ نے اسے نکلے درجے کے اسکول میں داخلہ دلویا تھا۔ ارادہ تھا کہ آمدنی کی سبیل بنے ہی سب سے پہلے عرشہ کو بہتر اسکول میں بٹھانا ہے۔ تابندہ نے کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر اس کا سر سینے سے لگا کر پوچھا۔

”عرشی! بیٹا! اگر ہمیں ہمیشہ نان کے گھر رہنا پڑے تو رہ لوگی؟“

”مگر کیوں ممما!“ اس نے کچھ دیر سوچ کر پوچھا۔
”بیٹا! حالات بدلنے کے لیے انسان کو کبھی کبھی جگہ بدلی پڑتی ہے۔ کچھ لوگوں کو چھوڑنا بھی کسی کو اپنانا پڑتا ہے۔ مما حاجب کریں گی تو ہماری مشکلات دور ہوں گی۔ ہم بہتر زندگی گزار سکیں گے۔ آپ کو ممما کا ساتھ دینا ہو گا دوگی نا۔“ وہ ایک بار پھر سوچ میں پڑ گئی تھی پھر ہا۔

”مجھے بس اپنی ممما کے ساتھ رہنا ہے۔“
عرشیہ نے اس معصومیت سے کہا تھا کہ تابندہ کو اس پر ڈھیروں ڈھیروں آگیا تھا۔ اسے بازوؤں میں بھینچ

اسے ان سب کا ہنسنا بولنا تک ناگوار گزرتا تھا۔ تنویر اپنی فیملی میں خوش رہتا تھا۔ مگر اس کا اپنا احساس کمتری عود کر آتا۔ یا یہ خلش سر اٹھاتی کہ یہ وہی تنویر تھا جس کی نااہلی کے سبب اس نے اب تک گھر بھر کا بار اٹھائے رکھا اور جس نے شادی کا فیصلہ ان ماں بیٹی کو پرے پھینک کر کیا تھا۔ وہ جیسے سر تپا آگ بن جاتی۔ تابندہ کہاں تک سنتی۔ اس نے اپنی سلائی مشین جھاڑ پونچھ کر نکال لی۔ چند نئے یوشن پر لگا لیے عرشہ فاربیہ کے ساتھ پڑھا دیتی مگر اس سے اتنا ہی ہوتا کہ روزمرہ کا خرچ نکل آتا۔ گھر کے بلوں کی ادائیگی راشن روزمرہ کی سبزی ترکاری دودھ والے کا بل یہ وہ۔ وہ تنخواہ پر مہینہ بھر کے لیے خرچ بھر دیتی۔ تابندہ بچتی تو کہاں تک بچتی۔ گھر میں ہر چیز الماس کی لالائی ہوئی تھی اور اگر وہ کچھ لاتی تو اک نیا فساد کھڑا ہو جاتا۔ ممکن ہے وہ چیز کر لیتی چیزوں پر پابندی لگا دیتی۔ اس کی زندگی اور رنگ کر دیتی طنز و ملامت کے ڈونگرے برسا برسا کر۔

الماس تو جیسی تھی سو تھی تنویر بھی چپ چاپ سنتا رہتا۔ بات گھوم پھر کر وہی تنویر کی کم چینی برآں رکتی تھی۔ اور بات اگر خود تک رہتی تب بھی گوارا تھی۔ مگر اب بچیوں پر منفی اثرات پڑ رہے تھے۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہونے لگی تھیں۔ وہ اسی جج جج سے بچنے کے لیے ہفتے کی شام میکہ آجاتی اور اتوار کی رات کو جاتی۔ اگر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے کوئی کب تک بچ سکتا ہے۔ ٹکراؤ ہو ہی جاتا۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ اپنے ایر کنڈیشنڈ کمرے میں بیڈ پر ٹانگیں پھیلائے مزے سے لی وی دیکھتے ہوئے چاکلیٹ کھا رہی تھی۔ جب فاربیہ پہنچ گئی۔ وہ بچی ہی تو تھی۔ سو اس کی نظر ٹک گئی۔

”ہاں۔ لو کہہ ماما۔ تمہیں بھلا کہاں نصیب ہوں گی امپورٹڈ چاکلیٹ۔“ اس نے تلخی سے کہتے ہوئے چاکلیٹ تقریباً ”فاربیہ کے منہ میں ٹھونس دی تھی۔ فاربیہ روتی ہوئی لولی تھی۔ تابندہ کے دل کو نہیں لگی تھی۔

کر چٹا پٹ پیار کیا تو آنکھوں کے گوشے خود بخود بھینچنے لگے۔



تابندہ کی ذات سے امی کو سو سکھ تھے۔ تب بھی وہ اسے تنہا کے نہیں — رکھ سکتی تھیں۔ شاید وہ اس کی خاموشی کے عقب میں چھپے مفہوم کو جانچ گئی تھیں۔ اور معاملہ اندرونی ہو کہ بیرونی۔ وہ بے بس ہوتیں تو پہلی پکار عادل کو پڑتی۔ عادل بھی ایک ہی آواز پر لبیک کتابوں کے جن کی طرح حاضر ہوتا۔ اس بار بھی یہ ہی ہوا۔ اسی شام عادل آیا تھا۔ گھنٹہ بھرائی سے کھسر پھسر چلی۔ تابندہ اپنے کمرے میں اندھیرا کیے فاریہ کو فیڈر پلانے کے بعد عرشہ کو تھکیاں دے رہی تھی۔ عادل اس کا کزن ہی نہیں۔ اس کا رستار بھی تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند بھی۔ مگر تابندہ نے انکار کر دیا۔ ہمیشہ سے عادل کا اس گھر میں عمل دخل تھا۔ وہ ساتھ کھیل کود کر پلے بڑھے تھے مگر اس نے عادل کے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ خصوصاً گھر میں اس کے عمل دخل کے سبب اب شادی کی صورت میں دنیا کی زبانیں کھل سکتی تھیں اور اسے اپنا کردار اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھا پھر عادل نے بھی کہا تھا کہ زبردستی کسی کو خود سے باندھ لینا محبت نہیں ہے۔ ہم اگر کسی کا ساتھ مانگیں تو اس کا پیار بھی میسر ہو۔ کیونکہ کسی کو پالینا محبت کی جیت نہیں بلکہ کسی کو اپنا بنالینا محبت کی جیت ہے۔

مگر وہ آج بھی اپنی محبت پر قائم تھا۔ امی کا خیال تھا کہ وہ عادل کی بات مانتی ہے۔ وہ اس کا خیال بھی انتہائی رکھتا تھا۔ ہمیشہ اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا۔ یہ اس کی محبت کی راستی نہیں تو اور کیا کہانی کہ وہ آج بھی تنہا تھا۔ اس تک آنے سے پہلے اس نے اپنے مخصوص انداز میں دروازہ بجایا تھا اور پھر دیوار سے لگے سوچ بورڈ کے بٹن کو کھٹ سے آن کیا تو سارے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ تابندہ لب بھینچے عرشہ کو تھکتی رہی اور عادل اس کے سامنے بیٹھ کر تادیر افسوس

بھری نظروں سے یوں نکلتا رہا جیسے اسے تابندہ سے اس عمل کی توقع نہ ہو۔

”مجھے پتا ہے تمہیں امی نے بلوایا ہے کہ مجھے سمجھا بھجا کے میرے دماغ میں گھسا خناس نکالو۔“ تابندہ کو کہنا پڑا۔

”مگر ایسا ہے بھی تو کیا حرج ہے۔ وہ تمہارا برا تو نہیں سوچتیں؟“

”انہوں نے اب تک میرا بھلا ہی تو چاہا ہے۔“ اس کی آواز گہمیر ہو گئی۔

”کیا تم جیسی سمجھ دار اور حوصلہ مند لڑکی کو یہ بتانا پڑے گا کہ نصیب سے ٹکرانا حماقت ہے؟“

”ہو نہ ہو۔ نصیب! انسان اپنی خطاؤں کو نصیب کے کھاتے میں رکھ کر کس آسانی سے ہاتھ جھاڑ لیتا ہے۔“

”تم پھپھو کے لیے اتنی تلخ کیوں ہو جاتی ہو۔ وہ ماں ہیں تمہاری؟“

”اور ماں ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ نا انصافی رکھی ہے۔“ اس کے اندر کسی پرانے سسکتے آزار نے سر اٹھایا تھا۔

”اب جو وقت گزر گیا، اس کی لیکر پیٹنے سے کیا حاصل۔ اگر آج پر نظر رکھو تو۔“

”میرا آج بھی امی کی بے پروائی کے سبب برباد ہے۔ تنویر کی چکنی چپری باتوں میں اگر انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یوں مجھے بیا ہے پر مل گئیں۔ جیسے میں روٹیاں زیادہ کھاتی تھی۔ اس نے جو جھوٹے سچے آسرے پکڑا دیے، ان پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ مجھ پر کیا گزرے گی؟“

اب اگر عادل یہ جانتا کہ وقت ہی ایسا چل رہا ہے کہ لڑکیوں کی شادی کے معاملہ میں سمجھوتا کرنا ہی پڑتا ہے، اور یہ کہ پھپھو نے بات اپنی سادگی سے کھائی تھی۔ وہ ہی نصیب کی کھوٹی نگاہ ورنہ انہوں نے اس کا برا تو نہ چاہا تھا۔ تو تابندہ یقیناً ”چڑ جاتی اور عادل اس کے احساسات کی بہت برا کرتا تھا۔ سو یہ ہی کہہ سکا۔

”راستے کی کٹھنایوں سے ہار کر منزل چھوڑ دینے

غصہ میں مبتلا کرتا ہے۔ تم نے ابھی اس کے اندر اتر کر اس کے آزار جانچنے کی کوشش کی؟ اس کے قریب ہو کر۔“

اس بار وہ سچ سچ چڑا گئی۔ وہ ہلا کیوں اس کی جوتیاں سیدھی کرے۔ سچ تو یہ تھا کہ کوئی تعلق بنا ہی نہ تھا۔ ”میری اپنی بھی کوئی زندگی ہے عادی! مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ ہر کسی کے آگے پیچھے پھر کر اس کی تیوری سیدھی کرنے کی کوشش میں لگی رہوں۔ میں بھی انسان ہوں۔ میری بھی کوئی عزت ہے۔“

”تالی! بوقت کیسا بھی برا ہو بڑا ضرور ہے۔“

”تب تک میں پاگل ضرور ہو جاؤں گی یا پھر خود کشی کر لوں گی۔“ وہ کچھ دیر لب بھینچتا کچھ سوچتا رہا پھر کہا۔

”بچلو اس سکرار کا اتنا تو نتیجہ نکلا کہ تمہیں کم از کم تنویر سے کوئی شکایت نہیں ہے اور یہ ہی سب سے اہم نکتہ ہے۔“

”اس کی خاموشی ہی اس کی کمزوری ہے جو اس کی بے کاری کے سبب ہے عادل! الماس کی زبان اگر تالو سے چپک کر رہ جائے تو بھی کسی کے ٹکڑوں پر پلنے کا احساس کم جان لیوا نہیں ہوتا۔ اچھی جا ب تو تنویر کو ملنی ہے نہ ملے گی۔“

”تو جا ب کو گولی مارو۔ کسی کاروبار کے لیے قرضہ بھی لیا جاسکتا ہے۔ میں ہوں نا۔“

”خدا کے واسطے عادی! میں ویسے ہی تمہاری بہت زربار ہوں۔ اب تنویر کو بے سادھی پکڑ کر چلنا مت سکھاؤ۔“

”اگر تم نے جا ب کا فیصلہ کیا ہے تو میدان چھوڑنے کی بات بنتی ہے؟“

”جب کما کے بھی مجھے ہی اکلانا ہے تو اس کے نام کا ایبل بھی کیوں چپکا کے رکھوں؟ میری بچیاں کیوں محرومی کی زندگی گزاریں جبکہ میں انہیں اچھی زندگی دے سکتی ہوں۔ لی! کیا ہے میں نے۔“

”مجھے پتا ہے تم دے سکتی ہو۔ مگر تم سے یہ کس نے کہا کہ پیسہ ہر محرومی کا ازالہ بن سکتا ہے؟“ یہ پہلی بار تھا کہ تالی نے کسی معاملہ میں اتنی دیر حجت کی ہو۔

”سے بہتر ہے کہ ٹھنڈائیوں کو سہل کرنے کی تدبیر کرو۔“

”تم اسے نہیں جانتے۔ وہ عورت نہیں آتش فشاں ہے اور اس ایک عورت نے گھر بھر میں حشر ڈھا رکھا ہے۔ آگہ کھلتے ہی اس منحوس کی صبح ہو جاتی ہے۔ آتے جاتے طعنے، ملامت، طعنے، اٹھاؤ، دست نگر ہونے کا عذاب، اس کی ذلت ہے۔ اس پر تنویر کی خاموشی و بے کاری۔ میں کم از کم اس کی طرح یہ ذلت نہیں سہ سکتی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو، ذلت بھلا کسے گوارا ہوتی ہے۔ ویسے وہ جا ب کرتی ہے تو گھر میں رہتی کتنے گھٹنے ہوگی؟“

”تم اسے ٹھکتو تو تمہیں پتا چلے کہ اسے پل بھر جھیلنا بھی کسی مذاب سے کم نہیں ہے۔ وہ ایک ایک چیز کی چوکی کرتی ہے۔ ہر چیز میں تالا ٹھونک کے جاتی ہے جیسے ہم چور ہیں۔ بچوں سے کرید کرید کر دن بھر کی روئداد پوچھتی ہے، تاکہ کیڑے چن کر مجھے بے عزت کر سکے۔ صاف سیدھی بات ہے کہ اسے ہم سب سے پر خاشا ہے۔ بس۔“

”اور تم ہار کر میدان چھوڑ دو گی؟ وہ لڑکی ہے اس کے بیاہنے تک ہی صبر کر لو۔“

”ہو نہ! اب کیا بیاہے گی؟ آدھا چونڈا تو گھر بیٹھے ہی سفید ہو گیا ہے۔“

”ایسا مت کہو۔ جوڑ تو اللہ نے سب کا بنایا ہے اور شادی کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔“

”اگر اس کے عارت ہونے کی ایک فیصد بھی امید ہوتی تو مجھے یہ ذمہ نہ اٹھانا پڑتا۔ مگر لگتا ہے وہ اس گھر سے ایک انچ ہلنے کو تیار نہیں ہے۔ اپنا معیار اتنا بڑھا رکھا ہے کہ کم از کم اس روئے زمین پر تو ایسا شہزادہ نصیب ہو نہیں سکتا۔ مجھے تو لگتا ہے اس کی نظریں مکان پر ہیں۔ یادہ ہمیں اتنا بیچ کر دینا چاہتی ہے کہ ہم میدان چھوڑ بھاگیں اور میں یہ بھی کر گزرتی! اگر تنویر ناکارہ ثابت نہ ہو تا تو۔“

”تالی! کوئی انسان صد فیصد اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ہوتا۔ الم اس جیسے لوگوں کو خود کار دیکے جانا بھی

”جن کے باپ نہیں رہتے وہ بھی تو زندہ رہتے ہی ہیں۔“ اس کی آواز بھگنے لگی۔ ”اگر امی کو میرا یہاں رہنا ناگوار ہے تو میں انہیں لے کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”مثلاً کہاں؟“

وہ لاجواب ہوئی تو لب بھینچ کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد کہا۔ ”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟“

”میرے تو صرف ٹھکانہ پوچھا ہے۔“

”کہیں کبھی۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ مگر اللہ نے کچھ حدود بھی تو بنائی ہیں عورت کے لیے۔ وہ بے سہارا ہو جائے تو کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ دنیا مجبور عورت کی ضرورت کو کیش کرتی ہے۔ تم کہاں تک بچو گی۔ عورت لوہے کی بھی ہو رہتی تو عورت ہی ہے نا۔ تابندہ! جہاں کئی زندگیاں تمہارے ساتھ جڑی ہوں۔ وہاں زندگی کے فیصلے از خود نہیں کیے جاتے۔ تمہارے ایک فیصلے سے کیا کچھ بگڑے گا۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ مجھے تمہاری کسی بھی خوبی سے انکار نہیں ہے۔ مگر کسی بھی فیصلے سے پہلے مل لکھاس کے کچھ ان گھروں پر نظر ضرور دوڑا لیتا جہاں بیای بیٹیاں کسی بھی وجہ سے آجڑ کر آ بیٹھتی ہیں، ہر جگہ نہیں تو اکثر دیکھتے ہیں کہ ایک نفسا نفسی ضرور نظر آئے گی۔ پروردگار نے مرد و عورت کے ذمہ مختلف ذمہ داریاں رکھی ہیں۔ عورت کو صنف نازک بنایا، اسی حوالے سے اسے فرائض بخشنے ہیں۔ یہ عورت جب کسی بھی وجہ سے دہری ذمہ داری کا بوجھ اٹھاتی ہے تو تھک کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ مرد کی بے کاری اور عورت کی بربادی عموماً ”فرسٹریشن بن جاتی ہے۔ یہ فرسٹریشن منفی سرخ پر چل پڑتی ہے تو اس پاس کے لوگ زیر عتاب ضرور آتے ہیں۔ ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا لیکن ایسا بھی ہوتا ہے۔ کیا تم خود کو کسی رسک پر رکھنا چاہو گی؟“

تابندی کی آنکھیں پھیل کر سکڑی تھیں۔ جیسے پل کے ہزاروں حصے میں کسی سسکتے آزار نے سر اٹھایا۔ اس کا ایک ایک لفظ جیسے تابندہ کے اندر اترتا جا رہا تھا۔

”بات تلخ سہی، مگر سچ ہے کہ تمہا عورت کا دگنا بوجھ اٹھانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔ وہ ہارٹی نہیں تو تھک ضرور جاتی ہے اور یہ تھکن ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتی ہے۔ میں انہیں اسی ٹوٹ پھوٹ سے بچانا چاہتا ہوں۔“

عادی کی بات راست ہی تھی۔ لمحے کے ہزاروں حصے میں جیسے اسے کہیں دور لے گئی تھی۔ یہ کوئی خلش نہ تھی۔ بس اک ان کہا سا بوجھ جو جانے کب سے اس کے دل کو مٹھی میں لیے ہوئے تھا۔

ہوتا ہے نا! بعض چیزیں انسان کے اندر پلتی پنتی ہیں۔ سانسوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ مگر وہ ان کے وجود سے بھی خبر رہتا ہے۔ یہ بھی اک ایسا ہی آزار تھا۔

عرشہ سوچکی تھی۔ عابد نے چلتے ہوئے کھٹ سے بٹن بند کر دیا تھا۔ اندھیرا ہو گیا اور جیسے ماضی جاگ گیا۔



جانے کتنے سالوں کی بات تھی۔ ابا کی وفات ہونے کے بعد اماں اکیلی رہ گئی تھیں۔

پھر گھر بھر کی دہری ذمہ داری امی کے ہی کاندھوں پر آ پڑی۔ مگر دنیا کو اک ٹارگٹ نصیب ہو گیا تھا۔ تنہا جوان خوش شکل عورت، ہر کوئی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پر مل گیا تھا۔ پڑوس کے انکل جمیل اکثر بہانوں سے اپنی بھت سے ان کے گھر جھانکتے۔ امی خاطر میں نہ لاتیں۔ مگر خائف ضرور رہتیں۔ پھر اک روز وہ گھر کے دروازے پر چلے آئے۔

”کوئی خدمت میرے لائق ہو تو بتائیے گا۔“ امی ان کی پاک جھانک سے برگشتہ تھیں۔ مگر نرمی ہی میں عافیت تھی۔

”آپ بس اپنی فکر رکھیے۔ ہماری فکر چھوڑ دیجئے۔“

”فکر کیوں نہ کریں۔ دونوں گھروں کی دیوار ملی ہے۔ پڑوس کا برا حق ہوتا ہے۔“ ان کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ ضبط کا کڑوا گھونٹ بھر کر بھی بول انھیں۔

”آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”بس اتنا کہ آپ ہمارا خیال رکھیے، ہم آپ کا رکھیں گے۔“ وہ مونچھیں مروڑنے لگے۔

اسے یاد تھا امی کا چہرہ شدت ضبط سے سرخ پڑ گیا۔ انہوں نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ مگر پھر ادھر سے کھٹاکھٹ پتھر آنے لگے۔ امی لرزتی کانپتیں۔ مگر بہر حال چار بچوں کی ماں تھیں۔ سوچتیں کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بچ سکتی۔ آخر کار ان کے حوصلے پست ہو ہی جاتے۔ مگر معاملہ اس کے برعکس ٹھہرا۔

وہ جھلتی گرمیوں کے دن تھے۔ رات میں لائٹ جاتی تو امی چار بچیاں صحن میں ڈال کر وہیں بچوں کو کھانا کھلاتیں۔ چار جنگ لیمپ جلا کر اسکول کا کام مکمل کروا تیں۔ بچے سو جاتے تو بعد میں انہیں اٹھا کر اندر لے جاتیں۔ اس دن بھی یہی ہوا تھا۔ جب وہ سب صحن میں اپنے کھٹولوں پر سو رہے تھے۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ امی نے کپکپاتی آواز میں ان کو بگایا تھا۔

”بارش ہو رہی ہے، جلدی اندر چلو۔“ وہ سر سے پیر تک لرز رہا تھا۔ تیزی سے سب کو اندر لے جا کر کنڈی تالے ٹھونک لیے۔ صبح پتا چلا کہ انکل جمیل ان کے گھر کو دگئے تھے۔

گمراہی نے ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہا۔ کچھڑ میں دھنسر پھینک تو بھینٹیں خود پر ہی آتی ہیں۔ بس انہوں نے خود کو محدود کر لیا تھا۔ پھر سڑی گرمی میں بھی امی کنڈی تالے لگنا کر رکھتیں۔ بچوں کو مرغی کی طرح پروں میں سمیٹ کر رکھتیں۔ انہوں نے گلی، محلہ میں بچوں کا کھیلنا تک بند کر دیا تھا۔ بس اسکول، یوشن اور گھر، خود بھی تقریباً ”قطع تعلق کر لیا اور لوگ کہتے کہ پیسے کی گرمی ان کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ مگر انہوں نے کانپوں میں روئی ٹھونس لی تھی۔ گھر کے کاموں کا بہانہ رویتیں۔ وہ بچوں کو اسکول لینے جاتیں تو واپسی میں سودا لیتی آتیں۔ اسکولز، بینک، بلیز، راشن کی لمبی قطاریں، وہ وہی ان دہری ذمہ داریوں کے بوجھ سے جیسے وہ سر تپتا تھکن میں ڈوب گئی تھیں۔ اس

تھکن نے انہیں توڑ ڈالا تھا۔

تابندہ نے ایک تکلیف دہ بچپن گزارا تو امی کے مزاج کی گرمی کی بدولت۔ وہ کچن میں کھڑی ہو جاتیں تو یا وہ آسمان کو چھو تا۔ پاس پڑی تیلی اٹھانے کے لیے بھی بر جلال آواز تابندہ کو پڑتی۔ وہ لرزتی کانپتی دور سے دوڑ کے آتی۔

”کہاں مر گئی تھی۔ اتنی دیر سے بلا رہی ہوں۔ جب تک میں کام کر رہی ہوں، یہیں کھڑی رہ۔“ وہ کچن کی دیوار سے لگی دوپ میں کھڑی رہتی۔ بہن، بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس لیے زیادہ زیر عتاب آتی۔ ان کا چڑچڑاہٹ، غصہ، بد مزاجی، وہ بچے کی طرح لرزتی رہتی۔ صبح آنکھ کھلتے ہی امی کا دھاڑنا شروع ہو جاتا۔

”شہزادی! آٹھ جا۔ تیر۔، باپ کی نوکر نہیں لگی ہوں۔“ چھوٹی سی عمر میں امی نے اس پر ڈھیروں دفعات لگا رکھی تھیں۔ وہ علی الصبح جاگ کر اپنے ساتھ بہن، بھائیوں کے بھی کپڑے پرکھ کر لیتی۔ اولاد کے لیے نرمی یا چھوٹ کا لفظ ان کی لغت میں نہ تھا۔ آج بھی وہ اس وقت کو یاد کر کے لرزتی تھیں۔ امی کے اندر جیسے آگ بھڑکتی تھی۔ دہری، امہ داری کا بار، تنہائی، جذباتی نا آسودگی اور دنیا۔ مانو کوئی خنجر تھما دے تو کسی ایک کو گھونپ دیں۔

اک بار انہوں نے تمبرز کا سردیوار میں ٹکرا ٹکرا کر مارا۔ ”تو مرجائے تو اچھا ہے، میں اکیلی جان کیا کیا کروں؟“ تمبرز کو بخار تھا۔ اس کا دل آٹھ آٹھ آنسو روتا۔ وہ یوں ہی بچوں کو کوستی نظر آتیں۔

”پورے چار ہیں، گنتی کے چار، اک آدھ کم بھی نہیں ہوتا۔“ اس وقت وہ یہ ہی سمجھتی کہ ماں کو ان سب سے نفرت ہے۔ وہ ابا کو یاد کرتی جو کتنا پیار کرتے تھے۔ ان کے لیے قیمتی سامان، کھلونے، چاکلیٹس لاتے۔ محلہ میں ابا کی دھاک تھی۔ مگر اب ان کا کون دفاع کرتا۔ امی کہتیں۔ اب تمہارا باپ سر پر نہیں بیٹھا ہے۔ گلی میں کھیلو گے، کسی سے ملو گے تو شکایتیں بھی آئیں گی۔

ڈال دی تھی۔ اس باغ کی دیکھ بھال میں وہ صبح سے شام تک مصروف رہتا۔ کبھی تھک کر ہانپتا تو کسی درخت سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ امی اسے ٹھنڈا پانی، کبھی شربت گھول کر بھیج دیتیں۔ کبھی دیر سویر ہو جاتی تو بلا کے کھانے کی ٹرے پکڑا دیتیں۔ اک روز وہ امی کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

”ایک بات بولوں بی بی صاب! آپ کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔ مجھ سے دو وقت کی روٹی کے صدقے ہزار کام کروالو۔ بس کھانے، پینے کا آسرا کر دو۔“

امی مسکرا دیں۔ وہ فطرتاً ”نیک طبع تھیں۔ بے چارہ سانول پردیس میں بے گھر تھا۔ وہ اسے اندر بلا کے کھانا کھلانے لگیں۔ ڈیروں کام سانول نے اپنے ذمہ لے لیے تھے۔ بچوں کو اسکول سے لے آتا۔ کسی نہ کسی بچے کو کندھے پر لاد کر سودا سلف لادیتا۔ کبھی کوئی بیمار پڑتا تو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ مانواک خاموش معاہدہ۔

امی اب کھانا پکاتیں تو سانول کی پسند ناپسند کا خیال رکھتیں۔ وہ امی کے ہاتھ کے ذائقہ کی تعریف کرتا۔ پھر بات ہاتھ کے ذائقہ سے، ہاتھ کی تعریف پر آگئی۔ تابندہ کا خیال تھا۔ امی اسے جوتے مار کر نکال دیں گی مگر امی اب خوش رہنے لگی تھیں۔ وہ سانول کا انتظار کرتیں۔ اس کے پسندیدہ کھانے، پکاتیں اور بجتی سنورتیں۔ مانو اک چھوٹی سی بے ایمانی۔ جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ بس نسلی تھی، سہارا یا شاید آسودگی۔

وہ کھل اٹھتیں۔ جب وہ امی کو سراہتا، یا یہ کہتا کہ وہ شخص بہت خوش نصیب تھا۔ آپ جس کا نصیب تھیں۔ شاید وہ اسی ستائش کے لیے خود کا خیال رکھنے لگی تھیں۔

اس بار وہ دنیا سے بھی بے پروا ہو گئی تھیں۔ سانول کسی کام سے گاؤں گیا تو کئی سوغاتیں لایا۔ ستودھنے کا تیل، اچار اور ساتھ میں امی کے لیے سندھی کڑھائی سے جچی چادر۔

پھر وہ امی سے ابا جیسی فرمائشیں کرنے لگا۔ یہ رنگ پنو، یہ نہ کرو۔ وہ کرو، امی بھی ہر چھوٹی بڑی بات اس

امی نے اسے دوپہر کی شفٹ میں داخل کروا دیا۔ وہ صبح کا سارا کام کر کے بارہ بجے سدھارتی شام کو لوٹ کر یونیفارم اتارتے ہی گھر کے دھندوں میں لگ جاتی۔ مگر انہیں اپنا غبار نکالنے کا موقع مل ہی جاتا۔ بس نہ پہلتا، اس کے منہ میں جاتا نوالہ تک چھین لیں۔ بیماری ان کے نزدیک جھوٹا ڈھونگ تھی اور پرہیزی بہانہ۔

”تجھے نہیں پتا ابھی کتنے کام پڑے ہیں تو نیک کھول کر بیٹھ گئی۔“ اکثر وہ ہاتھ میں پکڑی چیز اس کو بھیج مارتیں۔ وہ چٹنی مسالا پیستی تو ہاتھوں میں آگ لگ جاتی، مگر پروا کسے تھی۔ عذروے کر بھی کام کرنا ہی پڑتا۔ امی کو بچوں بھی منظور نہ ہوتی تھی اور فرمائش لاڈ و تحروں کے تو وہ چاروں معنی بھی بھول گئے تھے۔ ان کا پکایا بچوں کے منہ کو نہ لگتا تو بھی پروا کسے تھی۔

”کھانا ہے تو کھاؤ، ورنہ بھوکے سو جاؤ۔“ کئی بار توجیح مچ کوئی نہ کوئی بھوکا ہی سو جاتا۔ امی ہر معاملہ میں من مانی و ہٹ دھرمی کی عادی ہو گئی تھیں۔ شاید اسی کو عورت ذات کی تریا ہٹ کہتے ہیں۔ مگر یہ تریا ہٹ بے سبب نہیں ہوتی۔



گھر کے عقبی حصہ میں ابا کے ہاتھ سے لگایا اک چھوٹا سا باغ تھا۔ آم پیتے اور امرود کے درخت گھر سے متصل سڑک سے نظر آتے۔ اک روز اک مناسب قدم قامت کا بھوری آنکھوں والا گورا چٹا آدمی دروازے پر چلا آیا۔

”سلام بی بی صاب!“ سندھی ٹوپی لگائے، ابرک کی بکل مارے، عجز و انکسار کا پیکر۔ وہ سانول تھا۔ جو ہاتھ جوڑے، درخواست گزار تھا۔

”اس باغ کا پھل ہم کو بیچ دو بی بی صاب! ہم اس باغ کی گوڈی کرے گا۔ پانی دے گا۔ جب فصل تیار ہوگی تو منڈی بیچ کر آئے گا۔ آدھا منافع آپ رکھنا۔“

امی کو بھلا اور کیا درکار تھا۔ اجڑا باغ بیٹھے بیٹھائے آمدنی دینے جا رہا تھا۔ ابا کے بعد اس باغ کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ سانول نے اپنی محنت سے باغ میں جان

تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسے لوثا تھا۔ صبر شکر کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار ہی نہیں کرنا تھا، الماس کے اندر اتر کر اس کی محرومیوں کو بھی ٹولنا تھا۔ ممکن ہے سمجھوتے کی کوئی راہ نکل آئے۔ یہ اس کا فیصلہ تھا۔

سے کرنے لگیں۔
”نکل ہم شادی میں گئے تھے، میں نے نیلی ساڑھی باندھی۔“
”اوہ! نیلا رنگ تو تم پر بہت جتا ہے۔“ وہ اپنی کو اس بے تکلفی سے پکارتا تو یہ حوصلہ ان ہی کا بخشا ہوا تھا۔

”ہاں۔۔۔ سب یہ ہی کہہ رہے تھے۔“
”مگر میں نے تو نہیں دیکھا۔“

پھر اگلے روز امی نے اسے نیلی ساڑھی باندھ کر دکھائی۔ بچوں کے اسکول سے شکایتیں آنے لگی تھیں۔ امی ان توجہ اب گھر اور بچوں سے ہٹ رہی تھی۔ مگر ساول نے ان کی تھکن بانٹ لی تھی۔ وہ مطمئن ہو گئی تھیں اور شاید آسودہ بھی۔ جانے کتنے دن گزرے۔ پھر سانول کے گھر سے بلاوا آ گیا۔ اس کی شادی ہو رہی تھی۔ سانول حساب کتاب کر کے چلا گیا۔ پھر نہ لوا۔ جانے امی نے اسے یاد کیا نہ کیا۔ کب کب اور کہاں کہاں اس کی کمی محسوس کی یا نہیں کی۔ مگر دنوں میں جیسے سب کچھ بدل گیا۔ شاید پہلے جیسا ہو گیا۔ یا پھر پہلے سے بھی بہتر۔ کیوں کیسے اور پتا نہیں، وہ منٹوں میں جیسے سالوں پیچھے کی سیر کر آئی تھی۔

عادل کا الزام بجا تھا۔ بار۔ تھکن۔ ٹوٹ پھوٹ۔ یہ لفظ اس کے لیے نئے نہ تھے۔ وہ خود ان کا عذاب اپنی جان پر جھیل چکی تھی۔ دہری ذمہ داریوں کا بار اٹھانے میں عورت تھک کر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ اس کی اپنی ذات ختم ہو جاتی ہے، اندر خلا رہ جاتا ہے تو محرومی عود کر آتی ہے۔ یہ نا آسودگی، تھکن، اسے آتش فشاں بنا دیتی ہے۔ جو پھٹتا ہے تو اس پاس کے لوگ زیر عتاب آتے ہیں۔

الماس۔ امی اور وہ خود۔
ایک ہی کہانی کے تین رخ تھے۔
الماس کی چیخ پکار امی کی بے ایمانی، تابندہ کا فیصلہ محرک ایک ہی تھا، محرومی۔
اسے الماس نہیں بننا تھا اور کسی بے ایمانی کا تو وہ

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش



450/-	سفر نامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفر نامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفر نامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفر نامہ	چلتے ہو تو چین کو چلیے
225/-	سفر نامہ	غمیری غمیری پھر مسافر
225/-	طنز و مزاح	خدا گندم
225/-	طنز و مزاح	اردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس بستی کے کوچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاند نگر

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

سارا طویل سہی

اسے دیکھا۔ وہ دونوں اس وقت سامان کے انتظار میں کنویر بیلٹ کے قریب کھڑے تھے۔
 ”یقیناً عرفان بھائی آئیں گے۔“
 ”اوہ۔۔۔ میں نے سوچا اب ان کی نئی جاب ہے کیا پتہ شیڈول وغیرہ چھینچ ہو۔“
 ”ہوں۔۔۔“ عازم نے مختصر جواب دے کر آتے جاتے سامان پر نظر ڈالی۔
 ”کیا بات ہے عازم! آپ بہت چپ چپ ہیں۔ حالانکہ آپ تو وطن آنے کے لیے برسوں بے چین رہے ہیں اور بالآخر ہم ہمیشہ کے لیے آہی گئے یا پھر آپ پچھتارہے ہیں جاب چھوڑ کر۔۔۔؟“ سارہ نے پورے سفر کے دوران محسوس کیا کہ اس بار عازم کے انداز میں وہ ہمیشہ والی شوخی اور جوش مفقود ہے۔ وہ تو

ہوائی جہاز علامہ اقبال انٹرنیشنل ایرپورٹ لاہور پر لینڈ کر۔۔۔ والا تھا۔ عازم نے عینک بند کر کے جیب میں پھنسائی اور کتاب بند کر کے ہینڈ بیگ میں ڈال لی۔ سارہ نے بالکل اچانک ہی زوردار طریقے سے اس کی کلائی تھامی۔ جس پر پہلے تو عازم۔۔۔ چونکا لیکن پھر مسکراتے ہوئے خود ہی اس کی نرم انگلیاں اپنے ہاتھوں میں پھنسا لیں وہ آنکھیں بند کیے کسی درد میں گمن تھی۔ ہمیشہ سے اسے لینڈنگ کے مرحلے سے خوف آتا تھا۔ جب جہاز کے پیسے ایک تیز گڑ گڑاہٹ کے ساتھ ان دے پر دوڑتے تو اسے لگتا ابھی یہ پھٹ جائیں گے اور ان میں آگ لگ جائے گی اور پھر ایک زوردار دھماکا۔۔۔
 ”ہمیں لینے کون آرہا ہے۔۔۔؟“ سارہ نے ایک نظر

محکم کیل ٹاؤل





Copied From Web

”بہتر ہے پہلے سے“ اب تم آگئے ہو امید ہے
بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“ عرفان نے محبت سے بھائی
کو دیکھا وہ بھی مسکرا دیا۔ گاڑی اب رنگ روڈ پر رواں
دواں تھی۔



”اف۔۔!“ وہ تھک کر گرنے کے انداز میں
صوفے پر بیٹھی۔ چار بجے کلج سے آنے کے بعد دل
چاہتا گھر چنچتے ہی کوئی گرم پائے کا کپ سامنے حاضر کر

دے لیکن یہاں کے ماحول میں ایسی خواہش تو بس
ایک خواب تھا ایسا ان بے جا چونچلوں کو پسند نہیں
کرتی تھیں۔ خزران نے زبردستی اپنا ذہن چائے سے
ہٹایا۔ برس الماری میں رکھ کر پہلے کپڑے تبدیل کیے
پھر لاؤنج میں آکر بچوں کو آواز دی اور وہ سیکنڈز میں
سامنے آکھڑے ہوئے۔

”ماما! آپ آگئیں۔“ مناہل اس کی ٹانگوں سے
لیٹ گئی۔

”تم لوگوں نے پھر کپڑے چنچ نہیں کیے۔۔۔ بری
بات ہے بیٹا!“ خزران نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔
مناہل اور رافع کی نئی کلاںز ابھی پانچ روز پہلے شروع
ہوئی تھیں۔ اماں نے بس پہلے دو دن ہی ان کا خیال
رکھا تھا۔

”دادی نے کہا خود تبدیل کر لو۔۔۔ لیکن مجھے تو گھر
والے کپڑے ملے ہی نہیں۔“ رافع نے بیڈ پر چھلانگ
لگائی۔

”اچھا کوئی بات نہیں۔۔۔ چلو نما کر صاف کپڑے
پہن لو۔۔۔ پھر مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ دیکھو! ماما کا بھوک
سے برا حال ہے۔“ اس نے جلدی جلدی تولیہ اور
کپڑے نکال کر رافع کو ہاتھ روم میں دھکیلا۔ کھانے
کے دوران وہ دونوں مسلسل اسے نئی کلاس ”نئی ٹیچرز
اور نئے نئے دوستوں کے متعلق معلومات فراہم کرتے
رہے۔

”خزران۔۔۔ کھانا کھا لیا۔؟“ اماں نے اپنے
کمرے سے ہانک لگائی تو وہ فوراً ”دوپٹے سے ہاتھ

جماڑ کے سفر میں بے تکان بولنے کا عادی تھا۔ جبکہ یہ
پہلا سفر تھا جو عازم نے سوتے اور کتاب پڑھتے گزارا
تھا۔

”نہیں بالکل نہیں۔“ اس نے فوراً ”سارہ کا خیال
رو کیا۔“ وطن واپس آنا میرا خواب تھا جو الحمد للہ آج
پورا ہو گیا ہے اور میں بہت خوش بھی ہوں۔ بس فیوچر
کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ آگے بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہو
گا۔“ اس نے سلی دینے کی کوشش کی۔

”ہمیں کیا کرنا ہے فیوچر کے بارے میں سوچ کر۔“
سارہ نے اسی سے آہ بھر کر کہا تو عازم نے ایک نظر
اسے دیکھا اور توجہ دوسری جانب مبذول کر لی۔
باہر نکلے تو ابریل کی ٹھنڈی خوشگوار ہوائ نے استقبال
کیا۔ جانی پہچانی مہک کو نتھنوں میں محسوس کرتے ہی
عازم کے لب مسکرا اٹھے۔

”کیا بات ہے اپنے وطن کی۔۔۔ اور پھر لاہور کی۔۔۔
وطن کی زمین پر پڑنے والے پہلے قدم ہمیشہ ہی اسے
بڑے جادو اثر لگتے۔“ پتا نہیں کیا ہے اس مٹی میں۔۔۔
زندگی تو اس ہمیں محسوس ہوتی ہے۔“ عرفان بھائی
نے ہاتھ ملایا تو وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا اور بھائی
کے گلے لگ گیا۔ سارہ سے سلام دعا کا تبادلہ ہوا پھر وہ
ٹرائی اس سے لے کر پارکنگ کی طرف بڑھ گئے۔

”بہتر ہے ہو گئے ہیں عرفان بھائی۔“

”بس یار۔۔۔ فیلڈ کا کام تو خون بھی نچوڑ لیتا ہے۔
ہماری تو ابھی چربی کم ہوئی ہے۔“ وہ تیزی سے ہاتھ
چلاتے ہوئے پیچکز گاڑی میں ایڈجسٹ کرنے لگے۔
”چلو تم آگے آجاؤ۔ بھائی! یہ چھوٹا بیگ آپ اپنے
پیروں میں رکھ لیں۔“ وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ
بیٹھے۔

”موسم تو بہت زبردست ہے آج۔“ عازم نے باہر
جھانکا۔

”یہاں بارش کی ہیشن کوئی بھی ہے شاید۔۔۔ فقط بتا
رہی تھی۔“ عرفان نے گاڑی پارکنگ ایریا سے نکال۔
”اماں کی طبیعت اب کیسی ہے۔؟“

اس کی سرال میں دوسرے تعلق سے سب ہی ناواقف تھے کیونکہ اس کی اور عازم کی باقاعدہ ممکنہ نہیں ہوئی تھی۔ بس گھر کے بیٹوں نے آپس میں کہہ رکھا تھا۔ عازم کا خزان۔ کے سرال میں آتا جانا لینی بھابھی کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ عازم اور لینی بھابھی کا بھائی حمزہ ملائیشیا میں ایک ہی جگہ کام کرتے تھے۔ عازم جب کبھی چھٹی پر آتا تو حمزہ اس کے ہاتھ لینی کے لیے تحائف وغیرہ بھیج دیا کرتا اور یوں ہر ڈیڑھ دو سال بعد عازم کا ایک بار ضرور اس سے ہاں آتا ہوتا۔ خزان نے کبھی اس کی آمد کو ناگواری یا شک کی نظر سے نہیں دیکھا کیونکہ عازم پر بھروسہ بہت پرانا تھا۔

”عازم کو میرے حالات کا علم تو ہو گیا ہو گا۔ سنجیدہ پھپھو اور فضہ بھابھی نے اسے بتایا تو ہو گا۔ پتا نہیں کیا سوچ رہا ہو گا وہ یہ سن کر۔ بہری حالت پر رحم۔ یا پھر بے حد غصہ، کہیں وہ اسے غصے کا اظہار اماں کے سامنے نہ کر بیٹھے۔ وہ اضطرابی کیفیت میں پیر کے انگوٹھے سے قالین کھرچے جا رہی تھی۔

”مما! آپ کو لینی مائی بلا رہی ہیں۔“ رافع نے کمرے میں جھانک کر کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈرائنگ روم سے اماں اور عازم کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ کچن میں داخل ہو گئی۔

”آؤ بھئی۔ ایک تو صبح سے سر میں درد ہے۔ اوپر سے مہمان کی خاطر مدارت بھی مجھے کرنا پڑ گئی۔“ لینی کی اکٹھاٹ پر خزان کو حیرت تو بہت ہوئی کیونکہ عازم ان کی وجہ سے یہاں آتا تھا اور ان ہی کا مہمان تھا لیکن بہر حال اس نے خود کو کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

”اچھا خیر۔ یہ دوسری ٹرے تم لے آؤ۔ میں چائے لے جا رہی ہوں۔“

”تم تو ہمیشہ کے لیے واپس آ گئے۔“ اماں کی آواز باہر تک آرہی تھی۔

”جی بس۔ بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں۔ یہاں آئے بنا نہیں ہو سکتے تھے۔“

”کام دھندے کے متعلق کیا سوچا ہے؟“ اماں نے

صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم لوگ کھانا ختم کر کے سیدھا اپنے کمرے میں چلے جانا، خردار جو مائی کے کمرے میں اوٹھم چلایا۔“ وہ انہیں تنبیہ کرتی اماں کے کمرے میں آ گئی۔

”جی اماں! کھانا کھالیا ہے۔ آپ کو کچھ چاہیے؟“

”ارے دو گھنٹوں سے اپنی عینک ڈھونڈ رہی ہوں۔ قرآن پاک سامنے رکھا ہے، دیکھو کیسی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ جاؤ ذرا گاڑی کے ڈیش بورڈ پر دیکھو! صبح میں آصف کے ساتھ بینک گئی تھی۔ شاید وہیں بھول آئی ہوں۔“

”جی اماں۔!“ وہ فوراً پورچ میں آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ ڈیش بورڈ تو کیا اوپر نیچے آگے پیچھے پوری گاڑی کھنگال ڈالی لیکن عینک ہوتی تو ملتی۔ وہ پیشانی پر چھتی بمشکل سیدھی ہوئی کہ مین گیٹ کی بیل بجی۔ وہ اس وقت گیٹ کے بالکل قریب تھی اس لیے خود ہی آگے بڑھی۔

”کون۔۔۔؟“

”میں۔۔۔ عازم حیدر!“ ٹھہرے ٹھہرے پرسکون لمحے پر وہ برن طرح چکرا گئی۔ ہر ڈیڑھ دو سال کے وقفے کے بعد یہ مانوس آواز یونہی اس کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر دیا کرتی تھی۔ اس نے گھبرا کر دوپٹا سر پہ لیا اور نہایت شرمندگی سے ایک نگاہ اپنے حلیے پر ڈال کر بدقت تمام چہوٹا دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم۔!“ وہ ایک اڑتی پڑتی نگاہ عازم پر ڈال کر ایک طرف ہو گئی۔

”وعلیکم اسلام۔“ وہ اس کے حلیے پر گہری نگاہ ڈالتا بہت سے سوال دل میں لیے حیران حیران سا اندر بڑھ گیا۔ خزان گیٹ بند کر کے پلٹی اور اسے اپنی معیت میں ڈرائنگ روم تک پہنچایا۔ اس نے اماں کو اس کی آمد کا بتایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بچے بتا نہیں کہاں بھاگ گئے تھے۔

وہ کھوئی کھوئی سی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔ عازم اس کا سگا پھپھو زاد تھا یوں تو سا تو، مگتیر بھی۔ لیکن

شاید مسکرایا تھا۔
 ”لیکن مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ آصف بھائی یا
 لبنی بھابی میں سے کوئی یہاں لاؤنچ میں آگیا تو؟“
 ”دیکھو! گھر کا نمبر میں نے اُسی مجبوری میں ڈائل کیا
 ہے کیونکہ تمہارا سیل نمبر میرے پاس نہیں ہے۔
 تمہارے علاوہ کوئی اور فون اٹھاتا تو میں بتا بات کیے بند
 کر دیتا۔ مجھے تمہارا نمبر چاہیے۔“ ابھی اس کا لہجہ
 قطعی تھا۔
 ”لیکن۔۔۔!“ خزران نے کچھ کہنے کے لیے منہ

اگلا سوال داغا۔
 ”پہلی ترجیح تو جواب ہے۔ آسانی سے چند ماہ کے
 اندر مل گئی تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ کچھ بزنس وغیرہ کا
 سوچوں گا۔“
 اس نے ہائے کا کب اٹھاتے ہوئے خوب فرصت
 سے خزران کو دیکھا لیکن وہ نظر خرا گئی۔ لبنی بھابی
 نے رکھ کر خود بھی وہیں بیٹھ گئیں لیکن خزران چائے
 دے کر کے لیٹ گئی۔



کھولا۔
 ”پلیز رازی! اگر ابھی تم سے بات نہ ہوئی تو میری
 دماغ کی رگ بھی پھٹ سکتی ہے۔ تم جانتی ہو میرا تم
 سے بات کرنا کتنا ضروری ہے۔ بحث میں مت پڑو۔ اپنا
 نمبر بتا کر روم میں جاؤ، تاکہ تسلی سے بات ہو سکے۔“ وہ
 ہرگز مصالحت کے موڈ میں نہیں تھا۔ خزران نے
 اسے اپنا نمبر دے دیا۔

بچے ٹی ای دیکھتے دیکھتے نوبے سے کچھ پہلے ہی سو
 گئے۔ وہ شکر کرتی اٹھ گئی۔ صبح کے لیے کپڑے تو پریس
 کرنے نہیں تھے کیونکہ آج ویک اینڈ تھا۔ خزران نے
 سوچا تھوڑا سا کلج کا کام ہی دیکھ لے۔ کچھ نئی کلاسز
 اسے دی گئی تھیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ نوٹس تیار کر
 لے۔ کتابیں وہ ساتھ اٹھالائی تھیں۔

”ٹھیک ہے، میں پانچ منٹ تک کال کرتا ہوں۔ تم
 اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اس نے ریسپور رکھ دیا۔
 خزران نے کرا اندر۔ سے بند کیا اور رائٹنگ ٹیبل
 کے پاس آ بیٹھی۔ عازم کی ٹھیک پانچ منٹ بعد کال آگئی۔
 ”مبارک ہو۔۔۔!“

سب کچھ ترتیب سے رائٹنگ ٹیبل پر رکھ کر وہ
 کمرے سے نکلی کہ اگر ماں جاگ رہی ہیں تو پوچھ لے،
 انہیں کوئی ضرورت تو نہیں۔ لیکن ان کے کمرے کی
 بند لائٹ دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ سو چکی ہیں۔ آصف بھائی
 اور لبنی بھابی کے کمرے سے البتہ ابھی تک بچوں کے
 شور کی آواز آرہی تھی۔ اس نے لاؤنچ کی فالتو بقیان
 بچھا کر صراب ایک جلنے دی۔ فون کی گھنٹی نے ماحول کی
 خاموشی توڑی تو اس نے لپک کر ریسپور اٹھایا تاکہ ماں
 کی نیند میں خلل نہ پڑے۔

”جی۔۔۔؟“ وہ ایسے آغاز پر حقیقتاً گڑبڑا گئی۔
 ”ارے بھئی۔ کلج کی پروفیسرین گئی ہو۔ مبارک
 دے رہا ہوں۔“

”ہیلو۔۔۔!“ خزران نے ریسپور کان سے لگایا۔
 ”ہیلو۔۔۔ کون ہے؟“ کوئی جواب نہ پا کر وہ دوبارہ

”اوہ۔۔۔!“ وہ بری طرح جھینپ گئی۔ ”تھینکس“
 ”جواب کب لگی۔ اور گریجویٹن کے بعد مزید
 پڑھائی کا موقع کب ملا۔۔۔؟“

بولی۔
 ”ہوں۔۔۔ اپنی تصدیق کر رہا تھا کہ تم ہی ہو۔“ عازم
 کی سنجیدہ آواز ماؤتھ پیس میں ابھری تو خزران کا دل سچ
 مچ ڈوب کر سیلیوں میں چلا گیا۔
 ”سب سو رہے ہیں عازم!“ اس نے بمشکل آواز

”تقریباً“ سال ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد ایم اے
 اکنامکس اور پھر ایم ایڈ بھی کر لیا تھا۔
 ”چلو اچھا ہے، اتنی کم عمر میں یہ واقعی بہت بڑی
 کامیابی ہے۔“

نکالی۔
 ”ابھی بات ہے۔ زیادہ تسلی سے بات ہوگی۔“ وہ

”اب ایسی بھی کم عمر نہیں۔“ وہ شرمندہ ہو گئی۔
 ”ہاں ویسے عقل کے حوالے سے تو بچوں کو بھی

مات دیے بیٹھی ہو۔“ عازم کا لہجہ ایک دم سنجیدہ ہوا۔
خززان جو با” بول نہیں پائی۔ دل بری طرح سکڑا تھا۔
یقیناً” اب وہ اصل موضوع پر آگیا تھا۔

”کیا واقعی یا سرنے تمہیں طلاق دے دی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ ایسے کیوں پوچھ رہے ہو۔“ وہ حیران ہو
گئی ایسے۔ بے شک سوال پر۔۔۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ یا سرنے
اور اس کی الملاق ہو چکی ہے۔ بھلا شک کی کیا گنجائش۔
”میں نے سوچا شاید تم تردید کرو گی۔“

”کیا مطلب۔۔۔ میں کیوں تردید کروں گی۔“ وہ

خاک نہیں سمجھ پائی۔

”بھئی تم طلاق کے بعد بھی سسرال میں بیٹھی ہو
مجھے لگا شاید لوگ جھوٹے ہیں اور نہ علیحدگی کے بعد
وہاں رہنے کا کیا جواز۔“

”بہت ساری وجوہات ہیں۔“ اس نے خود کو کھل
کربات کرنے کے لیے تیار کیا۔

”جیسے۔۔۔؟“

”پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یا سرنے یہاں نہیں رہتا۔ وہ اپنی
سیکنڈ وائف کے ساتھ بحرین میں ہوتا ہے۔ دوسری
وجہ یہ ہے کہ یا سرنے جو زیادتی میرے اور بچوں کے
ساتھ کی اس کی سزا بلا وجہ اماں کو کیوں ملے۔ میرے
بچے داوی۔ کے ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں۔ یہاں سب
ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں کیسے بچوں کو ان
سے دور کروں۔“

”بس یہی وجوہات ہیں۔“ عازم نے تصدیق

چاہی۔

”ہاں۔ کیا مطلب۔۔۔؟“ وہ اسے مسلسل الجھا رہا
تھا۔

”اگر صرف یہی وجہ ہے تو میں کل ہی جنید سے
بات کرتا ہوں کہ وہ آکر تمہیں لے جائے۔ حیرت ہے
کیسا بھائی۔ بہن طلاق کے بعد بھی سسرال میں
بڑی ہے اور اسے کوئی پروا ہی نہیں۔ اسے تو چاہیے
تھا اگلے دن بازو سے پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لے آئے۔“
”اب اس میں جنید بھائی کا کیا قصور۔ میں اپنی

مرضی سے یہاں رہ رہی ہوں۔“
”تمہاری تو عقل گھاس چرنے لگی ہے۔“ وہ اس پر
بری طرح برسایا۔ ”کس دینے میں رہتی ہو جاہل! تمہاری
ساس اپنے بیٹے اور ننی بہو سے ملنے کے لیے تڑپ رہی
ہے، لیکن تمہاری یہاں موجودگی کی وجہ سے انہیں بلا
نہیں پارہی۔“

”ایسا کہا اماں نے؟“ خززان نے حیرت سے
دہرایا۔ ”انہوں نے کہا تھا یا سرنے میرے اور بچوں
کے ساتھ جو کیا وہ ساری عمر اس کی صورت بھی نہیں
دیکھیں گی۔ آصف بھائی بھی ہرگز اسے معاف کرنے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
ذرد موسم	راحت جمیں	750/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آمینہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	600/-
بھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوہا رہے	فائزہ افتخار	300/-
مین سے عورت	غزالہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آمینہ رزاقی	350/-
بکھرتا جاؤں خواب	آمینہ رزاقی	200/-

ناول منکھوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ - 30/- روپے
منکھوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار، کراچی۔
فون نمبر: 32216341

طلاق ہوئی ہے، ان کا رویہ اور بھی بدل گیا ہے۔ ہر لمحہ انہیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں میں دو بچوں سمیت ان کے سر پر نہ جا بیٹھوں، جنہیں اکیلے رہنے کی عادت ہو جائے، انہیں کسی کی مداخلت اچھی نہیں لگتی۔ میں صرف ملنے بھی چلی جاؤں تو وہ نہایت روکھے انداز میں ملتی ہیں۔

”ہوں۔۔۔ تو یہ کہو ناں کہ یہ تیسری وجہ ہی اصل بنیاد ہے۔ چلو مان لیا لیکن جب تم پوری تنخواہ دے کر سسرال بلکہ سابقہ سسرال میں رہ رہی ہو تو تمہارا رویہ اتنا غلامانہ کیوں ہے۔ کیوں تم اور تمہارے بچے تن کر مالکوں کے اسٹائل میں نہیں رہتے؟“

”یہ تو بری بات ہے۔“ اس نے فوراً بات کٹی۔
”پیسہ دے کر احسان جتائی اچھی لکوں گی کیا۔؟“

”ہاں جانتا ہوں۔۔۔ ایڑی کیشس میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے میڈم نے۔ لیکن جو لوگ تمہاری کمائی کھا رہے ہیں، کم از کم انہیں اڑا تا پتا ہو کہ جس کا کھاتے ہیں اس کے گرن بھی گاتے ہیں۔“

”ان کا رویہ بھی میرے ساتھ ٹھیک ہے۔ خواہ مخواہ تمہیں غلط فہمی ہوئی۔“ خزران باوجود کوشش کے اپنے لہجے کی کمزوری پر قابو نہ پاسکی۔

”دنیا تم پر باتیں بنا رہی ہے بے وقوف لڑکی۔ جب سے آیا ہوں۔ خانہ ان بھر میں یہی سرگوشیاں گردش کر رہی ہیں کہ خزران علیحدگی کے بعد بھی سسرال میں بیٹھی ہے۔ سمجھا بھابھی کا رویہ تمہیں نظر آتا ہے اور جیٹھانی لبنی کی پریشانیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ جب یا سر سے تمہارا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو آصف بھی اب تمہارا جیٹھ نہیں ہے۔ نہ تم اس کی بھابھی ہو۔ گھر میں جو ان خوب صورت عورت کے رہتے، لبنی کو سوتے جاتے ہول اٹھتے ہیں۔“ وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا۔

”فضول باتیں مت کرو عازم! آصف بھائی سے میرا جو احترام اور عقیدت کا رشتہ ہے، کم از کم اس پر تو انگلی مت اٹھاؤ۔“ وہ بری طرح بگڑ گئی۔
”انگلی نہیں اٹھا رہا۔ میں نے تو لبنی بھابھی کے

کو تیار نہیں۔“
”شاید تب تک وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نئی بہو کراچی کے بہت بڑے جیولر کی بیٹی ہے۔“

”یہ بات یہاں سب کو پتا ہے کہ اس لڑکی کا باپ سونے کا تاجر ہے۔“ خزران نے عازم کے اندازے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا اور تمہیں لگتا ہے یہاں یہ بات سن کر کسی کی رال نہیں ٹپکی ہوگی۔ یہ لوگ اس امیر کبیر دلہن کا استقبال کرنے کے لیے بے چین ہیں اور تم۔“ وہ پھر غصہ کھا گیا۔

”غلط فہمی ہے تمہاری۔“ خزران نے لہجہ سخت کیا۔ ”سب تمہارے مفروضے ہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں اپنی پوری تنخواہ اماں جی کے ہاتھ پر رکھتی ہوں۔ وہ جیسے چاہے استعمال کرتی ہیں۔ پھر کیوں وہ مارے یہاں سے جانے پر خوش ہوں گی۔“
”مائی گاڈ۔!“ وہ چلایا۔ ”تمہاری آمدنی پر پلنے کے بعد بھی ان کا رویہ تمہارے ساتھ شکر گزاروں والا ہونے کے بجائے احسان جتانے والوں جیسا ہے۔ ایک نظر اپنے بچوں کو دیکھو۔ گلی میں پھرتے بچے لہجے ان سے اچھی حالت میں ہوتے ہیں۔ انہیں چھوڑو، خود کو دیکھو۔ گھروں میں کام کرنے والی ماسیاں بھی شرمنا جائیں۔ ادب مرو کہ تم ایک کلج کی پروفیسر ہو۔ پکڑے بیچ کر ڈگری حاصل کی ہے کیا؟“ وہ اچانک اتنے غصے میں آیا کہ ایک لمحے کو خزران سم سی گئی۔

”کل ہی اپنا سامان باندھو اور جنید کی طرف چلو۔ اس کی تو میں ٹھیک ٹھیک خبر لیتا ہوں۔“ وہ اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر غصے میں تھا۔

”پلیز عازم! میری بات ٹھنڈے دماغ سے سنو۔“ خزران کے ہاتھ پیر ہی پھول گئے اس کا رویہ دیکھ کر۔
”دیکھو! یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ جنید بھائی تو بہت بار مجھ سے کہہ چکے ہیں کہ میں ان کے ہاں آجاؤں لیکن۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ”تم سمجھا بھابھی کی طبیعت تو جانتے ہو۔ پھر جب سے میری

روئے ہے جو محسوس کیا وہی بتا رہا ہوں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایسے بے ہودہ و نام میں کبھی نہیں پڑیں گی۔“

”اوکے لیواٹ۔ تمہاری لبنی بھابھی کو تو میں زیادہ نہیں جانتا۔ ہم سمجھنا بھابھی کی بات کرتے ہیں۔ اب وہ تو میرے ماموں زاد کی بیوی ہے۔ اس کو تو میں قریب سے جانتا اور سمجھتا ہوں۔ یہاں تم اپنی سالیہ سسرال پر ہر مہینے بلا وجہ پوری تنخواہ لٹا رہی ہو۔ اگر اس کا آدھا حصہ کے ہاتھ پر رکھ دو تو نہ صرف عزت سے سگے بھائی کے گھر رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا بلکہ یہی بھابھی تمہارے پیروں پر دھو کر بھیجے گی۔ پھر نہ دنیا کی باتیں ہوں گی اور نہ ایسی غلامانہ زندگی جو میں آج دیکھ کر آیا ہوں۔“

اس نے اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں مفت مشورہ دیا اور خزان کچھ بولنے کی کوشش میں منہ کھولے بیٹھی رہ گئی اسے حیرت ہوئی کہ اتنی ٹھوس جامع اور پتے کی بات اس کے دماغ میں کیوں نہ آئی۔ ”تم میری باتوں پر غور کرو۔ جنید سے فی الحال میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرتا۔ اور ہاں۔ اب نکلو اس دکان سے کہ یا سرنے تمہارے ساتھ بے وفائی کی اور تمہیں چھوڑ دیا۔ اب کوئی نیا غم پالو۔ اپنی اولاد کی فکر کرو اس وقت ان کا واحد سہارا صرف اور صرف تم ہو۔ راتوں کو تکیے بھگونا اور دنیا والوں کی ہمدردیاں بنو رہا بند کرو۔ دم ہے تو ان دو معصوموں کے لیے کچھ کر کے دکھاؤ۔ جنہیں بلا وجہ رشتوں کی چکی میں پیس کے رکھ دیا ہے۔ نکالو انہیں دادا دادی اور چچا چچی کے چکر سے۔ انہیں صرف تمہارا وقت تمہاری ثروت اور تمہارا ساتھ چاہیے۔ کیوں انہیں زبردستی پرانے رشتوں سے چکا کر بیٹھی ہو۔ تمہاری ساس صاحبہ نے آج کی ایک گھنٹے کی ملاقات میں کوئی تین مرتبہ آہ بھر کر یا سرنے کو یاد کیا اور کہا کہ اس کی وجہ سے چپ ہوں۔ ہر کسی کو اپنی اولاد سے مطلب ہوتا ہے۔“

وہ اجازت لیتے لیتے بھی پوری تقریر کر گیا۔ خزان نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔

”یہ تو میں ہمیشہ سے جانتی ہوں عازم! کہ تم میرے سچے خیر خواہ ہو لیکن آج بھی اتنا ہی درد محسوس کرتے ہو۔“ وہ خاموشی سے آکر بچوں کے ساتھ لیٹ گئی۔ چھت کو گھورتے ابھی انھری سوچوں سے نتیجے اخذ کرتے جانے کب وہ آٹھ سال پیچھے چلی گئی۔ یا سرے شادی طے پانے سے محض دو مہینے پہلے تک بھی اس کی اور عازم کی دنیا کی انقلاب اور طوفان سے قطعاً نا واقف اور انجان تھی۔



”کیا کر رہی ہو پاگل۔ یہ ایکسیلیٹر ہے۔“ عازم اپنے غصے پر حسب عادت ناہونہ پاسکا۔ ”جاؤ میں نہیں سیکھتی ڈرائیونگ۔“ وہ زور سے کندھا جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ عازم کو ہنسی آگئی۔

”یار! تین مرتبہ بتا چکا ہوں لیکن تمہیں بریک اور ایکسیلیٹر کا فرق ہی سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ ”تو پیچر کی طرح سمجھاؤ ناں۔ مالکوں جیسا رعب کیوں ڈال رہے ہو۔“ خزان نے منہ پھلایا۔

”ہم کہاں کے مالک مالکہ عالیہ! گاڑی بھی آپ کی ہے اور بندہ بھی آپ کا غلام ہے۔“ وہ رومانٹک ہونے لگا تو خزان نے مسکراہٹ دی۔ ”اچھا بس بس۔ جب تمہارے گھر آ جاؤں تب کہنا فی الحال ابو کو منانے کا کچھ سوچو۔“

”ارے یار! یہ ابو کہاں سے آگئے بیچ میں۔ کیوں لانگ ڈرائیو کا ٹاس مار رہی ہو۔“ عازم سچ بچ بد مزہ ہو گیا۔ خزان زور سے ہنس پڑی۔

عازم نے اب ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ خزان نے مزید ڈرائیونگ، بریکش کا ارادہ ترک کر دیا اور گھوم کر فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔

”کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے سر پر لٹکی تلوار ہٹ نہیں جائے گی۔ یہ دو“ ابے“ ہمیں سچ بچ ہی نہ لے ڈو میں۔ ابھی بھی وقت ہے نہ جاؤ ملائشیا اور ان دو ابوجان کے آپس کے اختلافات پر دھیان دو۔“

”اور کتنا سر بٹخوں رازی جان۔۔۔! روز ایک نئے
آئیڈیے اور نئے حل کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچتا
ہوں لیکن لمبی لمبی بے مقصد بحثوں کے بعد بھی ان چار
دکانوں کا مسئلہ کالا باغ ڈیم کی طرح بجائے حل ہونے
کے وہیں ٹھہر رہا تھا۔“
”پھر ہوگا کیا عازم۔۔۔؟“ خزران کی تشویش کچھ
اچانک ہی بڑھی تھی۔

”پوچھوں گا ان نند بھالی سے جنہوں نے دو معصوم
بچوں کو نا سمجھی کی عمر میں ایک دوسرے سے منسوب کر
دیا۔“

”یعنی ہمارا رشتہ ہونا اصل غلطی ہے۔“ خزران
اس کے جملوں پر جربز ہونے لگی۔ ”ویسے اتنے نا سمجھ
بھی نہیں تھے ہم۔ میں پندرہ سال کی تھی اور جناب
شاید سترہ اٹھارہ سال کے۔“ اس نے یاد دلایا۔
”چلو مان لیا لیکن جب ہماری ماؤں کے شوہروں کی
آپس میں نہیں بنتی تھی تو کیا ضرورت تھی ایسا نازک
پنگالینے کی۔۔۔ لے کہ ہماری زندگی مصیبت میں ڈال
دی۔“

”تمہیں میں مصیبت نظر آتی ہوں۔“ وہ روہانی
ہو گئی۔ ”پھر کیوں جگہ جگہ ساتھ لیے پھرتے ہو۔“
”محبت کا روگ جو بھی پالتا ہے نری مصیبت ہی تو
مول لیتا ہے۔“ وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے
لگا۔ خزران کا چہرہ ایک دم گلابی ہو گیا۔
”صرف بولنا آتا ہے۔ کرتے تو کچھ ہو نہیں۔“
اس نے منہ بنا کر شکوہ کیا تو عازم کا بے ساختہ قہقہہ بلند
ہوا۔

”اب اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے۔
تمہارے دماغ کا بھی بس اللہ حافظ ہے۔“ خزران کو
اس کی بے وقت کی ہنسی بالکل اچھی نہیں لگی۔
”بولے سے پہلے سوچا تو کرو۔ خیر یہ بتاؤ۔ میرے
ملائشیا جانے سے کیوں ناخوش ہو؟“ اس نے موڑ
کاتے ہوئے ایک نظر خزران کو دیکھا۔

”کیونکہ تم جھوٹے اور وعدہ خلاف ہو۔ میں تو
تمہیں خدا حافظ کہنے بھی نہیں آؤں گی۔“ وہ پرانی بات

یاد آنے پر پھر سے غصہ کھا گئی۔

”ارے اتنا غصہ۔۔۔ یار! تمہاری قسم! ارادہ تو میرا
بھی یہی تھا کہ جانے سے پہلے ہماری شادی کا کچھ سلسلہ
ہو جاتا یا کم از کم نکاح ہی ہو جاتا تاکہ وہاں جا کر میں
تمہیں بلوانے کے لیے کچھ کرتا۔ تمہیں بلوانے کے
لیے نکاح نامے کی کافی بہت ضروری ہے۔ لیکن دیکھ لو
یہ نئے حالات۔۔۔ خالد نے مجھے واقعی یہی کہا تھا کہ دو ماہ
بعد آتا ہے لیکن اب اچانک یہ کہہ کر فوراً بلا لیا کہ
وہاں ایک جگہ خالی ہوئی ہے اور نیا بندہ ارجنٹ
چاہیے۔ اگر میں نہ گیا تو وہ کسی اور کو لگالیں گے۔ یار!
ایک سال کی تو بات ہے۔ نیم لوگ شادی کی تیاریاں
شروع کرو۔ سال گزرنے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔“
”باتوں کے شہنشاہ ہو تم۔ خود تو ابھی نہیں بیٹھے ہو
اور ہمارا وعدہ بھی کروا دیا۔“ وہ بالکل اس کی باتوں میں
نہیں آرہی تھی۔ عازم نے مسکراتے ہوئے گاڑی
روک دی۔

”تمہارا باپ ویسے بھی میری شکل سے نالاں ہے۔
اب اگر بنا نوکری کے ننھلوں کی طرح جا کر شادی کی
بات کروں گا تو جوتے مار کے بھگائے گا۔“

”شرم نہیں آتی۔ کیسی رف لینگو تن بول رہے
ہو۔ میرا باپ تمہارا سگاماموں ہے۔“ وہ براہمن گئی۔
”ہونے والا سر بھی نہ ہے۔“ وہ زور سے ہنسا تو
خزران مسکرانے لگی۔ ”بد تمیز کہیں کے۔۔۔“
”کہیں کے نہیں۔ ہفتے بعد تو ملائیشیا کے کہنا۔“
”بہت خوش ہونا؟“ خزران پھر سے اداس ہو گئی۔
تو عازم نے ایک آہ بھری۔

”نہیں رازی۔۔۔ قسم سے دل بہت بھاری ہے۔
لیکن مرد ہوں ناں۔ اپنے جذبات چھپانے پڑتے
ہیں۔“

”دل کیوں بھاری ہے۔۔۔؟“ خزران نے بے
ساختہ سوال کیا۔

”اب یہ بھی پوچھو گی۔۔۔ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”ہاں نا۔۔۔ مجھے کیا پتا۔“

”تم لڑکیاں بھی ناں۔۔۔ ذرا بھروسا نہیں کرتیں۔

اب سوچ رہی ہوگی ضرور اس کی وجہ ”میں“ تو نہیں ہو سکتی۔ ماں کی وجہ سے اداس ہو گا۔ دوستوں کی وجہ سے یا پھر گھر چھوڑنے کے خیال سے۔۔۔ ہوں؟“ اس نے تائید طلب نظروں سے دیکھا تو خزران نے شرمندگی سے نیچا سر دیا۔

”تم کبھی کچھ بتاتے بھی تو نہیں ہو۔ ہر وقت تو غصے میں رہتے ہو۔“

”غصہ کرنے والوں کا دل نہیں ہوتا کیا۔؟“ اس نے سادگی سے خزران کا ہاتھ تھاما تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔ آج تو بڑا مہربان رویہ تھا۔ یہ دعوائے حلفیہ کر سکتی تھی کہ عازم صرف اور صرف اسی کو چاہتا ہے۔ لیکن وہ طبیعت کا ایسا الابیالی اور لا پروا تھا کہ ہمیشہ بس مستی کے موڈ میں رہتا تھا جبکہ وہ خود پھول کی پتیوں سے نازک جذبات والی رومانٹک اور جذباتی لڑکی تھی۔ پندرہ برس کی عمر میں امی اور پھپھو نے اسے عازم کے نام سے منسوب کر دیا تو بس ہمیشہ کے لیے دل کی لوح پر کندہ ہو گیا۔ لیکن اس کے ابو اور پھوپھا کے اختلافات کا اونٹ برسوں گزرنے پر بھی کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔

خزران کے والد توفیق حسین نے براہِ پی خریدنے کا ارادہ کیا تو کسی نے مین روڈ کی چار دکانیں دکھائیں جو انہیں بہت پسند آئیں۔ سو چار دکانیں کرایہ پر اٹھادیں تو ہر مہینے معقول کرایہ بھی ملنے لگے گا۔ لیکن دکانوں کی قیمت ان کی برماط سے قدرے زیادہ تھی۔ انہوں نے اپنے بہنوئی جاوید علی یعنی عازم کے والد سے بات کی تو چار میں سے دو ایک دکان خریدنے پر رضامند ہو گئے۔ یوں چاروں دکانوں کی رقم یکمشت ادا کر کے معاملہ حل کر لیا گیا۔ جاوید علی ان دنوں پارٹ ٹائم چھوٹا موٹا بزنس کرنے کا ایسے بھی سوچ رہے تھے۔ دکان کا مالک بننے کے بعد ارادہ مزید پختہ ہو گیا۔ عازم ابھی میٹرک میں تھا، لیکن عرفان نے گریجویشن مکمل کر لیا تھا۔ انہوں نے عرفان کی مدد سے آٹو اسپئر پارکس کی دکان کھول لی۔ کام چل نکلا اور آہستہ آہستہ پوری طرح قدم جم گئے۔ البتہ توفیق حسین نے اپنی مین دکانیں

کرایہ پر لگا دی تھیں۔ لیکن چند ماہ بعد جیسے ہی ریٹائرمنٹ ملی اور بہت سارا پیسہ اکٹھا ہاتھ آیا تو ملنے جلنے والوں نے مشورہ دیا کہ دکانوں کی جگہ ڈبل اسٹوری مارکیٹ تعمیر کرائیں۔ بات ان کے دل کو لگی اور انہوں نے نیچے سپر مارکیٹ اور اوپر گارمنٹس شاپ بنوانے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس سب سے منصوبے میں بڑی رکاوٹ جاوید علی کی دکان تھی۔ توفیق حسین کو اب وہ چوتھی دکان ہر قیمت پر چاہیے تھی کیونکہ اسے واپس لیے بنا مارکیٹ تعمیر نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جاوید علی سے کہا کہ وہ اپنی دکان انہیں بیچ کر اپنا کاروبار کہیں اور شروع کر دیں۔ لیکن جاوید صاحب اس بات پر اڑ گئے کہ ان کا کاروبار لوکیٹن کی وجہ سے کامیاب جا رہا ہے۔ اگر جگہ تبدیل کر دی تو کام ٹھپ ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی وہ اپنی دکان کے قانونی مالک ہیں۔ بنا اپنی مرضی کے وہ کیوں دکان سے دستبردار ہوں۔ عازم اور عرفان کئی طرح کے آئیڈیاز لے کر ماموں کی خدمت میں حاضر ہوتے اور تبھی چند پھوپھا کو قائل کرنے کے لیے ان کے پاس آ بیٹھتا لیکن ڈھاک کے وہی تین پات کے مصداق معاملہ تھا کہ سلجھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وقت کافی آگے سرک گیا۔ خزران اس وقت بیسیویں سال میں تھی اور گریجویشن کر رہی تھی۔ عازم ایم بی اے فٹالس کرنے کے بعد فارغ تھا۔ اس کے دوست خالد نے ملائیشیا میں اس کی جاب کے لیے کوششیں شروع کر دی تھیں۔ اور پھر ہتا بھی نہیں چلا اور دنوں میں اس کا کام ہو گیا۔

عازم ملائیشیا چلا گیا تو خزران کے وہی شوق رہ گئے۔ دن میں اسے لمبی لمبی ای میلز لکھتی اور رات کو چٹنگ کرتی۔ ان ہی دنوں یا سر کی والدہ اپنی بہو لبنی کے ساتھ ان کے گھر آئیں۔ خزران انہیں جانتی تھی نہ پہلے کبھی دیکھا تھا۔ اس لیے بالکل بھی ان کی آمد پر دھیان نہیں دیا لیکن پھر تھوڑے دنوں کے وقفے سے وہ لوگ دوسری اور پھر تیسری مرتبہ آئے تو اس کا ہاتھ ٹھنکا۔ امی سے پوچھا تو وہ چھپا۔ سکیں اور خزران ہکا بکا بیٹھی رہ گئی۔ ابو نے یا سر سے اس کی بات پکی کر دی

بھی وقت اس سے عازم اور اس کے رشتے کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ لیکن صرف ایک بار اس کی ساس نے ذکر چھیڑا۔

”سنا ہے تمہاری پھوپھو سنجیدہ اس لیے شادی میں نہیں آئیں گی کیونکہ وہ اپنے بیٹے کی شادی تم سے کرنا چاہتی تھیں؟“

”جی۔۔۔ ان کی یہ خواہش ضرور تھی لیکن ہمارے گھر میں کوئی ایسا نہیں چاہتا تھا۔“

خزران نے سوچا سمجھا جواب دیا تو انہوں نے بھی لا پرواہی سے سر ہلادیا۔ اور بات آئی گئی ہو گئی اور یا سرتو گھونگھٹ اٹھاتے ہی خزران کی موہنی صورت کا ایسا دیوانہ ہوا کہ دن رات صبح شام سوائے خزران کے گرد پروانے کی طرح گھومنے کے اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ اور وہ بھی رفتہ رفتہ یا سرتی محبتوں کی عادی ہوتی چلی گئی۔

یا سرتی بحسن میں کام کرتا تھا اور شادی کے لیے دو ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ یا سرتی کا ارادہ تو یہی تھا کہ بحسن واپس جاتے ہی خزران کو اپنے پاس بلا لے لیکن اماں نے خزران کی طبیعت کو دیکھتے ہوئے منع کر دیا۔ وہ امید سے بھی اور چونکہ پہلا بچہ تھا اس لیے اماں کو وہ ہم لائق ہو رہے تھے کہ وہ اکیلی کیسے رہ پائے گی۔ یوں فوری طور پر اس کا جانا کینسل ہو گیا۔

اور نو مہینے بعد جب رافع اس کی گود میں آیا۔ عین ان ہی دنوں میں عازم کا ملائشیا میں ایک سال پورا ہوا اور وہ پہلی چھٹی پر پاکستان آیا۔ گھر والے تو اسے پہچان ہی نہیں پائے۔ سنجیدہ اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔ ایسے لٹے پٹے، شکست خوردہ خاموش عازم کو انہوں نے کب یہاں سے رخصت کیا تھا۔

پہلا شک انہیں یہ لاحق ہوا کہ عازم کیسے نشے کی لت میں تو جھلا نہیں ہو گیا۔ لیکن اپنی عمدہ تربیت کے مان نے انہیں ایسا سوچنے سے باز رکھا۔ وہ جان گئیں کہ عازم کی یہ حالت خزران کی شادی کے باعث ہوئی ہے۔

انہوں نے فضلہ کے ساتھ مل کر اگلے ہی دن سے

تھی۔

اسے اب تو کچھ نہیں سوچھا فوراً ”فضلہ بھابھی کو فون کر دیا۔ وہ بھی سن کر کالی پریشان ہوئیں۔ شام کو سنجیدہ پھوپھو، سیکندہ پھوپھو اور فضلہ بھابھی ابو سے بات کرنے کے لیے ان کے گھر آ گئیں۔ لیکن ان کا آنا تھا کہ گھر میں طوفان کھڑا ہو گیا۔ اس کے ابو نے سنجیدہ پھوپھو کو خوب سنائیں کہ انہوں نے اپنے شوہر کو دکان واپس دلوانے کے لیے ایک بار بھی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ سیکندہ پھوپھو پر بھی سخت ناراض ہوئے کہ وہ بھائی بھائی کا ساتھ دینے کے بہن کی حمایت میں بولنے آ گئیں۔ اور یہ اعلان بھی صاف الفاظ میں کر دیا کہ خزران اور عازم کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ چکا ہے۔ اور وہ اسی مہینے کے آخر میں خزران کی شادی کرنے والے ہیں۔ سنجیدہ نہایت مایوس دل لیے بھائی کے گھر سے واپس وٹ گئیں۔ ان کے لیے سب سے مشکل مرحلہ عازم کا سامنا تھا۔ اس کے بے شمار سوالات کا جواب دینا انتہائی مشکل کام تھا۔ اس سے تو یہ بھی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ ملائشیا سے ہی واپس آجائے۔ لیکن جب تقدیر اپنی من مانی کرنے پر آتی ہے تو ساری راہیں کوشش کے باوجود مسدود ہو جایا کرتی ہیں۔

عازم کی انٹی نئی جاب تھی۔ چھٹی بھی نہیں مل رہی تھی اور پاسپورٹ بھی کمپنی کے پاس تھا۔ ایک مخصوص مدت پوری ہونے تک اسے جاب چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ سوائے کسی انتہائی ایمر جنسی کے اس کا واپس آنا ممکن نہیں تھا۔ قسمت نے کچھ ایسے اس کے ہاتھ پیریاں دے دیے تھے کہ ساری بھاگ دوڑ رائیگاں گئی اور عازم روتی، گڑ گڑاتی خزران کے آنسو تک نہیں پونچھ پایا۔

اور وہ معاشرے کی اپنے جیسی بے شمار دوسری لڑکیوں کی طرح فرماں برداری پر مجبور کر دی گئی۔ عازم کی محبت کو باپ کی دلیزیر دوسری تمام سہالی یا دوا سمیت دفن کر کے یا سرتی حسین کے گھر آ گئی۔ شادی کے دنوں میں وہ بہت خوفزدہ اور ڈری ڈری رہی کہ کسی

لڑکی کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ عازم چونکہ دو ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا اس لیے وہ یقین نہیں کہ کہیں نہ کہیں سلسلہ ضرور جم جائے گا۔ یوں قرعہ نال سارہ کے نام نکلا۔ سارہ کا تعلق غیر خاندان سے تھا۔ جلد شادی کرنے پر ان کی طرف سے زیادہ حیل و حجت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور عازم کے ملائشیا جانے سے بیس دن پہلے سارہ بیاہ کر ان کے گھر آگئی۔ کزن کی حیثیت سے خزان نے بھی شادی میں شرکت کی۔

انسانی ذہن بھی اللہ تعالیٰ نے خوب بنایا ہے۔ انقلابی تبدیلیوں کی آمد سے پہلے تو انہیں سوچنا بھی نا ممکنات ہیں سے لگتا ہے۔ لیکن وہی انقلابی تبدیلیاں جب وقوع پذیر ہو جاتی ہیں تو بڑی سہولت سے ذہن نہ صرف انہیں قبول کر لیتا ہے بلکہ بعض حالات میں ہم یہ بھی سوچنے لگ جاتے ہیں کہ ”اب“ جو ہوا وہی ٹھیک ہے۔ خزان جو کبھی یہ سوچا کرتی تھی کہ شاید اب وہ زندگی بھر عازم کا سامنا نہیں کر پائے گی، بڑے ہی ناز مل دل و دماغ سے ہر فنکشن میں شریک ہوئی۔ البتہ عازم کا شادی کے دوران جتنی مرتبہ بھی اس سے سامنا ہوا وہ ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈال کر رخ بدل گیا۔

عازم نے ملائشیا واپس جاتے ہی سارہ کو اپنے پاس بلوانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور شادی کے تین ماہ بعد ہی وہ عازم کے پاس ملائشیا چلی گئی۔ اوہر ایک سال پورا ہونے پر یا سر بھی پاکستان آگیا۔ خزان اس کی آمد پر بے حد خوش تھی لیکن جانے کیسے وہ ایک مہینہ پرانا کراڑ گیا۔ یا سر بھی واپس جاتے ہوئے بہت اواں تھا۔ خصوصاً ”رافع کو چھوڑ کر جانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس نے خزان سے وعدہ کیا کہ جاتے ہی وہ انہیں بلوانے کی کوشش کرے گا۔ خزان حد سے زیادہ پر امید تھی کہ جلد ہی وہ اور رافع یا سر کے پاس ہوں گے۔ لیکن یا سر نے واپس جاتے ہی کمپنی کی صورت حال اور اپنی جاب کے حالات کے بارے میں بتایا کہ فی الحال معاملات زیادہ ٹھیک نہیں چل رہے۔

کچھ دن بعد پھر یہ ”کچھ دن بعد“ کا سلسلہ طویل ہوتے ہوتے،

مزید ایک سال لے گیا اور یا سر دوسری چھٹی پہ پاکستان آگیا۔ اور اس بار جب وہ گیا تو خزان ایک مرتبہ پھر امید سے تھی۔ یعنی اب تو کچھ کہنا ہی بے کار تھا۔ اور مسائل کی پیدائش کے بعد تو وہ مصروف اس قدر ہو گئی کہ سوچنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ کچھ گزرے تین سالوں نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اماں اس کے پردیس جانے کے حق میں نہیں تھیں۔ کیونکہ اس کے بحرن جانے سے یا سر کے اخراجات ایک دم سے بڑھ جاتے اور گھر بھیجی جانے والی رقم پر برے اثرات مرتب ہوتے۔

خزان نے یہ سب دیکھ سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی اور یا سر کو اپنے بلوانے کے متعلق کہنا چھوڑ دیا۔ اب اس نے کیلنڈر سے دوستی کر لی تھی۔ جہاں یا سر کے آنے جانے اور پھر انتظار کے بے شمار دنوں کا حساب درج تھا۔ بلکہ یا سر کے پاس بحرن نہ جانے کا ایک فائدہ یہ ہو گیا کہ اس نے آگے پڑھائی جاری رکھی۔ شادی کو چھ سال گزر گئے۔

رافع پانچ سال کا اور، نائل تین سال کی تھی جب پہلی مرتبہ معمول کے مطابق چلتی لگی بندھی زندگی میں پریشانی کی ہوا چلی۔ اصف بھائی کے ایک دوست کی بیوی سعدیہ ان کے گھر آئی تو اس نے اماں کو بتایا کہ اس نے یا سر کے متعلق کچھ سنا ہے۔ سعدیہ کا بھائی بحرن میں رہتا تھا۔ اس نے بتایا کہ یا سر وہاں کسی پاکستانی لڑکی میں انوالو ہے بلکہ شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ اماں کو یقین تو نہیں آیا لیکن سعدیہ کو بھی وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ ایک پڑھی لکھی سوہ لڑکی تھی۔ بلاوجہ لگائی بھائی کرنا اس کی فطرت نہیں تھی۔ اماں نے اسی شام خزان سے بات کی اور کہا کہ وہ صاف صاف یا سر سے اس بارے میں پوچھ گچھ کرے۔

خزان کی کیفیت بھی کچھ اماں جیسی ہی تھی۔ ایسے اچانک اتنی بڑی بات کا سامنے آنا کچھ ناقابل یقین سا لگ رہا تھا۔ پھر ابھی دو ماہ پہلے ہی تو یا سر چھٹی گزار کر گیا تھا۔ اس کے دوسرے اور محبت میں اس نے کہیں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کی تھی۔ پھر بھی اس نے یا سر سے

بات کر لی لیکن ظاہر ہے کہ وہ صاف ٹال گیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ حتیٰ کہ مہینوں گزر گئے اور بات خزران کے دماغ سے بھی نکل گئی کہ اچانک ایک دن آصف بھائی کے نام یا سر کا خط آ گیا۔ حالانکہ دونوں بھائی انٹرنیٹ اور فون کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ میں تھے پھر بھی یا سر نے خط کا سہارا لیا۔ شاید وہ شرمندگی سے بچنا چاہ رہا تھا۔

اس نے لکھا کہ وہ قرۃ العین سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کا تعلق کراچی سے ہے لیکن وہ اپنے والدین کے ساتھ بحرین میں رہتی ہے۔ یعنی مجھ سے شادی کی شدید خواہش مند ہے اور وہ خزران اور بچوں کو قبول کرنے کو بھی تیار ہے لیکن اس کے والد ہرگز ایک شادی شدہ مرد کو داماد بنانے کو راضی نہیں ہیں۔ بالآخر بہت مشکلوں سے انہوں نے اس شرط پر شادی کی اجازت دے دی کہ میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دوں تب ہی یعنی سے شادی کر سکتا ہوں۔ اور یا سر یعنی کی محبت میں خزران کو طلاق دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ آصف بھائی کے ذمے اس نے یہ کام لگایا کہ وہ اماں کو بتادے اور خزران کو سمجھائے۔ آصف کو خط بڑھ کر شدید غصہ آیا اور یا سر کو فون کر کے کسی بھی قسم کے تعاون سے قہراً انکار کر دیا۔ اماں بھی سن کر سخت ناراض ہوئیں کہ خزران اور بچوں کو بے قصور اتنی بڑی سزا دینا سراسر زیادتی ہے۔ خزران کا تو یہ حال تھا کہ اسے یہ سب کچھ جھوٹ اور مذاق لگ رہا تھا۔ اس نے یا سر کو فون کیا کہ ابھی وہ ہنس کر کہہ دے گا کہ ڈیر یہ سب مذاق تھا۔ لیکن وہ تو آگے سے رونے لگا۔

”میں بہت مجبور ہو گیا ہوں خزران! تم تو جانتی ہو میں تم سے اور بچوں سے کتنا پیار کرتا ہوں۔“

”لگ کیا بات ہے یا سر! تیری مجبوری پلینز کھل کر بتائیں۔“ اس کے تو ہاتھ پیر ہی پھول گئے یا سر کو روتا دیکھ کر۔

”میں نے بیٹی کے باپ سے لاکھوں روپے کا قرض لیا تھا لیکن میرے حالات ابھی ایسے نہیں ہیں کہ رقم انہیں لوٹا سکوں۔ اور انہیں لگتا ہے کہ میں کسی بھی

وقت جاب چھوڑ کر پاکستان بھاگ جاؤں گا اور واپس نہیں آؤں گا۔ وہ مجھے اب ہر طرح سے پھانس رہے ہیں۔“

”آپ نے قرض کیوں لیا یا سر اور۔ اور آپ کو وہاں روکنے رکھنے کا حل شادی ہی کیوں۔ آپ ہم سے کہیں ناں ہم یہاں رقم کا کوئی بندوبست کرتے ہیں۔“ وہ سادگی سے اس کی دلجوئی کرنے لگی۔

”کچھ نہیں ہو سکتا خزران۔! یہ لوگ بہت ہوشیار ہیں۔ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ میرے پاس فرار کی کوئی راہ نہیں۔ میں بہت بری طرح پھنس چکا ہوں۔“ وہ ابھی بھی رو رہا تھا۔

”آپ واپس آجائیں یا سر۔ پلینز جاب چھوڑ کر جلد از جلد ہمارے پاس آجائیں۔“ وہ رور کر اس کی منتیں کرنے لگی۔ لیکن ہوا انہیں یہ کہ ایک ہفتے بعد یا سر کی طرف سے طلاق نامہ آ گیا اور وہ ایسی بےوقوف تھی، شدید دکھ کی کیفیت میں بھی یہی سوچے جا رہی تھی کہ پتا نہیں یا سر وہاں کرن مجبوریوں کا شکار ہو گیا ہے لیکن یا سر کے فریب کا پردہ بھی جلد ہی چاک ہو گیا۔

وہ طلاق کا کوئی بیسواں روز تھا۔ آصف بھائی کی بڑی بیٹی لاریب لیپ ٹاپ لے کر اوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

”یہ دیکھیں خزران چچی۔۔۔ یا سر چاچو کی نئی دلہن“ وہ تقریباً دھکا دیتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی، اور لیپ ٹاپ اس کے سامنے کیا۔ خزران نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہ دیکھیں! یا سر چاچو نے اپنے فیس بک اکاؤنٹ پر ہنی مون کی نئی پکچر اپ لوڈ کی ہیں۔“

مصر کے حسین مضافات میں وہ اپنی نئی دلہن کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے نہایت شاداں و فرحاں دکھائی دے رہا تھا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کہیں وہ اسے اپنے ہاتھوں سے آکس کریم کھلا رہا تھا تو کہیں وہ لڑکی اس کے بازو سے چپکی کھڑی تھی۔

خوب صورت نقوش کی مالک وہ گوری سی لڑکی یا سر
کوپا کر نہایت مسرور لگ رہی تھی۔ زندگی سے بھرپور
ان تمام تہائیہ میں کہیں بھی یا سرافسردہ اور مجبور یوں کا
مارا نہیں لگ رہا تھا۔

اس رات پہلی مرتبہ خزان نے اپنی اور یا سر کی
شادی کی تصاویر پر زے پر زے کر کے ڈسٹ بن کے
حوالے کیے۔ گزشتہ بیس راتوں سے جنہیں ہاتھ میں
اٹھا کر وہ بین کیے جا رہی تھی۔ حالانکہ ان تصاویر کو
سنہال کر رکھنا ویسے بھی اب بے معنی تھا۔ وہ سے اپنی
زندگی سے نکال چکا تھا۔ اب وہ اس کی کچھ نہیں لگتی
تھی۔ دلہانے تسلیم کر لیا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا
ہے۔ ہار لیکن اب پچھلے پانچ چھ ماہ کے دوران نہیں
کم ہوئی تھیں تو اس کی بے چینی اور شدید احساس
محرومی۔ وہ رات رات بھر جاگ کر سوچتی کہ کہاں کی
رہ گئی تھی، خوب صورتی، تعلیم، اچھی عادات، یا سر
کے لیے محبت، اولاد، سب کچھ تو تھا پھر کیوں؟

لیکن عازم کے دو ہی جملوں نے ایسا زور دار اثر کیا
کہ ذہن پر پڑی جمود کی گرد ہٹنا شروع ہو گئی تھی۔
اسے کیسے پتا چل جاتا ہے ہر بات کا۔ جب اس نے
کہا کہ اٹھو اس احساس سے کہ یا سر نے تم سے بے
وفائی کی ہے۔ چھوڑ دو تکیے بھگوننا اور لوگوں کی
ہمدردیاں، پورنا تو خزان نے نہایت شرمندگی محسوس
کی۔ صحیح تو کہتا ہے جو ہو چکا وہ بدل نہیں سکتا پھر
کیوں وہ سوچ سوچ کر بلا وجہ اپنا اور بچوں کا نقصان کر
رہی ہے جبکہ یا سر وہاں دونوں ہاتھوں سے زندگی کی
خوشحال سمنیٹ رہا تھا۔

صبح کی نماز پڑھنے کے بعد وہ کتنی ہی دیر جائے نماز پر
گم صم بیٹھی رہی۔

”کتنی بڑی بے وقوف ہوں میں۔“ خود پر ہنستے
ہوئے ہانے کہاں سے دو آنسو بہ کر گال پہ اتر آئے۔
انہیں صاف کرتے کرتے وہ زار و قطار ہچکیوں سے
رونے لگی۔ دیر تک رونے سے دل کا کتنا غبار پاک ہو
گیا۔ وہ جائے نماز لپیٹ کر کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

جنیور بھائی نے یوں تو ہمیشہ اس کا بہت خیال رکھا تھا

لیکن امی، ابو کے گزر جانے کے بعد تو انہوں نے
خزراں کو اپنی ذمہ داری سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ ہمیشہ ہر
خوشی، غم، عید، برات کے موقع پر جتنا ان سے بن پڑا،
انہوں نے بہن کے لیے کیا۔ سمیٹا، بھی شروع سے
یہی دیکھتی آرہی تھیں کہ باوجود اپنے محدود وسائل کے
جنید نے بھی بہن کے معاملے میں کمی نہیں آنے
دی۔

لیکن بہن۔ اس نے کیا کیا تھا آج تک۔ ہمیشہ
سسرالیوں کو خوش کرنے کے جتن کرتی رہی۔ لین
دین کی لسٹ سے اس نے بھائی کو قطعی طور پر خارج
سمجھا ہوا تھا۔ کبھی بھائی، بھالی یا بھتیجیوں کے لیے کوئی
معمولی سا تحفہ بھی نہیں لیا تھا۔ عازم نے احساس دلایا
تو خزراں خود کو کوس کوس کر تھکنے میں نہیں آرہی
تھی۔ ناشتا بنانے اور کرنے کے دوران بھی وہ ایسی ہی
سوچوں میں گم تھی۔

”خزراں پلیز! تم ذرا یہاں بیٹھ جاؤ۔ مجھے آصف کے
سلاٹس پر مکھن لگانا ہے۔“ لبنی بھابی نے آہستہ آواز
میں کچھ جتانے کے، انداز میں درخواست کی تو وہ
چونکی۔ بے دھیانی میں ہانے کب وہ آصف بھائی کے
ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی
اور اماں کے پاس جا بیٹھی۔

”منائل! گوڈا کٹر کے پاس کب لے جاتا ہے؟ میں
ابھی آٹھ گھنٹے تک ایک ضروری کام سے باہر جاؤں
گا۔“ آصف نے براہ راست اسے مخاطب کیا، جواب
ابھی اس کے منہ میں تھا کہ لبنی بھابی بول پڑیں۔

”کوئی بات نہیں آصف! آپ جائیں۔ خزان کے
ساتھ میں چلی جاؤں گی۔ ویسے بھی اتنی صبح ڈاکٹر کہاں
آتے ہیں۔ کیوں خزان۔؟“

”جی بھابی۔!“ وہ مختصر جواب دے کر منائل کو
کھانا کھلانے لگی۔

”تو تم یہاں بھی درہت تھے عازم! جانے میں کس
دنیا میں رہتی ہوں۔“ لبنی بھابی کے ایسے جملوں سے تو
میرا روز واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن اس پنج پر کبھی سوچا ہی
نہیں۔ کیا لبنی بھابی کے مستقل سر درد کی وجہ میں

ہوں۔؟“ انہیں یہ مسئلہ ڈیڑھ دو ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔ ”تو کیا وہ میری یہاں موجودگی سے پریشان ہیں؟“ خزر ان چند اور سوالات کا بوجھ لیے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئی۔

کمرے میں آکر اس نے سب سے پہلے اپنا پرس کھنگالا، لیکن یہاں سے برآمد ہوئے بس ڈھالی، تین ہزار۔ اماں کے ہاتھ پر پوری تنخواہ رکھنے کے بعد وہ صرف اپنی ضرورت کی رقم ہی پرس میں رکھا کرتی۔ اس نے تھوڑی دیر کچھ سوچا، پھر الماری سے چیک بک نکال کر پرس میں ڈالی۔ طلاق سے پہلے چونکہ یا سر اسے ہر مہینے الگ سے رقم بھیجا کرتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی تنخواہ بینک سے نکلاتی ہی نہیں تھی۔ کم از کم پانچ چھ ماہ کی تنخواہ اس کے پاس اب بھی محفوظ تھی۔

بچوں کو تیار کرنے کے بعد اس نے اپنے لیے بھی ایک اچھا سوٹ نکالا۔ لبنی بھابھی سے اس نے کہہ دیا، کہ وہ کچھ دیر کے لیے جنید بھائی کے گھر جائے گی۔ انہوں نے تو جان چھوٹ جانے پر ویسے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ خزر ان اماں کو بتانے ان کے کمرے میں چلی گئی۔

منائل کو کچھ دن سے اسکنالرجی کا مسئلہ شروع ہوا تھا۔ پہلے اسے ڈاکٹر کو دکھایا، پھر مارکیٹ سے جنید بھائی سمیعہ بھابھی اور سندس، یسری کے لیے شاپنگ کی۔ جوش محبت ایسا غالب تھا کہ اس نے پوری رقم اڑا دی۔

جنید بھائی، گھر بنا اطلاع آکر انہیں حیران کرنے کی کوشش کی، لیکن وہاں عازم کو بیٹھے دیکھ کر خود حیران ہو گئی۔ وہ سب ہی اس وقت باہر صحن میں بیٹھے تھے۔ خزر ان نے شاپنگ پیگز بھابھی کو تھمائے اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ سچے البتہ سندس اور یسری کو ڈھونڈتے اندر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ سمیعہ بھابھی سامان رکھنے اندر گئیں تو جنید بھائی بھی ان کے پیچھے چلے گئے۔ شاید اس کی خاطر مہارت کے سلسلے میں۔

”تم کب آئے؟“ خزر ان نے تنک کر اسے گھورا تو وہ دبلی دبلی مسکراہٹ لیے اسے دیکھنے لگا۔

”آج لگ رہی ہو پروفیسر صاحبہ۔ ویسے خوشی ہوئی تمہیں یہاں دیکھ کر۔“ وہ اتنا بغور دیکھ رہا تھا۔

”تم کیوں خوش ہو رہے ہو۔ میرے بھائی کا گھر ہے۔ اکثر ہی آجاتی ہوں۔“ وہ خواہ مخواہ صفائی دینے لگی۔

”ہاں ابھی یہی بتا رہا تھا جنید کہ میڈم کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جاتے ہیں۔“ اس نے نہایت شوخی بھرے لہجے میں اسے مزید چڑا۔ کچھلی رات کی ڈائنٹ پھنکار اور غصے کا شائبہ تک نہیں تھا۔

”تم نے کوئی بات تو نہیں کی بھیا سے؟“ وہ ایک دم گھبرا گئی۔

”کون سی بات؟“ وہ بننے لگا۔

”وہی جو تم کہہ رہے تھے کہ میرے یہاں رہنے کی بات ان سے کرو گے۔“ وہ دہیمی آواز میں سرگوشی کرنے لگی۔

”ارادہ تو تھا، لیکن اب لگنا ہے ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ ہنسنا تو خزر ان بری طرح شرمندہ ہو گئی۔

”تمہیں گھر میں آرام نہیں آتا۔ خاندان بھر کی سن گن لیتے پھر رہے ہو؟“

”غصہ کرتی ہو تو قسم سے بہت اپنی اپنی لگتی ہو۔“ وہ آنکھوں میں چمک لیے پھر تنک کرنے لگا۔ خزر ان مزید غصہ کھا گئی۔

”اور جب تم منستے ہونا تو زہر لگتے ہو۔“ وہ پاؤں پٹختی اندر کی طرف برہہ گئی۔ پیچھے عازم کا بھرپور نقشہ بلند ہوا۔



وہ جب سے جنید بھائی کے گھر سے آئی تھی، عجیب منجھے کا شکار تھی۔ سمیعہ بھابھی تو چند ایک چھوٹے موٹے تحائف پا کر ہی اس قدر مننون ہو گئی تھیں کہ ان کا لہجہ، برتاؤ، خاطر مہارت سب میں اس روز واضح تبدیلی آئی تھی۔ زبردستی اسے رات کے کھانے پر بھی روک لیا۔ خزر ان ان سب کے لیے جو ڈریسز لے گئی تھی بھابھی ایک ایک چیز کی تعریف کیے جا رہی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ان سب سے بات کا آنا کیسے کروں۔“
 ”صاف لفظوں میں کہہ دو کہ میرا یہاں رہنا اب
 مناسب نہیں۔“ عازم قدرے حیران ہوا اس کی سوچ
 بچار پر۔

”ایسا تو میں شروع شروع میں کہہ چکی ہوں۔ یہ
 لوگ زبانی بہت ہمدردی جتاتے ہیں۔ بچوں سے ایسی
 شدت کی محبت ظاہر کرتے ہیں کہ مجھے کچھ بھی بولنے
 کی ہمت نہیں ہوتی۔“
 ”تو تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ ان کے دلوں میں کچھ اور
 ہے اور لبوں پر کچھ اور۔“

عازم کو خوشی ہوئی جان کر کہ خزان حقیقت کا
 ادراک رکھتی ہے۔ وہ تو سمجھ رہا تھا شاید ایسوں کے
 ہاتھ بے وقوف بن رہی ہے۔

”سب سمجھتی ہوں عازم! سات سال گزارے ہیں
 ان کے ساتھ۔ میں تو بس سمجھ بھابھی کے رویے کی
 وجہ سے مجبور تھی۔ وہ گتھی تم نے اتنی آسانی سے
 سلجھا دی۔ اب تو ایک ایک لمحہ یہاں گراں گزر رہا
 ہے۔ ہاں البتہ علیحدگی کے فوراً بعد ان سب نے مجھے

بہت سپورٹ کیا۔ طمان کے فوراً بعد کا کچھ عرصہ میں
 نے انتہائی تکلیف اور اذیت میں گزارا۔ مجھے لگتا تھا
 میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گی یا مجھے برین ہیمرج
 ہو جائے گا۔ یہ سوچ ہی بہت اذیت ناک تھی کہ یا سر
 سے ہمیشہ کے لیے ہر رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس کی بے
 وفائی اور بے حسی مجھے ایک ڈراؤنا خواب لگتی تھی۔ دل
 ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کا دل میری اور

بچوں کی محبت سے خالی ہو چکا ہے۔ اماں اور آصف
 بھائی فون پر یا سر سے ٹھکڑا کرتے۔ صاف الفاظ میں
 اسے کہتے کہ اب وہ اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں
 گے۔ مجھے ہر طرح کی تسلی دی کہ کبھی مجھے بے سہارا
 نہیں چھوڑیں گے۔ ان ہی سب باتوں کی وجہ سے میں
 ان کی ممنون ہوتی چلی گئی۔ تنخواہ اماں کے ہاتھ پر رکھنے
 کا فیصلہ بھی اس لیے کیا کہ اب میں یہاں کی کسی چیز پر
 اپنا حق محسوس نہیں کرتی۔ لیکن مجھ سے ہمدردی کا یہ
 رویہ بس مہینہ ڈیڑھ کی بات ثابت ہوئی۔ یا سر سے

تھیں۔
 عازم سے گفتگو کے بعد ویسے تو مسلسل وہ اس رنج پر
 سوچ رہی تھی کہ اب اسے یہاں سے چلے جانا
 چاہیے۔ بھابھی کی طرف سے اچھے رسپانس کے بعد تو
 وہ جلد از جلد اسے عملی جامہ پہنانے کا سوچنے لگی۔
 لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اماں اور آصف بھائی سے کس
 طرح بات کرے۔ زندگی نے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا تھا
 کہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اسے سو مرتبہ سوچنا
 پڑتا تھا۔

کمرے میں یہاں سے وہاں چکر کاٹتے اس نے بے
 شمار جوں سوچ ڈالے۔ لیکن کسی بھی نتیجے پر پہنچنے میں
 سخت کنفیوژن محسوس کی۔ عازم سے بات کیے بنا
 چارہ نہیں تھا۔ لیکن وہ بے شرم۔ بولتا بہت ہے۔
 خزان نے تین مرتبہ موبائل اٹھا کر واپس رکھ دیا۔
 بچے رونے کے لیے آئے تو انہیں تھکیاں دیتے
 بالآخر کال ملانے کا مضبوط ارادہ کر لیا۔

”ابھی نصیب۔“ بنا سلام دعا عازم نے شوخی سے
 آغاز لیا۔

”سارہ کہاں ہے؟“ وہ پریشان ہو گئی کہ عازم کے
 شوخ معنی خیز لہجے سے سارہ کچھ اخذ نہ کر لے۔

”ارے وہ تو اپنی سرزمین پر لینڈ کرتے ہی ہفتہ دس
 دن کے لیے میکے رخصت ہو جاتی ہے۔ آخر وہاں چاؤ
 بھی تو ٹوب کیے جاتے ہیں۔“ وہ ہنسنا تو خزان نے پہلا
 سکون کا سانس لیا۔

”پھپھو کے گھر سے کب آئے تم لوگ؟“

”ہاں۔ اماں کے گھر تو دو ہی دن رہے۔ پھر سارہ
 اپنی امی کے گھر چلی گئی اور میں یہاں کی صفائی وغیرہ میں
 مصروف ہو گیا۔ ابھی پچھلے تین دنوں سے اپنے گھر میں
 ہوں۔“ وہ اب سنجیدگی سے بات کرنے لگا تھا۔ خزان
 نے بھی سہولت محسوس کی۔

”عازم! مجھے تم سے مشورہ کرنا تھا۔“
 ”ہوں۔ ہوں۔ کہو۔“

”مجھے لگتا ہے تم صحیح کہہ رہے تھے۔ اب مجھے بھیا
 کے گھر آ جانا چاہیے۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا

مختلف حل بتاتے بتاتے پھر طیش میں آگیا۔
 ”یقین نہیں آتا“ تم وہی خزان ہو جو کالج کے اسٹیج پر دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے مائیک توڑ دیا کرتی تھی۔ وہ اسے لتاڑنے لگا اور خزان خاموشی سے اس کی پھٹکارنے لگی۔

”جانتی ہو خزان! جب میں کبھی نیوز میں سنتا یا پیپر میں پڑھتا کہ ایک عورت نے غریت کے ہاتھوں تنگ آکر بچوں سمیت نہر میں چھلانگ لگادی یا پیٹرول چھڑک کر خود کو آگ لگالی، زہر چاہا۔ تو دونوں طبیعت بوجھل رہتی۔ الفاظ سوتے جگتے میرے کانوں میں گونجتے رہتے اور میں یہی سوچتا کہ کیوں اس نے اپنی اور بچوں کی زندگی اپنے ہی ہاتھوں اتنی آسانی سے ختم کرلی۔ کیا اس کے پاس اور کوئی حل نہیں تھا۔ کسی کے گھر کام کر لیتی، کہیں مزدور بن کر لیتی۔ بچوں کا پیٹ پھرنے کی خاطر ہاتھ ہی پھیلا لیتی۔ چلو بہت غیرت مند تھی اور بھیک مانگنا گوارا نہیں تھا تو ایدھی ہوم سینٹر میں بچوں کو چھوڑ آتی۔ لیکن غیرت مند کہاں تھی۔ خود بھی حرام موت مر گئی اور بچوں کا قتل بھی سر پر لے لیا۔ کیوں کر لیتے ہیں لوگ ایسے بے رحم فیصلے۔ پر اب تمہیں دیکھ کر سوچتا ہوں شاید وہ عورتیں ٹھیک تھیں۔ ان پر نہ غریت میں ملی عورت اور کر بھی کیا سکتی ہے۔ جب تم جیسی اعلا تعلیم یافتہ برسر روزگار عورت کا یہ حال ہے تو جو جی میں آئے خواہ کی بیٹیو! کرو۔ سب جائز ہے۔“ وہ بولنے پہ آیا تو بے تکان بولے چلا گیا۔ خزان لب چبائے اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن بہت مشکل تھا۔ بے لگام آنسوؤں کی لکیر گردن تک بہہ آئی۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگی۔

”تم اس وقت کہاں تھے عازم! جب مجھ پر اتنی بڑی قیمت گزری میں بہت اکیلی ہوئی تھی۔“
 وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ عازم نے کرب سے ہونٹ کاٹے خزان کا رونا اس کا دل چیر رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری تکلیف نیزے کی طرح دل کے آپار ہوئی تھی۔ لیکن خاموش رہا۔ خزان کا درد بانٹنے

ان سب کی فوان بر بات ہوتی رہتی تھی۔ وہی بار بار فون کر کے جانے کیا کچھ کہتا رہتا تھا۔ شاید معافی مانگی ہو یا خود کو صحیح ثابت کرنے کے دلائل دیے ہوں۔ بہر حال جو بھی ہوا۔ پہلے تین چار ماہ سے میں تو یہی دیکھ رہی ہوں کہ نہ میرے بچوں کا ٹھیک سے خیال رکھا جاتا ہے نہ ہی میری کسی بات کو اب یہاں کوئی اہمیت دی جاتی ہے۔ یا سر کے خلاف بولنا بھی سب بند کر چکے ہیں۔“

”پھر تو تمہیں بہت پہلے یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا، کیوں اتنے مہینوں سے ان سب کے برے رویے سہہ رہی تھیں۔“ وہ ایک بار پھر حیران ہو گیا۔

”یہ سب اتنا آسان کہاں ہے۔“ وہ خاصی بے چارگی سے بولی جس پر عازم مزید تپ گیا۔

”اچھا اور جتنی آسانی سے تمہاری ہستی بستی زندگی تباہ ہوئی، اس کے متعلق کیا کہو گی اسٹوڈنٹ کی۔ ایسی بے چاروں اور مظلوموں والی باتیں کرتی مجھے سخت بری لگتی ہو۔ اتنی ہی بے بس اور لاچار ہو تو جلا دو اپنی ڈگریاں اور لائٹ مارو نو کری رہے۔ تمہیں تو چاہیے تھا پہلی فرصت میں کہیں الگ کوئی گھریا فلیٹ لے کر اپنے بچوں سمیت وہاں شفٹ ہو جاتیں۔ کیا تم الگ رہنا افرڈ نہیں کر سکتیں؟“ وہ پھر اس کی کلاس لینے لگا۔

”بچوں کا کیا کرتی۔ مجھے تو کالج جانا ہوتا ہے۔ روز یہاں سے شیخوپورہ جاتی اور آتی ہوں۔ اتنا نام ہو جاتا ہے۔“ وہ منمنائی۔

”کیا میڈ کا کال بڑ گیا ہے شہر میں۔ گھر تو کرہی کہ ذاتی گاڑی بھی رکھ سکتی ہو، لیکن جاہلوں کی طرح ساری رقم ان ناقدروں کے ہاتھ پہ دھر کے ماسیوں جیسے حلیے میں ان کی نوکریاں دے رہی ہو اور یہ جو شیخوپورہ سے روزانہ لیٹ آنے کا رونا رو رہی ہو تو محترمہ! روزانہ لاہور والوں کو اپنا چہرہ کرانا بہت ضروری ہے کیا۔ یا بنا آپ کے آئے یہاں سورج غروب نہیں ہوتا۔ بھئی! وہاں ہاسٹل ہو گا، اسٹاف کے لیے کوارٹرز ہوں گے اور بھی پیچرز رہتی ہوں گی۔ بچوں کو اپنے ساتھ رکھو اور آرام سے سیٹ ہو جاؤ۔“ وہ اسے

صرف نبھا کر لیا ہے، بلکہ بہت سہولت سے اسے اپنی زندگیوں میں شامل کرایا ہے۔ تمہارے لیے شاید یہ نئی بات ہو، لیکن اسی سے تمہاری اور تمہارے بچوں کی خوشیاں جڑی ہیں۔ انسانوں سے امیدیں وابستہ کرنے کا خیال ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دو۔ تمہارا اچھا برا سوائے تمہارے کوئی نہیں سوچ سکتا اور امید صرف اللہ سے رکھو سن رہی ہو نا۔ "عازم کو اس کی طویل خاموشی پر تشویش ہوئی۔

"ہاں۔" وہ ہلکا سا ہنسی۔ "تمہارے آخری جملے سے پہلے تم سے امید لٹائے بیٹھی تھی۔ تم نے پل میں وہاں چھین لیا۔"

"اوہ۔" عازم شرمندگی سے ہنس پڑا۔ "میں تو بھی فلسفہ جھاڑ رہا تھا۔ بولو کیا کام ہے؟" "چھوڑو، پھر کبھی بتاؤں گی۔" اس نے فون رکھ دیا۔ "ارے۔ سنو تو۔" بات اس کے منہ میں رہ گئی۔ پھر اس نے بھی موبائل ایک طرف پہ رکھ دیا۔



عازم نے واقعی سوچا کہا تھا۔ بھیا کے گھر آکر ذہن ایک دم دوسرے کئی معاملات کی طرف ایسے منتقل ہوا کہ دنوں اس کے پاس کچھ سوچنے کا جیسے وقت ہی نہیں رہا۔

جنید بھائی نے اس کے کہنے کے مطابق یا سر کے گھر والوں سے بات کی اور اگلے ہی دن اسے اپنے گھر لے آئے۔ وہ آخری رات خزران نے اپنے کمرے میں بہت تکلیف میں کائی۔ کمرے کی ایک ایک چیز یا سر کی یادوں سے جڑی تھی۔ وہ کمرہ جہاں وہ بیاہ کر تلی تھی۔ سوچا نہیں تھا، ایک دن وہاں سے ایسے حالات میں جانا پڑے گا۔ یا سر کی اس کے لیے محبت، بچوں سے والہانہ لگاؤ، دونوں کی آپس کی انڈر اسٹینڈنگ، کبھی کسی بات نے ایک لمحے کے لیے بھی اس وہم میں نہیں ڈالا کہ یا سر بدل سکتا ہے۔ وہ بھی شادی کے محض سات سال بعد۔ بتائیں لوگ کیوں کہتے ہیں کہ اولاد میاں بیوی کے رشتے کو مزید مضبوط کرتی ہے۔ یا سر

کو تو وہ اب بھی جی جان سے حاضر تھا، لیکن زبانی ایک جملہ بھی ادا کرنا سراسر اس سے دشمنی کرنے کے مترادف تھا۔ کیونکہ یہی ہمدردی کے بول سن سن کر تو گزشتہ پانچ چھ ماہ سے وہ مظلومیت کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ اگر وہ بھی یہی سب کچھ کرنے لگتا تو کون سمجھاتا اسے کہ نہ وہ مظلوم ہے نہ کمزور۔

"ذہد کو سنبھالو خزران۔ اور سنو! یہاں سے جانے کا ایک سیدھا سا حل ہے میرے پاس۔ سن رہی ہو نا؟"

"ہوں۔" خزران نے دھیان اس کی طرف لگایا۔ "پہلے جنید سے بات کرو اسے کہو کہ میں اب آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ پھر اسے سمجھاؤ کہ وہ تمہاری ساسی کے پاس آئے اور انہیں کہے کہ لوگ خزران کے یہاں رہنے پر بہت باتیں بنانے لگے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اب وہ مزید یہاں رہے۔ لہذا وہ تمہیں لینے آئے ہیں۔ کیا کہتی ہو؟"

"ہاں۔" یہی صحیح ہے۔ میں پہلے بھیا سے بات کرتی ہوں۔" اس نے ایک دم اپنے اندر سکون اترتا محسوس کیا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ سو طرح کے جیلے اور مکالمے، رٹنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اماں سے اس طرح بات شروع کروں گی، پہلے یہ کہوں گی، پھر وہ کہوں گی۔ عازم نے جو حل بتایا اس کے مطابق تو اماں سے براہ راست بات کرنے کا مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔ جانے اس کا پناہ داغ کیوں بند ہو کر رہ گیا تھا۔

"دو باتیں میری یاد رکھنا۔ پہلی یہ کہ جب تک اس گھر میں ہو، یا سر کی یادوں سے جڑی رہو گی جو کہ اب سراسر نقصان کا سودا ہے۔ جوں ہی جگہ تبدیل ہوگی، نہ صرف دماغ کھلے گا، بلکہ پوز۔ ٹو خیالات آنا شروع ہوں گے۔ مثبت سوچوں کو اپنے اندر جنم دے۔ ابھی پینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں نے شاید تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ یہاں زخموں پہ مرہم بھی پیسوں سے لکھا جاتا ہے۔ رکھ رکھاؤ، میل جول، رسموں، رواجوں اور رشتے ہاتوں کے سب کھیل آج صرف پیسے سے چلتے ہیں اور تم نے بہت حد تک اس سے نہ

دہرایا۔
”ٹھیک ہے۔ کوکنگ وغیرہ تو میں خود ہی کروں گی۔
بس یہ جھاڑو، پوچا کوئی اور لے۔ لے تو ج میں بہت آرام
مل جائے گا۔“

سمیعہ نے بھروسے مند کام، ابی کا بندوبست خود ہی
تین روز کے اندر کر لیا۔ خزران نے اس طرف سے
سکون کا سانس لیا۔ یہ سب کر کے، کے پیچھے اس کا ایک
مقصد یہ بھی تھا کہ شروع دن۔ سے بھابھی کے ساتھ
بیسے اچھے حالات آرہے ہیں۔ وہ فضا قائم رہے اور
چھوٹے موٹے مسائل اس تعلق پر اثر انداز نہ ہوں۔
شام کے وقت بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی اس
نے خود اٹھالی۔ رافع اور منال کے ساتھ ساتھ وہ سیری
اور سندس کو بھی پڑھانے لگی۔ اس سے بھی سمیعہ کو
کافی آرام مل جاتا۔ جنید بھائی بھی اس کے آجانے سے
بہت خوش تھے۔ ایک دن شام کی چائے پیتے ہوئے
اسے کہنے لگے۔

”تمہارے آنے سے گھر کا وی پرانا ماحول تازہ
ہو گیا۔ امی، بابا کی یاد آ جاتی ہے۔“

ابا کا انتقال خزران کی شادی کے ڈیڑھ سال بعد
اچانک دل کی تکلیف کے باعث ہوا تھا اور امی ان کے
گزرنے کے بعد ایک سال ہی زندہ رہیں۔ قسمت
کے فیصلوں کو واقعی کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ اگر ابا ایک
ڈیڑھ سال اور اس کی شادی کی جلدی نہ کرتے تو آج وہ
عازم کی بیوی ہوتی، لیکن زندگی ہمارے بچے تلے
اصولوں کے مطابق کہاں چلتی ہے۔

ابا کی وفات کے بعد دکانوں کو مارکیٹ بنانے کا
منصوبہ خود ہی دھرا رہ گیا تھا۔ جنید نو لری والا بندہ تھا۔
نہ اس کے پاس مارکیٹ بنانے کے لیے وقت تھا اور نہ
پھوپھا، پھپھو سے تعلقات بگاڑنے کا کوئی ارادہ۔
عرفان اور عازم کے ساتھ بحیثیت کرن نہایت اچھے
دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ انہیں بھی قائم رکھنا چاہتا
تھا۔ اس لیے دکانیں کرایہ پر ہی رہنے دیں اور پھوپھا
اپنی دکان پر اپنا کاروبار چلاتے رہے۔



نے تو بچوں کا بھی نہیں سوچا۔ وہ اگلے ہی روز صبح ساڑھے
سائیں بھیا کے گھر آگئی۔ وہ سامان جو بھیا اور ابو نے اس
کی شادی کے موقع پر بڑے پار سے بنوایا تھا۔ خزران
نے چند دن کے اندر سب بیچ کر رقم بھیا کے حوالے
کر دی۔ جنید بھائی کے گھر جیسے اس نے نئی زندگی کی
شروعات کیں۔ سمیعہ، بھابھی کے ہاتھ پر اس نے یہ
کہہ کر تنخواہ رکھی کہ۔

”بھابھی! یہ پیسے آپ کہیں سنبھال کر رکھ لیں۔
میرے پاس کوئی نقطہ نظر جگہ نہیں ہے۔“ اور ہفتے بھر
بعد اس میں سے ادھی رقم لیتے ہوئے نہایت سلجھے
طریقے سے کہہ دی۔

”باقی رقم آپ استعمال کر لیں بھابھی! اب میں اور
بچے آگے ہیں تو ظاہر ہے اخراجات بڑھ جائیں گے۔“
”لیکن یہ رقم تو بہت زیادہ ہے۔“ سمیعہ کی
آنکھیں پھیل گئیں۔

”کوئی بات نہیں بھابھی! پیسہ تو کام ہی آتا ہے۔ جو
رقم گھر کے خرچ سے بچ جایا کرے، آپ خود رکھ لیا
کریں۔ میں نے اپنے استعمال کی رقم لے لی ہے۔“
اس نے نرمی سے بھابھی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو سمیعہ
مارے خوشی کے کچھ بول ہی نہیں پائیں۔

بہت سارے دن گزر گئے تھے۔ صبح کالج جانے کے
لیے تیار ہو کر نکلتی تو ناشتا تیار ہوتا۔ کالج سے واپس آتی
تو بچے نہاد ہو کر کھا، ابھی کھا چکے ہوتے اور اکثر جنید
بھائی کی بیٹیوں کے ساتھ آرام سے بیٹھے کارٹون دیکھ
رہے ہوتے۔ وہ سخت شرمندہ ہو کر شام کے کام بھابھی
سے لینے کی کوشش کرتی، لیکن وہ اسے منع کر دیتیں۔

”یہ سب میرے روٹین کے کام ہیں خزران!
تمہارے آنے سے کبھی ایکسٹرا بوجھ نہیں پڑا۔“

”لیکن بھابھی! سرادن کام میں جتنے رہنا بھی ٹھیک
نہیں۔ مجھے نہیں آتا آپ کو ریسٹ ملتا ہے پھر میں
بھی آپ کی ہیلپ نہیں کر پاتی۔ آپ کہیں تو ہم کوئی
کام والی رکھ لیں۔“ خزران نے چند دن میں ہی نوٹ
کر لیا کہ بھابھی بہت کام کرتی تھیں۔

”کام والی۔“ سمیعہ نے حیرت سے زیر لب

صاحب نے دیکھا تو فوراً "اندر گھسے اور اس بوڑھے آدمی کو ڈاکوؤں سے چھڑانے لگے۔ تب ہی یہ دو پولیس والے آگئے اور انہوں نے سمجھا کہ رقم چھیننے والے لوگ تین ہیں۔ وہ دو اصل مجرم تو بھاگ گئے۔ انہوں نے اسے پکڑ لیا۔" اس لڑکے نے ہمت کر کے تفصیل بتائی تو پولیس والے شرمندگی سے بغلیں جھانکنے لگے۔ "چھوڑیں اسے۔۔۔" خزران نے غصے سے پولیس والے کو دیکھا اور سہارے سے عازم کو اٹھانے کی کوشش کی۔ ایک دو اور بھی مدد کو آ پہنچے اور عازم کو خزران کی گاڑی تک پہنچایا۔

"بنا تصدیق مارنا بھی شروع کر دیا۔ کم از کم لوگوں کی سن تو لیا کریں۔" وہ بدبڑا تے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ عازم کو لڑکوں نے ٹرنٹ سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ خزران نے گاڑی دوبارہ روڈ پر ڈالی۔

"کیا ضرورت تھی دوسروں کے معاملے میں پڑنے کی اگر خدا نخواستہ ان کے پاس پشیل ہوتا تو۔۔۔" "پشیل تو دونوں کے پاس تھے۔ لیکن چلانے میں اتاڑی تھے۔" وہ ہنسا۔

"تو کیا انہوں نے فائر بھی کھولا تھا؟" خزران کا دل لحظے کو ڈوب سا گیا۔

"ہاں۔ ایک لڑکے نے گولی چلائی تھی۔ دروازے کا شیشہ ٹوٹ گیا۔"

"تم بھی نا عازم! وہ جھلا گئی۔ "پلیز یہاں احتیاط سے رہا کرو۔ یہاں تو ہر قدم پر ایسے خطرات کا سامنا ہے۔"

"ہاں" پر مجھے تو تمہارے پولیس والے لے ڈوبے۔ سنا تھا یہاں پولیس کبھی موقع پر نہیں پہنچتی۔ لیکن داد دینی پڑے گی کیا کمال ایف بی شینسی ہے۔"

"کہاں کی ایف بی شینسی۔ مجرم تو بھاگ گئے اور لے کے تمہاری ٹانگہ۔۔۔" جملہ خزران کے منہ میں رہ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ عازم کی ٹانگ پر توجہ کی۔ گھٹنا اس بری طرح چھل گیا تھا کہ پینٹ پر خون نظر آنے لگا تھا۔ "اوہ تمہاری ٹانگ سے تو خون بہہ رہا ہے۔ عازم! یہ زخمی کیسے ہوئی۔"

کانج کی چھٹی ہو گئی تھی۔ وہ گھر واپسی کے لیے روانہ ہوئی۔ شہر پہنچی تو تین بج چکے تھے۔ اس نے پہلے بینک جانے کا ارادہ کیا۔ سمیعہ بھابھی کو فون کر کے اس نے بتا دیا کہ ذرا لیٹ گھر پہنچے گی۔ بینک پہنچ کر ابھی وہ پارکنگ کے لیے جگہ ڈھونڈ رہی تھی کہ اے ٹی ایم مشین کے سامنے کچھ ہنگامہ نظر آیا۔ خزران نے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے سمجھنے کی کوشش کی۔ تب ہی نظر عازم پر پڑی۔ دو پولیس والے اسے کھینچتے ہوئے پولیس دین کی طرف لے جا رہے تھے اور وہ لنگڑا کر چلتے ہوئے تقریباً "کھنچا جا رہا تھا۔ لوگوں کی اچھی خاصی جھپٹ ان کے پیچھے تھی۔ خزران بجلی کی سی تیزی سے باہر نکل کر ان کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا عازم! کیا بات ہے آفسر۔" وہ بالکل وین کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ عازم نے اسے دیکھ کر سکون کا گہرا سانس لیا اور نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

"کون ہیں آپ؟" پولیس والے نے اسے بری طرح نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

"میں کانج کی پروفیسر ہوں۔ یہ میرے کزن ہیں اور ایک شریف شہری ہیں۔ آپ انہیں اس طرح کیوں لے جا رہے ہیں۔ معاملہ کیا ہے؟" خزران نے قدرے رعب سے تعارف کرایا۔

"یہ شریف آدمی اے ٹی ایم سے رقم چرا کر بھاگ رہا تھا۔" پولیس والے نے اپنا کیس مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" خزران بری طرح بگڑی۔ "بولو عازم! کیا معاملہ ہے۔" وہ نیچے کو جھکی لیکن عازم چپ رہا۔ گھٹنے کی چوٹ شاید اسے کافی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ دو تین لوگ مجمع میں سے آئے نکلے۔

"باجی! یہ آدمی بے قصور ہے۔ لیکن یہ پولیس والے ہماری بات ہی نہیں سن رہے۔ ادھر آؤ بابا جی۔" انہوں نے ایک بزرگ کو پیچھے سے نکالا۔ "یہ آدمی مشین سے پیسے نکال رہا تھا۔ تب ہی دو لڑکے اندر گھسے اور اس بوڑھے آدمی سے رقم چھیننے لگے۔ ان

”ہائے مت، پوچھو۔“ اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ ”ظالموں نے تابڑ توڑ دھڑے برسائے اور گھٹنا۔ اس لیے چھل گیا، کیونکہ گھسیٹ کر لارے تھے۔ پتا نہیں راستے میں کیا کچھ آیا، انہیں پروا کب تھی۔“

”پہلے تمہیں اسپتال لے جاتی ہوں۔“
”نہیں بھئی۔ اب کہیں اور خوار ہونے کی سکت نہیں ہے۔ تم مجھے گھر تک چھوڑ دو، میرے پاس فرسٹ ایڈ کاسب سامان موجود ہے۔“

”لیکن عازم! پوٹ گہری نہ ہو۔“ وہ بہت پریشان نظر آرہی تھی۔

”اب کوئی چوٹ گہری نہیں لگتی۔“ وہ ہنس پڑا۔
”تم یہاں آئے کیسے تھے۔ آئی مین گاڑی یا بایک وغیرہ تھی تمہارے پاس؟“ خزران نے بات بدلی۔

”نہیں۔ مجھے عرفان بھائی نے یہاں ڈراپ کیا تھا۔ وہ آگے کسی کام سے چلے گئے۔ واپسی پر ٹیکسی کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن۔“ وہ کچھ کتے کتے ایک دم چونکا۔ ”تم کس کی گاڑی لیے ہوئے ہو۔ ڈرائیونگ بھی خود۔ حیرت ہے میں نے دھیان ہی نہیں دیا۔“ وہ ایک دم حیران نظر آنے لگا۔ خزران ہنس پڑی۔
”اپنی گاڑی ہے۔“

”اپنی۔ مطلب، جنید کی؟ لیکن اس کے پاس تو بایک ہے۔“ وہ خود ہی سوال جواب کرنے لگا۔
”نہیں بھئی۔ میری اپنی ہے۔“ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

”کبلی؟“
”جنید بھائی کے گھر آتے ہی خرید لی تھی۔ بینک کے توسط سے لی ہے۔“

”واہ بھئی۔ یہ تو بیچ بیچ بڑا کمال کام کیا۔ اتنی جلدی میری بات پر عمل کرو گی۔ بالکل اندازہ نہیں تھا۔“ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔

”اس روز تم سے گاڑی کے متعلق ہی کچھ مشورہ مانگنے لگی تھی جب تم نے دوسروں سے امید لگانے سے منع کر دیا تھا۔“

”اوہ!“ عازم نے یاد آنے پر ہنسی اچکائی۔ ”یار! اب مشورہ مانگنے سے تو منع نہیں کیا تھا۔ تم بھی بہت ڈیپ لے لیتی ہو باتوں کو۔“

”مجھے صرف مشورہ نہیں، بلکہ تمہاری مدد بھی چاہیے تھی۔ گاڑیوں کے ماڈل، قیمتوں اور کارکردگی وغیرہ کے متعلق میری معلومات مفرب ہیں۔ پھر بینک کا چھبھٹ بھی لمبا چوڑا ہوتا ہے۔ سوچا، تم ان معاملات میں بہت ہوشیار ہو۔ سارا کام تمہارے ہی ذمے لگا دوں گی۔“ اس بار خزران نے تفصیلی جواب دیا۔

”تو پھر۔ بنا میری مدد کے کیسے کر لیا۔“ اس نے ایک نظر خزران کو دیکھا۔

”بھیا نے اپنے کسی دوست سے بات کی، اس نے سارا کام کروایا۔“

”چلو، شکر ہے۔ مجھے خوشی ہے، کہ اب تم بہت خود مختار اور برا اعتماد نظر آنے لگی ہو۔ ایسی رہا کرو۔ تم میں دم ہے کچھ بھی کر لینے کا۔“ وہ کھل کر اس کی تعریف کرنے لگا۔ خزران چپ رہی۔

”یہ ڈرائیونگ میں اتنی مہارت کہاں سے حاصل کی۔ مجھ سے تو روز ڈانٹ کھاتی تھیں۔“ عازم کچھ یاد آنے پر مسکرانے لگا۔

”لائسنس ہولڈر ہوں۔ مہارت، کیسے نہیں آئے گی۔“ اس نے ابرو چڑھائے۔

”اوہ لائسنس ہولڈر تو یہاں ہر دو سرابندہ ہے، بنا کسی ٹریننگ کے، پاکستان میں یہ کون سا بڑا کمال ہے۔“

”آج کل بڑی یہاں وہاں کرنے لگے ہو۔ چند سال باہر کیا گزار لیے تم میں تو پاکستانیت ہی نظر نہیں آتی۔“ وہ خفاسی ہو گئی۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ باہر والوں میں پاکستانیت تم لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ بس یہاں کے سسٹم دیکھ کر دل دکھتا ہے۔ شکوہ سسٹم سے ہے، پاکستان سے نہیں۔“

”بھیا بتا رہے تھے، تم ہمیشہ کے لیے آگئے ہو، خیریت؟“ خزران نے موڑ کاٹا۔

رکھیں۔ پھر ریک۔ سے ایک بڑا پالہ نکالا اور اب یہاں سے وہاں جانے اور کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ کچن کی بڑی سی کھڑکی لاؤنج میں کھل رہی تھی۔ عازم نے ایک نظر اس کی مصروفیت پر ڈالی اور مسکرا کر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”حق تو صرف تمہارا تھا یہاں کی ہر چیز۔ لیکن یہ تقدیر کا پنجہ بہت ظالم ہے۔“ اس نے افسردگی سے سوچا۔ خزان کچھ ہی دیر میں برف کے ٹکڑے پیالے میں لیے واپس آئی۔

”ابھی تک ایسے ہی بیٹھے ہو۔؟“ وہ ماتھے پہ ہل ڈال کر اسے دیکھنے لگی۔ عازم کو خزان کی ڈانٹ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

”پینٹ گھٹنے۔۔۔ چپک گئی ہے عازم۔ اب کیا جادو سے اس پر دوا لگے گی۔“

”بعد میں کر لوں گا۔ تم جاؤ۔ یہ پینٹ یا نینچوں سے تنگ لگ رہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ گھٹنے تک اونچی ہوگی۔“ عازم اس کی بات سمجھ کر وضاحت دینے لگا۔

”تمہاری پینٹ کا کپڑا نرم اور لچک دار ہے اگر جینز ہوتی تو واقعی بہت مشکل ہو جاتی۔ تم آہستہ آہستہ گھٹنے تک اٹھاؤ۔ پانچویں بھی زیادہ تنگ نہیں ہے۔“ وہ بالکل اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ عازم نے آرام آرام سے پانچویں اوپر اٹھایا۔

”اف۔۔۔!“ خزان دل پہ ہاتھ رکھے وہیں نیچے بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی عازم کا صرف گھٹنا جھٹکا ہے، لیکن اس کی تو پوری ٹانگ ہرٹ ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سرخ دھبے نظر آ رہے تھے جو یقیناً ”پولیس کے ڈنڈوں کا نتیجہ تھے۔ گھٹنے کا حال سب سے براتھا۔ اوپر جلد اس بری طرح اتری تھی کہ اب سرخ اور سفید حصہ نکل آیا تھا۔

”گھٹنے پہ برف مت لگانا۔ جلن بھی ہوگی اور پانی لگانا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ میں کریم لگاتی ہوں۔ تم بعد میں ان باقی سرخ دھبوں پر لگاتے رہنا۔“ خزان نے کریم اپنی انگلیوں پہ نکال کر لپٹ لگانا شروع کیا۔

”ہاں۔۔۔ کچھ ضروری کام نپٹانے ہیں۔“ وہ سیٹ سے پشت نکاتے ہوئے عجیب افسردہ سے لہجے میں بولا۔ خزان اس کے انداز پر چونکی، لیکن پوچھا کچھ نہیں۔ عازم کا گھر آگیا تھا۔ وہ باہر نکل کر تیزی سے دوسری طرف پہنچی۔ عازم اپنی طرف کا دروازہ پہلے ہی کھیل چکا تھا اور نیچے اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اسے خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ خزان نے خود ہی اس کا بازو تھام لیا۔ اس کے سہارے وہ قدرے سہولت سے باہر آگیا۔ اس نے بغلی جیب سے چابیاں نکال کر خزان کی طرف برہائیں۔ ”ذرا لاک کھول دو۔“

”سارہ نہیں ہے گھر پہ۔“ خزان چابیاں لیتے ہوئے تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

”وہ آج صبح ہی اپنی بہن کے گھر گئی ہے۔ تم بس مجھے دروازے تک چھوڑ دو۔ ویسے بھی تم بینک کے کام سے لیٹ ہو رہی ہو۔“ وہ آہستہ آہستہ میڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے گیٹ کھول کر اسے اندر آنے میں مدد دی۔

”بینک کا کام تو اب کل ہی ہو سکے گا۔ یہاں سے سیدھا گھر جاؤں گی۔ آف۔ تمہیں کسی آرام دہ جگہ پر بٹھا دوں۔“ وہ اسے سہارا دیے کو ریڈور سے گزر کر لاؤنج میں آئی۔

”بس یہیں صوفے پر بیٹھوں گا۔“

”بڈ پر لیٹ جاؤ معلوم نہیں زخم کتنا شدید ہے۔“

”نہیں۔۔۔ فی الحال ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ گھٹنے کی کچھ ٹریٹ منٹ کرتے ہیں۔ بعد میں ضرورت محسوس ہوئی تو صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔“ وہ آگے بڑھ کر خود ہی صوفے میں دوڑا گیا اور ٹانگ سامنے ٹیبل پر لمبی کی۔

”وہاں فی دی کے ساتھ الماری کے نچلے خانے میں دیکھو فرسٹ ایڈ پاکس ملے گا۔“ وہ کہنے لگا۔ خزان نے بائیں لاکر سامنے ٹیبل پر رکھا۔

”اب ذرا فریج سے کچھ برف نکال دو۔“ وہ آگے بڑھ کر بائیں کھولنے لگا۔ خزان کچن کی طرف بڑھ گئی۔ فریج سے کیوبز نکال کر واش بیسن کے پاس

کی ہیں۔ اب تم یقیناً ”بہت ذہنی سکون محسوس کرو گی۔“

ملائشیا سے آنے کے بعد سارہ نے کافی وقت سیما کے ساتھ گزارا تھا۔ سیما نے محسوس کیا کہ وہ اولاد کے معاملے میں حد سے زیادہ حساس ہو چکی ہے۔ اس کا دن رات ایک ہی معاملے کو لے کر پریشان رہنا، سیما سے دیکھا نہیں گیا۔ تب ہی سائیکائرسٹ وقت لے کر اسے دکھانے لے آئی۔

”میرا ذہنی سکون تو۔“ گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے وہ رک گئی۔ تھوڑے ناصلے پر ایک اسکول بس آ کر رکی تھی۔ دو زسری کی بچیاں بیگ سنبھالتی نیچے اتر کر اسی کی طرف چل کر آنے لگیں۔ آگے والی چھوٹی بچی دو پٹیاں باندھے اپنے اتھے کے بالوں کو پیچھے کرتی بیگ سنبھالتی آگے بڑھنے لگی۔ چہرے پر آنے بسنے کو اس نے اپنی ننھی انگلیوں سے صاف کرنے کی کوشش کی تو میلے ہاتھوں کے دھبے اس کے سفید چہرے پر نظر آنے لگے۔ سارہ نے بے ساختہ اپنے دوپٹے کا پلو ہاتھ میں لیا۔ بچی کا لبی قریب آ چکی تھی۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ بچی کو روک کر اس کا چہرہ اپنے پلو سے صاف کرے اور اس کے سفید گل جوم لے لے لیکن وہ مستی میں مگن قریب سے گزر کر چلی گئی اور سارہ بھی بھیج کر اپنے درد کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”اس پلو کے نصیب میں کہاں، کسی بچے کا ناک منہ صاف کرنا۔“ وہ دوپٹا چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ سیما نے اسے گھر کے دروازے پر چھوڑا۔ سارہ نے اندر بلایا لیکن اس کے بچے اسکول سے آنے والے تھے۔ اس لیے باہر سے ہی گاڑی بڑھا لے گئی۔ سارہ اندر آئی تو عازم اپنی زخمی ٹانگ نیمل پہرے کھینچی دیکھ رہا تھا۔

”ارے۔ کیا ہوا آپ کو؟“ ٹانگ کے سرخ دھبے اور گھٹنے پر کریم کا لپ دیکھ کر وہ پریشانی سے آگے بڑھی۔

”پولیس والوں کی مہربانی کا شکار ہوا ہوں۔“ عازم ہنسا۔

نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے وہ دروازہ کھول کر اپنے کوشش کر رہا تھا۔ خزاں نے پوری ٹیوب اس کے زخم پر خالی کر دی۔ عازم نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ وہ کریم لگانے کے ساتھ ساتھ زخموں پر پھونکیں بھی مار رہی تھی۔ اس کی پانیوں سے جھلملاتی آنکھیں دیکھ کر عازم حیرت زدہ رہ گیا۔

”تم رو رہی ہو؟“ وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ خزاں نے چونک کر اوپر دیکھا تو بے شمار آنسو چھلک کر گال پہ اترے۔ وہ گھبرا کر چہرہ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میرے لیے درد محسوس مت کیا کرو۔“ وہ صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

”پھر تم بھی چھوڑ دو ایسا کرنا۔“ وہ آہستہ سے کہہ کر باہر نکل گئی۔ عازم اس کی پشت دیکھتے ہوئے گم صم بیٹھا رہا۔



”آپ بھی ناں آپی۔ آپ کو لگتا ہے میرے مسائل کا حل نفسیاتی معالج کے پاس ہے۔“ سارہ کلینک کی سیڑھیاں اتر کر پارکنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ سیما آپی پھولی سانسوں کے ساتھ اس کے مقابل آئیں۔

”مجھے تو تمہاری صحت کی فکر ہے۔ ٹینشن لے لے کے تم نے اپنا کبہ حال بنا لیا ہے۔ پانچ سال بڑی ہوں تم سے اور لوگ تمہیں میری بڑی بہن سمجھتے ہیں۔ یہی حل رہا تو عازم تمہاری طرف دیکھنا بھی چھوڑ دے گا۔“ سیما نے پارکنگ کا رخ کیا تو وہ بھی ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

”اچھا اور آپ کی سائیکائرسٹ نے کون سا تیر مار لیا۔“ سارہ نے التزیہ ان کو دیکھا۔ ”سکون اور گولیاں۔“ اور بس یعنی یہی حل ہے میرے مسئلے کا۔“

”ارے بھئی! گولیاں لوگی تو نیند اچھی آئے گی، پر سکون نیند سے صحت بھی بہتر ہوگی اور بلاوجہ ہر وقت سوچتے رہنے سے بھی نجات ملے گی۔ یہ ڈاکٹر بہت لائق ہے۔ اس نے تمہارا مسئلہ جان کر دوا میں تجویز

ذہنی رونے رخ تبدیل کیا تھا۔ البتہ یہ بھی جانتا تھا کہ شادی ختم ہوتے ہی وہ پھر سے افسردہ اور بیمار نظر آنے لگے گی۔



”سکینہ پھپھو کا تین مرتبہ فون آچکا ہے اور آج تو تم معمول سے بھی لیٹ آئی ہو۔“ خزران گھر میں داخل ہوئی تو سمیعہ بھابھی اور بچے تیار بیٹھے تھے۔ ”ہاں بھابھی! جنتی ہوں، بس چھٹی ہوتے ہی پرنسپل صاحبہ نے چھوٹی سی میٹنگ بلوائی۔ اچھا میں تیار ہو کر بس ابھی آئی۔“ وہ فوراً ہی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آج سویرا کی مہندی تھی۔

مہندی کا فنکشن کافی اچھا رہا تھا۔ وہ لوگ رات کو ایک بجے کے قریب گھر پہنچے۔ خزران خوش تھی کہ اگلے روز اتوار ہے، کم از کم بچوں کی تھکاوٹ تو اتر جائے گی۔

سکینہ پھپھو بیوہ تھیں اور یہ ان کے گھر کا پہلا فنکشن تھا۔ اس لیے عین بارات کے وقت پہنچنا ان سب کے لیے مناسب نہیں تھا۔ خزران نے گلی میں ہی گاڑی پارک کی۔ سامنے عرفان بھائی کی کار کھڑی تھی۔ یعنی وہ بھی آچکا تھا۔ آج سویرا نے تیار ہونے پار لرجانا تھا۔ چار بجے کے قریب وہ سمیعہ بھابھی اور سویرا کو پار لرجھوڑ آئی۔ ان کو وہاں سے واپس لانے کی ذمہ داری بھی خزران کی تھی۔ گھر واپس آتے ہی اس نے بچوں کی تیاری شروع کرادی۔ سمیعہ بھابھی، پیری اور سندس کو تیار کرنے کا کام بھی اسے دے گئی تھیں۔

اپنے لیے اس نے مہزاور سرمئی امتزاج کا ہلکے کام والا سوٹ نکال کر پہنا۔ لمبے بالوں کی ڈھیلی چٹیا بنا کر بائیں کندھے پر آگے ڈالی۔ اور کانوں میں چھوٹے بندے پن کر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔

”بس۔۔۔ یہی۔۔۔؟“ اچانک پیچھے نضہ بھابھی کی آواز آئی تو وہ چونک کر پلٹی۔

”جی۔۔۔؟“

”پولیس۔ کہاں گئے تھے آپ؟“ وہ مزید حیران ہو گئی۔ عازم نے تفصیل بتانا شروع کی۔ وہ سننے کے ساتھ ساتھ ٹیبل کا سامان سمیٹنے لگی۔

”خزران وہاں کیسے آئی۔؟“

”وہ چھوڑو اور یہ سوچو اگر خزران وہاں نہ آتی تو اس وقت میں لاک اپ میں ہوتا۔“

”یہاں بہت احتیاط سے رہا کریں عازم! ادھر حالات مختلف ہیں۔“ سارہ نے خزران والے انداز میں تنبیہ کی تو عازم نے مسکرا کر سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔

”آپ کو کچھ چاہیے۔؟“ ٹیبل صاف کر کے وہ سیدھی ہوئی۔

”گرم دودھ کا ایک گلاس دے دو۔ تھوڑی سی ہلدی بھی ڈال دینا۔“

”ہوں۔۔۔“ وہ کچن کی طرف چل پڑی۔ عازم دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پچھلے کچھ سالوں سے ازدواجی زندگی کچھ ایسے ہی روٹین کے جملوں کے گرد گھومنے لگی تھی۔ نہایت رسمی اور بہت حد تک روکھی پھکی سی۔ عازم نے بہت مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہے۔ عازم نے بارہا اسے کہا کہ وہ خود کو مصروف رکھا کرے۔ لیکن وہ اس قدر حساس ہو چکی تھی کہ کسی وقتی مصروفیت سے بہل جانا اس کے بس میں نہیں تھا۔۔۔ ہر وقت ایک ہی سوچ، ایک ہی خیال۔۔۔ حالانکہ اسے تو ساس کے روایتی طعن و تشنیع کا سامنا بھی نہیں تھا، سنجیدہ تو بلکہ نرمی اور پیار سے اسے سمجھاتیں، لیکن اس پر کوئی تسلی اثر نہیں کرتی تھی۔ پاکستان آکر البتہ اتنی بہتری ضرور آئی تھی کہ دن کا وقت وہ اپنے بہن بھائیوں کے ہاں گزار آتی تھی۔

اب پچھلے کچھ دنوں سے مصروفیت قدرے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ کیونکہ عازم کی خالہ کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ دونوں کافی سالوں کے بعد کسی خاندانی فنکشن میں شریک ہو رہے تھے، اس لیے سارہ زور و شور سے تیاریوں میں مصروف تھی۔ عازم خوش تھا کہ سارہ کی

”پلیز“ مجھے ذرا آگے تک ڈراپ کرو۔ سارہ کسی پارلر میں کھڑی میرا ویٹ کر رہی ہے۔ ”وہ غجلت میں بولنے لگا۔ خزان نے منہ پھلا کر بتا کچھ کسے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”بنا سوچے کہیں بھی کود پڑتے ہو۔ پھپھو کے دروازے پر کتنے لوگوں نے تمہیں دیکھا ہو گا۔ پتا نہیں اب کیا کیا باتیں بتائیں گے۔“ وہ غصے سے بڑبڑانے لگی۔

”ارے ایک دو محلے کے لڑکے کھڑے تھے۔ اب انہیں کیا پتا ہمارے معاملے کا۔“

”نہ تمہیں لوگوں کی پروا ہے نہ میری عزت کی“ لیکن میں بست ڈرتی ہوں عازم۔!“

”ڈر کی وجہ؟“ عازم نے اس کے پچھلے جملے کو نظر انداز کیا حالانکہ غصہ بست آیا تھا۔

”طلاق یافتہ عورت کی زندگی ایک جوان کنواری لڑکی کی زندگی سے زیادہ حساس ہوتی ہے، ہمیں کیسی کیسی نظروں کا سامنا ہوتا ہے۔ تم نا سمجھ نہیں ہو کہ ہر بات کھول کھول کر بتانی پڑے۔“

”ڈر کی وجہ پھر بھی سمجھ نہیں آئی۔“ وہ ایک دم رکھائی سے بولا۔

”تم جانتے ہو۔“

”یعنی میرے بجائے اگر عرفان بھائی، رضوان یا حیدر میں سے کوئی آبیٹھتا تو تمہیں براہِ علم نہیں تھی۔“

”ہاں صحیح سمجھے ہو۔“ خزان نے بلا جھجک کہہ دیا۔

بست دنوں سے وہ اسی سنج پر سوچ رہی تھی کہ اس کے اور عازم کے بیچ اچانک ہی حدِ اصلہ کچھ کم ہونے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ اب وہ ملائشیا سے واپس آ گیا تھا اور خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے آنا سامنا بھی ہو جاتا تھا اور بات چیت بھی۔

”ڈرنا انسان تب ہے جب وہ کچھ غلط کر رہا ہو اور تم صرف اس لیے ڈرے جا رہی ہو کہ لوگ تم پر جھوٹا الزام لگا دیں گے۔“

”میں صرف یہ جانتی ہوں کہ مجھے احتیاط سے اور سنبھل کر رہنا ہے۔ پھر لوگوں کی زبانیں کہاں بولتی

”میک اپ، کیوں نہیں کیا خزان۔ کل بھی میں نے دیکھا تم نے لباس بھی نہایت سادہ پہن رکھا تھا اور دھلے منہ کے ساتھ پورا فنکشن اینڈ کیا۔ ایسا کیوں کر رہی ہو۔“ انہوں نے خزان کو سامنے کھڑا کر کے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ جواباً بالکل چپ رہی۔

”یا سرنے تمہیں طلاق دی ہے خزان! تم اس کی بیوہ نہیں ہو جو ایسا سوگ والا انداز اپنا رکھا ہے۔ خود کو آزاد سمجھنا کب شروع کرو گی۔ تم اس طرح سادگی سے رہتی ہو تو لوگ کہتے ہیں۔ اسے یا سرنے سے طلاق کا بھی تک غم ہے۔ میری مانو اور خوب بن ٹھن کے رہا کرو۔ زیادہ سے زیادہ سب یہی کہیں گے کہ دیکھو اسے تو طلاق کی کوئی پروا ہی نہیں۔ ہاں بھی ٹھیک ہے۔ جیسا سلوک یا سرنے تمہارے ساتھ روا رکھا، پروا ہونی بھی نہیں چاہیے۔“

”اب مجھ کو قحی پروا نہیں ہے بھابھی۔ میں تو۔“

”جانتی ہو یا۔“ فضا نے اس کی بات کاٹی۔

”لیکن اس لا پرواہی کو ظاہر تو کرو۔ اس نے تمہیں ٹھوکر ماری ہے تو تم بھی بتا دو دنیا کو کہ ٹھوکر مارنے والے کو تم بھی جوئی کی نوک پر رکھتی ہو چلو میں خود تمہیں تیار کرتی ہوں۔“

وہ زبردستی اسے ڈرنگ ٹیبل کے آگے بٹھا کر تیار کرنے لگیں۔ ان کے اپنائیت بھرے انداز پر خزان مسکرا کر سامنے بیٹھ گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے، لیکن پلیز لائٹ میک اپ کیجیے گا۔“

”ہاں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ اب چپ بیٹھو۔“ وہ اسے لانٹرو لگا۔ لگیں۔ سمجھ بھائی کا پارلر سے فون آیا کہ سویرا تیار ہو چکی ہے۔ خزان خود بھی تیار ہو چکی تھی۔ فضا بھابھی کو بتا کر اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اکیلی ہی باہر آئی۔

گاڑی اشارت کر کے جونہی گلی سے نکال کر سیدھی کی۔ اچانک ساتھ والا دروازہ کھلا اور عازم اندر آ بیٹھا۔

”تم۔؟“ وہ یکدم بوکھلا گئی۔

بہت مس کیا۔ تم سے دوستی کا رشتہ بہت مضبوط رہا تھا۔ اتنا مضبوط محبت کا رشتہ بھی ہوتا تو شاید تقدیر ہم سے جیت نہ پاتی۔ کیا اب زندگی کے اس موڑ پر میری دوست مجھے واپس مل سکتی ہے؟

وہ اب اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا۔ انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا۔ اس نے بات مکمل کی۔ خزان نے اس کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا محسوس کیا تھا۔ لیکن جواب دینے میں شدید مشکل محسوس کی۔ لب چباتے ہوئے وہ مسلسل گاڑی چلاتی رہی۔

”بس یہاں آگے روک دو۔“ اس نے باہر دیکھتے ہوئے اچانک کہا۔ خزان نے گاڑی روک دی۔

”مجھے جواب کی ہلکی نہیں ہے۔ تم ہر پہلو پر غور کرو۔ لیکن دیکھو میری نیت یہ شک مت کرنا۔“

”تمہاری نیت پر مجھے شک تمہیں ہے عازم۔“ لیکن۔ ”وہ قدرے رہا۔“ دوستی سے آغاز لینے والے

رشتے کا انجام معلوم نہیں کیا ہو۔ میں تمہیں الزام نہیں دے رہی۔ اپنی کمزوریوں سے خوف زدہ ہوں۔

اپنی ٹوٹی بکھری زندگی کو خشک مزاجی کی ڈھال سے سہارا دیے ہوئے ہوں۔ میری ڈھال مجھ سے مت چھینو۔

میں تم سے ہر بات کہہ سکتی ہوں اس لیے بہانے کا سہارا لینے کے بجائے صاف بات کی ہے۔ امید ہے میری مجبوری کو سمجھو گے۔“

وہ اسٹیرنگ کو مضبوطی سے تھامے آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔ عازم نے توجہ سے اس کو سنا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

”میں تمہاری طاقت سے بھی واقف ہوں رازی اور کمزوریوں سے بھی“ بے فکر رہو، میرا کردار ہمیشہ

ایک بھلا چاہنے والا دوست کا ہی پاؤں گی۔“ وہ کہہ کر اس کے جواب کے لیے نہیں رکا اور گاڑی سے اتر گیا۔



موسم کافی گرم ہو گیا تھا۔ جولائی کے آغاز کے دن تھے اتوار کے دن اچانک آسمان بادلوں سے بھر گیا۔

ہیں۔ ان کی تو نظریں بولتی ہیں۔ ایسے میں ہم ایک ایک کو صفائی بھی نہیں دے سکتے۔“ اس نے اپنا موقف وضاحت سے بتایا۔

”چلو ٹھیک ہے جب کبھی ”ڈیٹ“ پر جائیں گے تو چوری چھپے نکلیں گے۔“ وہ ڈھٹائی سے ہنسا۔

”بہت بکواس کرتے ہو۔“ خزان نے ایک غصے کی نظر اس پر ڈال کر سامنے دیکھا۔

”وہ۔ میں تو قسم سے بہت سنجیدہ ہوں۔ پھر تم بھی آزاد ہو اب تو مسئلہ ہی کوئی نہیں۔“ وہ مزے سے سیٹ سے ٹیک لگا کر اسے چھیڑنے لگا۔

”ہاں ٹھیک ہے میں آزاد ہوں۔ اور تم؟“ اس نے ابرو چڑھائے۔

”میں مرد ہوں اور مرد تو ہے ہی آزاد۔“

”بڑا اترار ہے ہو۔ جتاؤں کی سارہ کو۔“ اسے ہنسی آگئی۔

”ایک سنجیدہ بات کہوں۔“ وہ سیدھا ہو کر اچانک اسے دیکھنے لگا۔ خزان کے دل کو کچھ ہوا۔ عازم کے

ایسے انداز جانے کیوں اسے سالوں پیچھے لے جانے لگتے تھے۔

”ہو۔ تم کون سا چپ رہو گے؟“

”بڑا اعتراض ہے میرے بولنے پر۔ حالانکہ میں جب کبھی بولا ہوں دوسرے کا بھلا ہی ہوا ہے۔“ خراب

میری بات دھیان سے سنا اور اس پر مثبت انداز میں غور کرنا۔

”ایسی کیا بات ہے؟“ خزان نے اس بار رویہ نرم رکھا۔

”تم جانتی ہو خزان! یا سر سے تمہاری شادی کے بعد میں نے خود کو پوری طرح اپنے آپ تک محدود کر

لیا تھا۔ تمہاری ازدواجی زندگی پر اپنا سانس بھی نہیں پڑنے دیا۔ بھلے تم سے بہت دور رہتا تھا لیکن رابطے

میں رہنے کے بے شمار طریقے تھے پھر بھی میں نے کبھی ایسی کوشش نہیں کی اور وہ زندگی جو میرے نصیب میں

لکھ دی گئی تھی اسے ہنسی خوشی جینے لگا۔ لیکن اس سب کے باوجود میں نے ہمیشہ اپنی ایک عزیز دوست کو

منائل کو اس نے کارٹون چینل لگا کر ٹی وی کے سامنے بٹھا دیا۔ اور اپنے لیے چائے بنانے کچن میں آ گئی۔ چائے بنا کر اس نے جوں ہی کپ میں ڈالی ڈور بیل بجنے لگی۔ وہ بال سمیٹی دروازے تک آئی۔
”کون۔؟“

”میں۔۔۔ عازم۔۔۔!“
”عاز۔۔۔ زی!“ وہ ٹھٹھک کر ذرا دیر کو رک کی پھر دروازہ کھول دیا۔

”اسلام علیکم۔۔۔!“ اس نے راستہ چھوڑا۔
”وعلیکم اسلام۔۔۔ جنید ہے؟“ وہ ایک قدم اندر آ کر رک گیا۔

”نہیں۔۔۔ وہ سمیعہ بھابی کو لینے گئے ہیں۔“
”اوہ۔۔۔ تو تم اکیلی ہو۔“ وہ چونکا۔

”ہاں۔۔۔ بس میں اور منائل۔۔۔ جنید بھائی اور بھابی آنے ہی والے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے، میں بعد میں آ جاؤں گا۔“ وہ واپسی کے لیے مڑا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ آ جاؤ۔“ وہ کمرے کی طرف بڑھی تو عازم بھی پیچھے آنے لگا۔

”ویسے بستر تو یہ ہوتا ہے کہ بندہ آنے سے پہلے فون پر بتا دے۔“ وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی۔

”بس یار! عادت نہیں ہے۔ اور جنید کی طرف تو اکثر ہی نکل آتا ہوں۔ اب تم آگئی ہو تو آئندہ احتیاط کیا کروں گا۔“

”اچھا واہ۔۔۔ اچانک بڑی تابع داری والی حس جاگ گئی۔“ وہ مسکراتے لگی۔

”ہاں۔۔۔ تم ہی نے احساس دلایا کہ جہاں کسی کے معاملے میں دل میں کوئی بات ہو وہاں احتیاط کرنی چاہیے۔“ وہ روانی میں بولتا اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ خزان نے کھور کرا سے دیکھا۔

”ایسا میں نے کب کہا۔؟“

”لو۔۔۔ صاف صاف تو کہا تھا کہ اگر میرے بجائے کوئی اور آ کر تمہاری گاڑی میں بیٹھا تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب اس کا اور کیا مطلب۔۔۔ ویسے

بچے چیزیا گھر جانے کی ضد کرنے لگے۔ جنید بھائی بھی گھر پر تھے۔ خزان نے بچوں کو تیار کیا۔ خود بھی تیار ہوئی البتہ ڈرائیونگ کی ذمہ داری بھیا پر ڈال دی۔

بچے چیزیا گھر جا کر بہت خوش ہوئے۔ واپسی پر بارش شروع ہو گئی۔ خزان کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا۔ اس نے شکر کیا کہ بچوں کو لے آئی جب تک سسرال میں تھی۔ بچوں کے لیے بالکل وقت نہیں نکلتا تھا۔ شکر ہے قدرت نے بروقت اسے یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔

کم از کم اس معاملے میں عازم واقعی رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔ اگر وہ اسے جنید بھائی کے گھر آنے پر نہ اکساتا تو وہ اب بھی یا سر کے گھر سڑ رہی ہوتی۔ جہاں بچوں کی شخصیت، نری مسخ ہو رہی تھی۔ خزان نے منائل کے سر کے نیچے سے اپنا بازو نکال کر سرہانے پر آہستہ سے اسے سلا یا۔ سیدھا ہو کر لیٹتے ہوئے اس نے عازم کے لیے دل سے اولاد کی دعا کی۔ تقریباً

سات سال ہوئے والے تھے اس کی شادی کو۔ اللہ نے اب تک اسے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ سارہ بھی کچھ اسی وجہ سے ابھی ابھی اور پریشان نظر آتی تھی۔

☆ ☆ ☆

”آج میں اپنی امی کے گھر جاؤں گی خزان! رات کو بھی وہیں رہوں گی۔ پنڈی سے باجی آئی ہوئی ہیں۔“ وہ کالج سے لعلی تو بھابی تیار می میں مصروف تھیں۔

”ہوں۔“ وہ سر ہلا کر اپنے لیے کھانا نکالنے لگی۔

بھابی کے جانے کے بعد اس نے کچھ دیر آرام کیا پھر رات کا کھانا بنالیا۔ بچوں کا آج ویک اینڈ تھا۔ وہ رات کے کھانے کے بعد فوراً سونے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھے۔ اس لیے جنید ماموں کے ساتھ پلے اسٹیشن کھیلنے لگے۔ خزان انہیں ان کے حال پہ چھوڑ کر کمرے میں آگئی۔

اتوار کا دن وہ کام والی کے ساتھ دوپہر تک کاموں میں لگی رہی۔ بھیا دا پھر کے کھانے کے بعد بھابی اور بچوں کو لینے چلے گئے۔ رافع بھی ان کے ساتھ ہوا۔

بات و تمہاری ٹھیک ہے۔ اب دیکھو ناں۔۔۔ بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ میں جنید سے ملنے یہاں آیا لیکن گھر پر صرف سمیعہ بھا بھی ہوئیں۔۔۔ لیکن ایسا ٹھنڈا میٹھا دل گد گد آنے والا احساس کبھی نہیں چاگا جو ابھی تمہاری موجودگی۔۔۔

الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے تھے۔ خزان نے بنا سوئے اس کے کندھے پہ مکامارا۔ ”بد تمیز۔!“ اور وہ بجائے برا ماننے کے قہقہہ مار کر صوفے پہ جا بیٹھا اور منائل کو گود میں لے لیا۔

”ہوں تو منو کو ڈوریمان پسند ہیں۔“

”جی انکل۔۔۔ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ آپ کو کون سے آرٹون پسند ہیں؟“ منائل بنا جھٹکے اس کی گود میں سوار ہو کر سوال پوچھنے لگی۔ عازم کی شروع سے عادت تھی کہ وہ بچوں کے ساتھ بہت جلد کھل مل جاتا۔ رافع اور منائل کے ساتھ اس نے سویرا کی شادی میں اچھی خاصی دوستی بنالی تھی۔

”مجھے تو کنگ فو پانڈا سرف اور جنگل بک بہت پسند ہیں۔“

”تم کارٹون بھی دیکھتے ہو؟“ عازم نے بڑی روانی میں بہت جلد جواب دیا تھا اس لیے وہ حیران ہو گئی۔

”ہاں اب تمہاری جدائی کا وقت کسی نہ کسی طرح تو کاٹنا پڑے گا۔“ اس نے چائے کا کپ لیتے ہوئے مصنوعی آہ بھری۔ خزان نے تنگ آ کر اٹھا پیٹا۔

”تم سے بات کرنا فضول ہے عازم۔۔۔ ذرا بھی تمہیں اپنی زبان پر کنٹرول نہیں ہے۔ اب چائے پو اور چلتے ہو۔“

”ارے ایسے کیسے ابھی تم نے کہا جنید آئے والا ہے۔“

”ہاں لیکن اچھا نہیں لگے گا۔ بس تم جاؤ۔“

”کیوں جاؤں۔ مجھے تو جنید سے کام ہے۔“

”کیا کام ہے بھیا سے۔؟“ وہ زچ ہو گئی۔

”اس سے بایک لینی تھی۔“

”لو اتنا سا کام تھا۔ وہ تو گاڑی لے گئے ہیں۔ بایک پیچھے کھن میں کھڑی ہے لے جاؤ۔“

”کیسی بے مروت ہو کوئی ایسے بھی بھگاتا ہے۔ چائے تو پینے دو۔ جا۔ بے کتنے برسوں بعد تمہارے ہاتھ کی بد مزہ چائے دوبارہ پی رہا ہوں۔“

وہ پھر تنگ کرنے لگا۔ خزان نے بمشکل ہنسی ضبط کی۔ چائے کے معاملے میں عازم اور اس کا مزاج قطعاً ”الگ تھا۔ وہ گاڑھی کم چینی والی چائے پیتی جبکہ عازم کم دودھ زیادہ شہروالی قدرے تیز چائے پسند کرتا تھا۔ ماضی میں عازم ہاتھ جوڑ کر منت کیا کرتا تھا کہ چائے بنانے وہ ہرگز بچن میں نہ جائے۔

”اب اچھی نہیں لگ رہی تو کیوں زبردستی پیے جا رہے ہو۔“ وہ کھسیا گئی۔

”بتاؤں کیوں پی رہا تھا۔“ وہ کپ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”تمہاری مخصوص بد مزہ چائے مجھے ایک دم برسوں پیچھے لے گئی۔ ایک ایک گھونٹ مجھے کچھ نہ کچھ یاد دلا رہا تھا۔ خیر۔ بس بایک لے جا رہا ہوں۔ شام تک واپس لے آؤں گا۔“ وہ باہر صحن میں نکل آیا۔

”دوسروں سے چیزیں مانگتے شرم نہیں آتی مہینوں گزر گئے تمہیں ملائیٹیا سے واپس آئے۔ اپنی بایک یا گاڑی اب خرید ہی لو۔ سارہ بے چاری بھی تمہاری وجہ سے خوار ہوئی پھرتی ہے۔“ خزان ساتھ ساتھ چلتے اس کی کلاس لینے لگی۔

”فی الحال بایک لے رہا ہوں۔ گاڑی ذرا ٹھہر کر۔“ اس نے چابی گھما کر اسٹینڈ اٹھایا۔ ”اچھا میں چلتا ہوں۔ سارہ کو اس کی امی کے گھر چھوڑنا ہے۔“

”ایک بات کہوں مازم! برا نہ ماننا۔“

”ہاں کہو۔ تمہاری بات کا کبھی برا نہیں مانا۔“ وہ جاتے جاتے رکا۔

”مجھے محسوس ہوا ہے کہ سارہ اپنا زیادہ وقت میکے میں گزارتی ہے۔ کیا تم اسے خوش نہیں رکھتے؟“

”چلو۔ میکے وہ بھالی ہے اور ہلیم تم مجھے کر رہی ہو۔ یعنی تمہیں لگتا ہے اس میں بھی میرا قصور ہے۔“

”عورت کی ازدواجی زندگی پر سکون ہو تو اسے اپنے گھر کے علاوہ کہیں سکون نہیں ملتا۔“ خزان نے وضاحت کی۔

موقع نہیں ملا تھا۔ البتہ خواتین کے متعلق اس کی عمومی رائے ہمیشہ سے یہی تھی کہ انہیں پڑھنا بھی چاہیے اور باہر بھی نکلنا چاہیے۔ لیکن آج وہی عازم عجیب متضاد باتیں کر رہا تھا۔

”آپ میری جاب کے خلاف کیوں ہیں۔ جبکہ آپ جانتے ہیں کہ گھر پر اکیلے وقت گزارنا میرے لیے کتنا مشکل ہے۔“

”تم نے خود ہی اپنے لیے زندگی مشکل بنالی ہے۔“ عازم نے قدرے ناراض لہجے میں کہا۔ ”فضہ بھابھی پچھلے سال اپنی دودن کی اربہ تمہاری گود میں ڈال رہی تھیں، لیکن اسے ہاتھ لگاتے ہوئے تمہیں پچھو کاٹ رہے تھے۔ بچے تو معصوم فرشتے ہوتے ہیں کیا تھا اگر ہم اسے گود لے لیتے، ہمارا اپنا خون تھا وہ۔ کیا پتا اس کی برکت سے اللہ ہمیں حقیقی خوشی سے بھی نواز رہا، بندہ اتنا ناشکر بھی نہ ہو۔“ وہ بار مڑا سا ہو کر ٹیبل سے اٹھ گیا۔

”ایسی بے وقت کی بحث کو اس وقت بیچ میں لانے کا کیا مطلب عازم! سیدھے سیدھے کہہ دیں آپ کو میرے جاب کرنے سے پرالہم ہے۔ بچے کو بیچ میں کیوں لا رہے ہیں۔ عرفان بھائی کی بیٹی کو میں نے اس لیے گود نہیں لیا تھا کیونکہ مجھے لگتا تھا بچہ لینے کے باوجود میری پریشانی جوں کی توں رہے گی۔ اب میں اپنا ذہن نہیں بتا رہی تھی تو اس میں میرا کیا قصور۔“ وہ رو دینے والی ہو گئی تو عازم نے مزید کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن جاب کی بات بھول جاؤ۔ نہ تمہیں روپے پیسے کی کوئی کمی ہے اور نہ کہیں آنے جانے کی پابندی۔۔۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر دوبارہ کوئی بحث نہیں ہوگی۔“

وہ قطعی انداز میں کتابا ہر نکل گیا اور سارہ نے زور سے تپتے کو پلیٹ پیچ کر اپنا غصہ نکالا۔



لاہور کینال کے پاس بیٹھے عازم کو شاید ایک گھنٹے

”ہاں۔ وہ بے سکون تو ہے لیکن۔۔۔“ وہ لحظے کو رکا۔ ”چلو! پھر کبھی ڈسکس کریں گے۔ ویسے بھی تم نے میری دوستی کی آفر پر غور نہیں کیا۔ اب کیا دروازے یہ کھڑے کھڑے اپنے پرسنلزم سے شیمز کروں۔ کبھی فون یہ بات کرنے کا وقت نکالو۔“ وہ کہہ کر مزید نہیں رکا اور بائیک نکال لے گیا۔



”میں نے اپنی سی وی ایک پرائیویٹ اسکول میں بھیجی تھی۔ وہاں سے انٹرویو کی کال آئی ہے۔“ بیچ کے دوران سارہ نے، بے سکون انداز میں عازم کو اطلاع دی، لیکن اس کا کھانے کی طرف بڑھتا ہاتھ وہیں رک گیا۔ چند سیکنڈ اس نے کچھ سوچا، پھر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

”کس کے مشورے سے سی وی بھیجی تھی۔“ اس کا لہجہ ایک سنجیدہ تھا۔ سارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عازم نے، ایسے جملے کی وہ ہرگز توقع نہیں کر رہی تھی۔ سی وی بیٹے کی اطلاع بھی یونہی دے دی کہ اگلی صبح انٹرویو کے لیے اسی کے ساتھ جانا تھا۔

”کیا مطلب۔۔۔ میں نے تو ملائیشیا سے آتے ہی کافی جگہوں پر اپلائی کر دیا تھا۔“

”لیکن کیوں۔۔۔ ملائیشیا سے جاب چھوڑ کر تو میں آیا ہوں۔ یہاں بھی یہ کام میرے کرنے کا ہے۔ تم بلاوجہ کیوں فکر مند ہو رہی ہو۔“

”میں تو یونہی وقت گزاری کے لیے جاب کرنا چاہتی ہوں۔ گھر کا ابوجھ اٹھا، میرا مقصد نہیں ہے۔“

”وقت گزاری کے لیے تمہارا خاندان ہی کافی ہے۔ جہاں تم روز صبح ملنے نکل کھڑی ہوتی ہو۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی تو سارہ نے بمشکل ضبط کیا۔

جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ عازم جیسا لبرل، عورت کی آزادی کا حامی بیوی کے معاملے میں اتنا تنگ نظر نکلے گا، اس نے۔۔۔ وہ چاہ نہیں تھا۔ تو کیا سات سال میں

نے اسے سمجھنے میں غلطی آئی۔ ملائیشیا میں سارہ کے لیے نہ تو جاب کرنے کا ماحول تھا اور نہ اس نے ایسی

کوشش کی تھی اس لیے عازم کے خیالات جاننے کا

سے زیادہ ٹائم ہو گیا تھا لیکن خاموشی سے لہروں کو تکتے وہ ابھی بھی وہاں سے اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے قریب سے ایک کنکراٹھا کر نہر میں پھینکا اور دور تک پھیلنے والوں کو دیکھنے لگا۔ آج اس کا دل بہت افسردہ اور بے چین تھا۔ نوکری کے معاملے پر سارہ سے بھگڑا کرنے کے بعد اس کے اور سارہ کے بیچ تین اور معاملات کو لے کر مزید کئی لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ نتیجتاً وہ ناراض ہو کر میکے چلی گئی تھی۔ کتنا مشکل ہے ایک ایسی لڑائی لڑنا جو غصے سے زیادہ کسی پلاننگ کا حصہ ہو۔ بے سرپیر کی ان لڑائیوں کا مقصد ایک ایسی جنگ جیتنا تھا جس میں ہار جانے کس کی تھی۔

موبائل کی گھنٹی بجی تو اس نے جیب سے موبائل نکالا۔ "خزران۔ ایک عجیب سی سرخوشی نے پورے وجود کا احاطہ کیا۔ اس نے بس کیا۔

"کیسی ہو مہربان دوست۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔
 "بالکل ٹھیک الحمد للہ۔ تم سناؤ قاریغ ہو؟"
 "ارے ایسا ویسا۔" وہ ہنسا "بس ایک کشتی اور چپو کی کمی ہے۔"

"کیا مطلب۔ کہاں ہو تم۔؟" وہ حیران ہوئی۔
 "نہر کنارے بیٹھا ہوں۔ تیرا کی تو جانتا نہیں۔ سوچ رہا ہوں کشتی ہوتی تو سیر کامزا آجاتا۔"
 "عجیب سر پھرے آدمی ہو۔ سارہ بے چاری کو ناراض کر کے میکے بٹھا دیا اور یہاں نہر کنارے بیٹھے مزے اڑا رہے ہو۔ شرم آتی چاہیے۔" وہ غصہ ہو گئی۔

"او۔ تو تمہاری ہمدرد طبیعت نے سارہ کی خاطر جوش ارا ہے۔ وہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ فون میں پہل کرنے کی رگ تم میں کیسے پھڑکی۔" وہ باقاعدہ طنز کرنے لگا۔

"اچھا فضول نہ بولو۔ سچ کہو کیا معاملہ ہے؟"
 "تمہارے ذرائع نے "معاملہ" بھی بتا دیا ہوتا۔" وہ اسے تنگ کرنے لگا۔

"بس صرف تمہاری بات پر یقین کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے معاملے میں 'سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں

کرتی۔"

"چلو تھینکس۔ تمہارا اتنا کہنا کافی ہے۔"
 "ایسی کیا بات ہوئی مازم! کہ دس روز ہو گئے۔ سندھ واپس آرہی ہے نہ تم۔ اسے منانے جارہے ہو۔ اتنا پرستی سے تو معاملہ اور بگڑے گا۔ تم اسے واپس لے آؤ۔"
 "یہ اتنا کی جنگ نہیں ہے رازی۔ یہ تو فاصلوں کی دیوار ہے جو روز بروز اونچیں ہوتی جا رہی ہے۔"

"میں تمہارے ذاتی معاملات کے بارے میں تو زیادہ نہیں جانتی اور نہ اس میں پڑنا چاہتی ہوں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ تم ان فاصلوں کو ختم کرنے کی کوشش ضرور کرو۔ مسائل بھی ہر گھر میں ہوتے ہیں اور چھوٹی موٹی غلط فہمیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہتر ہوتا ہے کہ ہر معاملے کو ایک دوسرے سے ڈسکس کر کے آپس میں سلجھا لیا جائے۔" وہ بھرپور سنجیدگی سے سمجھانے لگی۔

"ہوں۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔" عازم نے ایک گہری سانس لی۔

"وعدہ کرو سارہ کو آج ہی واپس لے آؤ گے۔"
 "اچھا۔ وعدہ بھی کرتا ہے۔" عازم ہنس پڑا۔
 "ہاں۔ پکارا مس۔" خزران بھی مسکراتے لگی۔
 "او۔ کے آج ہی۔ لے آؤں گا۔ خوش؟" وہ اسے تسلی دینے لگا۔

خزران نے تھینک یو کہہ کر فون رکھ دیا اور عازم فون کو تکتے ہوئے اس کے پُر خلوص جذبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ جب وہاں سے اٹھا تو دل ایک دم بہت ہلکا پھلکا سا لگنے لگا۔ وہ جیسے اڑتا ہوا گھر پہنچا۔ جانے کیا تھا خزران کی آواز میں۔ وہ ہمیشہ یونہی مطمئن اور پرسکون سا ہو جاتا تھا۔ کوئی پریشانی، پریشانی نہیں لگتی تھی۔ اور نہ کوئی غم پہاڑ جیسا۔

"خوش رہو رازی۔ تمہارے ہوتے مجھے کسی اپنے کی ضرورت نہیں، تم قریب ہو، آس پاس ہو، تمہاری موجودگی کے احساس سے میری زندگی پھر سے بھر گئی ہے۔"

وہ اسی شام سارہ کو واپس لے آیا۔ محض اس لیے

ہوا اور نہ ہی سیٹ ہو گئے۔

”اور؟“

”میں۔۔۔ وہ نہیں۔“ میرا تو کام ہے ناں۔ مجھے تو

ہر جگہ جیسے، تیسے سیٹ ہونا ہی پڑے گا۔“

”وہاں وقت کیسے گزرتا ہے۔“ وہ پوری توجہ اور دھیان سے، اس کے متعلق جاننا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ سارے سوال بظاہر کافی فارمل سے تھے، لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ واقعی خزران کی ترجیحات اس کے شب و روز کے متعلق سننا چاہتا ہے۔

”بس دن کا وقت کالج، دوپہر کے وقت سے رات گئے تک بچوں کے ساتھ مصروف، ماحول یہاں کا بہت پرسکون اور اچھا ہے۔ فارغ وقت کبھی بی وی دیکھتے، کبھی کتابیں پڑھتے گزر جاتا ہے۔“ وہ تفصیل بتانے لگی۔

”اتنی فارغ رہتی ہو تو کبھی بات بھی کر لیا کرو۔“ وہ بے ساختہ شکوہ کر بیٹھا۔

”میں اپنی عادتیں خراب نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ مسکرانے لگی۔

”بہت عجیب ہو۔“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا تو خزران حیران ہو گئی۔

”کیا مطلب؟“

”مجھ سے جھگڑا کرنا ہو تو اتنے اپنوں کے سے انداز میں ہو کہ ایسے، تو سارہ بھی نہیں لڑتی۔ لیکن جب مجھے کسی معاملے میں تمہاری مدد چاہیے ہو، کچھ مشورہ کرنا ہو یا تم سے کچھ شیئر کرنا چاہوں، تم اتنی دور کھڑی دکھائی دیتی ہو جیسے دوا جیسی۔“

”ایسا ہمیشہ سے تو نہیں ہے عازم۔“ اس نے فوراً کہا۔ ”وقت اور حالات کے ساتھ تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ اب وہ وقت نہیں ہے کہ تم گھنٹوں مجھ سے فون پر گپیں لڑاؤ۔“

”بنا سوچے کچھ بھی بول دیتی ہو۔ تمہارا مطلب ہے میں تمہیں بہکانا چاہتا ہوں یا ٹائم پاس کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ سخت برامان گیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ لیکن تم سے فون پر لمبی

لمبی باتیں کرنا بھی میں بالکل صحیح نہیں سمجھتی۔“

”مشکل میں کسی دوست کی مدد چاہنا اور بات ہے اور لمبی لمبی گپیں لگانا اور۔۔۔ لیکن خیر تم تو کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ تمہاری اس ضد کی وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوا لیکن آج کے بعد نہیں۔ آئندہ تمہاری پریشانیوں میں اضافے کا باعث کم از کم عازم حیدر کی ذات نہیں ہوگی۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔“

عازم کا انداز اتنا قطعی اور ٹھوس تھا کہ خزران نے اپنا دل ڈوبتا محسوس کیا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا۔ اور وہ جان ہی نہیں سکتا تھا کہ جب کسی عورت کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ اس کی محبتوں کے صلے میں صرف درد اس کی جھولی میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ تکلیف کی کیسی انتہاؤں پر پہنچ جاتی ہے۔ اندر کی توڑ پھوڑ جب لاوے کی صورت بنتی ہے تو کوئی برائی، برائی نہیں لگتی، ہر انتقامی کارروائی جائز اور ہر منفی اقدام اپنا حق محسوس ہوتا ہے یا سر کی دھوکا دہی سے چوٹ کھائی خزران نے اب تک ہر مرحلے پر خود کو ٹارگٹ رکھا تھا۔ ہر وقت خود کو مصروف رکھتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اب اپنی محرومیوں پر سوچ بچار کرنے کے بجائے وہ صرف، اپنے بچوں پر دھیان دے۔ عازم کے دوستی کے لیے برہمائے ہاتھ کو بھی اس لیے جھٹک دیا کہ اب وہ اپنے خیالات میں کسی قسم کی اکھاڑ بچھاڑ کی ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ عازم تو پھر اس کی پہلی محبت تھا۔ اگر وہ اپنے دل کو اس کی طرف مائل ہونے سے نہ بچا سکتی تو۔۔۔

عازم کی تو عادت تھی کہ اکثر آتے جاتے مذاق کے انداز میں کوئی شگفتہ جملہ کہہ جاتا یا ہلکا پھلکا اظہار کر جاتا تو وہ گھنٹوں خود کو اس جملے کے سحر میں جکڑا محسوس کرتی۔ عازم سے اپنا ذہن ہٹانے کے لیے گھنٹوں خود سے لڑتی، اپنے حالات اور بچوں کی طرف دیکھ کر اپنے ضمیر کو جگانے کی کوشش کرتی۔ عازم کے لیے بے اختیار لپکتے اپنے دل کو کئی جتن کر کے منائی۔ اور آج وہ اس سے ناراض ہو گیا تھا تو خزران کے دل کو ایک لمحے کے لیے قرار نہیں آ رہا تھا۔ پھر بھی اس نے زبردستی خود کو فون کرنے سے باز رکھا۔ اور ایسے وقت

میں جبکہ اس کی بیوی بھی گھر میں نہیں تھی۔ جو بھی ہو، وہ ایک مرد تھا۔ خزران ایک حتمی فیصلے پر پہنچ کر عازم کی ناراضی کا بوجھ دل پہ لیے وہاں سے اٹھ گئی۔



دو ماہ مزید گزر گئے۔ اس دوران وہ تقریباً "تین چار مرتبہ لاہور ہو آئی۔ لیکن عازم سے ایک بار بھی سامنا نہیں ہوا۔ ان ہی دنوں ایک دن سمیعہ بھابھی نے فون پر بتایا کہ عازم نے سارہ کو طلاق دے دی ہے۔ "کیا؟" خزران کی حیرت سے چیخ نکل گئی۔ "طلاق" کا لفظ کتنا تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ اس سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ پھر عازم اور سارہ کی طلاق۔ جانے بھابھی اور بھی کیا کچھ کہتی رہیں۔ وہ شدید صدمے سے دوچار کچھ بھی سن نہیں پاتی۔ "تو تم بھی عام مرد نکلتے عازم۔ کیا فرق رہا تم میں اور یا سر میں۔ اور کیا فرق ہے مجھ میں اور سارہ میں۔ اسے بھی ایک ایسے تصور کی سزا ملی جس میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ زندگی میں وہی مردوں پر بھروسہ کیا اور انہی دو کر محبت کے قابل بھی جانا، لیکن یا سر کی بے وفائی کے بعد اس بات کا تو گمان بھی نہیں کیا تھا کہ ایک دن عازم بھی ویسا ہی کرے گا۔ شاید اس معاملے میں میرا نصیب ہی برا ہے یا شاید دنیا کا ہر مرد ہی برا ہے۔ مجھ سے لمبی بات کرنے کے لیے مہینوں سے وقت مانگ رہے تھے تو یہ کہنا چاہتے تھے۔ طلاق کا مشورہ مانگ کر اپنے خیالات مجھ تک پہنچانا چاہتے تھے۔"

وہ خیالوں میں گم ویر تک ایسی ہی باتیں سوچ چلی گئی۔ البتہ ایک بات پر بار بار شکر ادا کیا کہ اچھا ہوا عازم سے دوستی پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی ورنہ ایسے حالات پیدا ہو۔ نے کی ذمہ دار خود کو ٹھہرائی رہتی۔



بچوں کے اسکول اور اس کے کالج کی چھٹیاں ہو گئیں تو وہ سب لاہور آ گئے۔ خزران اور بچوں کو بھی دو ماہ کا آرام مل گیا تھا۔ ہفتہ بھر ہی گزرا تھا اسے آئے کہ ایک دن فضا بھابھی اچانک اس سے ملنے کے لیے آ

گئیں۔ "تم تو فون تک کرنے کی زحمت نہیں کرتیں۔ اماں نے کہا خود جا کر خزران کو لے آؤ۔"

"سوری بھابھی میں بس ایک دو روز میں آنے ہی والی تھی۔ پھپھو کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ انہیں ساتھ لیے کمرے میں آئی۔

"شکر ہے۔ اب تو بہت بہتر رہتی ہے۔ تم سناؤ فی الحال تو ہمیں ہوتاں؟"

"جی بھابھی! دو مہینے یہیں ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے پھر اس خوشی میں جلد از جلد کوئی دن طے کرو۔ تمہیں کھانے پر انوائٹ کرنے آئی ہوں۔"

فضہ جب عرفان کی دلہن بن کر سنجیدہ پھپھو کے گھر آئیں تو انہوں نے خزران کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ یہ تمہاری دیورانی ہے۔ اب عازم اور اس کا رشتہ ہو چکا تھا۔ اس لیے فضہ بھی کبھی کبھار اسے دیورانی کہہ کر بلا لیا کرتیں۔ بہر حال وہ خطاب تو یا سر سے شادی کے بعد خود بخود چھن گیا۔ لیکن خزران کا فضا بھابھی سے دوستی کا رشتہ جوں کا توں قائم تھا۔ بہت دیر بھابھی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے بالآخر خزران نے خود ہی عازم اور سارہ کی طلاق کا موضوع چھیڑ دیا۔

"ہاں اب تو بات پرانی بھی ہو گئی۔" فضا نے ایک آہ بھری۔

"ایسا کیا ہوا تھا بھابھی کہ نوبت علیحدگی تک آپہنچی؟"

"بس خزران! ہمیں تو خود سمجھ میں نہیں آیا کہ کب ان کے معمولی معمولی جھگڑے اتنی سنجیدہ نوعیت اختیار کر گئے۔"

"پھوپھو اور پھوپھانے بھی معاملہ سلجھانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"جب میاں بیوی ہی آپس میں مصالحت کو تیار نہیں تھے تو بے چارے کیا کرتے؟"

"اور عازم۔ وہ کہاں ہے آج کل؟" خزران پوچھے بنانہ رہ سکی۔

"یہیں ہے۔ دن میں اپنے شوروم پر ہوتا ہے۔"

”تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں کیا کروں گی جان کر۔ ویسے بھی اب کیا نامدہ۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔“

”ہاں، لیکن میرے حساب سے تمہارے لیے جاننا بہت ضروری ہے۔“ وہ اب اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کیوں؟“ وہ چونکی۔

”کچھ دنوں تک خود ہی جان لوگی۔“ اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

”اب اس کا کیا مطلب۔؟“ وہ ابھی ابھی چند قدم آگے آئی۔

”اگر تمہیں ہماری آخری گفتگو یاد ہو تو میں نے کہا تھا کہ تمہاری ضد کی وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوا ہے۔ حیرت ہے تم نے اب تک غور نہیں کیا کہ میں نے ایسا کیوں کہا تھا؟“ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ایڑیوں

پر گھوما تھا اور اب سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ”اب بھی یہی کہوں گا بے کار کی ضد چھوڑو۔ خود

پر پابندیاں لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ذہنی مریضہ بن جاؤ گی۔ نارمل زندگی گزارنے کے بارے

میں سوچو، آزاد ہو تو آزادی محسوس بھی کرو۔“

وہ کچھ مبہم، کچھ ظاہری گفتگو کر کے باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ سوچوں کے گرداب میں پھنس گئی۔ ”تو کیا اس

دن وہ سارا کو طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا تھا اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں سختی سے اسے طلاق کے فیصلے سے روکتی تو ہو سکتا ہے وہ سارا کو

تہ چھوڑتا۔ تو کیا میں قصور وار ہوں؟“

وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور کڑیاں ملانے لگی۔ اور اس بات کا کیا مطلب ہے کہ میں خود پر پابندیاں لگانا

چھوڑ دوں۔ اب اس بات کا کیا مطلب۔ اور سب سے

چونکی۔ ”اور اس نے کہا کہ نارمل زندگی گزارنے کے بارے میں سوچو۔ تو کیا اب وہ مجھ سے کوئی توقع

باندھنے کی سوچ رہا ہے۔“ اچانک ابھی گھر پہنچنے پر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”ہرگز نہیں۔ میں اس جیسے خود غرض اور دوغلے انسان سے ہرگز رشتہ نہیں جوڑ سکتی۔ اب تو تمہارے

رات کو کھانا ہماری طرف کھاتا ہے۔ بس سونے کے لیے اپنے گھر چلا جاتا ہے۔“

”کیا لگتا ہے بھابھی! اس معاملے میں کون قصور وار تھا۔“ دل کے بہت اندر ایک من چاہی خواہش بالکل

مارے بیٹھی تھی کہ کاش کوئی کہہ دے عازم مظلوم تھا اور سارا قصور واس۔

”میرا خیال ہے اگر عازم چاہتا تو اس رشتے کو قائم رکھ سکتا تھا۔“ فضا بھابھی نے بہت سوچ سوچ کر الفاظ

کا چناؤ کیا۔ خزان کی امیدوں پر اس بڑ گئی۔ وہ جب چاپ بیٹھی رہ گئی۔ اگلے روزہ ہماری میں کپڑے رکھ

رہی تھی جب وہ اچانک ہی اس کے کمرے میں چلا آیا۔

”تم؟“ وہ بالکل گڑبڑا گئی۔ عازم ہنستے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”ڈرتو ایسے لٹیں جیسے چوری پکڑی گئی ہو۔“

”کیا مطلب، چوری پکڑی گئی؟“ وہ خفاسی اپنے کام میں لگی رہی۔

”بھئی جب کوئی کسی کے بارے میں سوچ رہا ہو اور وہ اچانک سامنے آجائے تو کچھ ایسا ہی رد عمل ہوتا

ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر مزے سے ٹیک لگائی۔

”تمہارے بارے میں سوچتی ہے میری جوتی۔“ وہ ٹھیک ٹھیک غصہ کھا گئی۔ ”اور یہ کیا تم سیدھے میرے

کمرے میں تھیں آئے۔ شرم نہیں آتی۔ سمجھو بھابھی کیا سوچیں ال۔ چلو اٹھو یہاں سے۔“

”بہت ناراض ہو۔؟“ وہ اسے بغور دیکھنے لگا۔

”میرا تم سے روٹھنے منانے کا کوئی رشتہ نہیں ہے زیادہ سوچو مت۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ کزن کا رشتہ تو ہے۔ ماموں زاد کی حیثیت سے بات نہ لو۔“

”کہو۔؟“ خزان نے کمرے کی چوکھٹ سے کندھا نکالتے ہوئے بدستور روکھے لہجے میں کہا۔

”کیا تم نہیں جانتا چاہتیں کہ میں نے سارا کو طلاق کیوں دی؟“

اسے گجرات آئے ڈیڑھ سال گزر گیا تھا، لیکن اس تیزی میں بھی ایک سکون، ایک ٹھہراؤ تھا اسی لیے وہ خوش تھی۔ مثال اور رافع ایک درجہ اوپر کی جماعت میں آگئے تھے۔

وہ اس وقت بچوں کو ہوم ورک کروا رہی تھی جب سمیعہ بھا بھی کافون آگیا۔
”کام تو نہیں کر رہی تھیں۔“ انہوں نے پوچھ لیتا مناسب سمجھا۔

”جی نہیں۔ آپ نائیں بھیا کیسے ہیں؟“
”ہاں، وہ ابھی گھر کا کچھ سامان وغیرہ لینے باہر گئے ہیں۔ انہوں نے میرے ذمے ایک کام لگایا تھا، سوچا فارغ بیٹھی ہوں، تم سے تسلی سے بات کر لوں۔“
”خیریت بھا بھی، کون سا کام؟“ وہ چونکی۔

”وہ دراصل تمہارے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔“ سمیعہ نے جھجک کر بات کا آغاز کیا۔ خزان نے جواباً خاموش رہ کر انہیں بات جاری رکھنے دی۔
”سنجیدہ پھپھو نے جنید کو گھر بلایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ تمہیں اپنی بیوی مانا چاہتی ہیں اور عازم کی بھی یہی مرضی ہے۔ جنید نے مجھ سے کہا کہ پھپھو کے پیغام سے تمہیں آگاہ کر دوں۔“ وہ بات مکمل کر کے اس کے جواب کا انتظار کرنے لگیں لیکن خزان بالکل خاموش تھی۔

”ہیلو۔ خزان! سن رہی ہو۔؟“
”جی بھا بھی!“

”کیا ہوا؟ ایسے چپ کیوں ہو گئیں۔ جنید کا خیال یہ ہے کہ تمہیں اس بارے میں سوچنا چاہیے کیوں کہ بچے ابھی نا سمجھ ہیں۔ اگر اس اسٹیج پر تم کسی اچھے بندے کو اپنی زندگی میں شامل کر لو تو زیادہ مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ پھر عازم ہمارا دیکھا بھلا اور اپنا ہے۔“

”بھا بھی! میں فیصلہ کر چکی ہوں کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گی۔ میں الحمد للہ کسی کی محتاج نہیں ہوں۔ باعزت روزگار سے وابستہ ہوں۔ بلاوجہ اپنی پرسکون زندگی میں ہلچل کیوں پیدا کروں؟“

چہرے پر بڑا نقاب اتر چکا ہے عازم۔ میں مسائل سے بھری زندگی کا یہ کوہِ ہمالیہ اکیلے سر کر لوں گی، لیکن تمہارا ساتھ، تم بھیک میں بھی مانگو تو نہیں دوں گی۔ تم آج سے خود کو میری سوچوں سے بھی بے دخل سمجھو۔ تمہارے نام سے جڑنا مجھے موت تک قبول نہیں۔ کبھی نہیں۔“ وہ جذباتی ہو کر رو پڑی، لیکن پھر خود ہی سختی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔



آج وہ دو ماہ بعد گجرات کے سفر پر رواں دواں تھی۔ عازم اس دن کے بعد دوبارہ جنید بھائی کے گھر نہیں آیا۔ اتنی کم مدت میں کیسے کیسے روپ دیکھ لیے تھے لوگوں کے۔ اعتماد، بھروسہ اور خلوص جیسے الفاظ اپنے معنی کھ چکے تھے۔ اپنی احمقانہ سوچوں پر اس کا دل چاہتا خود کو بے وقوفی کا میڈل دے۔ رافع اور منابل کو ان کے دو میاں سے دور نہ کرنے کی خاطر ان کے گھر سے چمکی رہی۔ جبکہ سل بھر ہونے کو آیا تھا۔ وہاں سے کسی نے پلٹ کر خبر بھی نہیں لی کہ جیتی ہو یا مر گئی۔ جاننے والوں سے البتہ خزان کو یہ خبر ملی کہ اس کے گھر چموڑنے کے ایک ماہ بعد ہی یا سر اپنی نئی بیوی کو پاکستان لایا تھا اور کافی دھوم دھام سے ولیمہ کیا گیا تھا اور اب اس کی بیوی امید سے تھی۔ اف۔۔۔ وہ ایک جھڑپ جھری لے کر کھڑکی کے پار گزرتے مناظر کو دیکھنے لگی۔ کیسی کیسی تلخ حقیقتوں کا زہر اپنے اندر اتارنا پڑتا ہے۔

کیسی حساس اور نازک ہوا کرتی تھی اماں ابابا کے گھر، لاڈلی، ضدی اور حاوی ہو جانے والی۔ اور اب۔۔۔ ہر خوشی ہر آسائش کو اس نے خود پر حرام کر لیا تھا۔ وہ تھا کہ خواہشات سے خالی گھر بننا چاہتا تھا۔ جانے اللہ تعالیٰ کو اس کی کون سی نیکی پسند آئی تھی کہ اس نے حوصلے، ہمت اور صبر کی دولت عطا فرمادی تھی۔ ورنہ اسے وہ دن بھی یاد تھے جب یا سر سے نئی نئی علیحدگی ہوئی تھی تو اسے ہر وقت مرنے مارنے کی باتیں سوچھا کرتی تھیں۔

آئیں۔ جنید بھائی کے جانے والوں میں سے تھے۔
 ثاقب حسن نام تھا اور محکمہ زراعت کا اعلیٰ افسر تھا۔
 اس کی پہلی بیوی کا کچھ سال پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں
 انتقال ہو گیا تھا اور ایک پانچ سال کا بیٹا تھا۔

جنید نے اپنی طرف سے تسلی کرنی تھی۔ لوگ بہت
 اچھے اور خاندانی تھے۔ ثاقب کے متعلق بھی عمومی
 رائے بہت اچھی تھی۔ جنید بھائی چاہتے تھے کہ
 خزران اس مرتبہ سوچ بچار سے کام لے۔ خزران نے
 انہیں تو ہاں کہہ دی، لیکن فون بند کرنے کے بعد ذرا
 برابر توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ جب طے کر لیا کہ
 شادی نہیں کرنی تو بلاوجہ کیوں دماغ پہ بوجھ ڈالوں۔



وہ چھٹی لے کر لاہور آئی ہوئی تھی۔ پہلا دن تو اس
 نے خوب آرام کرتے گزارا۔ اگلے روز بھابھی کے
 ساتھ شاپنگ وغیرہ کے لیے نکلنے کا پروگرام تھا، لیکن وہ
 دونوں ہی بچوں کو ہرگز ساتھ لے جانے کے موڈ میں
 نہیں تھیں۔ بھیا نے بھی آفس جانا تھا۔ لہذا انہوں
 نے طے کیا کہ بچوں کو فضا بھابھی کے پاس چھوڑا
 جائے۔ جاتے وقت تو دونوں نے کھڑے کھڑے ہی
 بچوں کو چھوڑا، لیکن واپسی پر آئے تو فضا بھابھی نے
 زبردستی دوپہر کے کھانے پر روک لیا۔ بلکہ کھانا وہ تیار
 کر چکی تھیں۔ سیدھے انہیں دسترخوان پر لا بیٹھایا۔

”ارے بھابھی! آپ نے تو اچھا خاصا اہتمام کر
 ڈالا۔“ خزران بری طرح شرمندہ ہو گئی۔ انہوں نے
 بریانی، کباب، قیمہ، سبزی جانے کیا کچھ بنا ڈالا تھا۔

”تم کون سا روز روز آتی ہو۔ پھر ہمارے گھر تو اور
 بھی کم کم آنے لگی ہو۔“ سنجیدہ پھپھو نے شکوہ کنال
 لمبے میں کہتے ہوئے اسے دیکھا۔

”اچھا۔ اور سیکینہ پھپھو یہ شکوہ کرتی ہیں کہ میں
 آپ کی طرف زیادہ آتی ہوں۔ ویسے اب تو لاہور ہی کم
 کم آتی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”گجرات اتنی دور بھی نہیں کہ تم مہینوں بعد چکر
 لگاؤ۔ پتا نہیں کب یہ بوڑھا وجود ٹھنڈا ہو جائے۔

”پلیز خزران! جلدی میں کوئی فیصلہ مت کرو۔ اپنی
 عمر دیکھو اور سوچو کہ اکیلے یہ زندگی کیسے بسر ہوگی۔ یہ
 رشتہ تو جیسے، اپنے گھر کی بات ہے۔“ سمیعہ نے اپنی
 طرف سے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں بھابھی! میرا فیصلہ قطعی ہے اور جہاں تک
 عازم کی بات ہے تو آپ جانتی ہیں وہ میرا منگیتر تھا۔
 میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ بھیا یا اور کوئی بھی اس
 رشتے کے بارے میں نے گا تو فوراً اس کے حق میں
 ووٹ دے گا، لیکن اگر آپ میری رائے پوچھیں تو میں
 اس سے شادی کے لیے کبھی ہامی نہیں بھر سکتی، بلکہ
 عازم کے علاوہ اگر کسی اور کا رشتہ آیا ہو تا تو شاید میں
 سوچنے کے لیے وقت بھی لے لیتی، لیکن عازم کے لیے
 بالکل نہیں۔“ اس نے کھل کر اپنی رائے ان تک
 پہنچادی۔

”اوہ!“ سمیعہ نے ذرا دیر کو کچھ سوچا۔ ”ٹھیک ہے
 میں تمہارا جواب جنید کو بتا دوں گی۔ اوکے پھر بات
 کروں گی تم سے۔“

”جی۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے فون رکھ دیا۔ ”عازم
 سے شادی“ وہ جملہ تھا جس پر ماضی میں وہ لال گلانی
 ہو جایا کرتی تھی، لیکن آج اسی عازم کا ایک بار پھر رشتہ
 آیا تو انکار کرتے ہوئے لمحہ نہیں لگایا تھا۔ اس نے ایک
 آہ بھر کر تصور میں عازم کو مخاطب کیا۔

”اگر تم نے میرا ساتھ پانے کے لیے سارہ کو طلاق
 دی ہے تو میں کیا اللہ بھی تمہیں معاف نہیں کرے
 گا۔ سارہ کی محبت کے مزار پر میں اپنی خوشیوں کا محل
 ہرگز کھڑا نہیں کروں گی۔“

شام کو جنید بھائی کا فون آگیا۔ وہ اسے ہر طرح سے
 سمجھانے لگے، لیکن خزران نے ہتھیار نہیں ڈالے
 اور صاف کہہ دیا کہ پھپھو کو میرا جواب پہنچا دیں۔ جنید
 نے مجبوراً اس کا انکار عازم اور پھپھو تک پہنچا دیا۔

تقریباً ایک مہینے سے وہ لاہور نہیں گئی تھی۔ بھیا
 بھابھی نے بہت بار بلایا کہ ایک چکر لگا جاؤ، لیکن وہ کسی
 نہ کسی بہانے ٹالتی رہی۔

ان ہی دنوں ایک بار پھر سمیعہ بھابھی رشتے لے

صورت تو دکھا جایا کرو۔“ پھپھو کے مایوس، افسردہ۔ لہجہ پر خزان کا دل منٹھی میں آگیا۔

”کی باتیں کیوں کر رہی ہیں پھپھو۔ اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ اماں کے بعد میں آپ میں اور سیکھنے پھپھو میں اماں کو دیکھتی ہوں۔“ اس نے جذباتی ہو کر ان کا ہاتھ تھاما۔

”مار بھی کہتی ہو اور دل میں ناراضی بھی رکھتی ہو۔“ پھپھو ہولے سے مسکرائیں تو خزان چونک گئی۔

”کیسے ناراضی پھپھو۔ میں تو۔۔۔“
”تمہارے اور عازم کے حق کے لیے برسوں پہلے اگر تمہارے پھوپھا کو منالیتی تو بھائی جان تمہارا رشتہ باسرت، تو نہ کرتے۔۔۔ لیکن سب میری کوتاہی ہے کہ شخص ایک دکان کے لیے تمہارے پھوپھا کو ناراضی نہ کر سکی۔ تم تو در بدر ہوئیں ہی۔ آج میرا عازم بھی اپنا درد دل میں چھپائے اکیلے زندگی گزار رہا ہے۔“ انہوں نے ایک آہ بھر کر کہہ ہی دیا۔ خزان خاموشی سے بچوں کے لیے کھانا نکالتے لگی۔

”سارہ کی شادی کے بعد تو عازم اور بھی ٹوٹا ہوا لگتا ہے۔“

”سارہ کی شادی۔“ خزان نے بے تحاشا چونکا کر سر اٹھایا۔

”سارہ کی شادی ہو گئی۔؟“ وہ آنکھیں پھیلانے ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔

”تمہیں سمجھنے میں نہیں بتایا۔“ فضلہ بھابھی حیران ہو کر سمجھنے کو دیکھنے لگیں۔

”میں نے تو جان بوجھ کر نہیں بتایا۔ میں نے سوچا۔ کہیں یہ سمجھے کہ سارہ کی شادی کا بتا کر شاید اسے دوبارہ عازم کے لیے قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”ہوں!“ فضلہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”اس کی شادی کو تو دو ماہ ہو گئے ہیں۔ اس کی والدہ کا دور کارشتہ دار ہے۔ آج کل ملتان میں ہوتی ہے۔ وہاں اس کا سسرال ہے۔ پچھلے دنوں ایک شادی کے فنکشن میں ملاقات ہوئی۔ خوش اور مطمئن لگ رہی

تھی۔“

فضلہ بھابھی خود ہی دھیرے دھیرے بتانے لگیں۔ سب خاموشی سے بنا کوئی تبصرہ کیے سنتے رہے۔ خزان کی حالت تو سوا تھی۔ ایسی دھماکا خیز خبر پر اس کی سوچیں عجیب سے ربط اور اوندھی اسیدھی ہو رہی تھیں۔

”میرا عازم بہت بد نصیب ہے۔ بچپن میں جتنا میرا لاڈلا ہوا کرتا تھا۔ آج قسمت نے اسے اتنا ہی دور اور اکیلا کر دیا ہے۔ پر ایس کی سختیاں بھی اسی کے نصیب میں لکھی تھیں اور اب یہاں ہے تو دو گھڑی مہمانوں کی طرح بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ اس کی خاموشی سے میرا دل چھلنی ہوتا ہے۔ اتنا صابر شا کر تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ ضد اور غصے سے بات منوانے والا آج میرے سامنے اپنا دل کھلنے کو بھی تیار نہیں۔“

وہ بولتے بولتے رو باسی ہو گئیں۔ عجیب سی اداسی ماحول میں در آئی تھی۔ خزان نے خود کو بولنے سے باز رکھا۔ کہتی بھی کیا۔

وہ کافی بو جھل دل لیے پھپھو کے گھر سے واپس آئی۔ شام کو جنید بھائی کی موضوع لے کر اس کے پاس آ بیٹھے۔ وہ تو لاہور آنے سے پہلے ہی اس بات کی توقع کر رہی تھی۔

”تمہارے بچے ابھی چھوٹے ہیں خزان۔ کوئی بڑی تبدیلی آئی تو زیادہ سوال جواب نہیں کریں گے۔“

”لیکن بھیا! ضرورت ہی کیا ہے کسی تبدیلی کی۔“

گلی بندھی نوکری ہے۔ اچھی خاصی آمدنی ہے۔ خدا نخواستہ کسی کی محتاجی نہیں۔ کیوں میں بلا وجہ بچوں کو ذہنی بے سکونی کا شکار کروں۔“ وہ کھل کر بولنے کے لیے تیار ہو گئی جان گئی کہ بھیا کافی سنجیدہ ہیں۔

”تمہارے لیے تمہارے بچے اہم ہیں اس لیے مسلسل ان ہی کے حوالے سے سوچ رہی ہو۔ میرے لیے تم بھی اہم ہو۔ میں بچوں سے پہلے تمہیں دیکھتا ہوں۔ آج امی اور ابا زندہ ہوتے تو شاید تمہاری کہیں شادی بھی کروا چکے ہوتے۔ اگر تم نے پونہی زندگی گزار دی تو بہت برا خلا رہ جائے گا تمہاری زندگی میں۔ جس کا

ابھی تمہیں احساس نہیں ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے دیکھو تو شریعت کا بھی یہی حکم ہے کہ بیوہ اور مطلقہ کا فیصلہ جلد سے جلد کرو۔ ”وہ اسے رسان سے سمجھانے لگے۔

”سادہ کے والدین نے طلاق کے محض سات آٹھ ماہ بعد اس کی دوسری شادی کر دی، کون ماں باپ چاہیں گے کہ ان کی اولاد بھی رہے۔ اب دیکھو جو نئی تبدیلی آئی ماشاء اللہ وہ خوش باش ہے اور عازم کو دیکھو، کیسا اکیلا اور خاموش سا ہو گیا ہے۔“ بھیا جانے کیوں عازم کے موضوع پر آگئے۔ خزران سے چپ نہیں رہا گیا۔ ”اچھا ہے“ اسے تو سزا ملنی ہی چاہیے۔ بے قصور بے چاری سادہ کو اپنی زندگی سے نکال دیا۔ آج اگر سادہ نئی زندگی میں خوش ہے تو یہ اللہ کی کرم نوازی ہے۔ اس پر۔ بندے دلوں سے کھیل جاتے ہیں اوپر والا تو شکر ہے انصاف کرتا ہے۔“ وہ ناراض لہجے میں بولنے لگی۔

”اچھا بابا۔“ جنید ہنس پڑا۔ ”ب تم سے کون بحث کرے۔ میں تو ویسے بھی تم سے ثاقب حسن کی بات کرنے آیا تھا۔ بہتر ہو گا کہ اپنے معاملے میں ہر پہلو پر غور کرو۔ خود ثاقب کی بہنوں بلکہ ثاقب سے بھی بات کر سکتی ہو۔ تم اب زندگی کی اس سنجیدہ اسٹیج پر ہو کہ ڈائریکٹ بات کرنے کو کوئی بھی تمہاری بولڈنیز سے تعبیر نہیں کرے گا۔ میں نے ثاقب کو تمہارا نمبر دے دیا ہے۔ وہ تمہیں فون کرے گا۔ کیوں سمجھو۔“ انہوں نے بھابھی کی طرف دیکھا۔ ”جی بالکل۔ ویسے بھی سنا ہے کہ ثاقب بہت سلجھا ہوا بندہ ہے۔“

”میں سوچ کر تاؤں گی۔“ وہ سر جھکائے ان کی ہر بات سن رہی تھی۔ ہولے سے بس اتنا کہہ پائی۔

”ماما! آپ کو میری کلاس ٹیچر نے بلایا ہے۔“ منال نے جوتے اتارتے ہوئے کافی سکون سے اطلاع دی لیکن خزران کا تودل دھک سے رہ گیا۔

”کیوں ایسا کیا کر دیا؟“

”اس کی ٹیچر نے مجھے بلایا تھا کلاس میں۔“ رافع نے غناغٹ پانی کا گلاس چڑھا کر اطلاع بہم پہنچائی تو خزران سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”میم تاجیہ کہہ رہی تھیں، منال لائق تو بہت ہے۔ لیکن اس میں کانفیڈنس نہیں ہے۔ اسمبلی کی ایکٹوٹیز میں حصہ نہیں لیتی، کلاس میں زیادہ بولتی بھی نہیں ہے۔ اور خود سے سوال بھی بھی نہیں کرتی۔ بوندو کہیں کی۔“ آخر میں وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا اور اس کی چھوٹی سے چھیا زور سے کھینچ ڈالی۔ منال بے چاری کی چیخ نکل گئی۔

”مست کرو رافع! کیا بد تمیزی ہے۔ جاؤ یونیفارم چھین کر۔ چلو بھاگو۔“ خزران نے زبردستی اسے اندر دھکیلا۔

”دھر آؤ منو!“ اس نے پیار سے منال کو گود میں بٹھایا۔ چھ سال کی معصوم سی اس کی ہنسی۔ پتا نہیں کیوں اتنی سہمی سہمی سی رہتی تھی۔ ”ماما! میرے فادر کون ہیں؟“ منال نے اچانک پوچھا تو وہ بری طرح چونکی۔

”کیا مطلب۔ کس نے پوچھا تم سے؟“

”میم کہہ رہی تھیں۔ آپ کی ماما اگر بڑی رہتی ہیں تو آپ اپنے فادر کو بھیج دیں، رافع نے انہیں بتایا کہ ہماری ماما کلج میں پڑھاتی ہیں۔ اور ہمارے فادر ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔“ منال نے ہاتھ اٹھا کر باقاعدہ جانے کا اشارہ بھی کیا۔ خزران نے پریشانی سے لب کاٹے س دوران رافع کمرے میں واپس آچکا تھا۔ ”تمہیں ایسا جواب نہیں دینا چاہیے تھا رافع!“

”ماما! یہ تو بالکل ہے۔“ رافع نے سر پینے کی اداکاری کی۔ ”میں نے میم کو تجھڑی ایسا کہا۔ وہ تو گھر آتے ہوئے یہ مجھ سے پوچھنے گئی تو میں نے اس کو بتایا۔ میم سے تو میں نے صرف ”جی اچھا“ کہا اور بس۔“ وہ سیانوں کے انداز میں بتاتے لگا تو خزران کو ہنسی آگئی۔

”واہ۔ میرا بیٹا تو بہت سمجھ دار ہے۔ اچھا یہ بتاؤ، کس نے تم سے کہا کہ تمہارے فادر ہمیں چھوڑ گئے

ہیں۔
”وہ تو مجھے کب سے پتا ہے۔ جب ہم دادی کے گھر
رہتے تھے۔“

”ہوں!“ خزران نے اسے قریب بٹھایا۔ ”تمہیں
اپنے فادر یاد ہیں۔“

”ہاں“ تھوڑے سے۔ ان کی بڑی سی پکچر ہمارے
کمرے میں لگی ہوئی تھی۔ اور ایک بار وہ آئے بھی
تھے۔ میری دائر گن لائے تھے اور ہم جلو پارک گئے
تھے ان کے ساتھ۔“

وہ اپنی یادداشت میں سے جن باتوں کو نکال رہا تھا وہ
یا سر کی اس آنری چھٹی کی تھیں جب وہ طلاق دینے
سے کوئی پانچ پندرہ ماہ پہلے آیا تھا۔ تب رافع ساڑھے پانچ
سال کا اور منال ساڑھے تین سال کی تھی۔ منال کو تو
وہ یاد بھی نہیں تھا اور رافع کے ذہن پر بھی دھندلے
دھندلے نقوش تھے۔ رات کو ان کے سو جانے کے
بعد وہ ایک بار پھر بے سکون ہو گئی۔ نیند کہیں دور
جا بھاگی تھی۔ آج پھر وہ تھی اور ان گنت سوچیں۔
”طلاق یافتہ عورت کے بچے دنیا والوں کو کیا جواب
دیتے ہوں گے کہ ہمارا باپ کہاں ہے۔“

”کیا میرے بچوں کے لیے باپ کا ہونا بہت ضروری
ہے۔ کیا بھیا صحیح کہتے ہیں کہ نا بچہ کی اس عمر میں ان
کے لیے کسی مرد کو باپ کے روپ میں اپنا لینا آسان
ہو گا۔ یہاں کئی ایک کو لیکز جواب بہت اچھی دوست
بن چکی تھیں اور اس کی ذاتی زندگی کے متعلق جان
چکی تھیں۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ یہی مناسب وقت
ہے وہ کسی اچھے ایر بھروسے مند انسان کو اپنی زندگی
میں شامل کر لے۔“

”اچھا اور بھروسے مند۔“ خزران نے ایک آہ
بھری۔ ”کبھی ان کی خصوصیات پر صرف عازم ہی پورا
اُترتا تھا۔ لیکن کیسا ہوا چلی تھی۔ اس نے تو جب قدم
قدم چلنا سیکھا تب ہی عازم کی ہی انگلی تھامی۔ بچپن کی
شرارتیں ملز کہیں کے لڑائی جھگڑے اور نوجوانی کا وہ نیا
نیا محبت کا سفر سب، مرحلے اس کے ساتھ ملے کیے
تھے۔“

اپنا مستقبل بچوں کا مستقبل کوئی مستقل ٹھکانا کسی کا
سہارا۔ عازم کا پریشان کردینے والا رویہ۔ سب گنڈ
ہونے لگے۔

عازم نے سارہ کا دل توڑا تھا۔ اس نے سارہ کے
ساتھ وہی کیا تھا جو یا سر نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ نہیں
میں عازم کو قطعاً ”معاف“ نہیں کروں گی۔ بتا دوں گی
اسے کہ خود غرض انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اور تم
میں خود غرضی بھی ہے انسانیت کا فقدان بھی۔

اگلی صبح اس نے سمیعہ بھابھی کو فون کیا تھا اور
ثاقب کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔ ثاقب کے معاملے
میں اس نے سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیا۔ اب وہی
جانے اس بار اس کے جیسے میں خوشیاں ڈالنی ہیں یا پھر
کوئی امتحان۔!



شاور کی تیز آواز میں اسے ایک پارگیٹ بجنے کا وہم
سا ہوا تھا۔ باہر آکر جب وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بال
سلجھا رہی تھی ایک مرتبہ پھر ٹیبل بجی۔ وہ برش ہاتھ
میں لیے دوپٹا کندھوں پر پھیلاتی باہر آ گئی۔
”کون؟“ اس نے پوچھنے کے ساتھ ہی تھوڑا سا
گیٹ کھولا۔

”عازم حیدر!“ خزران کا ہاتھ وہیں رہ گیا اور عازم
گیٹ کے نیچوں بچ آکر ٹھہر گیا۔
”اندرا آ سکتا ہوں؟“

عازم بنا جواب کا انتظار کیے اندر آ گیا۔
”تم یہاں کیسے آئے؟“ وہ گھبرا کر اس کے پیچھے
آئی۔

”اندرا چل کر بتاؤں گا۔ کافی لمبا سفر کر کے آیا
ہوں۔ بری طرح تھک چکا ہوں۔ بھوکا بھی ہوں۔“ وہ
آرام سے برآمدہ عبور کر کے بڑے کمرے میں آ گیا۔
خزران تیز قدموں سے اس کے پیچھے پہنچی۔ اس نے
کچن میں آکر پانی کا گلاس بھرا اور خاموشی سے عازم کو
تھما دیا۔ وہ اس دوران صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

”تھینکس۔“ اس نے گلاس لے کر ایک ہی

شادی کے لیے رضامند ہو گئیں۔ کون لگتا ہے وہ تمہارا۔ کب سے جانتی ہو اسے؟“ وہ اس وقت بالکل جنونی سا ہو رہا تھا۔

”نہیں۔ نہیں جانتی اسے۔ کبھی دیکھا تک نہیں۔“
 ”تم بات تو سنو عازم!“ وہ ایک دم رو دینے والی ہو گئی۔ مولیٰ مولیٰ آنکھیں پانی سے لبریز تھیں۔
 ”یکو۔ کیا کہنا ہے؟“ وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔ سمجھ گیا کہ خزران اس کے غم کے وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہی۔

”میں اسے بالکل نہیں جانتی۔ جنید بھیا کے توسط سے رشتہ آیا تھا۔ بھیا کی خواہش ہے کہ میں شادی کر لوں۔ وہ نہیں چاہتے کہ میں ساری زندگی اکیلے گزار دوں۔“ خزران نے خود کو نارمل کر کے جواب دینے کے قابل بنایا۔

”ہاں تو سب یہی چاہتے ہیں اسنو پڑا کہ تم شادی کر لو۔ پھر مجھے چھوڑ کر ناقب کیوں؟“ وہ زچ ہو کر پھر سے اونچا بولنے لگا۔

”نہیں کرنی تم سے شادی۔“ وہ بھی جھنجھلا گئی۔ ”تم سب جانتے ہو پھر کیوں انجان بن رہے ہو۔“

”کیا خاک جانتا ہوں میں۔“ سمجھ بھابھی اور جنید کے ذریعے انکار اماں تک پہنچا دیا۔ وجہ کیا تمہارے فرشتے آکر تائے مجھے؟“ وہ برس بڑا۔

”جانتی ہوں عازم! کہ تم مجھے بہت بے وقوف سمجھتے ہو۔“ وہ ایک دم طیش میں آ گئی۔ ”لیکن اس بھول میں مت رہنا کہ میں تمہارے دل کی بات نہیں جان سکتی۔ مجھ سے کچھ چھپا نہیں ہے۔“ وہ سب بھول بھال جیسے جنگ پر آمادہ ہو گئی۔ ”تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ سارہ کو طلاق دے کر تم میرا رشتہ مانگو گے اور میں ہامی بھریوں گی۔ یا سرنے مجھے ایک عورت کی وجہ سے چھوڑ دیا اور تم نے۔۔۔ تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے سارہ کو طلاق دے دی۔ کیا تمنا سمجھ رکھا ہے ہم عورتوں کی زندگی کو۔“ وہ پوری شدت سے چلائی لیکن اس سے بھی زیادہ شدت سے عازم کا طمانچہ اس کے گل پر پڑا۔

سانس میں چڑھا لیا اور تھکے تھکے انداز میں ہاتھوں سے پیشانی مٹنے لگا۔
 ”کھا! لاؤں؟“

”نہیں۔ یونہی کہہ رہا تھا۔“ وہ ایک دم سنجیدہ سا فرش کو گورے جا رہا تھا۔
 ”چائے بناتی ہوں۔“

”مجھ نہیں۔“ عازم نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ جانے نظریں کیوں نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایک بار بھی خزران کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ صوفے پر ہلکا سا ٹک کر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے خاموشی سے بیت گئے۔ خزران نے کچھ بھی خود سے نہ پوچھنے کی جیسے قسم کھالی۔

”بہت خوش ہونے رشتے سے؟“ عازم نے اپنی سرخ سرخ شکوہ بھری نگاہ سٹے بھر کو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ خزران کا دل تو بڑی زور سے دھڑکا لیکن بنا کوئی جہاں اب دیے نیچے دیکھتی رہی۔

”بتا کر کے چھوڑو گی مجھے؟“ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے وہ اپنی نظریں اس پر گاڑے بیٹھا تھا۔ خزران گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نہ ایسی صورت حال کا تصور کیا تھا نہ اس کے سوالوں کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا کہتی۔

”تمہید برباد ہونے کی سکت نہیں ہے مجھ میں۔ جان سے مار دو پھر کرلو مزے سے شادی۔ جہاں دل چاہے۔“

وہ اچانک ہی عین اس کے پیچھے آکھڑا ہوا تھا۔ نہایت قریب سے اس کی زبان نے شعلے اگلے تو خزران کا دل چڑیا کی طرح سما۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ عازم نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر پوری طرح اس کا رخ اپنی جانب موڑا۔ خزران نے کانپتی پلکیں اوپر اٹھا دیں۔ وہ آگ برساتی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہوئی لیکن دیوار سے ٹکرا گئی۔

”مجھ سے شادی کے لیے انکار کیا تو میں سمجھا شاید بچوں کی خاطر عمر بھر اکیلے گزارنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس ناقب حسن میں کون سے ہیرے جڑے ہیں جو

”ٹٹ اپ!“ وہ آگ بگولا اسے دیکھ رہا تھا۔
 خزان حیرت اور صدمے سے گنگ دیوار سے لگ گئی
 اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے نیچے بیٹھتی چلی
 گئی۔ عازم پلٹ کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔
 اپنی حرکت پر سخت پشیمانی محسوس کرتے ہوئے وہ اب
 لب چبار ہاتھ بالکل ہی بے ساختہ ہاتھ اٹھ گیا تھا۔
 عازم نے ایک نظر خزان کو دیکھا۔ وہ چہرہ ہاتھوں
 میں دیے ابھی بھی رو رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر رک
 کر سوچا پھر کن میں آکر پانی کا گلاس بھر اور واپس آیا۔
 اس کے قریب اکثروں بیٹھ کر نرمی سے اس کے ہاتھ
 اس کے چہرے سے ہٹائے اور گلاس آگے بڑھایا۔
 ”آئی۔ ایم سوری رازی! سوری سوری۔ پانی پی لو۔“
 اس نے خود ہی گلاس خزان کے منہ سے لگایا۔ اس
 نے ایک گھونٹ پی کر سبک پھیر لیا۔

”چلو اٹھو یہاں سے۔“ وہ اسے بازو سے پکڑ کر
 اٹھانے لگا تو خزان خود ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 عازم اب اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”ملائیشیا۔ سے آنے کے بعد میں نے کئی مرتبہ تم
 سے کہا کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اپنے پرسنل
 شیئر کرنا چاہتا ہوں لیکن تم۔“ وہ ذرا دیر کو رکھا ”بس یہی
 تھی ہماری انڈر اسٹینڈنگ اور ایک دوسرے کو جان
 لینے کے دعوے کہ میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ
 بڑھایا تو تم نے اسے گمراہ کرنے اور ہرکانے سے تعبیر
 کیا۔ بس اتنا ہی جانتی ہو مجھے لیکن اب۔“ اس نے
 انگلی اٹھا کر حتمی لہجے میں سیدھا خزان کی آنکھوں
 میں دیکھا۔ ”اب میں جو کہوں۔ چپ چاپ اپنے کان
 کھول کر سنو۔ بیٹھو یہاں۔“ اس نے صوفے کی
 طرف اشارہ کیا تو وہ کسی معمول کی طرح خاموشی سے
 جا کر بیٹھ گئی اور عازم بھی عین اس کے سامنے کرسی
 ٹھیک کر ٹک گیا۔

”اب شروع۔ سے سنو احمق لڑکی! کہ میں تم سے کیا
 کہنا چاہتا تھا۔ کچھ ایسا جسے تم تک پہنچانے میں مجھے دو
 سال لگ گئے۔ بلکہ تب جب میرے پاس کچھ باقی
 نہیں رہا۔ بہت سے کام جو میں تم جیسی مخلص اور ہمدرد

کے مشورے سے کرنا چاہتا تھا جو مجھے اکیلے اپنے بل پر
 بے پناہ رسک لے کر کرنا پڑ گئے۔ جہاں تک تمہاری
 بات ہے تو بھول جاؤ کہ اب تم میرے علاوہ کسی اور کی
 ہو سکتی ہو۔“ وہ کچھ اور کہتے کہتے اچانک رکا۔ ”نیر!
 اس پر بعد میں بات کریں گے۔“ وہ شاید ایک بار پھر
 جذباتی ہونے لگا تھا لیکن خود ہی اپنے آپ کو روکا۔
 ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے خود کو
 بولنے کے لیے تیار کیا۔

”سارہ کو طلاق دینے کا فیصلہ میں نے ملائیشیا میں ہی
 کر لیا تھا۔ بہت پہلے۔“ اس نے آہستہ آہستہ کہنا
 شروع کیا اور خزان پہلے ہی جملے پر چونک گئی۔
 ”بہت پہلے کیوں؟“

”میں ہمیشہ کے لیے ملائیشیا چھوڑ کر دوبارہ پاکستان
 آیا۔ صرف اسی منصوبے پر غم در آمد کرنے کے لیے۔
 میں نے اپنی کلی بندھی بہت عمدہ جاب چھوڑ دی۔
 کیونکہ پاکستان آنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ البتہ سارہ میرے
 ایسے کسی منصوبے سے قطعاً لاعلم تھی بلکہ اسے
 اب تک نہیں پتا تھا کہ ہماری علیحدگی کے پیچھے اصل
 وجہ کچھ اور تھی۔ مجھے تم سے یہ سب شیئر کرتے
 ہوئے بہت بہت درکار ہے خزان! شاید کچھ معاملات
 میں مرد ہوتے ہی تنگ نظر اور روایتی ہیں۔ میں بھی عام
 مردوں سے مختلف تو نہیں ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھوں کی
 انگلیاں آپس میں پھنسائے بہت کچھ کہنے کو تیار لگا۔

”جب تمہاری یا سر سے شادی ہوئی تھی الفاظ میں
 بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ پر غم کا کیا سا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ ایک
 سال میں موت اور زندگی کی کشمکش میں جھولتا رہا۔
 تمہاری جدائی کے صدمے کو جھپٹتے جانے کب دے کا
 مریض بن گیا پتا ہی نہیں چلا۔ کھانتے کھانتے سینہ
 پھٹتی ہو جاتا اور میں بے دم ہو کر گر پڑتا۔ کبھی کبھی یہ
 حالت ہو جاتی کہ مصنوعی آکسیجن دلانے کے لیے
 آدھی رات کو دوست ایمر جنسی میں لیے پھرتے۔ جیسے
 تیسے ایک سال گزرا اور میں پہلی پھٹی پر پاکستان آیا۔
 اماں اور ابا کو سلاشک کی گزر کہ شاید میں نشے کا علوی
 ہو چکا ہوں۔ لیکن جب میں نے طبیعت کا بتایا تو انہوں

تھا۔ سرور اور ہائی بلڈ پریشر جیسے اسے چپک ہی گئے تھے۔ وہ فرسٹ ہینڈ ہو کر مجھ پر بھی چلانے لگی تھی۔ کبھی گھنٹوں — روتی — اسے بہلانے کے لیے میں نے ہر سہولت گھر میں مہیا کی لیکن اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ میں اس کا ذہن بٹانے کے لیے ہوٹلوں اور تفریحی مقامات پر لے جاتا، فلمیں دکھاتا لیکن وہ ہر جگہ غائب دہرائی رہتی۔ نہ اسے کسی اور چیز میں دلچسپی تھی نہ کسی قسم کا شوق اور نگوں دکھائی دیتا۔ میں سخت پریشان تھا۔ اسے نارمل رکھنے کی ہر تدبیر بے کار گئی تھی۔ وہ زندہ تھی لیکن زندگی کی رنگینی دور عثمانی سے قطعاً "عاری"۔

ہاں یہ میں مانتا ہوں کہ مجھ سے وہ پیار بھی کرتی تھی، میرا خیال بھی رکھتی تھی اور کبھی کبھی اس بات پر حد سے زیادہ پشیمان بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنے رویے سے میرا دل دکھا رہی ہے۔ کبھی وہ بچے کے لیے روتی تو کبھی میرے لیے۔ کوشش تو کرتی تھی کہ اپنا دکھ مجھ سے چھپائے، لیکن ناکام رہتی کیونکہ بے اولادی کا دکھ اکثر ہی میری محبت پہ حاوی ہو جاتا۔ میں نے ایک آخری کوشش کے طور پر ایک مرتبہ پھر سنجیدگی سے اپنا علاج شروع کر دیا لیکن ڈاکٹرز سے تفصیلی ڈسکشن کے بعد یہی سمجھ میں آیا کہ کامیابی کے چانسز بیس یا پچیس فیصد ہیں۔ یعنی ایک سو سو میں سے ایک امید پر ہم مزید کئی سال بچے کی راہ دیکھیں اور اس کے نتیجے میں بھی معلوم نہیں کامیابی نصیب ہوتی یا نہیں۔

اوپر سارہ کے لیے "انتظار" ایک تکلیف دہ لفظ بن گیا تھا۔ میں نے سارہ سے کہا کہ ہم بچہ گوولے لیتے ہیں۔ فضا بھابھی ان دنوں امید سے تھیں اور میں نے عرفان بھائی اور بھابھی سے بات بھی کر لی تھی۔ دونوں اپنا تیسرا بچہ ہمیں دینے کے لیے تیار تھے۔ لیکن سارہ نے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی قیمت پر کسی اور کا بچہ نہیں پالے گی۔

اس وقت پہلی بار میں سوچ میں پڑ گیا کہ جب ہماری اپنی اولاد ہونے کے چانسز انتہائی کم ہیں اور سارا کسی اور کا بچہ بھی گوولے لینے کو تیار نہیں تو پھر سارا کی بیماری اور

نے میرے مسئلے کا حل شادی نکالا اور دونوں دونوں میں نہ صرف سارہ سے رشتہ بلکہ شادی بھی انجام پا گئی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ پہلے دن سے ہی میں نے سارہ کو اپنی ہلکوں بٹھالیا تھا یا پہلی ہی نظر میں وہ میرے دل میں سما گئی تھی۔ مجھے اس کا عادی ہونے میں کچھ وقت لگا تھا لیکن میں نے اس پر کبھی یہ بات ظاہر نہیں کی۔ دی اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ اپنی اچھائیوں کی بدولت میرے دل میں جگہ بناتی گئی۔ بظاہر تو سب کچھ بہت نارمل انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ لیکن میری پینے پینے میں شاید میرا پچھانہ چھوڑنے کی قسم کھاتی تھی۔

ہماری شادی کو تین برس گزر گئے تھے لیکن ابھی تک اولاد کی خوشی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تو حالانکہ کبھی یہ معاملہ زیادہ سنجیدہ نوعیت کا نہیں لگا لیکن سارہ کو کافی تشویش لاحق تھی۔ میں اس سے کہتا ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے لیکن وہ میری ایک نہیں سستی اور ڈاکٹروں کے پاس جانا شروع کر دیا۔ تقریباً سب ہی ڈاکٹرز نے ہم دونوں کے ٹیسٹس تجویز کیے لیکن میں اپنی آفس ٹائمنگ اور کچھ سستی یا لاپرواہی کہہ لو کہ اس کام کے لیے وقت نہیں نکال پایا اور وہ اپنی ٹریٹمنٹ منسوخ وغیرہ میں مگن رہی۔

پانچویں سال کہیں جا کر سارہ کے انتہائی فورس کرنے پر بالآخر میں نے اپنا ٹیسٹ کروایا تو یہ بری خبر بن کر ہم دونوں پہ پھٹی کہ پر اہلیم مجھ میں ہے۔ شروع شروع میں میں نے علاج وغیرہ کو کافی سنجیدگی سے لیا، اور متواتر کئی ٹیسٹ کروانے کے بعد رپورٹ میں بہتری کے آثار بھی دکھائی دیے لیکن اولاد کی خوشی پھر بھی نصیب نہیں ہو رہی تھی۔ سارہ اب بہت مایوس اور ناامید رہنے لگی تھی۔ اسے تو کسی علاج کی ضرورت تھی نہیں اس نے بس عبادت اور وظائف وغیرہ کا سہارا لے لیا۔ لیکن علاج اور دعاؤں کا بھی کوئی نتیجہ نہ پا کر وہ پھر مایوسی میں ڈوبنے لگی۔

وہ اس معاملے کو اتنی سنجیدگی سے لینے لگی تھی کہ شاید اب یہ اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا

کی مجرم رہتی۔ وہ دوسرے، گھر خوش رہ پاتی اور نہ اولاد پا کر بھی خوشی حاصل کر سکتی۔ ساری عمر یہ سوچ کر نام رہتی کہ اس نے میرا دل توڑ کر اولاد پائی ہے۔ اب بھلا کسی کو ادھوری خوشی دینے کیا فائدہ۔ بہتر تھا کہ وہ پوری طرح مجھ سے بدظن ہو جاتی۔ اس لیے میں نے سنگ دل شوہروں جیسا رویہ اپنا لیا۔ جس پر وہ دن رات یہ سوچنے لگی کہ ایک تو کمی بھی عازم میں ہے اور پر سے رویہ بھی اسی کا برا ہے۔ میں آخر کس بنیاد پر اس کے ساتھ رہوں۔ اس نے مجھ سے بلا تردد علیحدگی کا مطالبہ کر دیا۔ اس طرح میرا منصوبہ کامیاب رہا۔

جہاں تک تمہارا معاملہ ہے تو مجھے ملایشیا میں صرف اتنا پتا چلا کہ یا سرنے اور سری شادی کر لی ہے وہ بھی لبنی بھابی کے بھائی حمزہ سے۔ سارہ نے مجھ سے یہ بات شیر نہیں کی حالانکہ اس کا یہاں سب سے رابطہ تھا۔ اسے یقیناً پتا چلا ہو گا لیکن مجھے اس نے نہیں بتایا۔ مجھے یہاں آکر فضا بھابی اور اماں سے یہ بات پتا چلی کہ یا سرنے تمہیں طلاق دے کر دوسری شادی کی ہے اور یہ بھی کہ تم ابھی تک سسرال میں رہتی ہو۔ بلکہ عین اسی دن پتا چلا جب میں لبنی بھابی کا پارسل لے کر تمہارے ہاں آیا تھا۔

خزان نے کافی غائب دماغی سے عازم کے آخری ہٹلے سنے ذہن ایک ہی سوچ پر سوچے جا رہا تھا۔ عازم کے انکشافات نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اتنی بڑی قربانی کوئی کیسے دے سکتا ہے۔

”سارہ کی دوسری شادی کا سن کر تمہیں کیسا لگا؟“ اس نے بے ساختہ سوال کیا تو عازم مسکرائے لگا۔

”خوشی ہوئی تھی سن کر۔ بس اللہ سے ایک ہی دعا ہے کہ اس نے سارہ کے نصیب میں اولاد کا سکھ لکھا ہو۔“

”کس کس کو پتا ہے عازم؟“

”کسی کو نہیں۔ میں نے کہا نا، مرد کچھ معاملوں میں بڑے تنگ نظر ہوتے ہیں۔ اپنے گھر خاندان سے اسی لیے تو لعن طعن سن رہا ہوں۔ سب ہی کو لگتا ہے سارہ پر ظلم ہوا ہے۔ البتہ جب سے اس کی شادی کا سنا

پریشانی کا تبسرا حل کیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے روایتی انسانی رویوں پر است حیرت ہوتی ہے یا شاید میں ہی دنیا سے انوکھا ہوں۔ سارہ سے مجھے ویسے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن بچہ گود لینے کے معاملے پر اس کا جو رویہ تھا، اس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ اگر عیب سارہ میں ہوتا تو بچہ گود لینے کا یہی مشورہ اس کی طرف سے آتا۔ تب بچہ اولاد کی دھ پر شوہر کی دوسری شادی کی پریشانی جاری ہو جاتی اور عدم تحفظ کا احساس سب سے پہلے اسے بچہ گود لینے پر اکساتا، لیکن خیر۔“ عازم نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”اس کی سوچ پر میں نے اسے معاف کیا۔

کچھ دن بعد کی بات ہے۔ میں آفس میں تھا اور سارہ گھر پر اکیلے۔ اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک ہائی ہو گیا۔ میں کھڑا آیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ میں فوری طور پر اسے اسپتال لے گیا۔ اس دن میں یہ سوچ کر بہت پریشان ہوا کہ اگر اکیلے میں خدا نخواستہ اسے کچھ ہو جاتا تو میں شاید زندگی بھر خود کو معاف نہیں کر پاتا۔ اس کے بعد اگرچہ اس نے بلڈ پریشر کی دواؤں کا ریگولر استعمال شروع کر دیا تھا۔ جس سے خطرے کا امکان کم ہو گیا لیکن اس کی ذہنی پریشانی جوں کی توں تھی۔ میں نے پاکستان واپسی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔

میری پہلی کوشش یہ تھی کہ سارہ کو اکیلے پن سے نجات دلائی جا۔ بھابی بہنوں، ملنے جلنے والوں میں وقت گزار کر یقیناً ”وہ نارمل لائف گزارنے کے قابل ہو سکتی تھی۔ اور وقتی طور پر وہ بہل بھی گئی لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ ڈیڑھ دو ماہ ہی کامیابی سے چلا اور میں سمجھ گیا کہ سارہ کی زندگی کا خلا اس حقیقی خوشی سے ہی پورا ہو سکتا ہے، جو میں اسے نہیں دے سکتا۔ تب جی کڑا کر کے دوسرے مرحلے پر میں نے اپنا رویہ اس کے ساتھ تبدیل کیا۔ میرا ارادہ روز کے لڑائی جھگڑوں سے آغاز کر کے نوبت علیحدگی تک لانا تھا۔

دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ سارہ کو حقیقت بتا کر پلان کر کے طلاق دوں۔ اس طرح وہ عمر بھر اپنے ضمیر

ہے قدرے خاموش ہو گئے ہیں۔ اور ایک دن بھول بھال جائیں گے اور کیا۔“

وہ لاہور والی سے ہنسنا تو خزان بغور اسے دیکھنے لگی۔ وہ جب مکمل کر ہنستا تھا تو اس کی آنکھوں کے بیرونی سروں پر کینٹی کے قریب تین تین لائینیں ابھر آتی تھیں۔ خزان ہمیشہ اسے کہتی عازم جب تم ہنستے ہو تو تمہاری آنکھیں بھی ہنستی ہیں۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے عازم کو غور سے دیکھا۔

”خود کو تنگ نظر مت کہو عازم! میں جانتی ہوں تم نے سب سے یہ بات کیوں چھپائی ہوگی۔“ خزان نے قدرے اوقف کے بعد لب کشائی کی۔

”اچھا!۔“ وہ ہنسا۔ ”تو مجھے جاننے والی حسیں بیدار ہونا شروع ہو گئیں؟“

”تمہیں پتا تھا کہ اگر تم نے عرفان بھائی یا پچھو وغیرہ سے یہ بات شیئر کی تو وہ سب تمہیں اس اقدام سے روکیں گے۔ جبکہ تم تو سارہ کو ایک عظیم خوشی دینے کی اٹھان چکے تھے۔ یہ تمہاری تنگ نظری نہیں بلکہ اعلا ظریفی ہے کہ تم نے اس معاملے کو دنیا میں نہیں اچھالا۔ ورنہ احسان کر کے ڈھنڈورا پیٹنا تو عام رواج ہے یہاں گا۔“

”نہیں رازی!“ عازم ایک آہ بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اس معاملے کو خود تک رکھنا اس لیے بھی بہت ضروری تھا کہ ہر کسی کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ میرا اور سارہ کا معاملہ قدرے الگ تھا ورنہ طلاق ایسے مسئلے کا حل ہونا نہیں چاہیے۔ کئی بے اولاد جوڑے پوری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ پورے اطمینان اور صبر و شکر سے گزار رہے ہیں۔ جو میرے ساتھ ہوا وہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ طلاق میاں بیوی کے کسی بھی معاملے کا آخری سے بھی اگلا آپشن ہونا چاہیے۔ طلاق جیسے ناپسندیدہ عمل کے متعلق یہ میری ہمیشہ سے رائے تھی، لیکن افسوس کہ میری اپنی ہی زندگی اس حادثے سے دوچار ہو گئی۔“

”سارہ نے بھی رپورٹس وغیرہ کے معاملات کبھی کسی سے ڈسکس نہیں کیے۔ اس معاملے میں وہ بھی

تعریف کی حق دار ہے۔“ خزان ابھی تک معاملے کی باریکیوں میں کھوئی تھی۔

”ہاں۔ ہماری فیملی کی حد تک مانتا ہوں اس نے کبھی کسی سے یہ بات شیئر نہیں کی۔ لیکن اس کی اپنی فیملی یقیناً اس سے لاعلم نہیں تھی۔“

”تمہارا اندازہ ہے یا؟“

”اچھا جو نیلی۔ میرے طلاق کے فیصلے کے بعد میرا خیال تھا کہ میرے سسرال کی طرف سے کافی شور مچاگا۔ ہو گا لیکن جب اس طرف سے کوئی خاص منفی رد عمل سامنے نہیں آیا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اس حقیقت سے یقیناً واقف تھے۔ اللہ جلد سارہ کی گود ہری کر دے۔ تب تو ساری دنیا خود بخود جان جائے گی کہ پر ابلم کہاں تھی۔“

وہ آخری جملے پر ہنسنا تو خزان نے بہت اندر کہیں درد اٹھتا محسوس کیا۔ آنکھوں میں اچانک نمی سی تیر گئی۔ اس نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔

”کتابد گمان ہو گئی تھی میں عازم سے۔ یہ تو آج بھی وہی عازم ہے۔ ساری دنیا کا درد اپنے اندر محسوس کرنے والا۔ دوسروں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے سوائے اپنے سب کے لیے جلنے کڑھنے والا۔ میرا عازم۔“ وہ جذباتی سی ہو کر چند قدم آگے بڑھ کر اور اس کے سامنے کھڑا ہو گئی۔

”مسوری عازم! میں سچ سچ تم سے بہت بدگمان ہو گئی تھی۔“

”ہاں اتنی کہ کسی اور کا ہاتھ تھامنے کو بھی تیار ہو گئیں۔“ اس نے ہلکا سا طنز کیا۔

”مجھے دوسری شادی کی قطعاً کوئی خواہش نہیں ہے عازم!“ وہ ایک دم رونے والی ہو گئی۔ ”بھیا بہت پریشور ڈال رہے تھے ہر بار ایک ہی بات مجھے لگا شاید دوسری شادی ناگزیر ہے۔“ اس کا لہجہ بھیگا بھیگا سا تھا۔ عازم نے بھرپور دلچسپی سے اس کی حالت پر نظر ڈالی۔

”دوسری شادی تو ناگزیر ہے محترمہ! یاد ہے میری آخری بات جو میں کہتے کہتے اس وقت رک گیا تھا۔“ عازم نے کچھ دیر پہلے کا اپنا جملہ یاد دلایا لیکن وہ حیران

ہوئوں پہ اپنا کانپتا ہاتھ رکھا اور پھر اس کے شانے سے لگ کر بے تحاشا روئے چلی گئی۔
عازم کی اپنی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی۔ اماں سے خزان اور ثاقب کے رشتے کا پتا چلا تو کیفیت ہی کچھ مرنے جیسی ہو گئی تھی۔
عازم نے نرمی سے خزان کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے خود سے تھوڑا سا الگ کیا۔
”ایک بات بتاؤ۔“ عازم نے سینے پہ ہاتھ باندھ کر سہولت سے دیوار سے ٹیک لگایا۔
”کہو۔“

”میرا پروپونل تمہیں قبول ہے نا۔“
”تمہارا پروپونل۔!“ خزان نے ناخن کھرچتے ہوئے پرسوج انداز اپنایا اور لمبے کو سنجیدہ بنایا۔
”ایک ساتھ دو لوگوں کا پروپونل کیسے قبول کر سکتی ہوں۔ میرا رشتہ تو ثاقب سے ہو چکا۔“ وہ اب چڑانے کے موڈ میں آگئی تھی اور عازم بھی بچ بچ غصہ کھا گیا۔

”تم ابھی تک اس ثاقب کی بات کر رہی ہو۔“
”میرا اس سے رشتہ طے ہوا ہے۔ ایسے کیسے کمٹ منٹ توڑ دوں۔“ وہ مسکرائے گئی۔
”شرم تو نہیں آتی، بار بار اس کا نام لے رہی ہو۔ اور کمٹ منٹ کیسے توڑتی ہے؟“ اسی بتاتا ہوں۔“ عازم نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے اس کی کلائی پکڑی۔
”اف، چھوڑو عازم۔!“ خزان نے کلائی چھڑوائی۔ ”بالکل جنگلی ہو قسم۔“

”اب لوگی اس کا نام۔“ وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔
”توبہ میری۔“ خزان بھی مسکراہٹ نہ روک سکی۔ ”اس کا معاملہ اب تمہاری درد سہی ہے۔ میرا کیا لینا دینا۔“ وہ سرخ چہرہ لیے نیچے دیکھ رہی تھی۔
عازم نے اندر تک سکون اترتا محسوس کیا تھا۔
”میو آر سو سو سیٹ۔!“ وہ دیوار سے ہٹ کر ایک جذب سے آگے بڑھا کہ عین اسی وقت شور مچاتے رافع اور منٹل کمرے میں وارد ہوئے۔ عازم نے اپنے قدموں پر روکے اور بچے بھی ٹھک کر رکنے

حیران اسے دیکھنے لگی۔
”ثاقب صاحب کی تو کسی سے بھی شادی ہو سکتی ہے لیکن اگر تم نے میرا ہاتھ نہ تھا تو سوچ لو کہ عمر بھر کے لیے اکیلا رہ جاؤں گا۔ سارہ نے میرے ساتھ سات سال کی ازیت اس لیے کالی کیونکہ میں اپنی رابلم سے لاعلم تھا۔ لیکن اب جانتے بوجھتے کسی لڑکی کی زندگی کسی قیمت پر تباہ نہیں کر سکتا۔ اس وقت صرف تم ہو جس کا ساتھ میں قبول کر سکتا ہوں۔ اللہ تمہارے بچوں کو سلامت رکھے، تم اس دولت سے محروم نہیں ہو۔ بلکہ تمہاری بدولت میرا گھر بھی ہر ابھرا ہو جائے گا۔“ عازم نے وضاحت کی تو خزان نے سر جھکا لیا۔

”اور ہاں!“ دو قدم مزید آگے آکر عازم نے انگلی سے اس کا چہرہ اپر کیا۔ ”ایک وجہ اور بھی تو ہے تمہارا ساتھ چاہنے کی۔ جو ہر چیز سے بڑھ کر ہے اس دنیا کے ہر جھنجٹ، ہر سٹلے سے اوپر، ہر شے پر حاوی اور مقدم۔ صرف میرے اور تمہارے درمیان۔“

وہ دھیمے لمبے میں نہایت رساں سے اس کے کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ خزان کی سانسیں ٹھمنے لگیں۔ وہ سامنے کہاں تھا وہ تو اس کے اندر بول رہا تھا۔ وہ دوسری وجہ جو عازم کے لبوں پہ تھی۔ صدیوں سے خزان کی کس کس میں بسی تھی۔ نہ اسے اظہار کی ضرورت تھی نہ وہ الفاظ کی محتاج تھی۔

”وقت کے خاتم ہاتھوں نے تمہیں بہت دور جا کر کھڑا کر دیا تھا رازی! میں بس مرا نہیں تھا تمہاری جدائی میں۔“ وہ درد سے چور لمبے میں بولنے لگا۔ ”تم سے دوری میں درد کی کن انتہاؤں کا چھوا ہے، لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ یا سرنے تمہیں چھوڑا تو اپنے زندہ بچ جانے کا راز سمجھ میں آیا۔ اور ابھی میں قدرت کے رازوں کو معنی پہنچانے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ تم نے مجھے ٹھکرا دیا۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے مرنے دیکھ سکتی ہو رازی! تو چلی جاؤ اس بار بھی منہ موڑ کر۔ تمہارے ہاتھوں آئی موت میں۔“

”بس کرو عازم!“ خزان نے بے ساختہ اس کے

”اے انکل! آپ! رافع نے پہچان کر انہو لگایا۔

”بس باس! عازم نے آگے بڑھ کر اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔

”کہاں غائب ہو گئے تھے آپ لوگ۔ سنجیدہ دادی کتنا یاد کر رہی ہیں آپ دونوں کو۔“ عازم نے منابل کو پیار کیا۔

”آپ ہمیں لینے آئے ہیں۔؟“ منابل نے بیگ صوفے پر پھینکا اور تجسس سے سوال کیا۔

”جی بیٹا! ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔“ اس نے منابل کو گود میں اٹھالیا۔ ”تم سے تو بچے بھی سمجھ دار ہیں۔“ عازم نے ایک نظر مسکرا کر خزران کو دیکھا تو وہ اسے گہور کر بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

عازم اپنی جیب پر کجرات آیا تھا۔ خزران نے دو روز کی چھٹی کی درخواست دی اور دوپہر کا کھانا کھا کر لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔

”انکل! ہماری ماما سے کہیں ناں۔ پورے ہفتے کے۔ ایسے وہاں ٹھہریں۔ تین دن سے کیا ہو گا۔“ رافع نے گاڑی میں پرجوش انداز میں فرمائش کی تو عازم ہنسنے لگا۔

”بہت جلد آپ لوگوں کو پورے ایک ماہ کی چھٹی کرائیں گے۔ فکر کیوں کرتے ہو۔“

”اچھا انکل۔۔۔ وہ کب۔؟ رافع نے خوش گوار حیرت سے سوال کیا۔

”تاؤ ناں، کب کی ڈیٹ فکس کریں۔؟“ عازم نے ذرا سی گردن موڑ کر خزران کو دیکھا تو وہ تنبیہ کے انداز میں اسے گھورنے لگی۔

”ہمازم! تم کوئی اور بات نہیں کر سکتے۔“ وہ ہلکی آواز میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

”ضروری ہے ڈیر۔ ہر کام سے بڑھ کر! ہم انہیں بچہ سمجھ کر ان سے کچھ شیئر نہ کرنا اور کوئی بڑا قدم اٹھا لینے کے بعد خود ہی فرض کر لیتا کہ یہ ابھی بچے ہیں، انہیں کچھ سمجھ نہیں، انتہائی خطرناک بات ہے۔ بچے بڑوں سے کہیں زیادہ پر تجسس اور ارد گرد پر نگاہ رکھنے

والے ہوتے ہیں۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ میرے تمہارے معاملے میں پوری دنیا ایک طرف اور یہ دو ایک طرف۔ بھلے پوری دنیا کی نفی کر کے میرا ہاتھ تھام لو پروا نہیں، لیکن ان دو کی ہرگز گز نہیں۔“ اس نے بھرپور سنجیدگی سے انگلیش میں کہا تھا اور جواباً ”خزران بھی قائل ہوتے ہوئے باہر دیکھنے لگی۔

”ہاں بھئی، کہاں بڑی ہو گئے؟“ عازم نے دوبارہ رافع کی طرف دھیان دیا۔

”جی انکل!۔“

”آپ کو لاہور اچھا لگتا ہے یا کجرات۔؟“

”لاہور زیادہ اچھا لگتا ہے۔ لاہور میں میرے بہت سے فرینڈز ہیں۔“ خزران نے محسوس کیا کہ وہ عازم کے توجہ دینے پر بہت خوش ہو رہا تھا۔

”اچھا اور اپنی فیملی میں کس کس سے دوستی ہے۔“ عازم نے گفتگو جاری رکھی۔

”فیملی میں۔۔۔“ رافع نے پرجوش انداز میں انگلی بجائی۔ ”یسری اور سندس تو گرتو والے گیم کھیلتی رہتی ہیں۔ عرفان انکل کے سنی اور شان سے میری بہت فرینڈشپ ہے، لیکن ماما ہاں بہت کم جاتی ہیں۔“

”آپ کو پتا ہے میں سنی اور شان کے گھر میں رہتا ہوں۔“

”اچھا۔؟“ رافع حیران ہوا۔ ”مجھے پتا ہے آپ سنی اور شان کے چاچو ہیں۔ لیکن آپ کا گھر تو الگ تھا نا؟“

”آپ کی سنجیدہ دادی نے بلا لیا۔ وہ بیمار رہنے لگی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ میں آپ سب کو بھی ان ہی کے پاس لے آؤں۔“ عازم نے اصل مددے کی تمہید باندھی۔ خزران نے گہرا کر تھوک نگلا۔

”آپ کے گھر؟“ رافع نے اپنی چمک دار آنکھیں پھیلائیں۔ ”لیکن ہم تو ہمیشہ جنید ماموں کے گھر جاتے ہیں۔“

”آپ کے جنید ماموں کا گھر کافی چھوٹا سا ہے۔ ماموں کے لیے کافی پرالیم ہے۔ دادی کا گھر بڑا بھی ہے۔

پھر وہاں آپ کے دوست بھی ہیں۔ عرفان انکل اور فضلہ آنٹی بھی آپ کا بہت خیال رکھیں گی۔ دادی کا پیار بھی ملے گا اور۔۔۔ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اور کچھ سوچنے کے لیے لب چبائے۔

”دراصل! آپ کی سنجیدہ دادی کو لگتا ہے کہ منو اور رافع کو اپنے فادر کی کمی محسوس ہوتی ہے۔“

بالآخر اس نے کہہ دیا۔ خزران نے بے ساختہ آگے ہو کر رافع کے تاثرات دیکھے، لیکن وہ چپ تھا۔ عازم نے ایک نظر اسے دیکھا۔

”آپ کے فرزند زجب اپنے فادر کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کا دل بھی چہ ہوتا ہے تاکہ آپ انہیں اپنے فادر کے متعلق بتائیں۔“

”جی۔۔۔!“ اس نے پھر مختصر جواب کا سہارا لیا۔ ”آپ نے اپنے فادر کے متعلق دوستوں کو کیا بتایا ہے!“

”میں نے کہا کہ وہ باہر رہتے ہیں اور کچھ نہیں بتایا۔“ رافع کے ایک ہی جملے نے اس کے دل و دماغ کی ترجمانی کر دی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ جانتا بھی ہے اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ ایسی باتیں ہر کسی کو بتانے والی نہیں ہوتیں۔ گھر میں سب اس بات پر متفق تھے کہ بچوں کا کوئی ایشو نہیں ہے، لیکن عازم کی سوچ لوگوں کی اسٹینڈرڈ سوچ سے ہمیشہ کچھ اوپر سوچتی۔ وہ بچے جن پر انجانے میں نئی نئی تبدیلیاں مسلط کر دی جاتی ہیں اور خود ہی فرض کر لیا جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ انہیں قبول کر لیں گے، اور حقیقت کتنی منتشر ذہنیت کے مالک ہو جاتے ہیں۔ عازم نے ہمیشہ پیش آنے والے مسائل کو ایک نقبہ اتنی معالج کی نظر سے دیکھ کر سلجھایا تھا اور بیشتر کا نتیجہ مثبت نکلتا تھا۔

”چھا ایک بات بتائیں۔“ عازم نے قدرے ٹھہر کر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ ”آپ کو جنید ماموں کتنے اچھے لگتے ہیں؟“

”بہت اچھے۔ وہ کبھی غصہ نہیں کرتے اور ہمارے ساتھ پلے اسٹیشن بھی کھیلتے ہیں۔“

”اور میں۔۔۔؟“

”آپ بھی بہت اچھے ہیں۔ آپ بھی جنید ماموں کی طرح خیال رکھتے ہیں لیکن آپ ماموں کی طرح ہمارے ساتھ گیمز نہیں کھیلتے۔“ اس نے منہ ہٹایا تو خزران کو ہنسی آگئی، لیکن ضبط کر لی۔

”اس کی وجہ ہے نا۔“ عازم نے مدبر سے جواب دیا۔

”وجہ۔“ رافع نے بے ساختہ اسے دیکھا۔ خزران بھی حیرت سے سننے لگی۔

”اچھو نیلی آپ کے جدید ماموں بہت خوش رہتے ہیں کیوں کہ ان کی فیملی کمپلیٹ ہے، لیکن میری کوئی فیملی نہیں ہے، میں بالکل اکیلا رہتا ہوں نا اس لیے کبھی کبھی بہت اداس ہو جاتا ہوں۔“

”اوہ۔!“ رافع نے از حد رنج سے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن آپ کی سنجیدہ دادی نے میرے اس مسئلے کا ایک حل ڈھونڈا ہے۔“ عازم نے بات آگے بڑھائی۔ ”چھا۔۔۔ وہ کیا ہے؟“ رافع اسے بدیکھنے لگا۔

”وہ چاہتی ہیں کہ آپ مجھے انکل کے بجائے بابا کہیں، تاکہ آپ کی فیملی بھی کمپلیٹ ہو جائے اور میری بھی۔۔۔“ وہ ذرا دیر کو رک۔ ”لیکن یہاں بھی ایک پرابلم ہے۔“ اس نے جی کڑا کر کہا، کہہ ہی دیا اور رافع جو بغور اس کی بات سن رہا تھا ایک دم چونکا۔

”کیا پرابلم انکل۔۔۔؟“ ”پرابلم یہ ہے کہ آپ کی ماما اس سے ایگری نہیں کرتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ رافع اور ماما کو فادر کی کوئی ضرورت نہیں۔ یا شاید انہیں آپ کے عازم انکل پسند نہیں۔“

”لیکن ماما نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی؟“ وہ ایک دم خزران کی طرف مڑا جو سانس روکے عازم کے لفظوں کے ہیر پھیر جانچ رہی تھی۔

”ماما! آپ کو انکل اچھے نہیں لگتے؟“ اس نے حیرت بھری آنکھوں سے خزران کو دیکھا۔

”وہ بیٹا۔!“ خزران نروس ہو کر عازم کو دیکھنے

گئی۔ "تو اب اس نے غصے سے گھورا کہ کم از کم اتنا تو تیار رہنا چاہیے۔ لیکن وہ پھر بھی کچھ نہیں بول پائی۔"

"آپ ماما کو چھوڑیں رافع! اپنی بات کریں۔ آپ کو داوی کے سنجیدگی پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"وانکل۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ آپ کی فیملی نہیں ہے اور آپ اکیلے ہیں۔ آپ ہمارے پاس آجائیں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ماما کو بھی۔ منالوں گا۔" وہ عازم کو ایسے تسلی دے رہا تھا جیسے وہ کوئی چھوٹا بچہ ہو اور اکیلے میں ڈر جاتا ہو۔

"تھینک یو میٹا۔!" اس نے مسکراہٹ بچھا کر ایک چور نظر خزران پر ڈالی جو اسی کو دیکھ رہی تھی۔ بے ساختہ نظریں ملیں تو وہ گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ وہ لوگ لاہور پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔

بچے بھاگ کر گھر میں چلے گئے۔ وہ گاڑی سے اُتر کر عازم نے گاڑی پر بھائی چاہی تو اس نے روک۔ اور گاڑی سے جھانک کر بولی۔

"تھینکس عازم۔ تم نے رافع کے معاملے کو بہت اچھے انداز میں سلجھایا۔ سوچ سوچ کر میری غنڈیں اڑ جاتی تھیں۔ تم سچ جادو کر ہو۔" اس کی تشکر سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ عازم ایک گہرا سانس لے کر اس کے نزدیک ہوا۔

"میرے لیے ایک عام انسان بھی میری اپنی ذات سے بڑھ کر اہم ہوتا ہے رازی! تم جانتی ہو یہ بات۔ رافع تو پھر بہت اپنا بہت خاص ہے میرے لیے۔ تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہمیشہ ایسے ہی رہنا میرے بچوں کے لیے۔" وہ چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ عازم نے سر فنی میں ہلایا تو حیران ہو گئی۔

"صرف اپنے بچے سمجھو گی تو بہت مشکل ہے۔" وہ مسکرایا تو خزران ایک دم ڈھیلی ہو کر رہی۔

"سیری۔!"



خزران جب سلمیٰ بھابھی کے بطن سے سنجیدہ کے

ہاتھوں پر آئی تو ایک مسموم سا گلابی پھول تھی۔ سنجیدہ نے اسی لمحے خزران کو اپنے تین سالہ عازم کے لیے پسند کر لیا، حتیٰ کہ اسپتال میں ہی بڑھال پڑی سلمیٰ بھابھی سے کہہ دیا کہ وہ اس پھول کو میرے عازم کی امانت سمجھ کر پالیں گی۔ سلمیٰ مسکرا دیں پھر پندرہ برس بعد دونوں کی رضامندی کے ساتھ باقاعدہ رشتہ بھی کر دیا۔

اور آج۔ اس کی آمد کئی کڑے امتحانوں کے بعد اس گھر میں ہو پائی تھی۔ تشکر سے بھیگی آنکھوں کو پلو سے صاف کر کے وہ خزران کو لینے آگے بڑھیں۔ آج بھی وہ گلابی رنگ کے لباس میں ایک گلابی پھول ہی لگ رہی تھی۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو خزران۔" فضا بھابھی نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا تو اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ عازم نے ہلکا سرمئی تھری پیس سوٹ پہنا تھا۔ بہت ہینڈ سم لگ رہا تھا۔ نکاح کی رسم جنید کے گھر چند قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں نہایت سادگی سے ادا کی گئی تھی۔

رخصتی کے وقت سمجھنے سے بہت کہا کہ وہ رافع اور منال کو ان کے پاس چھوڑ جائے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ وعدہ تو کیا تھا ان کی زندگی میں باپ کا خلا پورا کرنے کا اور یہاں ہی غائب ہو جاتی۔ تو وہ کیا سوچتے۔

رافع کو تو یہ بھی پتا تھا کہ آج اس کی ماما کی شادی ہے۔ خزران نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کیا تھا کہ عازم کو ان کا بابا بنانے کے لیے اسے ان سے شادی کرنی پڑے گی۔ رافع نے سیانوں کے انداز میں سر ہلا کر رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔

فضا بھابھی اور سنجیدہ پھپھو نے اسے عازم کے کمرے میں لا بٹھایا تو بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ خزران نے بھابھی کو سختی سے منع کیا تھا کہ کمرے کو دہنوں کی طرح نہ بلیا جائے۔ سادہ سا فرنیچر سلیقے سے رکھا تھا۔ رافع اور منال پانچ دس منٹ ہی ٹنگ کر بیٹھے پھر کھینے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے خزران

ویسے ہیں۔ وہ سونے کے لیے چلے گئے ہیں۔ منال تمہیں بلا رہی تھی۔ چاہو تو پارک دس منٹ کے لیے ہو آؤ۔ تم جاؤ گی تو جلدی سو جائیں گے۔ وہ اس کے قریب آکر بتانے لگیں۔ خزران ان کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں میں ابھی چلتی ہوں۔ منو میرے بغیر نہیں سوئے گی۔“ وہ عازم کی طرف دیکھے باہر آگئی۔

”بھابھی! یہ بیٹھک میں اکیلے کیسے سو میں گے؟“ وہ قدرے پریشان ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

”درمیان میں دروازہ ہے نا۔ تم فکر نہ کرو میں آکر دیکھتی رہوں گی۔“ انہوں نے کہا کہ تو خزران نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔ دونوں ہی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ لائٹ آف کر کے ان کے ساتھ لیٹ گئی۔

منال تو فوراً ہی اس کے بازو پر سر رکھ کر اس سے چپ گئی۔ خزران سمجھ گئی کہ خوب تھکی ہوئی ہے، لیکن رافع صاحب کی کہانیاں ہی الگ تھیں۔ اس کی سنی سے کسی بات پر لڑائی ہو گئی تھی۔ اب وہ لمبی چوڑی لڑائی کے آغاز سے بے بس ایک ایک ڈانٹا لگ پورا معاملہ بتانے لگا۔

خزران کی پلکیں بھاری ہوئے لگیں۔ لمبی لمبی جہانیاں لیتے اس نے جانے کتنی مرتبہ رافع کو ٹوکا کہ اب سو جاؤ، لیکن وہ تو جانے کب سویا، خود خزران کو گہری نیند آگئی۔

عازم کا گھڑی دیکھ دیکھ کر برا حال ہو گیا تو ٹی وی آن کر لیا، لیکن اب ٹی وی دیکھتے بھی ٹھنڈ بھر ہو چکا تھا۔ گھڑی نے دو بجائے تو وہ مجبور ہو کر بیٹھک تک آیا۔ لائٹ آف تھی، لیکن کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ تھوڑا سا اندر آیا۔ رافع قدرے دور سویا تھا اور وہ منال کو اپنے بازوؤں میں لپیٹے بے خبر سوئی تھی۔ عازم نے مسکرا کر بے ساختہ ایک آہ بھری۔ اس کی میٹھی نیند میں خلل ڈالنا سراسر تہذیب کے خلاف لگا۔ وہ دروازے کو آہستہ سے بند کر کے واپس آگیا۔

پانچ بجے کے آس پاس اذان کی آواز اسپیکر میں گونجی تو خزران ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھپھو کا گھر مسجد

نے کمرے کے دروازے پر ایک فرصت کی نگاہ ڈالی۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں برسوں پہلے عازم نے چندہ سالہ خزران سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آئی۔ زاپر تو اس نے بہت کم ہی پہن رکھے تھے۔ پھر بھی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے اتار کر سامنے رکھ دیے۔ کمرے کے کونے میں اپنا سوٹ کیس بڑا نظر آیا۔ تھوڑی دیر پہلے شاید عرفان بھائی رکھ گئے تھے۔ اس نے اپنے لیے ایک نسبتاً آرام دہ سوٹ نکالا اور واش روم چلی آئی۔ بالوں میں پنوں کی بھرمار تھی۔ اس نے بالوں کو ہر چیز سے آزاد کر کے سنگٹھسی کی اور کپ لگالیا۔ اور ہاتھ منہ دھو کر باہر آگئی۔

عازم اس دیران کمرے میں آچکا تھا۔ گھڑی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ذرا سی گردن گھمائی اور پھر حیرت سے پورا گھوم گیا۔

”تم نے ڈریس تبدیل کر لیا۔؟“

”ہاں۔ کیا مطلب۔؟“ وہ اس کے لہجے پر گھبرا گئی۔

”میں نے تو ٹھیک سے تمہیں دیکھا بھی نہیں تھا۔“ اس کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔

”تصویروں میں دیکھ لینا عازم! مجھے بہت الجھن ہو رہی تھی۔“

”عجیب ہو یا۔!“ وہ سخت بد مزہ سا ہو کر کوٹ اتارنے لگا۔ ”ڈریس کے روپ کا تو اپنا ایک حسن ہوتا ہے۔ اس کی تمام تیزی اپنے شوہر کے لیے ہوتی ہے۔ ایسے کیسے تم میرے آنے سے پہلے منہ تک دھو کر بیٹھ گئیں۔“ اس کا موڈ بری طرح بگڑا ہوا تھا۔ خزران کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کچھ دیر اور انتظار کر لیتی تو کیا جاتا۔ وہ اپنے آگے آئے۔ معذرت کے لیے الفاظ ڈھونڈنے کی کوشش کی، لیکن اسی وقت دروازہ بج۔ عازم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو فضا بھابھی اس سے معذرت کرتی اندر آ گئیں۔

”خزران! میں نے بچوں کے بستر بیٹھک میں لگا

سے کافی قریب تھا۔ اس لیے آواز نہایت قریب سے سنائی دیتی تھی۔ اس کے لیے چونکہ نئی بات تھی تب ہی گھبرا کر اٹھی تھی۔ اتنی گہری نیند آجانے پر دل میں سخت تیشیلی محسوس کی۔

عازم کا خیال آتے ہی دل ایک دم اپ سیٹ ہو گیا۔ وہ تو رات بھی خفا سا تھا اور اب تو۔۔۔ وہ پریشانی سے ہرٹ کاٹتی باہر نکلی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ وہ عازم کے کمرے تک آئی۔ ہلکا سا دباؤ ڈالا اور دروازہ کھل گیا۔ ٹائٹ بلب کی روشنی میں اس نے دیکھا عازم بید پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ نظریں چرا کر باتھ روم چلی گئی۔ وضو کر کے کمرے میں واپس آئی۔ عازم کا اندازہ نوز تھا۔

اسے بے تحاشا ترس اور پیار آیا۔ پتا نہیں بے چارہ کتنی دیر جاگتا رہا تھا۔ اس نے جائے نماز کی تلاش کی۔ کہیں نظر نہیں آئی تو چادر بچھا کر ہی نماز ادا کر لی اور نماز پڑھنے کے بعد بھی وہیں بیٹھی رہی۔ دل و دماغ پر ایک ہی سوچ حاوی تھی کہ عازم جب جاگے گا تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ جانے کتنا ناراض ہو۔

باہر ہلکی کھٹ پٹ شروع ہوئی تو وہ باہر آگئی۔ پھپھو اور فضا بھابھی اٹھ چکی تھیں۔ اب تو روشنی بھی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ وہ ایک نظر بچوں کو دیکھ کر واپس آئی۔ پھپھو باہر صحن میں چارپائی ڈالے بیٹھی تھیں۔ وہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ فضا بھابھی اپنی تین سالہ اربہ کو سامنے بٹھا گئیں تو وہ اس سے کھیلنے لگی۔

”رات تو آرام سے گزری خزران!“ انہوں نے پیچھے ہو کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

”جی پھپھو۔۔۔“

”اصل میں عازم کی تو یہی خواہش تھی کہ تمہیں اپنے گھر لے جائے۔ یہ تو میں نے ضد کر کے اپنی بات منوائی۔ برسوں پرانی خواہش تھی کہ تم یہاں میرے گھر دلہن بن کر آؤ۔ شکر ہے اس نے میری بات کا مان رکھا۔ ورنہ کہاں کسی کو خاطر میں لاتا ہے۔“ وہ ہنسیں تو خزران نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”میں بھی خوش ہوں یہاں آکر۔“

”اچھا ہاں خزران۔۔۔ آج دوپہر کے کھانے پہ تمہارے پھوپھانے کچھ مہمانوں کو بلایا ہے۔ بلکہ سب ہی مہمان وہی رات ولے ہیں۔ تم نے اور عازم نے تقریب کی سادگی پر اتنا زور دیا تو ہم نے باقاعدہ ولیمہ کا اہتمام ہی نہیں کیا، لیکن ولیمہ کی دعوت سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ تم ناشتے وغیرہ سے فراغت پا کر ذرا تیار ہو جانا۔ بھاری کپڑے تو تم نے بنوانے ہی نہیں دیے پھر بھی دیکھ لیتا۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ آپ کے لیے کوئی سوٹ نکالنا ہے بتائیے پریس کر لیتی ہوں۔“

”ارے رہنے دو، فضا نے کر لیا ہوگا۔“ وہ مسکرا دی۔

”خزران! ناشتا بن گیا ہے۔“ فضا بھابھی نے پکن سے آواز لگائی تو وہ ان ہی کے پاس چلی آئی۔

”پھپھو کا ناشتا مجھے دے دے میں تو ابھی۔“

”اوہ ہاں۔۔۔ تم تو عازم کے ساتھ ناشتا کرو گی۔ سوری۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“ وہ شوخی سے ہنس پڑیں۔ خزران نے ناشتے کی ٹرے پھپھو کے سامنے رکھی اور خود کمرے میں آگئی۔ عازم کو بے خبر سوتے دیکھ کر خزران کے دل کو کچھ ہوا۔ ”شاید پوری رات نہیں سویا تھا۔“

وہ آہستہ سے سوٹ کیس باہر نکال لائی اور بیٹھک والے کمرے میں آگئی۔ یہاں بھی اٹیچ باگ تھا۔ وہ نہما کر نکلی تو رافع اور منال جاگ چکے تھے۔ اس نے باری باری دونوں کو تیار کیا اور ناشتا بھی کروادیا۔ سوائے عازم کے سب ہی جاگ چکے تھے۔ سیکنہ پھپھو کی فیملی بھی آئی تھی۔ اس وقت، سارے بڑے کمرے میں جمع تھے خزران نے جا کر سلام کیا اور باہر آگئی۔

صحن میں اچھی خاصی دھوپ آگئی تھی۔ سارا بچپن جس گھر کے آئلن میں کھیلتے گزرا تھا، آج اس کے بچے وہاں بھاگ دوڑ رہے تھے اگرچہ ہونا تو یہی تھا۔ اس نے بیاہ کر اسی گھر میں آنا تھا اور ظاہر ہے اس کے اور عازم کے بچے اسی آئلن میں کھیلتے، لیکن یہ اس نے کب سوچا تھا کہ یا سر کے بچے ایک دن عازم

کے گھر پہلے بڑے ہیں گے۔ وہ قدرت کے نرالے کھیل پر بے ساختہ مسکرائی۔

کمرے سے نکلتا عازم دروازے میں ہی ٹھنک کر رک گیا۔ سامنے برآمدے میں چارپائی کے کونے پر بیٹھی خیزران سچ سچ کوئی آسمان سے اتری حور معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا اورنج اور براؤن سوٹ اور کھلتا ہوا خوب صورت چہرہ پورے ماحول میں جان ڈال رہے تھے۔ گیلے بال شانوں پر پھیلے تھے۔ سیاہ آنکھیں عجیب بھگی بھگی اور نشیلی سی لگ رہی تھیں۔ آج تو آپ اسٹک بھی خوب شوخ سی لگا رکھی تھی۔ عازم نے عرصے بعد خیزران کا یہ روپ دیکھا تھا۔ دل و دماغ سے ایک دم ساری تھکان اتر گئی۔

”کیا کہنے زوجہ محترمہ کے۔ صرف نکاح نامے پر دستخط اور عازم حیدر کے نام سے جڑنے کے بعد حسن کا یہ عالم ہے۔ ابھی تو محبت کے دیول بھی کہنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ تب کیا رنگ لائے گا یہ حسن۔ الہی خیر۔“ وہ خوب ترنگ میں اس کے سامنے آیا۔

”کہاں کھوئی ہو ظالم حسینہ!“ عازم کی اچانک ہی آواز سنائی دی تو وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ عازم نما دھو کر نئے کپڑے بھی پہن چکا تھا۔ ”یہ کب اٹھا۔؟“ وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

”کیا اتنا پیارا لگ رہا ہوں کہ نظر نہیں ہٹ رہی۔“ وہ ہنسنا تو خیزران جھینپ گئی۔ ”تم کب اٹھے۔؟“

”بس آدھا گھنٹہ ہوا۔ ناشتا کر لیا تم نے۔؟“ وہ اسے بھرپور توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ تندر۔۔۔ تمہارے جاگنے کا انتظار کر رہی تھی۔“ نئے رشتے کا بہت ہی ٹھنڈا میٹھا احساس اندر کہیں جاگا تو نظریں بے ساختہ جھک گئیں۔

”بھابھی سے کہوں پھر۔؟“

”نہیں۔ میں خود لے آتی ہوں۔ تم اندر جاؤ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں ساتھ آؤں۔؟“ وہ شوخ ہو کر آگے بڑھا۔ خیزران نے گھبرا کر آس پاس دیکھا۔

”توبہ! کتنا ڈرتی ہو۔ بوائے فرینڈ تو نہیں ہوں

تمہارا۔“ وہ ہنستے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مسکراہٹ دبا کر پکچن چلی گئی۔

”چائے تم نے تو نہیں بنائی۔“ اس نے ناشتے کی ٹرے سامنے رکھی تو عازم نے پہلا سوال یہی کیا۔

”آج تو میں نے نہیں بنائی، لیکن آگے کیا کرو گے، پھر تو روز مجھے ہی بنانی ہے۔“ وہ پہلی مرتبہ اس کے ساتھ مسکرائی۔

”یعنی سیکھنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں۔؟“

”اپنی چائے خود بنا لینا۔“ وہ مسکرا کر اس کے لیے ناشتا نکالنے لگی۔ عازم نے نظریں اس کے چہرے پر جمائیں۔ پورے حق سے خیزران کو دیکھنے کی یہ پہلی صبح۔ بہت حسین تھی۔ وہ اس کا ایک بھی پل ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ایسے ہی شوخ رنگ پہنا کرو۔ آج سالوں بعد پھر سے فلمی ہیروئن لگ رہی ہو۔ پتا نہیں کیسے گھسے پٹے جیلے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔“

”مجھے شوخ رنگ اچھے نہیں آتے۔ یہ کچھ ڈریسز تو بھابھی نے خریدے تھے تب ہی۔۔۔“

”تو بس۔ ایسے ہی ڈریسز پہنا کرو۔ میری پسند ایسی ہے۔“ وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔

”تم تو ہو ہی۔“ روانی میں کچھ کہتے کہتے اس نے اپنی زبان کو بریک لگائی۔ عازم نے قہقہہ لگایا۔

”رنگین مزارج۔؟“ عازم نے جملہ پورا کیا تو وہ جھینپ گئی۔

”پر اب تو تم آگئی ہو رنگین مزارجی کا ستیاناس کرنے۔“ جانے کیا تھا عازم کے ابجے میں۔ اس نے چونک کر نظر اٹھائی۔ بظاہر تو نارمل رہا یہ تھا، لیکن جانے کیوں خیزران کو لگا اس کا جملہ کچھ خاص معنی لیے ہوئے ہے۔ اس نے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت لیا، پھر نظر اٹھائی۔

”سوری عازم! رات مجھے پتا نہیں کیسے بچوں کے پاس نیند آگئی۔ آنکھ اذان کے وقت کھلی۔ تم بہت گہری نیند سوئے تھے۔“ خیزران بات کے دوران اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ صرف ہلکا سا مسکرایا تھا۔ ہونٹوں

پہ تہی مبہمی مسکراہٹ پہ ”تو کمٹش“ کی تحریر بہت واضح تھی۔

دوپہر کو دلیمہ کی سادہ سی تقریب تھی۔ سیدھا اور فضہ نے اس کے لیے فیروزی سوٹ پسند کیا جو باقیوں سے قدرے بھاری تھا۔ عازم سفید کاٹن کے سوٹ میں بلا کا جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا۔ سارا دن اسی کی نذر ہو گیا۔ شام تک وہ بری طرح تھک گئی۔ مہمان رخصت ہوئے تو اس نے کمرے میں آکر پہلا سکون کا سانس لیا۔

عازم کے دوستوں نے ریسٹورنٹ میں پارٹی مانگی تھی وہ انہیں ڈنر کرانے باہر چلا گیا تھا۔ خزران نے کپڑے تبدیل کرنے کے لیے سوٹ کیس کھولا تو عازم کی بات یاد آئی۔ لائٹ براؤن سوٹ کی طرف اس کا بڑھتا ہاتھ وہیں رک گیا۔ جانے کیا جادو اور کیسی تاثیر ہوئی ہے شوہر کی بات میں عورت جی جان سے اس کے رنگ میں رنگنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ خزران نے آتشیں گلابی سوٹ کو عازم کی نظروں سے دیکھا اور مسکراتے ہوئے وہی نکال لیا۔

”ماما! یہ سارے پارے پارے ڈرہسز آپ کے ہیں؟“ منال تیری کے دوران اس کے ساتھ ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ خزران نے گود میں بٹھا کر خوب زور سے اس کا گال چوما۔

”جی میری جان۔ اچھا جاؤ رافع کو بلاؤ، کہاں غائب ہے وہ؟“

”سنی اور شان کے روم میں ہے۔ ابھی بلا لاتی ہوں۔“ وہ باہر دوڑ گئی۔

”جی ماما! آپ نے بلایا۔“ رافع فوراً ہی آیا۔

”ہاں بیٹا! کہاں غائب ہو صبح سے؟“ اس نے رافع کو پاس بٹھایا۔

”آپ بڑی تھیں تو اس لیے سنی وغیرہ کے کمرے میں بیٹھا رہا۔“

”ارے!“ وہ حیران ہو گئی۔ ”میں تو سمجھ رہی تھی تم سب کھیل رہے ہو اچھا کھانا کھایا تم نے؟“

”کھانا بہت اسیا کسی تھا۔ مجھ سے کھایا نہیں جا رہا

تھا۔“

”اوہ۔“ خزران نے سیٹی کے انداز میں ہونٹ سکپڑے۔ قورمہ شاید باہر سے پکوا یا تھا، واقعی تیز مسالے دار تھا اور پلاؤ تو رافع کو پسند ہی نہیں تھا۔ اسے شدت سے اپنی لاپرواہی کا احساس ہوا۔

”اچھا بیٹھو، میں تم دونوں کے لیے کھانا لاتی ہوں۔“ اس نے کچن میں آکر بھابھی کے بنے سالن میں سے پلیٹ نکالی اور تان اٹھائے۔

”ماما! یہ کمر کس کا ہے؟“ رافع کھانے کے دوران بھی غور سے عازم کے کمرے کو دیکھ رہا تھا۔

”یہ۔“ وہ رکی۔ ”یہ بھی ہمارا روم ہے۔“

”آج ہم یہاں سوئیں۔ یہاں بیڈ بھی ہے۔ کل تو میں بالکل ایزی نہیں سویا تھا۔“

”ہاں۔ ہاں۔ سو سکتے ہو۔“ وہ اب اور کیا کہتی۔ گھڑی پر نگاہ کی۔ بس بج چکے تھے عازم تو شاید لیٹ آتا۔ بچوں کو ابھی سے نیند آرہی تھی۔ اس نے لائٹ آف کر کے بچوں کو وہیں سلا دیا۔ پتا نہیں بے چارے کتنے تھکے ہوئے تھے۔ خلاف توقع رافع کو آدھے گھنٹے میں ہی نیند آگئی اور منال تو ویسے بھی لائٹ آف ہوتے ہی دبک جاتی تھی۔

بچوں کو یہاں سوتے دیکھ کر عازم کیا سوچے گا۔ وہ پریشانی سے لب کاٹتے اٹھ بیٹھی۔ ”اب کیا کروں، کیا سوئے ہوئے بچوں کو بیٹھک میں سلاؤں۔ نہیں۔ نہیں۔ پورا صحن عبور کر کے انہیں وہاں تک لے جانا۔ تو بہ کتنی عجیب لگوں گی۔ فضہ بھابھی سے بات کروں یا سب کے سونے کا انتظار۔ اچھا عازم کا ویٹ کر لیتی ہوں۔ وہ آئے تو مل کر کچھ سوچتے ہیں۔ وہ تو آئیڈیاز کی مشین ہے۔“

خزران مطمئن سی اٹھ کھڑی ہوئی۔ لائٹ دوبارہ آن کر کے کمرے کو تھوڑا سیٹ کیا۔ کپڑوں کا پھیلاوا سمیٹا، ہر چیز جگہ پر رکھی ڈریسنگ ٹیبل کی اشیاء کو ترتیب دی۔ بک شاہت کو کپڑے سے صاف کرتے کچھ اچھی کتابوں پر نظر پڑی۔ عازم کے آنے تک ٹائم تو پاس کرنا تھا۔ وہ ایک کتاب لے کر بیڈ کے کنارے پر ٹک

روز واپس جاتی ہے اور تم نے رات کے کھانے پر بھی آتا ہے۔“
 ”اوہ“ وہ قدرے رکا۔ ”دراصل بھابھی! مجھے تو آج بھی باہر جانا ہے۔ آج کچھ دوست مجھے پارٹی دے رہے ہیں اس لیے ایڈوائس معذرت۔ کل پھر جس وقت واپسی ہو مجھے بتا دینا۔“
 آخری جملہ اس نے خزان کو مخاطب کر کے کہا اور باہر نکل گیا۔



فوڈ اسٹریٹ کی ہلکی روشنیوں میں گرما گرم کھانوں اور دوستوں کی خوش گہیوں سے محظوظ ہوتے بھی عازم نے بے شمار مرتبہ موبائل جیب سے نکال کر چیک کیا۔ وہ دوپہر کے دو بجے جنید کے گھر سے آیا تھا اور اب رات کے دس بج رہے تھے۔ اس دوران خزان سے ایک بار بھی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ کل تو وہ خود بھی اسے کر سکتا تھا، لیکن دل سے اٹھتی خواہشوں کا کیا کرتا۔ جہاں سے لگا تا ایک ہی پکار آرہی تھی کہ وہ اسے فون کرے۔ اس کا حال دریافت کرے۔ وہ اسے بری طرح مس کر رہا تھا۔ جانے کیوں دوستوں کی محفل بھی بے رنگ اور پھکی لگ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا سب مضاحمتیں بالائے طاق رکھ کر اسے جنید کے گھر سے لے آئے۔ ایک غصہ خود پر بھی آیا کہ سمیچہ کی ڈنر کی دعوت منع کیوں کر دی۔ دوستوں کو کوئی مجبوری بتا کر اگلے روز کے لیے ٹال دیتا۔ کم از کم شام کا وقت اس ظالم کے ساتھ تو گزار لیتا۔



خزان نے گھڑی کی طرف دیکھا گیارہ بجنے والے تھے۔ بچے پلے اسٹیشن کھینے میں مصروف تھے۔ بھابھی تھک کر سونے چلی گئی تھیں اور جنید بھیا بچوں کے کمرے میں کمپیوٹر پر کچھ کام کر رہے تھے۔ خزان بے چین سی کمرے میں آئی تاکہ عازم کو کل کرے۔ لیکن گھڑی دیکھ کر رک گئی۔ ”اس وقت تو دوستوں کے ساتھ ہو گا۔ مسیج کر لوں۔ پر کیا لکھوں؟ وہ بھی تو

گئی۔ کافی سارے صفحے یونہی بیٹھے بیٹھے پڑھ لیے۔ پھر کمر کو ذرا آرام دینے کے لیے لیٹ کر پڑھنا شروع کیا۔ کتاب بہت ہی دلچسپ تھی وہ پوری توجہ سے حرف حرف پڑھ رہی تھی۔ لیکن اب نیند کے جھونکے آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ اب تو یقیناً ”وہ آنے والا تھا۔ خزان نے دوبارہ دھیان کتاب کی طرف لگایا اور پھر صبح کی اذان۔ ایک بار پھر وہ گزشتہ روز کی طرح ہڑبڑا کر اٹھی۔

”آف میرے لائن۔“ اس نے سر ہاتھوں پر گرایا۔ کتاب گود میں دھری تھی اور کمرے کی لائٹ۔ وہ چونکی۔ لائٹ آف بھی اور ٹائٹ بلب جل رہا تھا جو اس بات کی دلیل تھا کہ وہ کمرے میں آیا تھا۔ خزان ست دی سے وارٹر روم کی طرف بڑھ گئی۔ ناشتا اس وقت دونوں کے سامنے رکھا تھا لیکن پچھلی صبح والی شوخی اور شرارت کا کہیں نام نہیں تھا۔ عازم جلدی سے چائے ختم کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”آج تو ہم جنید کی طرف انوائٹڈ ہیں نا۔ وہ کیا کہتے ہیں مکلاوا۔“ اس نے یاد آنے پر دہرایا۔ ”تم اور بچے تیار ہو کر باہر آ جاؤ“ میں اہل کے کمرے میں ہوں۔“

وہ جیب کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔ خزان نے ایک گہری سانس لے کر برتن اٹھائے۔ وہ چاروں دس بجے جنید کے گھر پہنچ گئے۔ عازم دوپہر کے کھانے تک وہیں رکا۔ زیادہ وقت جنید کے ساتھ گپ شپ میں گزارا۔ کھانے کے بعد اس نے اجازت چاہی۔

”تمہیں لینے کب آتا ہے؟“ اس نے خزان کی طرف دیکھا۔

”بھی کہاں عازم! لے جانے کی باتیں کل کرنا۔ آج تو خزان اور بچے ہمارے ہاں رہیں گے۔“ سمیچہ نے شوخی سے اطلاع دی عازم حقیقتاً ”حیران ہو گیا۔“ ”چھانے مجھے واقعی نہیں بہتا تھا۔“ ”ہاں بھئی۔ ہمارے ہاں مکلاوے کی دلہن اگلے

رہنا مجھے پسند نہیں۔ میں اپنے اکثر کام خود کرنے کا عادی ہوں۔“ دروازے کے دائیں بائیں ہاتھ جما کر اس نے خزان کے نکلنے کا راستہ بند کر دیا۔

”جانے دو عازم! باہر سب کھانے پر وٹ کر رہے ہیں۔“ وہ منمنائی۔

”جا کر دکھاؤ۔“ لہجے میں بھرپور شرارت سموئے وہ اور نزدیک ہوا۔

”بھی کوئی۔“ بلانے آجائے گا، پلیز عازم! جملہ اس کے منہ میں رہ گیا اور عازم نے اسے پیچ کر گلے سے لگالیا۔ بس چند لمحے ہی وہ اس قہوت کی گرمی محسوس کر سکے۔

”کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے خزان عازم۔ جلدی سے آجاؤ۔“ فضلہ بھابھی کی آواز نے طلسم توڑا تو دونوں ہی گھبرا کر دوڑ ہوئے۔ خزان نے بے ترتیب دھڑکنوں اور کاپتی انگلیوں سے دروازہ کھولا۔

کھانے کے دوران بھی وہ معنی خیز مسکراہٹ لبوں پہ سجائے مسلسل اسی کو دیکھ رہا تھا۔ خزان نے بمشکل چند نوالے حلق سے اتارے۔ بدتمیز کہیں کالے دو سروں کی موجودگی کا بھی کچھ احساس نہیں۔ وہ اسے دل ہی دل میں سناہٹ لگی۔

عرفان بھائی نے کھانے کے بعد عازم کو بیٹھک والے کمرے میں بلا لیا۔ ڈیجیٹل کیمرے کی تصویروں کو کمپیوٹر میں ٹرانسفر کرنے کے لیے انہیں عازم کی مدد درکار تھی۔ خزان کمرے میں آئی تو رافع اور منو بھی ساتھ ہی آگئے۔ رافع جس معصومیت سے تھک کر بیڈ پر گرا، خزان کو ٹوٹ کہ اس پہ پیار آیا۔ بچے واقعی معصوم فرشتے ہوتے ہیں۔ اس نے پیار سے رافع کے بال سہلائے اور جرابیں اتار کر اسے تھیک سے سٹایا۔ مثال بھی اس کی بغل میں گھس آئی۔ خزان نے اٹھ کر ٹائٹ بلب جلایا اور لائٹ آف کر دی۔ عازم کوئی ایک گھنٹے بعد کمرے میں آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر بیڈ پہ سوئے بچوں پر ڈالی۔ پھر ڈرنگ ٹیبل سے کچھ ضروری سامان اٹھا کر خزان کی طرف دیکھا۔

کال کر سکتا تھا۔ اتنی دیر پہلے ہمیں چھوڑ کر گیا۔ حال احوال تو دریافت کر لیتا۔“ وہ جھنجھلائی ہوئی ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ لیکن دل بے زار اور اچاٹ سا ہو رہا تھا۔ اپنا ہی کمرہ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بے دل سے لیٹ گئی۔

عازم نے اگلی صبح سے شوروم جانا پھر سے اشارت کر لیا۔ جنید سے فون پر پوچھا کہ خزراں اور بچوں کو لینے کب آئے۔ جنید نے کہہ دیا کہ وہ نگر نہ کرے۔ میں خود انہیں چھوڑ آؤں گا۔ خزان بچوں کے ساتھ چار بجے کے قریب پھپھو کے گھر پہنچی۔ عازم ابھی شو روم سے واپس نہیں آیا تھا۔ پھپھو کے ساتھ کچھ دیر حال احوال بانٹنے کے بعد وہ فضلہ بھابھی کی مدد کرنے کچن میں آگئی۔ فضلہ نے بہت منع کیا، لیکن وہ نہیں مانی تو مجبور ہو کر اسے میٹھے میں کھیر بنانے کی ذمہ داری سونپ دی۔

سات بجے عازم واپس آیا تو وہ کچن میں ہی تھی۔ وہ کسی کام سے اندر آیا تو سرخ اور سیاہ سوٹ میں میک اپ بھرپور اہتمام کیے وہ سیدھی دل میں گھس گئی۔ ”کچن میں کام کرنے کا یہی ٹائم ملا تھا؟“ وہ سر کھاتے ہوئے اس کے قریب آیا۔ خزان مسکراتے ہوئے کام میں مصروف رہی۔

”مجھے گھر میں پہننے کے لیے کپڑے چاہئیں۔ کوئی ایزی ساٹراؤ زرو غیرہ۔“

”میرا کام ہو گیا۔ تم جاؤ، میں آکر دیتی ہوں۔“ ”مجھے بھگانے کے علاوہ کوئی کام ہے تمہیں؟ اچھا جلدی آتا۔“ وہ باہر نکل گیا۔ خزان دس منٹ بعد ہی پیچھے آگئی، لیکن عازم کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ ”ارے! میں آ ہی رہی تھی۔ ایسی کیا جلدی تھی۔“ وہ حیران ہو گئی۔

”کپڑوں کا تو بہانہ تھا۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا تو خزان دروازے میں ہی رک گئی۔ عازم نے اس کی کلائی پکڑ کر آگے کو کھینچا اور پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

”گھر کے ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے بیوی کو آواز

”میں بیٹھک میں سوؤں گا۔ تم کمر بند کرلو۔“
عجلت میں جملہ پھینک کر وہ بل میں غائب ہو گیا۔
خزراں لحظے کو کچھ سمجھ ہی نہیں پائی۔ وہ تو سوچ رہی
تھی کہ عازم کے ساتھ مل کر اس مسئلے کا کوئی حل
ڈھونڈے گی، لیکن وہ تو بنا کوئی موقع دیے چلا گیا تھا۔
اب وہ اس کے پیچھے جا کر کیا کہتی۔ بیٹھی رہ گئی اور یہ ہی
کیا ”آنے والی تین“ چار راتیں مزید یہ ہی کچھ ہوا۔ وہ
ان کی شادی کا آٹھواں روز تھا۔ خزراں اپنے کمرے
میں اکیلی بیٹھی تھی، جب فضا بھابھی ہاتھوں پہ کبل
اٹھائے اس کے کمرے میں آئیں۔

”یہ عازم کا کبل ہے۔ پچھلی دو تین راتوں سے
ٹھنڈ ذرا زیادہ ہو گئی ہے۔ وہ اپنا کبل اماں کے کمرے
میں ڈھونڈ رہا تھا۔ شکر ہے اماں ہاتھ روم میں تھیں۔
ورنہ پوچھتیں اس سے کہ یہ ایکسٹرا کبل وہ کیوں ڈھونڈ
رہا ہے۔“ بھابھی نے شاید تمہید باندھی۔ خزراں نے
خاموشی سے کبل ایک طرف رکھا اور بھابھی کے بیٹھنے
کی جگہ بنائی۔

”تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں خزراں۔ امید ہے
برا نہیں مانو گی؟“

”کچھ بھی پوچھیں بھابھی! برا ماننے کا سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔“

”تین“ چار راتوں سے دیکھ رہی ہوں۔ عازم
بیٹھک میں سوتا ہے۔ شکر ہے یہاں اور کسی کو نہیں پتا
چلا۔ اماں کا زیادہ وقت ان اپنے کمرے میں گزرتا ہے۔ اور
عرفان کو لگتا ہے کہ عازم شاید کمپیوٹر استعمال کرنے
کے لیے دیر تک بیٹھک میں رہتا ہے۔ پھر سونے کے
لیے کمرے میں آجاتا ہے۔ میں نے بھی انہیں کچھ
نہیں بتایا۔ لیکن تم سے ضرور پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایسا
کیوں ہے۔ کوئی بات ہے تم دونوں کے بیچ؟“ بھابھی
نے بہت نرمی اور آرام سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”نہیں بھابھی! بات تو کوئی نہیں ہے۔“ وہ بس اتنا
ہی کہہ پائی۔ ”مجھے یہ بھی پتا ہے کہ بات ان تین
چار دنوں کی نہیں ہے۔ تم دونوں پہلی رات سے دور
ہو۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بنا کسی بات یا اختلاف

کے ایسا ہو رہا ہے۔“
”سچ بھابھی۔ بس اتفاقاً ہی پہلی رات مجھے بچوں
کے پاس نیند آگئی تو۔“

”تو کیا وہ ناراض ہو گیا اس بات پر۔“
”نہیں بھابھی۔ اس کا رویہ بالکل ٹھیک تھا اور
بعد میں جب بچوں نے میرے کمرے میں سونے کی
ضد کی تو میں نے سوچا تھا عازم کے ساتھ مل کر اس
مسئلے کا کوئی حل نکالوں گی، لیکن وہ بنا بات کا موقع
دیے بیٹھک میں جا کر سونے لگا۔“

”شاید وہ مروت میں ایسا کر رہا ہو کہ بچوں کا معاملہ
ہے، کہیں تم مائنڈ نہ کر جاؤ۔ میرا مطلب ہے وہ چاہتا
ہو گا کہ اس معاملے کو تم خود اچھے طریقے سے
سمجھاؤ۔“

”لیکن بھابھی! اب یہ ہمارے بچے ہیں۔ ہمیں ان
کے سب سے معاملات مل کر سلجھانے ہیں۔“
”وہ سب ٹھیک ہے خزراں! لیکن تم اول روز سے
ایسی توقع مت کرو، سب کچھ آہستہ آہستہ ٹھیک
ہو گا۔“

”نہیں بھابھی! خزراں نے فوراً اس کے خیال کی
نفی کی۔“ ”میرا خیال ہے ایسے نازک ایٹوز اول روز
سے ہی توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ بلکہ عازم کا بھی یہی
خیال ہے۔ عازم نے کہا تھا کہ بھلا پوری دنیا کی نفی
کرلو، لیکن میرے اور اپنے معاملے میں ان دو کی نفی
ہرگز مت کرنا۔ بھابھی! میرے کچھ خدشات اور وہم
ہیں۔ آپ میری دوست بھی ہیں۔ میں کھل کر آپ
سے بات کر سکتی ہوں۔“ خزراں نے فضا کا ہاتھ پکڑ کر
آرام آرام سے وہ ساری باتیں بتانا شروع کیں جو عازم
نے، جرات سے لاہور کے راستے میں رافع سے کی
تھیں۔

”بھابھی۔ عازم کا سارا فوکس ہی اس بات پر تھا کہ
رافع اپنے دل کی رضامندی سے اسے باپ کے روپ
میں خود ہی قبول کرے اور یہ عازم کی سمجھ داری کا
ثبوت ہے کہ لاہور پہنچتے پہنچتے وہ رافع کے منہ سے
اقرار کروا چکا تھا۔ لیکن بھابھی! بچے بہت سیدھے اور

ہے کہ شاید میں نے بچوں کی زندگی میں سوتلا باپ لاکھڑا کیا ہے۔
 ”ایسا نہیں ہے خزان! عازم کے لیے اپنا دل برا مت کرو۔“

”ہماری شادی کو آٹھ دن ہو گئے ہیں بھابھی۔ رافع سے کرکٹ کھیلنے اور اس کی زندگی میں باپ کی کمی کو پورا کرنے کے دعوے کرنے والے عازم نے اسے پوچھا تک نہیں۔ نہ پاس بلایا، نہ بٹھلایا، نہ بات کی۔ اس نے تو مجھے یہ احساس دلایا تھا کہ بچوں کو بچہ سمجھ کر ہرگز یہ فرض نہیں کرنا چاہیے کہ انہیں کسی بات کی سمجھ نہیں آتی اور اب وہی عازم یہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ میں بھی بچوں کے جذبات کی پروا کرنا چھوڑ دوں۔ انہیں ان کے حال پر اکیلا چھوڑ دوں۔ اگر وہ ایسی اجنبیت سے پیش آئے گا تو زندگی کیسے کٹے گی بھابھی؟“ خزان باتا عیدہ رو دی۔ فضلہ کے دل کو کچھ ہوا۔ خزان بھی تھک گئی تھی اپنی جگہ۔

”دو۔ مت خزان۔ اچھا میں امل سے بات کرتی ہوں۔ اب تم لوگوں کو اپنے گھر چلے جانا چاہیے۔ کچھ دن ایلے گزارو گے تو یقیناً خاموشی کی یہ دیوار گر جائے گی۔ ایک دوسرے سے کھل کر بات کرنا بہت ضروری ہے۔ بنا کچھ کہے سنے ہر بات دل میں رکھتے گئے تو آپس کے فاصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ بس میری ایک بات یاد رکھنا۔“ فضلہ نے محبت سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”بچوں کو باپ سے قریب کرتے کرتے کہیں خود سے دور نہ کر بیٹھنا۔“ وہ اس کا کندھا تھک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اب تم آرام کرو، کل اپنے نئے گھر میں اچھی سوچوں اور خوش گوار دل و دماغ کے ساتھ قدم رکھنا۔“ وہ مسکرا کر باہر نکل گئیں۔



”آپ بھی ہمارے ساتھ چلتیں پھپھو!“ خزان تیاری مکمل کر کے سنجیدہ کے کمرے میں آئی تو کچھ دیر وہیں بیٹھ گئی۔ فضلہ بھابھی نے شاید رات ہی ان سے

سچے ہوتے ہیں۔ وہ صرف وہی زبان سمجھتے ہیں جو ان سے ابلی جارہی ہوتی ہے۔ اب ان جملوں کے پیچھے کچھ اور مقاصد بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات ان کا معصوم ذہن نہیں سمجھ سکتا۔ رافع اور منائل کا ذہن یہ بات تسلیم کرچکا ہے کہ میں نے عازم کو اپنی زندگی میں صرف ان کا باپ بنانے کے لیے شامل کیا ہے۔ تو کیا چند دن اپنی خواہشات کی چھوٹی موٹی قربانیاں دے کر ہم یہ بات ان پر ثابت نہیں کر سکتے۔ عازم نے خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ بچوں کا نا پختہ دماغ سوالات کا کارخانہ ہوتا ہے انہیں مطمئن کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔“

”وہ سب ٹھیک ہے خزان۔ بچوں کو مطمئن کرنا بہت ضروری ہے میں جانتی ہوں۔ لیکن ایسا کب تک چلے گا۔ مجھے لگتا ہے تم نے انہیں غیر ضروری طور پر خود سے چپکا رکھا ہے۔ سنی اور شان تقریباً رافع کے ہم عمر ہیں لیکن میں نے دو سال پہلے ہی ان کا کمر الگ کر دیا تھا۔ کچھ دھیان ان پارکیوں کی طرف بھی دو۔“ وہ بھانری سے سمجھانے لگیں۔

”ہاں۔ میں نے انہیں غیر ضروری طور پر خود سے چپکا رکھا ہے میں جانتی ہوں۔ لیکن میرے حالات ہمیشہ ہی دوسروں سے مختلف رہے ہیں۔ یا سر چونکے باہر رہتا تھا تو میری زندگی تب بھی صرف بچوں کے ساتھ گزر رہی تھی۔ وہ سال میں ایک مرتبہ ملنے آتا نہ بچوں کے ساتھ اس کی کوئی المیج منٹ تھی نہ لگاؤ وہ صرف میرے قریب تھے اور جب یا سر نے دھوکا دیا تو میں بچوں کے اور قریب آگئی۔ میری مجبوریاں الگ ہیں بھابھی!“ وہ کچھ افسردہ سی ہو گئی۔ فضلہ نے اسے ساتھ لگایا۔

”اللہ نے تمہارے صبر اور حوصلے کا صلہ دیا ہے خزان!“

”نہیں بھابھی! میرے ڈر خوف ابھی ختم نہیں ہوتے۔“ اس نے اپنی آنکھوں کی نمی پینے کی کوشش کی۔

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟“ وہ پریشان ہو گئیں۔
 ”عازم کے رویے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا

بات کر لی تھی، کیونکہ صبح ناشتے کے بعد انہوں نے خود عازم سے کہا کہ آج وہ لوگ اپنے گھر چلے جائیں، تاکہ خزان گھر کو اپنی مرضی کے مطابق تھوڑا سیٹ کر لے۔

”اب تم آگئی ہو تو ان شاء اللہ ضرور آیا کروں گی“ جیتی رہو۔“ انہوں نے پیار سے خزان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”جاؤ پیانگ وغیرہ مکمل کر لو اور ہاں دوپہر کا کھانا کھا کر جانا۔ عازم کا گھر تو ہفتوں بلکہ مہینوں سے بے توجہی کا شکار ہے۔ جاتے ہی بے شمار کام پڑے ہوں گے۔“

”جی پھپھو!“ وہ واپس کمرے میں آگئی۔ عازم گھر جانے کا سن کر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ شوروم گیا تو سہی، لیکن لڑکوں کو کام سمجھا کر جلدی ہی واپس آ گیا۔ اس کا پرجوش انداز دیکھ کر خزان کے دل میں دلی دلی خوشی کی لہر اٹھی۔ لیکن شاید ابھی اس کا امتحان ختم نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ لوگ اپنے گھر کے لیے نکلے۔ یہاں کام تو زیادہ نہیں تھا۔ موٹی موٹی بنیادی صفائی عازم نے کروائی تھی۔ البتہ گھر میں کچھ خالی خالی پن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ فوری طور پر خزان کی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن کچن اور وارڈروب وغیرہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ عقدہ بھی حل ہو گیا۔

پہلے جب وہ یہاں آئی تھی تو گھر سارہ کے جیز کے سامان سے بھرا تھا جو طلاق کے بعد یقیناً ”اسی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ کچن میں برتنوں کی شدید قلت تھی۔ فریج شاید عازم نے نیا لیا تھا۔ لاؤنج سامان سے خالی تھا اور بیڈ روم میں صرف بیڈ اور ٹی وی رکھا تھا۔ عازم نے اسے اور جنید کو جیز کے لیے سختی سے منع کیا تھا اور کہا تھا ضرورت کا سامان وہ بعد میں مل کر خرید لیں گے۔ عازم نے گھر واقعی بہت خوب صورتی اور محنت سے بنوایا تھا۔ خزان نے پہلی مرتبہ ”اپنی“ چھت کے احساس کو دل میں اترتا محسوس کیا۔

عازم انہیں اندر چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ کیونکہ دوران ڈرائیونگ اسے مسلسل شوروم سے کاڑا رہی

تھیں۔ اب یقیناً ”اس نے شام کو ہی واپس آنا تھا۔ خزان نے سب سے پہلے الماری کی صفائی کر کے اپنے بچوں اور عازم کے کپڑے سیٹ کر کے رکھے۔ بچوں کو نہلا کر زبردستی ٹی وی کے سامنے بٹھا کر کچن میں آئی اور راشن وغیرہ کا جائزہ لیا۔ وہاں چاول اور دال ہی ایسا آٹم دکھائی دیے جنہیں وہ رات کے لیے پکا سکتی تھی۔ شام بھی ہونے والی تھی۔ ابھی تو اس نے خود بھی تیار ہونا تھا۔ عازم کی لمبی ناراضی کو اس کی مرضی کے مطابق تیار ہو کر مٹانا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مسکراتے ہوئے کچن کے کام پنپانے لگی۔

پھپھو کی طرف سے دیے گئے کپڑوں میں اس نے ایک میون سوٹ دیکھا تھا۔ جس پر سفید موتیوں کا کام کیا ہوا تھا۔ خزان نے نما کر وہی پہنا اور بلکا سائیک اپ بھی کر لیا۔ عازم سات بجے کے قریب کئی قسم کے بے شمار چھوٹے بڑے شاپرے، گھر میں داخل ہوا تو وہ حیران رہ گئی۔

”ارے۔۔۔ یہ اتنا سامان!“ وہ سنبھالنے کے لیے آگے بڑھی۔

”میرے خیال میں تو سب ہی ضرورت کالایا ہوں۔ گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔“

”اور یہ کھانے کے ڈبے۔“ خزان نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ تو ہوٹل سے تیار کمانا بھی ساتھ لایا تھا۔ ”ہاں تو آج رات کیا بھوکے سوئیں گے؟“ وہ مسکرا کر کچن کی طرف بڑھ گیا۔ خزان بھی سامان لیے پیچھے آگئی۔

”میں نے دال، چاول بنائے۔ تھے۔“ اس نے خاصی شرمندگی محسوس کی بتاتے ہوئے۔

”واہ۔“ عازم نے ڈھکن اٹھا کر دال کی خوشبو اپنے اندر اتاری۔ ”لو یو مائی سوٹ وائف! میں تو یہی کھاؤں گا۔“

وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا تو خزان نے مسکرا کر سر ہلایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو عازم سے محلے کے کچھ دوست ملنے آگئے۔ اس نے واپس آ کر خزان کو بتایا اور ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ کہہ کر یہی گیا کہ جلدی

نہیں کھلا۔ عازم نے اندر سے چمکنی چڑھادی تھی۔
خزران حیرت اور صدمے سے جہاں تہاں کھڑی رہ
گئی۔ ”تو دروازہ عازم نے غصے سے بند کیا تھا۔“ وہ چاہتی
تو دروازہ بجا سکتی تھی، لیکن عازم کی جلد بازی اور غصے پر
قانون رکھنے پر اس کا بھی خون کھول اٹھا۔ ایک بار پھر وہ
بنا کچھ کمرے سے غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ خزران چپ
کر کے مناہل کے پاس آکر لیٹ گئی۔

نیند تو بھلے سے پوری رات نہیں آئی۔ وہ اپنا غصہ
اور آنسو بہنے کی کوشش کرتی رہی۔ اذانوں سے شاید
کچھ دیر پہلے اسے نیند نے آیا۔ آنکھ کھلی تو صحن والی
کھڑکی سے اچھی خاصی روشنی آرہی تھی۔ صبح کی نماز
بھی گئی اور جب باہر آکر دیکھا تو عازم بھی شوروم جا چکا
تھا۔ اس نے صحن کا گیت اور اندر کا داخلی دروازہ بند
کیا۔

آج بہت سارے کام کرنے تھے۔ اس نے ذہنی
اکھاڑ بچھاڑ اور پھینک کام پہ کمر کس لی۔ بچے ناشتے کے
بعد خود ہی لی وی آن کر کے بیٹھ گئے اور خزران نے
کچن سے کام کا آغاز کرتے ہوئے آہستہ آہستہ
سارے گھر کی صفائی شروع کر دی۔ دھونے والے
کپڑوں کا اچھا خاصا ڈھیر اکٹھا کیا تھا۔ کچھ پہلے سے عازم
کے پڑے تھے اور کچھ ایک دو روز میں اس کے اور
بچوں کے جمع ہو گئے تھے، لیکن واشنگ مشین پورے
گھر میں کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس نے کپڑوں کی
گٹھڑی بنا کر اسٹور میں رکھی اور برش لے کر کمروں اور
لاؤنج کی صفائی شروع کر دی۔ رافع اور مناہل آدھا گھنٹہ
بھی ٹک کر نہیں بیٹھے اور پورے گھر میں بھاگنا دوڑنا
شروع کر دیا۔

”اما! ہم چھت پر جائیں۔“

”چھت پر۔“ وہ چرتک کر رکی۔ سیڑھیاں لاؤنج
کے اندر ہی تھیں۔ اوپر ایک دروازہ بھی تھا، لیکن پتا
نہیں دو سری جانب کیا صورت حال تھی۔
”نہیں بیٹا! پہلے میں خود چھت پر جاؤں گی۔ اگر
وہاں کھیلنے کی جگہ ہوئی تب تم لوگوں کو اجازت دوں گی۔
ابھی مجھے کام کرنے دو۔“

واپس آ رہی ہوں۔ خزران نے کچھ دیر تو بچوں کو لی وی
دیکھنے دیا۔ پھر سلائے کے لیے گیٹ روم میں لے
آئی۔ یہ اگر بیڈ روم سے کافی دور تھا۔ لیکن مجبوری یہ
تھی کہ دو سنگل بیڈ اسی کمرے میں رکھے تھے۔ ان کے
علاوہ پورے گھر میں کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔
خزران کو پریشانی تو لاحق ہوئی، لیکن اس نے بچوں پر
ظاہر نہیں کیا کہ انہیں یہاں اکیلے سونا ہے۔

وہ ایک بیڈ پر رافع کو سلا کر خود مناہل کے ساتھ
دوسرے بیڈ پر لیٹ گئی۔ دونوں کو جلدی ہی نیند آگئی۔
شاید یہاں کے پرسکون ماحول کا اثر تھا۔ اوپر سے ہفتے
بھر کی تھکاوٹ خزران دونوں پر کمرل درست کر کے باہر
آگئی۔ بیڈ روم میں آکر لی وی آن کیا۔

خزران کا سارا دھیان دروازے اور گھر کی طرف
تھا۔ بے چینی سے انگلیاں چٹختے کبھی وہ بیٹھ جاتی تھی
چلنے لگتی۔ بچوں کی الگ فکر لگی تھی۔

وہ ایسی ہی سوچوں میں گم تھی جب بیل بجی۔ دل
ایک دم زور سے دھڑکا۔ وہ تیز قدموں سے دروازے پر
آئی۔ عازم نے اندر آکر لاک لگایا۔ خزران نے اس
دوران احتیاطاً بچوں کے کمرے میں جھانکا۔

”اوہ۔“ منو بالکل بیڈ کے کنارے پر آگئی تھی۔
اگلی جنبش پر یقیناً ”نیچے گر جاتی۔ وہ فوراً اندر چلی گئی۔
جبکہ عازم آگے بڑھ گیا تھا۔ خزران نے مناہل کو ٹھیک
طریقے سے دیوار کی طرف کر کے سلایا تو وہ آنکھیں
کھول کر خزران کو دیکھنے لگی۔ وہ اسے سلائے کے
خیال سے ساتھ لیٹ گئی اور تھپکیاں دینے لگی۔

عازم اسے اپنے پیچھے آتے نہ پا کر واپس پلٹا۔
گیٹ روم میں جھانکا تو ہلکی روشنی میں وہ اسے مناہل
کے پہلو میں لیٹی نظر آئی۔ وہ بنا کچھ بولے واپس چلا
گیا۔

”ٹھام۔“ کر کے کہیں کوئی دروازہ بند ہوا تو خزران
پریشانی سے اٹھ بیٹھی۔ آواز تو گھر کے اندر سے ہی آئی
تھی۔ اس نے ایک نظر مناہل کو دیکھا وہ دوبارہ سوچکی
تھی۔ خزران بیڈ روم کے دروازے تک آئی۔
دروازے کا ہینڈل آہستہ سے نیچے کیا، لیکن دروازہ

”او کے بابا!“ رافع جو اوپر والی آخری سیڑھی پر پہنچ گیا تھا۔ ریٹنگ سے پھسل کر نیچے آنے لگا۔
”مت کرو بیٹا! پلیز میرے آنے تک کیس آرام سے بیٹھ جاؤ۔“

اس نے جالی والا دروازہ کھول کر لاؤنج اور کوریڈور کا کچرا باہر صحن میں نکالا اور باہر کی صفائی مکمل کرنے کے لیے خود بھی باہر آگئی۔ پکی اینٹوں والے چھوٹے صحن میں ساتھ والے گھر کے درخت کے خشک پتے بکھرے بڑے تھے۔ خزران نے وہاں بھی برش سے صفائی شروع کر دی۔ اچانک اندر سے رافع کی زوردار چیخ باندھ گئی۔ وہ بری طرح چوکی پھر پاگلوں کی طرح اندر بھاگی۔ ریٹنگ کے نیچے فرش پر رافع بے سدھ پڑا تھا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ خزران کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ خون شاید کان سے آ رہا تھا۔ شاید کپٹی سے۔ کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے دوپٹے کو اس کے سر پر باندھ دیا۔ اس کی ناک کے آگے ہاتھ کر کے سانس چیک کی۔ دل جیسے ڈوب کر ابھرا۔

”خدا یا شکریہ!“ بھاگ کر اس نے پہلے اپنا سیل فون اٹھایا۔ پھر وارڈروب سے بڑا دوپٹا اوڑھ کر واپس آئی۔

”بھائی! پاس رہو منو!“ وہ موبائل پر نمبر ڈائل کرتے ہوئے لیٹ سے باہر نکل آئی۔

”بھیا! رافع کے سر پر چوٹ لگی ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ پلیز بھیا! جلدی سے آجائیں۔“ اس نے پہلا نمبر جنید کا ملا۔ ساتھ ساتھ رکشوں کو ہاتھ دے کر روکتی رہی۔

”میں آتا ہوں خزران۔“ اس نے فون رکھ دیا۔ اتنے میں ایک رکشہ قریب آکر رکا۔

وہ اٹنے پر واپس بھاگی۔ رافع کو بازوؤں میں اٹھایا اور منہاں کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دروازے کو کھینچ کر چابی گھمائی اور باہر والا گیٹ یوں ہی کھلا چھوڑ کر رکشہ میں بیٹھ گئی۔

اسپتال قریب ہی تھا۔ پانچ سات منٹ میں ہی

ڈرائیور نے نہ صرف وہاں تک پہنچایا، بلکہ رافع کو خزران سے لے کر اندر تک پہنچایا۔ دو وارڈ بوائے فوراً اسے ایمرجنسی وارڈ لے گئے۔ تب ہی فضلہ بھابھی کا فون آگیا۔ انہیں شاید جنید بھائی نے بتایا تھا۔ وہ عرفان بھائی کے ساتھ حشر سے نکل پڑی تھیں۔ خزران نے اسپتال کا ایڈریس اور نام بتایا۔ بھابھی کے فوراً بعد عازم کا فون آگیا۔ خزران نے اسے بھی بتا دیا۔ منہاں کو ایک کرسی پہ بٹھا کر وہ ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھ گئی۔

ڈاکٹر نے تسلی آمیز رپورٹ دی تو وہ شکر پڑھتی منہاں کو لینے کوریڈور میں آئی۔ عین اسی وقت عازم سامنے سے اتار دکھائی دیا۔

”رافع کیسا ہے؟“ وہ تقریباً دوڑ کر اس کے قریب آیا۔

”ٹھیک ہے۔“ خزران نے تسلی بھرے انداز میں سر ہلایا۔

”لف شکر ہے۔“ اس نے اطمینان کی سانس لی۔
”ہوا کیا تھا؟“

”سیڑھیوں پر کھیل رہے تھے دونوں۔ شاید ریٹنگ سے پھسلا ہے۔“ وہ اسے بتانے لگی۔ تب ہی جنید فضلہ اور عرفان بھی آگئے۔ وہ ان کو لیے کمرے میں آگئی۔ رافع کو سارے سے اٹھا کر بٹھایا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا اسے گھر لے جاسکتے ہیں۔ وہ گھر لے آئے تھے۔

عازم بازوؤں پہ اٹھا کر رافع کو اندر لایا اور اپنے بیڈ پہ لا سلا یا۔ خزران نے فوراً دودھ گرم کر کے پلایا۔ خون بسنے کی وجہ سے اسے کافی نقاہت ہو گئی تھی۔ عازم نے اس کے لیے نی وی آن کیا۔ جنید بھائی وغیرہ تقریباً گھنٹہ بھر بیٹھے رہے۔ سنجیدہ پچھو اور سمجھ بھابھی نے فون پر اس کی خیریت دریافت کی۔ عرفان بھائی نے گھر جانے کی اجازت لی تو عازم بھی ان کے ساتھ کیس چلا گیا۔ پتا نہیں کہاں گیا تھا۔ خزران پریشان ہوئی کہ بتا کر نہیں نکلا تھا۔ لیکن اس کی واپسی جلد ہی ہو گئی۔ رافع اور منہاں کے لیے آکس کریم، چاکلیٹ، جوس

اس کی دائمی خوشیوں سے، مشروط تھے اور اس کے بعد رافع کی حفاظت اور سلامتی پر اللہ کا شکر و نفل ادا کر کے کیا۔ دل ایک دم مطمئن سا ہو گیا۔

شام بلکہ رات تک کا سارا وقت ان چاروں کا ایک ساتھ بیڈ روم میں گزرا۔ عازم نے اسے بچن کے کام سنبھالنے سے منع کر دیا اور رات کا کھانا باہر سے لے آیا۔ رافع بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا اور اب سونا چاہتا تھا۔

”تم بچوں کے ساتھ اسی روم میں رہو۔ میں ادھر گیسٹ روم میں سو جاتا ہوں۔ دروازہ کھلا رہے گا۔ اگر خدا نخواستہ کوئی پرابلم ہو تو فوراً بلا لیتا۔“ اس نے رافع کی پیشانی پر جوی منٹل کو ہار کیا اور کمرے سے چلا گیا۔ خزران کی آنکھ دیر سے کھلی۔ اس کا خیال تھا شاید آج عازم چلا گیا ہو گا۔ لیکن وہ دروازے تک آئی تو لاک بھی لگا ہوا تھا اور کمرے میں جھانکا تو وہ بھی بے خبر سویا ملا۔ خزران نے گھڑی دیکھی تو نو بجنے والے تھے اور اس کا جاگنے کا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بچن میں آکر کام میں مصروف ہو گئی۔

”اما! رافع بلا رہا ہے۔“ منٹل آنکھیں ملتی بچن میں داخل ہوئی تو خزران تیزی سے اندر بھاگی۔

”کیا ہوا بیٹا۔ ٹھیک تو ہو؟“ رافع تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔

”اما! دوش روم جانا ہے۔“

”آؤ۔ میں لے جاتی ہوں۔“ وہ آگے بڑھ کر اسے بازو سے سہارا دے کر نیچے اتارنے لگی تو رافع ہنسنے لگا۔ خزران نے حیرت سے دیکھا۔

”اما! میں خود جاسکتا ہوں۔ میں نے تو اس لیے بلایا تھا کہ یہ والا باتھ روم میں یوز کر سکتا ہوں یہ انکل کا ہے نا۔“ اس نے وضاحت کی تو خزران بھی مسکراتے لگی۔

”ہاں شیور۔“ اس نے دور ہو کر رافع کو جانے کا راستہ دیا۔

”یہ نہیں۔“ پیچھے سے عازم کی آواز آئی تو دونوں نے ایک ساتھ سرگرد ہو کر دیکھا۔

بسکٹ اور جانے کیا کیا اٹھا لایا تھا۔ رافع اپنی من پسند چیزیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ عازم نے مسکرا کر ساری چیزیں اسے تھما دیں اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”ساری چیزیں میرے بیٹے کی ہیں۔ بس یہ چھوٹا شاپر بہنا کو دے دوں۔“ اس نے منٹل کو پاس بلایا اور باقاعدہ گور میں بٹھا کر آئس کریم کھلانے لگا۔ خزران مطمئن سی باہر چلی آئی۔ عصر کا وقت ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے حلیے پر ایک نظر ڈالی۔ صبح سے گھر کے کام کرتے حشر خراب ہو چکا تھا۔ ان ہی کپڑوں میں سارے گھر جی کہ باتھ روم کی صفائی بھی کی تھی۔ نماز کے لیے، تو ہرگز مناسب نہیں تھے۔ اس نے وارڈروپ سے اپنا ایک سوٹ نکالا اور باتھ لینے چلی گئی۔

عصر کی نماز سے پہلے صبح اور ظہر کی قضا ادا کی اور عصر کی نماز کے بعد شکرانے کے دو نفل ادا کرنے کی نیت کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن اللہ اکبر کے لیے اٹھے باتھ فضا میں ہی رہ گئے۔ ہفتوں پیچھے کی ایک بات یک دم ایسے جھماکے سے یاد آئی کہ وہ نیت توڑنے پر مجبور ہو گئی۔ ثاقب حسن سے رشتہ طے پایا تھا تو اس نے حاجت کے دو نفل ادا کیے تھے۔ دل میں یہ ارادہ کرتے ہوئے کہ اللہ اس کی ازدواجی زندگی کو خوشیوں سے بھر دے تو وہ شادی کے بعد وہ نفل شکرانہ ادا کرے گی۔ بھلے ثاقب سے رشتہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ آج عازم کی بیوی تھی۔ لیکن اس کی دو رکعت حاجت میں کہیں ثاقب کا ذکر نہیں تھا۔ صرف خلوص دل سے اس نے اپنی اور بچوں کی خوشیوں کی بھگ، مانگی تھی اور اس کی صاف نیت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے خوشیوں کی راہیں خود بخود ہموار کی تھیں۔ اسے ثاقب نہیں ملا۔ بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ملا۔

شکرانے کے دو نفل ادا کرنا تو بنتا تھا جو اس نے اب تک نہیں پڑھے تھے اور جس کا شاخسانہ وہ ہفتے بھر سے بگائت رہی تھی۔ اس نے رافع کی صحت کے لیے دو نفل شکرانہ پڑھنے سے پہلے وہ دو نفل ادا کیے جو

”ایک شرط پر تم اس باتھ روم جاسکتے ہو۔“ وہ اندر آگیا۔ رافع حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔
 ”اب میں انکل نہیں بابا ہوں تمہارا اور یہ پورا گھر ہم سب کا ہے۔ اس لیے آئندہ پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے پاس آکر انگلی سے رافع کا گال چھوا تو وہ مسکراتے لگا۔

”تھینک، یو۔ ان۔ بابا۔“ وہ اٹک کر بولا تو خزان بھی ہنسنے لگی۔

”اوکے۔ اب تم جاؤ، لیکن اندر سے لاک نہ لگانا۔ ابھی تمہاری طبیعت پوری طرح نہیں سنبھلی۔ کوئی پرابلم نہ ہو خدا نخواستہ۔“ عازم نے نرمی سے سمجھایا۔

”جی بابا!“ وہ سر ہلا کر باتھ روم میں گھس گیا۔
 ”مجھے کپڑے چاہئیں۔ تم نے شاید جگہ تبدیل کی ہے، چیزوں کی۔“ عازم نے سنجیدگی سے خزان کو مخاطب کیا۔ وہ شاید باہر والے باتھ روم سے نما کر آیا تھا۔ اس وقت ٹراؤزر اور بنیان میں تھا اور بال بھی گیلے تھے۔ خزان نے الماری کھول کر اس کے سامنے کی۔
 ”تمہارے، سب ہی کپڑے یہاں رکھے ہیں جو چاہیے لے لو۔ میں ذرا ناشتا بنا لوں۔“

”ہوں۔“ وہ آگے بڑھ کر خود ہی کپڑے دیکھنے لگا۔
 خزان کچن میں چلی آئی۔ عازم کا آج شاید کہیں جانے کا پروگرام نہیں تھا۔ اس لیے ساتھ سی شلوار میس پہن لی۔ خزان نے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ بھی جانے کیوں سنجیدہ رہا تھا۔ خصوصاً ”خزان سے کلنی رسمی انداز میں بات کی تھی۔“

گیارہ بجے۔ کے قریب وہ رافع کو مٹی تبدیل کرانے لے گیا۔ خزان نے ساتھ جانے کی کوشش کی، لیکن اس نے منع کر دیا۔ وہ دونوں کھٹے بھر میں ہی واپس آگئے، ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگلی پٹی کے لیے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک دو روز میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔

دوپہر کو سنجیدہ پھپھو رافع کی طبیعت پوچھنے آگئیں۔ شام تک وہ یہیں رہیں۔ واپسی پر عازم انہیں

خود گھر چھوڑنے گیا۔ خزان نے کچن کا پھیلاوا سمیٹا اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے اندر آ بیٹھی۔ تب ہی عازم بھی واپس آگیا۔
 ”تم بڑی ہو ابھی؟“

”نہیں۔ بس رات کا کھانا دینا ہے۔ کہو تو لے آؤں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں۔ میں نے دوپہر کو اماں کے ساتھ خوب ڈٹ کر لچ کیا تھا۔ فی الحال بالکل بھوک نہیں ہے۔ دراصل مجھے تم سے ضروری کام تھا۔ اس لیے پوچھا۔“ وہ کافی سنجیدہ سا تھا۔ یہ لوجہ، یہ انداز عازم کی طبیعت کا حصہ نہیں تھا۔ خزان کچھ پریشان سی ہو گئی۔ رافع والے واقعے کے بعد بچوں کے ساتھ تو رویہ بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے شاید ابھی بھی خفا تھا۔

”کیا بات ہے عازم؟“ وہ اس کے پیچھے لاؤنج میں آئی۔

”گھر کی سیٹنگ تبدیل کرنی ہے، تمہاری ہیلپ چاہیے۔“

”ہاں۔ کہو۔“ وہ بغور اسے سننے لگی۔
 ”گیسٹ روم کے دو سنگل بیڈ یہاں بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے میں لانے ہیں اور یہاں کا سلمان ادھر لاؤنج میں شفٹ کر کے لی وی یہاں دوبارہ سیٹ کر دیتے ہیں اور گیسٹ روم کو فی الحال خالی رہنے دیتے ہیں۔ بعد میں وہاں کے لیے نیا فرنیچر خرید کر اسے ڈرائنگ روم بنادیں گے۔“ عازم نے تفصیل سے اپنا خیال اس سے شیئر کر کے تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

”او۔ ہاں۔“ بات سمجھ آ جانے پر خزان کے محسوسات ایک دم خوش گوار ہوئے اور اپنی موٹی عقل میں ایسا آئیڈیا نہ آنے پر خود کو کرا سا بھی۔ وہ تو کل سے یہ سوچ کر پریشان ہوئی جا رہی تھی کہ بچے اس سے اتنی دور کیسے رہیں گے۔

”تمہارے ذہن میں کوئی ایر اچھا آئیڈیا ہے تو بولو؟“

”نہیں۔ یہ ہی ٹھیک ہے۔“

”تو او پھر۔“ اسے اشارہ کر کے عازم ڈرائنگ روم میں آگیا۔

”کھو ٹھیک ہے۔“ عازم نے کچھ تبدیلیاں کر کے اسے مخالف کیا تو وہ چوکی اور سیٹنگ پر توجہ دی۔ کھٹ پٹ کی آواز سے منابل اور رافع بھی بھاگ آئے تھے۔

”ارے۔“ رافع نے آنکھیں پھیلائیں۔ ”یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“

”آپ کے لیے کمر سیٹ کر رہے ہیں۔ بابا کے بالکل پاس والا۔“ خزران نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”واہ۔ تو اب ہمیں الگ کمر ملے گا سنی اور شان کی طرف۔“ اس نے کافی جوش اور خوشی کا مظاہرہ کیا۔

”بالکل۔“ عازم اس کے قریب آیا۔ ”الگ کمر ملے گا، لیکن فی الحال نہیں۔ ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ فی الحال کچھ دن تم بابا کے بیڈ پر آرام کرو گے۔“

عازم نے پیار سے رافع کو اپنے ساتھ لگایا تو خزران نے آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے منہ پھیر لیا۔

”بچوں کے ساتھ کتنا مہربان ہو گیا ہے اور میرے ساتھ۔“ اس نے زور سے لب بھیجے۔

”کچھ دن کہاں بابا! رافع نے منہ بسور تو خزران اس کی طرف مڑی۔ ”کل تو ہم گجرات واپس جا رہے ہیں۔“

”کل۔“ عازم نے بے ساختہ خزراں کو دیکھا تو اس کا سر جھک گیا۔

”ہاں پرسوں میری حاضری ہے۔ وہ ایک چھوٹی سی شادی۔ سے تین دن پہلے ہی آگئی تھی تو اس حساب سے کل چند دن ہو جائیں گے۔“

”ہاں۔“ اس نے کسی قسم کے تبصرے سے خود کو باز رکھا۔ ”کوئی بات نہیں اب تو ان شاء اللہ ہر ایک اپنا جانا لگا رہے گا۔ ہفتے بعد بالکل ٹھیک ہو کر آنا پھر اپنے الگ روم میں سونا، بلکہ اسے مزید خوب صورت بنانے کے لیے اپنی مرضی کا نیا سامان بھی خریدنا اوسکے۔“ اس نے شوخی سے رافع کے بال

بکھیرے۔

”چلو بچو۔ کل سفر کرنا ہے۔ اس لیے آج جلدی سوناڑے گا۔ اب اور کوئی شور مچا نہ نہیں۔“ وہ عازم سے نظریں چرا کر بیڈ روم میں آگئی۔

”میری کچھ مدد چاہیے؟“ وہ کچن میں تھی جب عازم پیچھے آگیا۔

”نہیں۔“ شکر یہ۔ برتن رہ گئے تھے۔ اب وہ بھی دھل گئے۔ وہ ہاتھ صاف کرتی اس کی طرف مڑی، لیکن نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

”بچے سو گئے۔“ بہت ہی عام سا انداز تھا۔ خزران نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہاں ابھی سوئے ہیں۔“

”سچ مجھے۔“ انداز ایک دم بدلا تو خزران نے بے ساختہ نظر اٹھائی۔ وہ چماتی آنکھوں میں بے پناہ محبت لیے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ لبوں پر بہت غیر محسوس لیکن دل کے اندر تک پیغام پہنچائی مسکراہٹ جی تھی۔ خزراں کا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ عازم نے آگے بڑھ کر اس کی دونوں کلائیاں اپنے ہاتھوں میں لیں۔

”کتی ناراض ہے میری سوہنی کڑی؟“

”نہیں تو۔“ اس نے گھبرا کر کلائیاں چھڑوائیں۔

”لڑتی کیوں نہیں ہو مجھ سے۔ بس خاموشی سے ہر بات دل میں رکھتی جا رہی ہو۔ دل ہے یا عمرو عیار کی زنبیل۔“ وہ ہنسا۔ ”غصہ ہے میری جان! تو باہر بھی نکالو ہتم حق رکھتی ہو کچھ بھی کہنے کا۔“

”کوئی غصہ نہیں ہے۔“ اس نے بمشکل خود کو بولنے کے قابل بنایا۔ ”بازم کی قوت حواس چھین رہی تھی۔“

”روٹی کیوں تھیں اس وقت۔“ عازم نے چہرے پر آئے اس کے بالوں کو ایک طرف کر کے اس کا چہرہ اوپر کیا۔ خزران نے جھلک کر تی آنکھوں کا پانی پینے کی کوشش کی۔

عہد و پیمان بھول بیٹھا۔ بعض دفعہ بہت زیادہ خوشی بھی ہمارے حواس محل کر دیتی ہے۔ تمہیں اپنا بنا لینے کی خوشی شاید میری اوقات سے بڑھ کر تھی۔ تب ہی سنبھال نہیں پایا۔“

”کیا میں خوش نہیں ہوں عازم؟“ خزران نے جھکی پلکوں سے اقرار کیا۔ ”لیکن مجھے اس خوشی نے استحکام بخشا ہے۔ یہ سوچ ہی پر سکون کر دینے کے لیے کافی ہے کہ اب ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ تمہاری طرف بے چینی سے بڑھتے قدموں کو کچھ سوچ کر روکتی رہی، صرف ہمیشہ کے بھلے کے لیے۔ میرے مد نظر صرف منائل اور رافع کے جذبات کا خیال رکھنا نہیں ہے۔ اللہ گواہ ہے عازم! مجھے ان سے پہلے تمہاری پروا ہے، جانتے ہو کیسے۔“ خزران نے پہلی مرتبہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اس نے جواباً بھرپور توجہ سے سر ہلایا۔

”میں نہیں چاہتی کہ فی الحال بچوں کو ہم دونوں کی محبت اور نزدیکی کا ادراک ہو۔ تمہیں میرے قریب دیکھ کر کہیں وہ تم سے حسد نہ کرنے لگیں۔ آغاز میں میری کوشش تھی کہ ان کے سامنے ڈائریکٹ تمہیں مخاطب بھی نہ کروں، تاکہ انہیں ہاں کے چھن جانے کا احساس نہ ہو۔ تم نے ہی یہ احساس دلایا تھا کہ بچوں کے جذبات کو انور نہیں کرنا چاہیے۔ بس ایک بار وہ تمہیں اپنا دوست اور ہمدرد مان لیں اور دل سے تمہیں اپنا باپ تسلیم کر لیں، پھر انہیں ہماری قوت ہمارا ہنسنا بولنا نہیں کھٹکے گا۔ لیکن اگر خدا نخواستہ کسی وجہ سے تمہارے کسی منفی عمل نے تمہیں ان کی نظر میں ولن بنا دیا تو میں عمر بھر کے لیے چکی کے دوپٹوں میں پس کر رہ جاؤں گی۔ نہ مکمل تمہاری ہو پاؤں گی نہ ان کی۔ نہ تمہیں چھوڑ پاؤں گی نہ ان کو۔ ایک دوسرے کو کھونے کا درد ہم دونوں ہی سہہ چکے ہیں اور تم جانتے ہو کہ یہ درد ہماری برداشت سے بہت بڑا تھا۔ اب دوبارہ نہیں عازم۔ ہرگز نہیں۔“

خزران نے جذباتی ہو کر دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو تھاما۔ عازم نے لب بھینچ کر تائید میں سر ہلایا۔ اس

”تم جھگڑا کرو گی تو میرے لیے آسانی ہو جائے گی۔ ورنہ تو اپنے قصور مجھے خود ہی گنوانے پڑیں گے۔“ عازم نے خاص بے چارگی سے اپنی مجبوری بیان کی۔ ”اچھا ہے۔ اب یہ ہی تمہاری سزا ہے۔“ خزران کو ہنسی آگئی لیکن ساتھ ہی روتا بھی۔ جو وہ بہت دیر سے روکے کھڑی تھی۔ عازم نے بے ساختہ کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔

”سوری رازی۔ میں نے تمہیں بہت پریشان کیا۔ پلیز اب، اور نہ رونا۔ تمہارا ایک ایک آنسو میرے ضمیر پر بوجھ ہے۔ دس بارہ دن کی دلہن کا تو آنسوؤں سے رشتہ ہی ٹوٹ جاتا ہے اور میں نے اپنی جان کو اتنا رلا دیا۔ بس اب اور نہیں۔“

اس نے خزران کو اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ ”منا راض بیوی کو منانے کے لیے کچن شاید سب سے نامعقول مقام ہے۔“ خزران کو بازوؤں پر لیے اس نے باہر کا رخ کیا۔ ”جگہ ایسی ہو جہاں کچھ چاندنی چٹکی ہو، ٹھنڈی ہوائیں سرسرا رہی ہوں۔ آسمان سرمئی بادلوں سے بھرا ہو، پیروں تلے پھولوں کی نرم پتیاں بکھری ہوں یا۔“ وہ اس کے چہرے کو بغور تکتے ہوئے کچھ کہتے کہتے رکا۔

”یا کم از کم بیٹھنے کے لیے بچوں کا یہ بیڈ سہی۔“ عازم نے اسے اٹھی ابھی سیٹ کے سنگل بیڈ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ خزران — سرخ چہرہ لیے دوپٹا درست کرنے لگی۔

”یہاں کا ماحول زیادہ رومانٹک تو نہیں ہے لیکن بنایا جاسکتا ہے۔“ عازم نے سر کھجایا۔ وہ ہنس پڑی۔ عازم مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

”بہت ظالم ہو، اللہ کی قسم۔“ وہ اس کے عین سامنے بہت قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ ”میری کوتاہیوں میں سارا قصور تمہارا ہے۔ اس بری طرح پھنسا لیا ہے واللہ، سوائے تمہارے اور کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کے دھیمے دھیمے بول رہا تھا۔

”مجھ جیسا محبت کا مارا نہ تم نے دیکھا ہو گا نہ سنا۔ تمہیں پانے کا نشہ ایسے حواسوں پر چھایا کہ سارے

کا حرف حرف سچ تھا۔ عازم نے اس کے ہاتھوں پر تھکی دی۔

”تمہارے سب وہم سب ہی خدشے جائز ہیں رازی۔ لیکن خدا را میری چند دن کی لاپرواہی کو میرے سونیلے پن پہ محمول مت کرنا۔ میرا کوئی سگاہوتا تو شاید میں ان کے لیے سوتیلابن بھی جاتا، لیکن میرا تو کل سرمایہ یہ ہی ہیں۔ اللہ گواہ ہے میں نے اس عہد کے ساتھ نکاح نامے پر دستخط کیے کہ اب مجھ پر تین لوگوں کی ذمہ داری ہے جسے مرتے دم تک بہ حسن و خوبی نبھانا ہے۔ جانتی ہو رازی۔“ عازم نے خزران کے نرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”پچھلی رات ایک خوف نے مجھے سوتے سے جگا دیا۔ شدید عدم تحفظ کا ایک احساس شاید زندگی بھر جس سے نجات ممکن نہیں۔“ وہ اچانک ہی بہت آزرہ اور مضطرب دکھائی دیا۔ خزران کا دل بند ہونے لگا۔

”کدہ۔ کیا خوف عازم؟“

”رافع کے ساتھ حادثہ پیش آیا تو تم نے فوری طور پر پہلا فن جنید کو کیا۔ میاں بیوی کے آپس کے تعلقات جتنے برے جتنے خراب ہوں بچوں پر تکلیف آئے تو اس پہلی مدد بچوں کے باپ سے مانگتی ہے نہ کہ اپنے بھائیوں سے۔ لیکن میرے رویے کے سوتیلے پن نے شاید تمہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ یہ تو تم تھیں جس نے آج بچوں کے معاملے میں مجھے بھروسے کے قابل نہیں سمجھا، کل کو اگر زندگی کے کسی موڑ پر یا سر اپنی سگی اولاد پر اپنا حق جتانے آکھڑا ہوا تو کیا بچوں کے دل میں میری محبت کا بخشا وہ مان وہ بھروسا ہوگا۔ خواہیں گے باپ کی سمت کھینچنے سے باز رکھ سکے۔ تم ہی دامن شخص نسبتاً زیادہ بے فکر اور بہادر ہوتا ہے، کیونکہ اس کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ کل تک میں بھی اسی مقام پر تھا۔ بالکل اکیلا، تہی دست و داماں۔ لیکن آج میری جھولی بھری ہے۔ خوف اور ڈر کا سایہ کچھ اچانک ہی سر پر منڈلا نے لگا ہے۔ تمہارا ساتھ اور تمہاری مدد میرے

لیے سانس لینے جتنی اہم ہو گئی ہے رازی۔ مجھے اکیلا مت چھوڑنا۔“ اس نے بے ساختہ خزران کو خود سے قریب کیا۔ اس نے مسکرا کر آنکھوں کی کمی پینے کی کوشش کی۔

”میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں عازم۔ خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔“

”اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی کوئی بات دل میں نہیں رکھو گی۔“ اس نے گویا تنبیہ کی۔

”یہ وعدہ تو تمہیں ہنہ سے کرنا چاہیے۔“ وہ مسکرائی۔ ”بنا کے سنے تو تم ناراض ہو گئے تھے۔“

”یعنی۔“ عازم کو فوری طور پر بات سمجھ نہیں آئی۔ ”یعنی یہ کہ پچھلی چار پانچ راتوں سے میں اس بات کی منتظر رہی کہ جب تم گھرے میں آؤ تو میں تم سے بچوں کے سونے ان کی جگہ وغیرہ سے متعلق ڈسکس کروں۔ لیکن تم تو پچھو کے گھر سے ہی بنا کچھ کچھ سنے کمر اچھوڑ جاتے تھے اور ہاں برسوں رات جب تم دوستوں سے ملنے باہر گئے میں تمہارے بیڈ روم میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تو منال کو پلنگ سے گرتے دیکھ کر پانچ دس منٹ کے لیے اس کے پاس لیٹ گئی اور تم نے ٹھاہ کر کے دروازہ بند کر دیا۔“ خزران نے اس کے جذباتی اقدامات پر تفصیل سے روشنی ڈالی تو وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا۔

”یعنی یہاں بھی قصور میرا نکلا۔“ وہ کھسیا گیا۔ ”اور میں پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔“ آخری جملہ اس نے دھیرے سے زیر لب دہرایا، لیکن خزران نے سن لیا۔

”تم کیا سوچ رہے تھے؟“ اس نے بھنوس سکیریں۔ عازم کا انداز ہی اتنا مشکوک تھا کہ خزران کو وال میں کچھ کالا نظر آیا۔

”کچھ نہیں یا۔ ایسے ہی۔“

”ہتاؤ نا عازم! اور کیا بات تھی۔ جتنا میں تمہیں جانتی ہوں تمہارا پچھلے کچھ دنوں کا غصہ اور ناراضی بچوں کی وجہ سے تو نہیں ہو سکتے۔“ اس کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ عازم نے قائل ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

”ہاں۔ تمہارا بچوں کی طرف زیادہ جھکاؤ ان سے

Art With You

Paint with Water Color & Oil Colour

First Time in Pakistan
a Complete Set of 5 Painting
Books in English



Art With You

کی پانچوں کتابوں پر حیرت انگیز رعایت

Water Colour I & II
Oil Colour
Pastel Colour
Pencil Colour

فی کتاب 150/- روپے
نیا ایڈیشن بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ
200/- روپے



بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

انڈیجسٹ کبھی میرے لیے پر اہلم کا باعث نہیں بن
سکتی۔ ماں کی اولاد کے لیے محبت فطری امر ہے میں
کوئی حد نہ دینی لگانے والا کون ہوتا ہوں۔ ان کے
معاملے میں تم کسی بھی حد سے گزر جاؤ جائز ہے۔ بلکہ
ہاں۔ ایک اور بات بھی یاد رکھو۔ ”اس نے بھرپور
ممانعت سے خزان کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”میں خود
بھی یہ بات سمجھ گیا ہوں کہ اللہ نے مجھے اولاد کی خوشی
اسی صورت میں دینا بھی۔ اللہ کی مصلحتیں واقعی
ہمارے دائرہ عقل سے بہت بالا ہیں۔ سوچو اگر سارہ کی
جگہ تم میری پہلی شریک سفر ہو تیں تو کیسے اتنی بڑی
قربانی دینا کیسے تمہیں خود سے جدا کر پاتا۔ سوچوں بھی تو
لرز اٹھتا ہوں۔ تم جس طریقے سے میری زندگی میں
شامل ہوئیں۔ یہی سب سے خوب صورت راستہ تھا،
اور یہ ہی میری اصل منزل ہے، میں ناشکری نہیں
کر سکتا۔“ وہ بہت رسان اور پیار سے وضاحت دے
رہا تھا۔ خزان اس کے خوب صورت الفاظ کی سچائی
میں کھو سی گئی۔

”اور پھر دوسری وجہ کیا تھی عازم!“

”اے۔۔۔“ وہ شرمندہ سا ہنس پڑا۔ ”میں نے کہا تھا
تمہاری محبت کا مارا ہوں، کبھی کبھی جوش میں ہوش کھو
جاتا ہوں۔“

”اب بتائی دو عازم کیا فالتو میں الجھائے جا رہے
ہو۔“ وہ منہ پھلا کر باقاعدہ ناراض ہو گئی۔ عازم لہجے
کو چونکا پھر بے ساختہ ہنس پڑا، ”خزان کا فطری انداز
جانے کیا کچھ یا دلا گیا۔“

”ج آج تو قسم سے وہی منگیتر منگیتری لگ رہی
ہو۔“ اسے خزان کی ناراضی پر بے تحاشا پیار آیا۔

”پاگل ہو بالکل۔۔۔ منگیتر کے تصور سے خوش
ہو رہے ہو، جبکہ اب تو میں۔۔۔“ اس نے بیوی کہتے
کہتے اچانک زبان کو بریک لگائی۔ بھلے وہ دونوں ایک
دوسرے کے دوست تھے اور بہت فری ہو کر بات
کرتے تھے، لیکن اس نئے حسین رشتے کا ریشمی سنہری
احساس ابھی اپنی پوری تباہی اور رعنائی اپنے اندر
چھپائے بیٹھا تھا۔ جس کے جیلے انوکھے رنگوں نے

ورق ورق اپنی خوب صورتی کی جھلک دکھانا تھی۔ تب دوستی اور محبت کا یہ رشتہ مزید بامعنی مزید مضبوط ہوئے والا تھا۔

”ہاں کہہ۔ اب تو میں کیا؟“ آنچ دیتا لہجہ تھا عازم کا لفظوں کے زیر و بم سے خزان کا وجود سلگنے لگا۔ اس نے بمشکل خود کو اس سحر سے نکالا۔

”میں ہمارے ہوں۔“ وہ اپنی بے قابو دھڑکنوں کی آواز اپنے آنٹوں میں سن رہی تھی۔

”چھار کو پایا!“ وہ ہار مان گیا اور باقاعدہ بازو سے پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ ”یار بندہ ہے تا غلط فہمی ہو جاتی ہے کبھی کبھی۔ تمہارے دور رہنے سے بلا وجہ میرے دماغ میں یہ شک بیٹھ گیا کہ شاید تمہارے لیے یا سر کی یادوں سے الگ ہونا اور مجھے شوہر کے روپ میں قبول کرنا ذرا مشکل ہو رہا ہے۔ بس کچھ اسی وجہ سے پوزیسو ہو گیا۔ میں نے ساراہ سے شادی کے باوجود اپنے دل کو کبھی تم سے خالی نہیں پایا۔ تم سے اپنائیت اور محبت برسوں بعد بھی جوں کی توں تھی، لیکن تمہارے معاملے میں مجھے لگا کہ شاید یا سر کی بیوی بننے کے بعد تم اب وہ پرانی خزان نہیں رہیں۔ میرا غصہ، جھٹاٹ اور ناراضی صرف اس لیے تھی کہ میری توقعات بہت زیادہ تھیں۔ اور تمہارا رسپانس تقریباً ”مانس۔ حالانکہ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ میں مرد ہوں، جس کے ہاں گنجائش لکنا فطری امر ہے۔ یہ نسبت اس کے عورت و فادار اور کمیٹل ہوتی ہے۔ شاید مجھے اسپیس دینا چاہیے تھا۔“

وہ اب کھلے دل سے اپنی کوتاہیوں، شکوک اور غلط فہمیوں پر بولنے لگا تھا۔ خزان نے اسے آرام سے بات مکمل کرنے دی۔

”تو پھر تم نے کیسے جانا کہ یہ صرف تمہاری غلط فہمی تھی؟“

”کل میں اماں کو چھوڑنے گھر گیا تو فضا بھابھی نے مجھے روک لیا۔ انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر تمہارے خدشات سے آگاہ کیا۔ شاید یہاں آنے سے پہلے تمہاری ان سے تفصیلی بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ تم صرف بچوں کی وجہ سے تھوڑا احتیاط سے پیش آرہی ہو اور ابھی جب میں نے رافع کو پیار کیا تو تم نے آنسو چھپانے کے لیے چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ میں جان گیا کہ میری سختی تمہاری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔ کیا میں ٹھیک سمجھا؟“

آخری جملہ پھر کچھ کچھ خدشات سے بھرا تھا۔ خزان قدر دانی سے مسکرا پڑی۔ وہ تشکر سے اسے دیکھنے لگی، وہ ابھی بھی اسے، سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ خزان کی پلکیں جھک گئیں۔

”اپنا مقابلہ ایک ناقد رے اور دھوکے باز شخص سے مت کرو عازم۔ جس نے مجھے طلاق دی ہے، اسے میں اپنی یادوں میں کیسے بسا سکتی ہوں۔ یا سراسر ایک مہمان کی طرح زندگی میں آیا اور سوائے میرے دل کے سب لوٹ کر لے گیا۔ ایسے بے مہر کو نہ دل کی ضرورت تھی، نہ قدر، اس کے معاملے میں میری ایموشنل لائف اسی روز پتھر ہو گئی تھی جب اس کی دھوکا دہی کا پول مجھ پر کھلا۔ راتوں کو جاگنا اور پریشان رہنا تو صرف بچوں کے فیوچر اور اچانک سر پر آڑنے والی ذمہ داریوں کی وجہ سے تھا۔ ابھی تم نے خود کہا کہ عورت کمیٹل اور وفادار ہوتی ہے۔ تو بھلا تم سے نکاح ہو جانے کے بعد میں کیسے کسی غیر مرد کی وجہ سے تمہارے ساتھ زیادتی کر سکتی ہوں؟“

”سوری رازی! میں اپنی بدگمانی پر معافی چاہتا ہوں۔“ عازم نے کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے خزان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ مسکرانے لگی۔

”کبھی بھی بالکل بچے بن جاتے ہو عازم!“

”تمہارے معاملے میں تو ایسا ہی ہوں۔“ وہ بھی مسکرانے لگا۔

”تو کیا ایسے ہی رہو گے، وہموں میں گھرے، شکی مزاج؟“ وہ گھبرائی۔

”نہیں۔ نہیں، تم جاہو تو میرے دہم اور گمان دور ہو سکتے ہیں۔“ وہ معنی خیز شوخی سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ویسے تو ہر معاملے میں بڑے سمجھ دار بنتے ہو۔“

”اب جانے دو، کل مجھے سفر بھی کرنا ہے۔“ وہ نظریں چرا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔
”محترمہ! صرف آپ کو نہیں، مجھے بھی سفر کرنا ہے۔“

”تمہیں...؟“ وہ حیران ہو کر مڑی۔
”کیا کہنے اس ادا کے۔“ عازم نے بازو سے تھام کر اسے اپنے قریب بٹھایا۔ ”بارہ روزہ قید تھائی کے بعد اب یہ ہفتے بھر کا نیا داغ جدائی کم از کم اس دولہا کی برواشت سے تو باہر کی بات ہے۔ کچھ تو شرم کرو حسینہ چار سو بیس۔“ وہ اپنے مخصوص طرز گفتگو سے اس کے دل کے تار چھیڑنے لگا۔ خزان کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”بہت دیر سے دل پہ پڑا بوجھ سرکنے لگا۔ یہ احساس ہی خاصا تکلیف دہ تھا کہ وہ عازم کو یہاں اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت حال کے بعد۔“
”خوش ہو؟“ عازم نے۔ بے یقینی سے اس کے کھلے چہرے کو دیکھا تو اس نے شرما کر اثبات میں سر ہلایا۔
”ہاں۔ بہت زیادہ۔ اس اب اس خوشی میں سونے دو۔“ اس نے لاڈ سے عازم کو پرے کیا۔
”یہ تو براہم ہو گئی دیر۔“ عازم نے ہونٹوں پر انگلی بجائی۔

”کیا مطلب۔“ خزان ٹھٹھکی۔
”بھئی مجھے تو خوشی میں نیند نہیں آتی اور۔“ وہ اور کو لمبا کرتے ہوئے اس کے بہت پاس آیا۔ ”جب مجھے نیند نہیں آتی تو میں اگلوں کی نیند بھی بھگا دیتا کرتا ہوں۔ کیا سمجھیں؟“ عازم نے خوشی کے لمحات کو طویل کرنے کا پختہ ارادہ کیا۔ خزان نے شدید بے بسی محسوس کرتے ہوئے راہ فرار کا ارادہ ترک کیا۔

”نہ چاندنی چٹک رہی تھی، نہ ہوائیں سرسرا رہی تھیں، نہ بادل تھے، نہ پتیاں۔ لیکن برسوں کے پچھڑے دودلوں کے طمن کے طلسمی پل کائنات کے ہر حسن پر حاوی ہونے لگے۔“

اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔“
”اور یہ اتنی سی بات تم خود کیوں نہیں سمجھا دیتیں۔“ وہ اصرار کرنے لگا۔ خزان کو مزید تنگ کرنا اچھا نہیں لگا۔ عازم بے چارے کی آزمائش تو یوں بھی خاصی طویل ہو گئی تھی۔

”دس بارہ روز پہلے ہم جس رشتے کی بنیاد پر ایک دوسرے کی زندگی میں شامل ہوئے، اس میں اپنائیت اور محبت پیدا ہونا بھلے بہت فطری بات ہے، لیکن تم سے اپنا پرنا محسوس کرتے مجھے تو اب بہت عرصہ ہو گیا ہے۔“ اس نے نیچے دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ اس کا شرمایا، شرمایا اقرار سن کر عازم کے لبوں پر بہت خوب صورت مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

”یعنی جب سے میں وطن واپس آیا ہوں۔“ اس نے تائید چاہی تو خزان نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

”اچھا۔“ وہ دھیرے سے ہنسنا۔ تھائی میں ایک دوسرے کا قریب کچھ اچانک ہی ابھر کر محسوس ہوا۔ عازم کی خوب صورت ہنسی میں جھرنوں کی روانی تھی۔ خزان کو اپنا دل لہروں پر بہتا سا محسوس ہوا۔ عازم نے دائیں ہتھیلی پلنگ پہ جما کہ بائیں ہاتھ سے خزان کی ٹھوڑی اوپچی لی۔

”عازم۔ میں نے جنید بھائی کو پہلا فون اس لیے کیا تھا، کیونکہ جلدی میں، میں ڈاکل کیے ہوئے بمبرزی نکال پائی، وہاں پہلا نمبر بھیا کا ہی تھا۔“ خزان نے ماحول کا جادو کم کرنے کے لیے جلدی سے موضوع بدلا۔ لیکن عازم نے محض بے دھیانی میں سر ہلایا۔
”ورنہ تم جانتے ہو، میں نے ہمیشہ ہر مشکل میں سب سے پہلے تمہیں آواز دی ہے۔“

”ہوں۔“ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہتا اپنا چہرہ اس کے مزید قریب لایا۔ خزان کی شش کم ہو گئی۔ رہے سہے اوسان عازم کے انداز خطا کیے جا رہے تھے۔ اس نے گھبرا کر پلیس پیروں میں ڈالے۔

”کیا ہوا؟“ اس کی عجلت پر وہ مسکراہٹ دبا کر سوال کرنے لگا۔



آٹھویں قسط

اس کا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا یا اندھیرا اس کے وجود سے نکل کر کمرے میں پھیلا تھا۔ اس کا فیصلہ کرنے والا وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اپنے زندہ اور مردہ ہونے کی تصدیق کر رہا تھا۔ اپنے زندہ ہونے کا صدمہ اس نے بڑے صدمے سے جھٹلایا۔ وہ اس احساس سے گزرا جو زندہ لوگوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اسی رات لیڈی مہرا سے اپنے ساتھ امریکہ

شعلہ زن غاروں سے چگاڑوں کی سام (زہر دینے والے) کی طرح اڑ کر اس کے وجود کے گرد منڈلانے لگیں مگر پاتال نے اپنے وجود میں اس کی موجودگی کا بگل بجایا۔
”عالیان مارگریٹ۔“

اس نے آنکھیں کھولیں اور جانا کہ اندھیرے کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ جس سفر کی چاہ نہیں تھی۔ وہ سفر بہت شوق سے اسے اپنے ساتھ کھیٹ رہا تھا۔

مکمل ناول





Copied From Web

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

شارلٹ کے گھر لے آئی تھیں۔ اسے سکون اور ادویات اور نیند کی گولیاں دی گئی تھیں۔ پھر بھی وہ ایک اچھی نیند حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔ وہ غنودگی میں بند رہتا رہا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ لیڈی مرنے اس کا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور وہ مسلسل اس پر پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اس کا نروس بریک ڈاؤن نہ ہو جائے۔ اس کی آنکھوں کے گرد ویسے ہی گہرے گڑھے بن گئے تھے جو اس کی ماں کی آنکھوں پر قابض رہے تھے۔

مارگریٹ کو وہ اس اسپتال سے جانتی تھیں جہاں وہ اپنے چیک اپ کے لیے جایا کرتی تھیں۔ مارگریٹ اکثر ان سے بے عالیان کا ذکر کرتی۔ اس کے مرنے کی خبر معلوم ہونے کے بعد انہوں نے بہت مشکل سے عالیان کو ڈھونڈا تھا۔ انہیں مارگریٹ جیسی معصوم دل لڑکی کی مرثیہ پر اتنا دکھ تھا کہ وہ کئی راتیں روتی رہی تھیں۔

عالیان کو پہلی بار دیکھنا کسی صدے جیسا تھا۔ اتنے سے بچے کی صورت میں مارگریٹ کے آخری ایام

رہے بے تھے۔ اس کے مجسمہ وجود میں مارگریٹ کے رنگ اتنے گہرے تھے کہ انہیں خوف محسوس ہوا کہ یہ بچہ نارمل زندگی نہیں گزار سکے گا۔ وہ دنیا میں رہ کر دنیا سے الگ ہونے میں وقت نہیں لے گا اور اسی خوف کے سہارے انہوں نے پھونک پھونک کر قدم رکھے تھے۔ اسے ریزہ ریزہ جوڑا تھا۔ اسے دعاؤں اور محبت سے تعمیر کیا تھا۔ اس میں "انسان" لقب کند کیا تھا۔

اور ان کے شاہکار کو ولید ایک دھکے سے پاش پاش کر گیا تھا۔ انہیں اس سب کا ڈر تھا۔ اسی لیے ولید کو اس سے دور رکھ رہی تھیں۔ جن بچوں کے والدین کے ساتھ سانحات گزرے ہوں وہ بچے اس سانحہ کی پرچھائیں بن جاتے ہیں۔ وہ نارمل ہو کر اپنا رمل ہونے میں وقت نہیں لیتے انہیں سوتی بھی چبے تو وہ اپنے پرانے دروں پر رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے بچے جنہوں نے معمول سے ہٹ کر بچپن گزارا ہو وہ کرب

کی ساری سرحدوں کو چھو کر آئے لگتے ہیں وہ رونے کے لیے کسی جلد باز کی طرح تیار رہتے ہیں اور خوش ہونے پر وہ خود کو خود ہی حیرت سے دیکھتے ہیں۔

بمشکل دو گھنٹے کی نیند لے کر وہ اٹھ بیٹھا اور گھنٹوں ہی پانی سے کھیلتا رہا۔ پانی کی بوندوں کو دیکھ کر اس نے سوچا وہ پانی ہی ہوتا۔ بہ جاتا۔ نشان چھوڑ جاتا اور مٹ جاتا۔ واش روم میں موجود ایک ایک چیز کو اس نے خوش قسمت جانا وہ ایک چیز پر نظر رکھتا سوچتا اور اگلی کی طرف ٹھہر جاتا۔ خود کو بے وقعت کرنے میں اس نے وقت نہ لیا اور وضاحت سے جان لیا کہ بد قسمتی "زندہ ہونا ہے۔" اور خوش قسمتی بے جان ہونا۔

اس نے گرم پانی کا استعمال نہیں کیا تھا اور ٹھنڈے پانی کے استعمال نے بھی اسے ٹھنڈا نہیں کیا تھا۔

اس کی شکست و ریخت کے ذریعے سال خورہ ہو چکے لمحوں کی سطح پر تیرتے تھے اسے ترس کھائے دیکھ رہے تھے۔ وہ ابھی یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ اسے سب سے زیادہ ماتم کس کا منانا ہے۔ اپنی ماں کا۔ ماں کے شوہر کا یا ان دونوں کی اولاد یعنی اپنا۔ اور سب سے

زیادہ نوحہ کننا اسے کس احساس پر ہونا چاہیے اپنی محبت پر۔ مارگریٹ کی محبت پر یا "تھو" سے بھی کمتر اپنی حیثیت پر۔

"جو روٹن اور شارلٹ کسی فلمی پارٹی میں جا رہے ہیں، تمہیں بھی لے جانا چاہتے ہیں۔" آخر کار جب وہ واش روم سے باہر آچکا تو بہت صبر سے اس کا انتظار کرتی۔ ماما مرنے انداز میں شوق بسا کر اسے لالچ سا دیا۔

"میں کیا کروں گا جا کر؟" تو لیے سے وہ اپنے گیلے بال رگڑ رہا تھا اور اپنی آنکھوں کی سرخی چھپا رہا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنسنے کے سفر میں مبتلا لگتی تھیں اور ان پر تنی کمانیں زخمی گھڑسوار کی طرح بس زمین پر آ گرنے کو تھیں اور اس کی خوب صورتی وہ بازگشت لگنے لگی تھی جو صحراؤں میں پیاسے جانور ریت میں

”کیونکہ میں یہ جانتی تھی کہ وہ تمہیں کیوں ڈھونڈ رہا ہے“ اس کے پاس وہ اوجہ نہ ہوتی تو میں فوراً اسے تمہارے پاس لے آئی۔ عالیان میں نے بہت محنت سے سب بچوں کو ان کے دکھوں سے نکالا تھا اور تمہیں خاص طور پر۔ تم بہت حساس رہے ہو، میری گود میں سوتے تم ان باؤں کو دہرایا کرتے تھے جو مارگریٹ کیا کرتی تھی، میں نے اینٹ اینٹ تمہیں جوڑا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ آکر تمہیں مسمار کر جائے اور میں نہیں چاہتی کہ یہ کام تم اپنے ساتھ اب کرو۔ اگر میری محبت کی کچھ قدر کرتے ہو تو پھر سے میرے عالیان بن جاؤ۔“

”آپ جانتی تھیں سب؟“
شارلٹ کے کمر میں تیزی آگئی تھی۔ شاید وہ سارا باغ کاٹ ڈالے۔ کوئی پھول باقی نہ رہے۔ سارے باغ کی ہمارا جڑ جائے۔

”ہاں! دو سال پہلے اس کا ایک آدمی آیا تھا۔ اس وقت اسے صرف شک تھا کہ تم میرے پاس ہو، خوش قسمتی سے ایک خاتون جو اسی سینٹر سے بچے گود لے گئی تھی۔ اس بچے کی ماں کا نام مارگریٹ تھا۔ وہ عورت برطانیہ چھوڑ کر کسی دوسرے ملک چلی گئی۔ یہ لوگ اسے ڈھونڈتے رہے۔ کڈز سینٹر نے کسی بھی طرح کی

غیر ضروری معلومات کسی کو بھی نہیں دی تھی، لیکن یہ تھوڑا بہت معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے وہ سارے والدین کھنگال لیے جنہوں نے بچے گود لیے تھے۔ آخر میں ان کا شک پھر مجھ پر ٹہر گیا۔ ڈینس کو ناروے بھیج کر میں نے سب معلوم کروا لیا تھا اور اس نے مجھے بتایا کہ ولید کو عالیان کیوں چاہیے مجھے اس کی کم طرفی بردھ ہو اور میں جانتی تھی کہ تمہیں حقیقت معلوم ہو گئی تو تم بھی اچھا محسوس نہیں کرو گے۔ مجھے تمہاری تعلیم کی فکر تھی۔ لیکن ایک وقت میں میں یہ بھی چاہتی تھی کہ تم خود اس سے مل لو۔ ایک بار سب جان کر اس طرح تمہیں تکلیف نہ ہوتی۔ اگر ڈینس مارک اور باقی سب دوسرے ملکوں میں نہ ہوتے

ریت ہونے سے پہلے سننے ہیں۔
”فلمی ستاروں کو دکھنا۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو فوراً چلی جاتی۔“ انہوں نے آواز میں اتنا جوش بھر لیا کہ بس وہ ضرور ہی چلا جائے۔

”خدا نہ کرے کہ آپ میری جگہ ہوتیں۔“
قد آدم کھڑکی کے پاس بیٹھ کر وہ شارلٹ کے گھر کے وسیع باغ کو دیکھنے لگا۔ شارلٹ پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی۔

”میں عالیان ہوتی تو دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان ہوتی۔“ وہ بھی کھڑکی کے پاس اس کے سامنے ذرا سے فاصلے پر بیٹھی تھیں۔ شارلٹ نے کمر سے ایک غیر ضروری شاخ کو کاٹا۔ اسے لگا اس کمر سے کئی غیر ضروری شاخ وہ ہے۔

”آپ مجھ سے اتنا پیار کیوں کرتی ہیں؟“ وہ باپ کا ڈسا تھا۔ اب اسے ہر محبت پر شک تھا۔

”میں تم سے اس سے بھی زیادہ پیار کیوں نہ کروں۔ مہر کی محبت پر تمہیں شک نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے محبت کو ہمیشہ باوجود رکھا ہے، میں ایک مکمل انسان نہیں ہوں۔ لیکن اپنی محبت کو میں نے نامکمل نہیں رہنے دیا۔“

”مجھ میں ایسا کیا ہے ماما جو آپ۔ آپ مجھ سے۔“ اس کی آنکھیں نم ہو کر اور اندر کو دھنسنے لگیں، جس نے خود پر محبت کو فرض کر لیا تھا۔ وہ اب ”محبت“ پر سوال اٹھا رہا تھا۔ وہ محبت پر اپنے ایمان سے جا رہا تھا۔

”تم میں ایسا کیا نہیں ہے جو تمہیں سینے سے لگا کر نہ رکھا جائے۔ تم ایک شخص کے پیمانے سے دوسروں کے پیمانے نہیں تاپ سکتے۔“

شارلٹ غیر ضروری شاخیں کاٹتی ہی جا رہی تھی۔ اس نے خود کو قریب الوقت کٹ جانے والی شاخ پھلایا اور وہ اپنے ہی اندر سسم گیا۔

”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ وہ مجھے ڈھونڈ رہا ہے؟“

تو وہ تم تک۔ جلدی پہنچ جاتا۔ انہیں یہ ہی شک رہا کہ تم دنیا میں کہیں اور موجود ہو۔“

عالیان کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے سامنے ہارٹ راک کا وہ ہال گھوم رہا تھا جس کی زمین پر ولید کھڑا تھا۔ اس کی انگلی اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور تمسخرانہ قہقہے لگانے کے لیے اس کا ذہن بے تاب لگتا تھا۔

”تم اسے معاف کرو عالیان تم میرے بیٹے ہونا؟“

”میں اس کے پاس جاؤں گا۔ اور تمام شیراز اپنے نام لگاؤں گا۔“

”تم مجھے دکھ دے رہے ہو۔ تم میرے عالیان کو گم کر رہے ہو۔“

”میری ماں کی زندگی کے نقصان کے ہر جانے میں اس کا کچھ تو نقصان ہونا چاہیے نا ما۔“ کہتے اس کا انداز سخت تھا۔

”نقصان اس کا نہیں تمہارا ہو گا۔ اپنی زندگی کے قیمتی وقت کو تمہیں اس شخص کے لیے برباد نہیں کرنا چاہیے۔ میں جان گئی ہوں کہ تم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو۔ تم ان شیراز کو کوڑیوں کے مول بیچ دو گے لیکن۔“

”نہیں میں چینی کروں گا۔“

”تمہیں خود کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔“

تمہیں بارہ لینے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ انصاف کا ترازو اللہ کے ہاتھ میں ہی رہنے دے۔ تم بس آگے بڑھو۔“

”میں تو بہت پیچھے چلا گیا ہوں۔“

”شارلٹ کچھ دیر سٹائیکول نہیں لیتی۔“ کہہ کر اس نے شارلٹ کے بارے میں سوچا جس کا کڑوا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔

آج سے ہمارا ختم ہونے کو ہے۔ ستم ظریفی قسمت پر راج کرنے کو ہے۔ مقاصد زندگی پر نظر ثانی کی جائے اور متاع جان کی تعریف بدلی جائے گی۔

”تو آؤ پھر بھاگ کر واپس اپنی جگہ پر۔ کیا میرے

ہوتے تمہیں کہیں لاپتہ ہونے کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو گے، لیکن عالیان! انسان کے پاس تو آنکھیں ہوتی ہیں جو وہ دیکھتی ہیں جو اس کے سامنے ہونا ہے۔ قدرت کی ہر ساعت آنکھ ہے۔ ہر ساعت انصاف ہے۔ ہر ساعت حساب ہے۔ تم مارگرٹ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہو، اس سے بڑھ کر اس کے لیے کیا انعام ہو گا۔ تم ولید کا نام بھی لیتا پسند نہیں کرتے۔ اس سے بڑھ کر اس کے لیے کیا سزا ہو گی۔ عالیان، ہم چاہتے ہیں کہ جو برا کرے جو برا ہو اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا ہو۔ بس اسی ایک خواہش سے ہم بھی اس برے انسان جیسے برے بن جاتے ہیں۔ تم اسے فراموش کرو اور یہ ہی سزا کافی ہے اس کے لیے۔ اگر تم بدلے کے پلڑے میں جا بیٹھے تو میری محبت کا پلڑا کبھی نہیں جھکے گا۔ تم سوچ لو، تمہیں ولید اور مریم سے کس کے پلڑے کو وزنی کرنا ہے۔“ آنسو بڑی روانی سے لیڈی مہر کی آنکھوں سے نکلے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی ان کی عمر بھر کی کمائی لے جا کر کنویں میں پھینکے والا تھا۔

عالیان ان کے قریب زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگا لیے۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری پرورش کی بلانج رکھ لی اور تم وہاں سے آگئے۔ تم میرے بیٹے ہو۔ تم نے یہ

ثابت کر دیا۔ تمہیں اللہ کے انصاف پر ایمان رکھنا چاہیے۔“ اس کی نظریں پھر سے شارلٹ پر جا پڑیں۔

”اسے فراموش کرو۔ بے نیکی سزاؤں؟“ اس نے خود سے پوچھا۔

”اسے معاف نہیں کر سکتے تو اس کے خیال کو ترک کرو۔ دنیا میں اس انسان سے بڑھ کر کوئی بد نصیب نہیں ہوتا جس کے وجود کو لاوجود مان لیا جائے۔ اس کے ہونے کو نہ ہونا کر دیا جائے۔“

شارلٹ نے ایک ملازانہ نظریاں پر ڈالی اس نے

”مجھے تم جیسی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر کے
بہت خوشی ہوگی ویرا۔“

اہلکسی جوش سے اُٹھ کر لگتا ہوا ویرا کے پاس
سے گزرا۔ ”ویرا! تمہارا یہ پرانا ٹرک اب نہیں چلے
گا۔“ وہ چلاتا اور ہوتا گیا۔

وہ مسکرانے لگی۔ ”اور۔“
”میں مانچسٹر میں تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔“
کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
ویرا اور زیادہ مسکرانے لگی۔

”تم ہمارا جاؤ گی ویرا۔“ اس کے پیچھے چلا تے ہوئے
اس کے قریب سے گزر کر آگے نکل گئے۔

ویرا نے موبائل والپس جیب میں رکھا اور اپنے
جوتوں تلے لگے پیوں کو اس نے اس زور سے سڑک پر
رگڑا جیسے وہ کسی جہاز کے پیچھے ہوں اور اڑان بھرنے
سے پہلے رفتار پکڑ رہے ہوں۔

پہلے اس نے پیپا کو پیچھے چھوڑا اور پھر وہ اہلکسی
کے پیچھے لپکی۔

دوسری طرف امرجہ اپنی کلاس لے کر نکل رہی
تھی کہ کارل اس کے پاس آیا۔ وہ دن اسے بخار رہا تھا۔
وہ آج ہی یونی آئی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے تمہاری امرجہ؟“
”میں ٹھیک ہوں شکریہ۔“ وہ الفاظ ضائع نہ کرتی
تو اس کی شکل بتا رہی تھی کہ وہ کتنی ٹھیک ہے۔
”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

”مجھے معلوم تھا تم آؤ گے۔ حساب لینے۔“

”نہیں اس بار تم نے غلط سمجھا مجھے میں حساب
لینے نہیں بات کرنے آیا ہوں۔“

دونوں ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔
”میں گھر گیا تھا تم سے ملنے۔ تم کافی بیمار تھیں میں
واپس آ گیا۔“

”مجھے ساوہنا نے بتایا تھا اور مجھے خوف آیا تھا تم
سے۔“

”اور میں تمہارے بیمار ہو جانے سے ڈر گیا۔“

بہت دل اگا کر کانٹ چھانٹ کی تھی۔
”اور امرجہ کو بھی معاف کرو۔“ ان کی آواز نرم
ہو گئی۔

”کر دیا معاف اور ترک بھی کر دیا۔“ اس نے
ٹھنڈے انداز میں کہا اور اس پھول کو گرتے ہوئے
دیکھا جو شارلٹ کے کٹڑے سے حادثاتی طور پر کٹ کر نیچے
ہی نیچے گز رہا تھا۔ شارلٹ کے چہرے پر افسردگی چھا
گئی۔ جیسے اس نے کسی زندہ انسان کا خون گر دیا ہو۔

”میں ڈکار عالم۔ میں سنگ آستل۔“
”میں لوح نگینہ سانس۔ میں لوح شعلہ بیاں۔“

عفو نہ میری گزر گاہیں
میں جمال۔ میں کمال۔ میں اہمام۔
میں گینت ہوں
”میں قسمت ہوں۔“



ویرا اہلکسی اور پیپا کے ساتھ اسکیننگ کر رہی
تھی۔ ایک راؤنڈ میں اس نے ان دونوں کو ہرا دیا تھا۔
اب وہ دوسرے راؤنڈ کی طرف بڑھ رہی تھی اور کافی
آگے نکل آئی تھی کہ اس کی جینز کی جیب میں رکھا
فون فل وائیو ریشن کے ساتھ بجنے لگا۔ سوائے ایک کال
کے اس نے سب کالز کو ”سائنٹ“ پر رکھا تھا اور وہ
ایک کال عالمیان کی تھی۔ اپنی رفتار ذرا آہستہ کر کے
اس نے فون نکال کر سنا۔

”کہاں تھے فرش میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے
تھے؟“

جواب میں خاموشی ملی پھر یہ سوال ”کیا برنگ مین
ٹائٹ پر پوچھا گیا اپنا سوال تمہیں یاد ہے ویرا؟“

”ہاں!“ اپنی رفتار کو اس نے بالکل روک لیا اور
سڑک کے کنارے لگے لیمپ پوسٹ کے ساتھ ٹک کر
کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر جا بجا خون کی لہریں دوڑ
گئیں اور اس نے اپنے دل کی دھڑکن کسی ساز کی
طرح سنی جسے سنتے ہی ایڑیاں بل کھانے لگتی ہیں۔

سے پڑھ لیتا ہوں۔ میں اس نے ایک جگہ لکھا۔ ”میرا یہ افسوس جاتا ہی نہیں کہ مجھ سے کسی کھلونے کی طرح کھیلا گیا۔ میرا یہ دکا کم ہونے میں نہیں آ رہا کہ جو مجھے سب سے سچا لگا تھا وہ میرے ہی منہ پر مجھ سے جھوٹ بول گیا۔“

اور اس نے ایک جگہ لکھا کہ ”جو لڑکی میرے لیے پہلی تھی اس کے لیے میں آخری بھی نہیں تھا۔“ اور اس نے یہ لکھا کہ ”بہت دکھ ہوتا ہے اس وقت کہ جس کے لیے ہم ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ دیں اور وہ خود دنیا میں آگے نکل کر ہمیں پیچھے اکیلا چھوڑ دے۔“ کہہ کر کارل خاموش ہوا اور پھر بولا۔

”پھر بھی مجھے یقین تھا کہ تم عالیان کو منالوگی فاصلہ کم کر لوگی اور ساتھ ہی مجھے یہ خوف بھی تھا کہ تم یہ سب نہیں کر سکو گی، کیونکہ تم بندہ لڑکی ہو۔ تم نے کبھی اپنی صلاحیتیں آزما ئیں ہی نہیں۔ اور امرجہ! میں سوچتا ہوں کہ تم نے ”بہت کچھ کر سکتی ہوں میں“ میں سب کچھ خراب کیسے کر دیا۔ اور میں تو یہ بھی اب تک نہیں سمجھ سکا کہ تم چاہتی کیا ہو؟ تم نے عالیان کو انکار کر دیا اور عالیان کے آس پاس بھی رہیں۔ سیف روم کی دیواروں کو تم نے پیغامات سے بھر دیا۔ یہ سب کیا تھا امرجہ؟“

”پانگل پن۔“ وہ رو دینے کو ہو گئی۔ ”دیرانے اسے پروپوز کیا تو وہ ایسے خوش نہیں تھا جیسے تمہیں کرنے سے پہلے تھا۔ امرجہ ہماری زندگی میں شامل ہونے والے شخص میں اتنی ہمت تو ہونی چاہیے کہ وہ جا کر ہمیں جیت لائے اور وہ تمہیں جیت لانا اگر تم نے سوال اس کی جان کے پیارے پر نہ

اٹھائے ہوتے عالیان کے فادر اسے ڈھونڈ رہے تھے اور یہ بھی ٹھیک رہتا اگر تم انہیں بتا دیتیں، لیکن جس وجہ کے لیے تم نے انہیں عالیان کا بتایا وہ وجہ ٹھیک نہیں تھی کہ تمہیں اس کے فادر کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے انسان کی موجودگی کی ضرورت جو اس کے نزدیک اس کی مدر کا قاتل ہے۔“

”کہہ دیں جلدی نہ مریاؤں؟“
”تمہیں مرنے کی بات نہیں کرنی چاہیے امرجہ۔ زندگی کی روشنی کو ایسی باتوں سے مدھم نہ کرو۔“
امرجہ نے اپنی دونوں ہتھیلیاں مسلیں۔

کارل گردن اس کی طرف موڑے اسے دیکھ رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ دوسرے عالیان کو ہی دیکھ رہا ہے۔ اس کی خاموشی بھی اس کی خاموشی جیسی تھی۔
”عالیان امریکہ میں ہے۔“ اس نے یہاں سے بات شریع کرنا مناسب سمجھا۔

”میں جانتی ہوں۔“ امرجہ کی ایک دوسرے میں پیوست ہتھیلیاں لرزنے لگیں۔

”تم ایک اچھی لڑکی ہو امرجہ!“ وہ نرمی سے بولا۔
”اب اس پر مجھے یقین نہیں رہا۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”میں یہ دعوا کرتا ہوں کہ تم عالیان کو سمجھیں ہی نہیں۔ تمہیں کچھ وقت لگا کر اور کچھ عقل استعمال کر کے اسے سمجھنا چاہیے تھا امرجہ! جب اس نے تمہیں پروپوز کیا تھا تو میرے لیے یہ عام سی بات تھی۔ عالیان نے میرے کتنے بریک اپ کروائے۔ وہ صرف اتنا کرتا کہ میری فریڈز کے ساتھ اچھی طرح سے بات کر لیتا اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزار لیتا اور ان کے لیے یہ ہی کافی ہوتا۔ یہ سب میرے لیے عام باتیں تھیں۔ مجھے معلوم ہوتا کہ وہ تم سے بریک اپ کے بعد اس حالت میں آجائے گا تو میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ میرے لیے وہ ایک مذاق تھا اور اب اندازہ ہوا کہ وہ کافی بے ہودہ مذاق تھا۔ مجھے بعد میں یہ احساس ہوا کہ اسے

کس قدر ریرا لگا کہ اس کی مدر پر سوال اٹھے۔ میں اپنی ماما سے نہیں ملا، لیکن اگر کوئی میرے والدین پر سوال اٹھاتا تو میں اسے سبق سکھا دیتا۔ لیکن عالیان نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے میرے پوچھنے پر کہا کہ اگر انسان درگزر نہ کر سکے تو اسے صبر کرنا چاہیے۔ ورنہ خاموش رہنا چاہیے۔ اس نے درگزر بھی کیا اور وہ خاموش بھی رہا۔ اس کی ڈائری جو کہ میں اسے بتائے بغیر بہت آرام

کارل رک، کراسے دیکھنے لگا کہ آگے بولے یا نہ بولے۔

امرحہ بس ایک کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس کے سامنے رو نہ پڑے۔ اس کی پور پور سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ ایک آنکھوں کو سنبھالنا زیادہ مشکل نہیں لگا اسے۔ عام انسانوں کی طرح سیڑھیوں پر بیٹھی تھی پھر بھی عام انسان نہیں لگ رہی تھی اس کے دکھ نے اسے نمایاں کر دیا تھا اور اس کے پاس رک کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے تسلی دینے کو دل چاہتا تھا، لیکن اتنا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔

کیا وہ قسمت کا وہی الہام تھی جس کا ڈھنڈورا قسمت اپنی بنیاد سے پیٹتی ہے۔

”عالیان نے ویرا کو شادی کے لیے ہاں کہہ دیا ہے۔“ کارل نے اس کے لیے اپنے انداز کو ہر حد سے زیادہ نرم بنالیا۔

سائی کے ذریعے اسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی، لیکن دوبارہ یہ سن کر اسے ایسا لگا جیسے یونیورسٹی نے اپنا رخ آتش فشاں کے دہن کی طرف موڑ لیا ہو۔

”اس نے یہ فیصلہ کسی بھی ذہنی حالت میں کیا ہو۔ لیکن امرتہ! اب کوئی نیار عمل اسے نئی تکلیف دے گا۔ تم سمجھ رہی ہونا امرتہ؟“

”میں پہلے سے ہی سمجھ چکی ہوں۔ میں یونیورسٹی چھوڑنے کے لیے بھی تیار ہوں۔“

کارل کو اس بات سے صدمہ ہوا ”ایسے نہ کو پلینز۔ میں صرف یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جس حالت میں وہ مجھ سے باتیں کر رہا تھا وہ ایک ایسی حالت تھی جو اس کی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اب کوئی نئی تکلیف اس پر کیا گر کرے گی میں یہ اندازہ لگا سکتا ہوں۔ تو امرتہ!

میں تم سے صرف یہ درخواست کرتا ہوں کہ اس سے دور رہنا۔ اب تم نے کچھ اور کرنے کی کوشش کی تو۔“

”مجھے کچھ نہیں کرنا۔ میں یہ یقین رکھتی ہوں کہ ویرا ایک اچھی لڑکی ہے، عالیان نے ٹھیک فیصلہ کیا۔“

میرے سارے عمل جذباتی اور بے وقوفانہ تھے۔ مجھے اپنے ایک ایک عمل پر دکھ اور شرمندگی ہے۔ میں نے تمہارے دوست کو بہت تکلیف دی۔ پاکستان میں میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں سب کچھ تباہ کر دینے والوں میں سے ہوں۔ میں وہ سیاہی ہوں جو ساری روشنیاں نگل لیتی ہے۔ میں دوسروں کی خوشیوں پر بجلی بن کر گر کر رہتی ہوں۔“

”کیا پاکستان والوں کے پاس وہ آنکھیں نہیں ہیں جو میرے ویرا، سائی اور عالیان کے پاس ہیں۔؟“ کارل نے بہت سنجیدگی سے پوچھا۔

امرحہ نے سر جھکا دیا وہ بالکل پھوٹ پھوٹ کر رو دینے کو بھی بس اب۔

کارل نے بہت غور سے اسے دیکھا ”میں جانتا ہوں کہ میں نے میس کیا، اگر وہ ریکارڈنگ عالیان نہ سنتا تو تمہیں لے کر اتنا تنگ نہ ہوتا۔“

”یہ سب ایسے ہی ہوتا تھا یہی میری قسمت تھی۔“ ”میں قسمت کے بارے میں نہیں سوچتا۔ سب ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“

”لیکن میں اس کے بارے میں سوچتی ہوں بہت کچھ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔“

”تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ میں تمہاری طرف سے ملامت کے لیے تیار ہوں۔“

”ملامت کی حق دار صرف میں ہوں۔ صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ مجھ سے دور رہنا۔“

”ہم دوست ہیں امرتہ۔“ کارل دکھی سا ہو گیا۔ ”نہیں۔ اب ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہم اس پر عمل کریں گے تو اچھا رہے گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کارل کو دیکھے بنا تیزی سے آگے بڑھ گئی اور کسی ایسے کونے کو ڈھونڈنے لگی جہاں چھپ کر وہ بیٹھ جائے۔

کچھ اس کے ذریعے کچھ سادہ سنا کے ذریعے دادا کو سب معلوم ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر روتے رہے کہ وہ ان کی جان پر رحم کھائے اور اپنی

کچھ اس کے ذریعے کچھ سادہ سنا کے ذریعے دادا کو سب معلوم ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر روتے رہے کہ وہ ان کی جان پر رحم کھائے اور اپنی

جان کے ساتھ کچھ نہ کرے۔ ان کا بس تمہیں چلتا تھا کہ
اڑ کر مچھڑ آجائیں۔

ان کے رونے اور ان کی منت سماجت نے امرجہ کو
شرمندگی سے زمین میں دھنسا دیا۔ اپنے دل کو وہ کفن
میں لپیٹ چکی تھی، دادا کو اذیت میں مبتلا رکھنا نہیں
چاہتی تھی۔ دونوں وہ بستر بڑی رہی اور دونوں دادا اس
کے بستر کے سامنے رکھے لیٹ ٹاپ پر ساکت اسے
دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھ کھلتی تو وہ سامنے موجود ہوتے
جیسے انہوں نے اس دوران پلکیں بھی نہیں جھپکیں۔
ایک بوڑھے شخص کے لیے یہ بہت جان لیوا مشقت
تھی۔ غرورگی اور بے ہوشی میں وہ جو بڑھتی رہی وہ وہ
سب سنتے رہے۔ بار بار دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اور
روتے رہتے۔ انہیں یقین تھا کہ جو پھونکیں وہ اسے
مار رہے ہیں وہ اس پر کارگر ثابت ہوں گی۔ امرجہ
سے زیادہ وہ جان کنی میں لگنے لگے۔ تو امرجہ اس
پیارے انسان کی بے مثال محبت میں بستر سے اٹھ
بیٹھی، انہیں کھا کر دکھایا، بول کر دکھایا، چل کر دکھایا،
ہنس کر دکھایا۔ وہ ایک اچھی اداکارہ بن گئی۔ اس نے
ایک محبت کے نقصان پر دوسری محبت کو نقصان میں
نہیں جانے دیا۔ وہ نہادھو کر یونی آگئی اور ساتھ ساتھ
دادا کو دکھاتی رہی کہ وہ کلاس لینے جا رہی ہے۔ اب وہ
لاہور کی جا رہی ہے۔ اب کینٹین۔ اب جاب پر۔
اور فون کو جیب میں رکھتے ہی وہ ایسی ہو جاتی جیسے
چار اطراف سے کوئی اس کا خون نہوڑ رہا ہے اور اس
کے جسم میں خون سے بھری نالیاں خالی ہوتی جا رہی
ہیں۔

دادا اسے یہ سمجھانا بھی نہیں بھولے کہ وہ وہاں
پڑھنے کے لیے گئی ہے اور اسے اپنے مقصد حیات کو
پانے پر توجہ دینی چاہیے۔ وہ دادا کو کہہ نہ سکی کہ
جب حیات ہی نہ رہے تو ”مقصد حیات“ کہاں رہ
پاتے ہیں۔

دادا ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد اسے فون کرتے
تھے۔ ”محبت ایسے ہی کمزور کر دیتی ہے دادا اور لاچار

بھی۔“

وہ ان کی آواز جو کسی انہونی کے ڈر سے لرز رہی
ہوتی سنتی تو سوچنے لگتی۔ شاید آپ کو معلوم ہو جائے
کہ بے بسی کسے کہتے ہیں اور اپنے کسی پیارے کے
بغیر رہنا کیسا لگتا ہے۔ میرے لیے آپ وہاں سو نہیں
باتے، کسی کے لیے میں، ماں سو نہیں پاتی۔ میں ہار بھی
گئی اور آپ کو جوتا بھی ڈالا۔ ایسے کھلاڑی آپ کو
صرف ”محبت“ میں ہی بائیں گے۔ میں کسی کے لیے
مر بھی گئی اور آپ کے لیے زندہ بھی ہوں۔ ہاں میں
صرف آپ کے لیے زندہ ہوں۔

”ایک لڑکا ہے عالیان۔
عرب کے سلطان سا۔
داستان کے جمال سا۔
آسمانی فرمان سا۔“

وہ شارلٹ کے ساتھ آگیا تھا صرف اور صرف ماما
کے لیے۔ وہ اس پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا رہی تھیں
اور وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں پاتی تھیں۔ وہ چاہتا تھا وہ
کچھ دیر آرام کر لیں۔ ماما نے اس کے لیے بہترین
سوٹ آرڈر پر منگوایا تھا، اپنے ہاتھوں سے اس کی ٹائی
باندھی تھی، جورڈن سے اس کا ہیرا شاکل بنوایا تھا اور
اس کی دونوں بھوری آنکھوں کو باری باری چوم لیا تھا۔
”حسن کی تعریف کے لیے تمہارا خیال پیش کر دینا
ہی کافی ہے۔ شاید تمہیں کوئی ڈائریکٹر دیکھ لے اور
اپنی فلم میں سائن کر لے۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا دوں
تمہیں پہلے ایک ایکشن فلم کرنی ہے۔“ وہ چاہتی تھیں
کہ وہ مسکرا دے۔

”اگر ایسا ہوا تو میں ضرور فلم کروں گا یونی چھوڑ دوں
گا۔“ وہ اپنی ماما کے لیے مسکرا دیا۔
”تم چاہو تو ابھی بھی یونی چھوڑ دو۔ یہاں شارلٹ

کے پاس رہو، ہوتی رہے گی پڑھائی۔ میں بھی یہیں رہ
لوں گی تمہارے ساتھ، ہم اپنا گھر لے لیں گے پھر۔“

”ایسے کیوں کھڑے ہو مالیان؟“ شارلٹ اس کے پاس آئی۔

”میں سب دیکھ رہا ہوں۔“ اس کی نظر اوپر سیاہ گاؤں والی لڑکی پر اٹھ گئی۔۔۔ اس کے انتظار کی شدت۔

”تم دیکھو مت۔۔۔ ملو اور باتیں کرو۔“

”میں ان سب کو جانتا بھی نہیں۔۔۔“

”یہ ضروری بھی نہیں۔۔۔ بہت سے لوگ پہلی بار آئے ہیں پارٹی میں اور میں انہیں اپنی دوستوں کے ساتھ چھوڑ کر آئی تھی۔“

”میں یہاں کھڑے رہنا چاہتا ہوں شارلٹ۔۔۔“

”ٹھیک ہے لیکن زیادہ دیر کھڑے نہ رہنا۔“ نرمی سے اس کا گل چھو کر شارلٹ چلی گئی اس کی نظریں چھت سے جھولتی لمبی لمبی کرشل لڑکیوں پر جا ٹکیں جن سے ٹنگے قہقہے جل بجھ رہے تھے اور پھر وہ سارے قہقہے بجھ گئے اور اتنی بہت ساری لڑیاں دائرہ بنا کر چکرانے لگیں۔۔۔ اور پھر سیڑھیاں اس دائرے میں ایسے شامل ہو گئیں جیسے خیرلی حسینہ شدت سے اونچی اڑیوں پر گھومنے لگی ہو اور اس کی پوشاک دنیا کی ہر چیز کو جالینے کو ہو۔۔۔ یوں پوشاک کے کناروں نے بالکونیوں کو جالیا اور انہیں اپنے دائرے میں گھسیٹ لیا پھر دیواروں کو اور چھت کو بھی اور پھر وہاں موجود ہر شے نے دائرے میں پناہ سمیٹ لی۔۔۔ اس نے سر کو جھٹکا۔

دائرہ بڑھتا ہی جا رہا تھا اور اپنے اندر ہر چیز کو سمو رہا تھا۔ زمین سے فلک تک ترن جانے کے قریب اس چکر کو اس نے خوف سے دیکھا۔

نزاکت بھرا ایک قہقہہ اس کے کانوں سے نکلا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا، یہاں کوئی نہیں تھا۔ قہقہہ پھر بلند ہوا اور پھر ہر طرف سے قہقہے بلند ہونے لگے۔ اتنے بلند قہقہوں کی آوازیں اسے پریشان کرنے لگیں۔ پھر ایک قہقہہ ان سب میں امتیازی ہو گیا۔

”ولید البشر کا“

ہم دنیا کھومیں گے، مجھے سان مرنو جانا ہے، سنا ہے سان مرنو کے لوگ بہت خوش اخلاق ہوتے ہیں ڈرا ان سے مل کر آئیں، کیا ایسا ہی ہے یا صرف افواہ ہی ہے۔“

وہ مسکرنے لگا۔ وہ سیاہ جرابیں پہن رہا تھا ان کے سامنے بیٹھ کر ”آپ سچ میں چاہتی ہیں کہ میں ہیرو بن جاؤں؟“

”ہاں۔۔۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ چاہتی ہوں کہ تم وہ کرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔“

”میں خود کو ختم کر لینا چاہتا ہوں۔“ وہ بڑبڑایا۔

وہ ایک گول سفید ستون کے ساتھ دایاں شانہ ٹکا کر کھڑا تھا۔ پہلے وہ مسکرا مسکرا کر سب سے ملتا رہا جیسے ان سب سے ملنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش رہی ہو، پھر وہ چند خوب صورت لڑکیوں سے (جو اتنی خوب صورت تھیں جیسے انہیں بنانے کے بعد فرصت سے ان کے نقص نکالے جاتے رہے ہوں اور انہیں کامل کر کے ہی چھوڑا گیا ہو) سے باتیں کرتا رہا۔ پھر وہ صرف سنتا رہا تو بولنا بھول گیا پھر اسے سر جھٹک کر خود کو سننے کے لیے موجود کرنا پڑا پھر وہ خود کو الگ کر کے اس ستون کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

ہاں بہت بڑا تھا اور چھت بہت اونچی۔۔۔ ہاں کے کراؤن سے وہ اطراف کھلی سیڑھیاں ہلکا سا بل کھاتیں کسی خیرلی حسینہ کی پوشاک میں اچھتی لہری طرح لہراتی اور جاری تھیں اور ہاں کی طرف نکلی گول بالکونیاں دور جدید کی پریوں سے سجی، بنی، بھری اپنی موجودگی کی اہمیت کا احساس اپنی شان و شوکت سے دلا رہی تھیں۔۔۔ ہنستے مسکراتے، بے فکرے نظر آتے لوگ ٹولیوں کی صورت بکھرے، کھڑے تھے۔ صرف ایک بالکونی تھی جس میں سیاہ گاؤں میں ملبوس کھڑی لڑکی اکیلی تھی اور اپنے ناخن کتر رہی تھی اور نیچے سر کر کے ایک مخصوص کونے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی کے انتظار کی شدت اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ ناخن کھاتے کھاتے خود کو بھی ادھیڑ ڈالے گی۔

”تم کتنی بھی اونچی ہواؤں میں اڑ لو۔۔۔ تمہارا نصیب پستی ہی رہے گا۔۔۔ جیسے مارگریٹ کا تھا۔۔۔ تم دونوں میرے بغیر کچھ کبھی نہیں ہو۔“

پوشاک کے کناروں نے اسے آلیا۔۔۔ سب گھونٹنے لگا اور وہ بھی۔۔۔ ہال کی ساری روشنیاں گل ہو گئیں۔۔۔ اندھیرا چھا گیا۔۔۔ کائنات میں روشنی کا نشان نہ رہا۔

”مقام نامعلوم ہے۔“

”فشاری“ وہ ایک با ایمان مرد ہے۔ اس نے روشنی کی چاہ چھوڑ دی اور زندگی کی بھی جس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں اور منہ بھی اس نے ایک برگزیدہ دعا کی تیاری کی۔ اس نے سب پاکیزہ الفاظ سمیٹے اور انہیں اپنی روح کے مقام پر رکھا۔ اس نے شانوں میں شان اقدس بیان کرنے کی نوید خود کو دی اور اپنے جکڑے وجود اور آزاد روح کو اللہ لفظ کی ادائیگی کی عبادت پر اکل پایا۔

موت کی چاب اسے اپنے بہت قریب سنائی دی جو اس کی عبادت میں غل ہوئی، لیکن اس نے پھر بھی عبادت کے اس رتبے کو روح سے نکل جانے نہ دیا۔ اور پھر اسے اس شخص کا نام لے کر ایک خاص دعا کہنی تھی جس کے لیے موت اس کی طرف برہہ رہی تھی اس کے ہاتھ پیر کاٹ دیے جائیں گے اور سر بھی۔۔۔ شاید۔۔۔ اور اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ اسے موت کے پروانوں کی پھونکوں نے قطعاً نہیں سمایا۔ وہ فشاری ہے۔ وہ ”حقیقت“ پا چکا ہے۔ اب وہ اسے جھٹلائے گا نہیں۔

اندھیرے کے ریوڑ پر چابک پڑے اور کبھی نہ بچنے کے لیے اندھیرے جل اٹھے۔ اسے مارگریٹ نظر آئی۔ اس نے سر کو جھٹکا اور پھر سے دیکھا ”ہاں یہ ماما ہیں“

اس کا جی ان سے لپٹ جانے کو چاہا لیکن وہ دائرے میں چکراتے خود کو اور انہیں ایک مقام تک نہ لاسکا۔ اس نے خود کو بے بس اور لاچار پایا۔ اس نے دیکھا کہ مارگریٹ کے وجود میں جا بجا کائے آئے ہیں اور

اس کا اپنا دل یہ دیکھ کر کربا سے لبالب ہو رہا ہے اور اس نے محسوس کیا کہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر قیامت آنا شروع ہو گئی ہے۔ ہر چیز اپنے نقطہ زوال کی طرف بھاگی جا رہی ہے۔

”تو کیا آپ نے جان لیا کہ آپ نے کیا پایا؟“ اپنی ہی آواز اس نے بھی سنی۔

”ماما! آپ نے کیا پایا زندگی میں؟ اس سوال کا جواب مجھے نہ ملا تو میں اپنے سارے نشان کھودوں گا۔۔۔ جب آپ مر رہی تھیں تو آپ نے کس طرح پرواز کی چاہ کی تھی۔ والد البشر کی طرف۔ اگر آپ نے ایسا کیا ہو گا تو میں اپنے دل میں آپ کو رکھوں یا نہ رکھوں مجھے اس بارے میں سوچنا ہو گا۔ اگر آپ مرنے سے پہلے اسے اپنے اندر سے نکال دیتیں تو میرے زندہ ہونے پر وہ موت بن کر نازل نہ ہوتا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ آپ کی موت پر زمین کو پھٹ جانا چاہیے تھا اور آسمان کو آگرتا چاہیے تھا۔ انسان کے لیے بنی کائنات کو اس کے دکھ پر اتنا تو ماتم کرنا ہی چاہیے۔“

وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا پھر بھی اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

”میں والد البشر کی قابلیت کا مداح ہو گیا ہوں اس نے میری محبت بھی نکل لی۔۔۔ وہ صرف ایک ہی۔۔۔ وہ صرف ایک ہی دل کو خالی کر کے صابر نہیں ہوا۔ اسے یہ غرور ہے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے اور میں یہ گناہ ضرور کروں گا۔ میں اس کے ہونے کو نہ ہونا ضرور کروں گا۔ مجھے یہ اعلان بھی کرنا پڑے تو میں کروں گا میرا کوئی باپ نہیں۔ اور ماما!“

”عالیان۔۔۔“ شارلٹ نے اس کا شانہ ہلایا۔

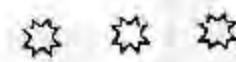
اس نے شارلٹ کو دیکھا وہ کچھ بول رہی تھی۔ کیا اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر شارلٹ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر وہ دیکھ پایا کہ ویٹر اس کے پیروں کے قریب گری ٹرے اٹھا رہا ہے۔ وہاں کانچ ہی کانچ بکھرا تھا۔ کچھ گردنیں اس کے رخ مڑی ہوئی تھیں۔ بالکنی میں کھڑی لڑکی کی آنکھیں اس پر جمی تھیں اور

اس نے ناٹن کترابند کر دیا تھا۔
چھت سے جھولتی لڑیاں جل اٹھیں۔ اور اس
نے شارلٹ کو ایسے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔
کیا قیامت آنے کے آثار معدوم ہو چکے۔ یا بس
قیامت آپ کی؟

”تم ٹھیک ہو؟“ شارلٹ نے شفقت سے پوچھا۔
وہ ہاں نہ کہہ سکا۔ اسے افسوس ہوا جب سب
کچھ ختم کرنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا تو ارادہ بدلا کیوں گیا
۔ اسے افسوس ہوا شمعیں پھر سے روشن کیوں کر دی
گئیں، مند جبرے پر روشنی کو کیوں غالب آنے دیا گیا
۔ ہاں اسے دکھ ہوا کائنات کے پھر سے آباد ہو جانے پر
۔ نقطہ زوال کے مٹ جانے پر۔

شارلٹ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ہی رکھا اور
اسے اپنے ساتھ لے کر چلنے لگی اور وہ اس کے پیچھے
ایسے چلنے لگا جیسے اسے کچھ اور کرنے پر اختیار ہی نہ
ہو۔

”ایک لڑکا ہے عالیان۔“
بھلا دی گئی دعا سا۔
بجھ چکے چراغ سا۔
عروج سے زوال سا۔“



سارا ماچسٹ اس کے آنسوؤں میں نہ بہا اور وہ خود ہی
ان میں غرقاب ہو گئی۔ چھپ کر رونے کے مشغلے کو
اس نے ایسے اپنا لیا جیسے فرض عبادت ہو، جو بعد از توہ
کی جاتی ہے۔ راتیں وہ کھڑکی میں کھڑے تمام کر دیتی
اور دن کو اس نے دھوکا دینے کا ذریعہ بنا لیا۔ اس کی گیلی
آنکھوں نے دھند کے پردوں میں فنا ہونا شروع کر دیا کہ
شاید وہ اس عکس کو جالیں جو وہاں تھا ہی نہیں۔ شاید
کسی معجزے نے خود پر اس کا نام لکھوا لیا ہو اور شاید
کسی تارک الدنیا کی صدیوں پہلے مانگی گئی دعا کی خیر
اسے بھی آ لینے کو ہو۔ اور کہیں کسی فراق زدہ کی ترپ
آسمان تک جا کر واپس پلٹتے ہوئے اس کے لیے بھی
رحمت اکٹھی کرا لی ہو۔ شاید۔

اسے ہر طرف سے ”عالیان“ نام کا جاپ سنائی
دینے لگا۔ وہ اس جاپ کو سنتی رہتی اور اپنے دل کے
مقام کو مسکتی رہتی۔ ہر ساعت اس کے نام کی پکار سن
گئی۔ ہر شبہ اس کی صبرت میں ڈھل گئی۔ اس
نے اس نام کی تسبیح پڑھنی شروع کر دی جس کے
ثواب میں وہ اسے ملنے والا تھا انعام میں۔

لیڈی مہر کے واپس آنے سے پہلے وہ کسی اور جگہ
اپنی رہائش کا انتظام کر چکی تھی اور جا بھی رہی تھی
لیکن سادھنا نے جانے نہیں دیا۔

”ایسی بے مروت نہ بنو انہوں نے کتنا خیال رکھا
تمہارا ان کے آنے تک انتظار تو کرو۔“

”ان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی میں۔ بہت شرمندہ
ہوں میں۔“

”تم ان کے سامنے شرمندہ ہونا میں تمہیں نہیں
جانے دوں گی، تم نے مشورہ کیے بغیر فیصلے کر کے دیکھ لیا
کیا ہوتا ہے۔ دوسروں کی ان لینے میں کبھی ہماری
بھلائی بھی ہوتی ہے۔“

”اب مجھے کہاں بھلائی زمیہ ہوگی“ وہ دونوں
سادھنا کے کمرے میں موجود نہیں۔
”ایک غلطی کی ہے دوسری غلطی نہ کرو، ہو سکتا
ہے کچھ بہتر ہو جائے۔“

وہ غلطی سے ہنس دی اور یہ سوچ کر رک گئی کہ کوئی
دوسری غلطی نہ ہو جائے۔

”میں نے تم سے ایک لفظ نہیں کہا اور تم گھر چھوڑ
کر جا رہی تھیں؟“

اگلے دن لیڈی مہر نے آئے، کے بعد رات کو اسے
اپنے کمرے میں اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا۔

”ایک لفظ نہیں کہا ہی تو برا کیا۔“ اس کا سر جھکا
ہوا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کمرے کی
کس چیز پر نظریں نکائے۔

”نہیں امجدہ! کچھ برا میں نے بھی کیا۔ جہاں کچھ
غلط ہوتا ہے وہاں صرف ایک انسان کی وجہ سے ہی
نہیں ہوتا، کہیں اس کے بہنو کا بھی ہاتھ ہوتا ہے
کہیں اس کے ماحول کا اور کہیں اس فضا کا جو

معاشرے میں رچی بسی ہوتی ہے۔“

”آپ ایسے نہ کہیں پلیز۔“

مجھے پریشان رکھا اور وہی ہوا جس کا ڈر تھا عالیاں بہت دکھی ہو گیا امرجہ۔“

امرجہ سے زیادہ اب کون جان سکتا تھا کہ وہ کتنا دکھی ہو گیا تھا اس نے اسے اس کرب میں بہت قریب سے دیکھا تھا۔

”اور اب عالیاں ویرا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ذہنی حالت کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل ہے۔“

”وہ ٹھیک کر رہا ہے۔“ اس نے فوراً کہا۔
”ہاں! شاید ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہے، خود کو بہلا رہا ہے، بھٹکا رہا ہے، سب یہاں وہاں کر رہا ہے۔ دیکھو ایک انسان آیا اور میری ریاضت کو کھوٹا کر گیا۔“ وہ اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں۔

”میرا عالیاں۔ میرا فرشتہ۔“
کچھ دیر کمرے میں تنگوت رہا۔
”بہر حال یہ تمہارا گھر ہے تم رہو یہاں۔ میں کل کی طرح آج بھی وہی ہوں۔ ماں ہوں نا اپنے بیٹے کے لیے تمہارے ساتھ تھوڑی سخت ہو گئی۔ ایک ماں کو معاف کر دو۔“

”اس بات سے آپ نے مجھے بے مول کر دیا۔“
”میں نے تمہارے لیے عالیاں کو سمجھانا چاہا لیکن شاید اس کا دل بہت سخت ہو گیا ہے۔“
”دل تو میرا سخت تھا۔“ سوچ کر وہ لیڈی مہر کا ہاتھ چوم کر اٹھ آئی۔

وہ چاہ کر بھی گھر نہ بدل سکی، لیکن ویرا کے آنے سے پہلے وہ اپنی ایک دوست کے فلیٹ میں چلی گئی۔ وہ دن وہیں رہی۔ ویرا واپس آ چکی تھی۔
”تم وہاں کیوں گئی ہو؟ آن لائن بھی نہیں آتیں، میں فون کرتی رہی تم نے فون پر بات بھی نہیں کی۔“
”مریم نے مجھے چند دن اپنے ساتھ رہنے کے لیے کہا تو میں انکار نہیں کر سکی۔“

”آ جاؤ گھر اہلکسی کی فلم دیکھیں گے۔“
”ٹھیک ہے میں چند دنوں تک آ جاؤں گی۔“
”تم ناراض ہو کہ میں نے تمہیں عالیاں کو پروپوز

”تمہارے دادا نے بات کی تھی مجھ سے کہ وہ کون لڑکا ہے جسے امرجہ پسند کرتی ہے۔ جس کی ماں غیر مسلم ہے اور باپ کا اتنا پتا نہیں۔ ان کا لہجہ اور انداز مجھے اچھا نہیں لگا۔ میرے بیٹے کے لیے کوئی ایسے بھی بات کر سکتا ہے، مجھے دکھ ہوا جان کر۔ میں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا، صرف اتنا کہا کہ وہ تم سے ہی اس سلسلے میں رابطہ کر لیں۔ میں جانتی تھی کہ بات آگے بڑھی تو ساری تکلیف پھر سے عالیاں کو ہی اٹھانی پڑے گی اور میں یہ نہیں چاہتی تھی اور یہ بھی نہیں چاہتی تھی جو اب ہوا ہے۔ امرجہ! عالیاں اپنی ماں کے لیے بہت حساس ہے۔ سب ہی بچے ہوتے ہیں پر جن کی ماؤں کے ساتھ وہ کچھ ہوا ہو جو مارگریٹ کے ساتھ ہوا وہ بچے بہت جذباتی ہو جاتے ہیں۔ تم نے مجھ سے اس کے ماضی کے بارے میں پوچھا اور میں نے صرف اس لیے کچھ نہیں بتایا کہ تم عالیاں کی دوست ہو، کچھ بھی اس کے سامنے کہہ دیتیں یا کوئی اور بے وقوفی کر گزرتی تو دکھ میرے بیٹے کو ہوتا۔ اس کا باپ، ولید مسلمان ہے جس نے مارگریٹ سے شادی کی پھر اسے بتائے بغیر چھوڑ کر چلا گیا۔ دکھ اور تکلیف کو اکیلی سستی مارگریٹ اس کے لیے مر گئی۔ میں نے اس کی وہ حالت دیکھی تھی جب وہ ولید کو ڈھونڈتی پھرتی تھی، بالکل دیوانوں جیسی، ولید نے عالیاں کو اپنا بیٹا ماننے سے بھی انکار کر دیا تھا اور مارگریٹ کے ساتھ اپنی آخری ملاقات میں اس نے مارگریٹ کو بہت برا بھلا کیا تھا۔ اسے بدکردار کہا اس کے مذہب پر سوال اٹھائے۔ ولید اب عالیاں کو بھی اپنے فائدے کے لیے ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے عالیاں سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ ایک خود غرض انسان ہے، میرے پاس مارگریٹ کی ایک ڈائری ہے جس کی آخری سطروں میں لکھا ہے۔

”میں دعا کرتی ہوں کہ عالیاں کبھی اپنے باپ سے نہ ملے۔ نہ۔۔۔ نجانے کیوں، لیکن مجھے خوف ہے وہ مجھ سے بدتر سلوک اس کے ساتھ کرے گا۔“ اس سطر نے

کرنے کے بارے میں نہیں بتایا، میں نے سائی کے علاوہ کسی سے بات نہیں کی تھی۔“
”میں ناراض کیوں ہوں گی ویرا۔ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔“

”پھر بھی۔“ ویرا بہت خوش لگ رہی تھی۔
”تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے میں تمہارے لیے خوش ہوں۔ تم نے ایک اچھے انسان کا انتخاب کیا۔“

”پاپا نے کہا میں عالیان کو لے کر روس آؤں اور تمہیں بھی۔“
”ٹھیک ہے۔“

”میں نے پاپا کو تمہاری باتیں فل پرفارمنس کے ساتھ سنائیں اور وہ ہنس ہنس کر دیوانے ہو گئے۔ انہوں نے کہا یا امرجہ چند سال ہمارے پاس آکر رہے یا ہمیں چند سال پاکستان میں اپنے ساتھ رکھے۔ انہوں نے کہا میرے دل میں حسرت جنم لینے لگی ہے کہ کاش امرجہ میری بیٹی ہوتی۔ معصوم اور فرشتہ سی۔ ہا ہا ہا! دیکھو، انہیں اپنی بیٹی اب بری لگنے لگی ہے۔ امرجہ مجھے شیطان کہہ رہے تھے اور تمہارے لیے ایک پیغام دیا ہے کہ ایک چھوٹا لوہے کا کھنجر خرید لو جہاں کہیں کارل نظر آئے اس کی ناک میں گاڑ دو۔“

ویرا شروع ہوئی تو بولتی ہی رہی اور وہ سنتی رہی۔ اچھا تھا کہ ساری گنگو فون پر ہو رہی تھی ورنہ فل پرفارمنس دینے پر بھی وہ صفر ہی رہتی۔

ایک بات امرجہ نے اپنے دل پر نقش کر لی تھی۔ اب وہ کسی کی بھی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔ اس نے سارے حساب نکال لیے تھے۔ ویرا غلط تھی ہی نہیں۔ نہ ہی عالیان غلط بس وہ تھی۔ اس نے عالیان کو اپنی محبت کے بارے میں بتایا نہ ویرا کو۔ اب اسے ان دونوں سے شکوہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ باب ہمیں بند کر دیا گیا اور آخری سطر میں ”سب ختم“ لکھا گیا۔

وہ یونی ایسے جاتی چبے یونی جا کر بھی یونی میں موجود نہ ہو۔ آنے والے دنوں میں اس کی آواز بھولی بری

داستان کی مانند ہو گئی اور پھر وہ ایسے موجوں ہونے لگی کہ اپنی غیر حاضری کے ثبوت دینے لگی۔
اس نے خود کو گم کر لیا۔ ایسے جیسے وہ قصہ پارینہ ہو۔ اسے دیکھ کر یہ یاد کرنا پڑا کہ ہاں یہ وہی لڑکی ہے۔ وہی لڑکی جو کبھی امرجہ تھی۔ وہ امرجہ رہی بھی اور نہیں بھی۔

سائی اکثر اس کے پاس آ جاتا لیکن اسے زیادہ بولنے پر مائل نہ کیا تا۔ اب سائی بولتا اور امرجہ سنتی۔
ماچسٹریو نیورسٹی میں سب ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کے اندر۔ اس کے باہر سب ٹھیک ٹھیک دن وہ اس کیفے گئی جہاں اسے پہلی جاب ملی تھی۔

”یعنی تم مجھے بھولیں نہیں، اس بار تم پورے دو مہینے بعد آئی ہو ملنے؟“ وہ مسکرا دی۔

”کتنا بدل گئی ہو تم مس اخروٹ۔!“
”کیسے؟“ وہ مسکرا رہی تھی پھر بھی وہ کہہ رہے تھے کہ وہ بدل گئی ہے۔

”جب تم جاب حاصل کرنے آئی تھیں اور تم نے اپنے یونی فیلوز کا استعمال کیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ تم دنیا گواہنے آگے لگانے کی طاقت رکھتی ہو لیکن اب تمہیں دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تم دنیا سے ہی بھاگنے کی تیاری کر رہی ہو۔“

”آپ کے شہر نے مجھے بدل دیا۔“ کافی مک کے کنارے پر انگلی پھیرتے اس نے کہا۔

”اگر یہ میرے شہر نے کیا ہے تو مجھے شکایت ہے ماچسٹریو اور تمہیں مشورہ دوں گا کہ اپنے گھر لوٹ جاؤ اور پہلے جیسی بن کر آؤ۔“

”ایک بار گئی تو ہر چیز سے جاؤں گی نہ پہلے سی نہ بعد سی۔“

انہوں نے غور سے اس کی شکل کو دیکھا ”تمہارا مسئلہ شہر نہیں، تمہارا مسئلہ کوئی اور ہے اسے حل کرو مس اخروٹ۔ دوبارہ آنا تو خود کو پہلے جیسا بنا کر آنا۔“

کافی ختم کر کے وہ بے دلی سے اٹھ آئی۔ وہ سارے شہر میں تسلیاں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ کوئی حکم، کوئی

حکمت کوئی خیر۔ کوئی تو۔ کچھ تو۔

اس نے دائم کو چیک کیا۔

”تم نے میری توقع سے جلدی پیسے اکٹھے کر کے دیے ہیں بلاشبہ تم نے کافی محنت کی تم ایک اچھی اسٹوڈنٹ ثابت ہوئیں۔ تمہارے دونوں سمسٹرز کے رزلٹ بہت اچھے رہے۔ مجھے یقین ہے تم شاہزادہ رزلٹ کی حامل ڈگری لے کر جاؤ گی۔ تم نے مایوس نہیں کیا ہمیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ تم نے بہت کچھ کر دکھایا ہمارا اسکا لرشپ ضائع نہیں ہوا۔“

”شاید۔“ اس نے مسکرائے بنا اتنا ہی کہا۔ اپنی تعریف اسے زہر لگ رہی تھی۔

”تمہیں آگے بھی پڑھنا چاہیے۔ ایم فل کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”ہاں میں اس بارے میں سوچ رہی ہوں۔“ یہ واحد مقصد تھا جو اس نے گھڑ لیا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تم چند سال اور یونیورسٹی میں پڑھو گی تو ال کارا وہ بھی ایم فل کا ہے۔“

”نہیں۔ اگر میں نے ایم فل کیا تو شاید کسی اور ملک سے کروں۔ شاید امریکہ سے۔“

”ماچسٹر سے کیوں نہیں؟“

”کسی اور یونیورسٹی سے کیوں نہیں؟ اس نے مسکرائے کی کوشش کی۔

دائم اسے دیکھ کر رہ گیا۔ وہ اسے کہہ نہ سکا کہ پرانی

امرحہ کو جہاں چھوڑ کر بھول آئی ہو۔ یاد کر کے اسے وہاں سے لے آؤ۔“ اسے یہ ملال بھی ہوا کہ کاش اس نے اسے یہاں نہ بلوایا ہوتا۔

رات آتی۔ دن نکلتا۔ پھر رات آجاتی۔

ایک دوسرے کے دوست و دشمن بنے، دن رات دھلتے نکلتے رہے۔ زندگی اپنے تخت نشین بدلتی رہی۔



وہ واپس آیا تو کارل اسے لچ کے لیے لے گیا۔ اس نے ماچسٹر کے سب سے مہنگے ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا اور سائی اور شاہدیز کو بھی ساتھ لیا۔ یہ اس کی شاہ خرچی

کی انتہا تھی۔ پھر کلب میں اس نے ان سب کو بلج کر دکھایا۔ ہنس ہنس کر سب کا برا حال ہو گیا وہ ہر مشہور ڈانسر کی نقل اتار رہا تھا۔ وہ ہاتھ سے ڈی جے کو اشارہ کرتا اور ڈی جے اس کا اشارہ فوراً سمجھ کر مطلوبہ میوزک لگا دیتا۔ اس رات اس نے ہر بڑے ڈانسر کو خراجِ نقل پیش کیا۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی وہاں موجود ہوتا تو ضرور کارل کو قتل کر کے قاتل بننا پسند کرتا۔

عالیان نے ایسے قمقمے لگائے جیسے اس سے زیادہ بے فکر انسان بھری دنیا میں اور کوئی نہیں پھر وہ چاروں فلور پر کود پڑے اور کلب انتظامیہ نے جانا کہ انہیں یقیناً ”اگلے دن ڈانس فلور کی مرمت کروانی پڑے گی۔“

پھر کارل انہیں سلویا کی شیورلیٹ میں جو وہ اس سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا مانچسٹر کی سڑکوں پر ایسے گھماتا رہا کہ ان کی پہچان ایسے ہو گئی کہ ایک روڈ سائیڈ پر بنے ریسٹورنٹ کے ملازم نے بیٹھے کے پار سڑک پر جھانک کر سوچا کہ ابھی ایک شیورلیٹ کار یہاں سے گزرے گی جس میں بیٹھے یونیورسٹی کے چار مسٹڈے چیخے چلاتے ہوئے گزریں گے۔ کارل نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ کار کو بھی جہاز بنا کر اڑا سکتا ہے اور عالیان نے یہ ثابت کیا کہ ڈرائیونگ کرتے کرتے بھی وہ پائلٹ کے عہدے پر فائز ہو سکتا ہے۔

بس اخبارات اور ٹی وی میں خبر نہیں آئی باقی سب جان گئے ”شیورلیٹ اور وہ چار۔“

شور و دل پر حاوی نہیں ہوتا پھر بھی وہ شور کا حصہ بن گیا۔ میلے تنہائی نہیں مٹاتے پھر بھی وہ میلے سجا کر بیٹھ گیا۔ عالیان۔ وہ ادھر ادھر یہاں وہاں ہو گیا۔ اس نے اپنا کمرہ سجا یا اور اپنی بچت سے پرانا سامان نکال کر نیا سامان خرید لایا۔ ہل کے ایک ایک اسٹوڈنٹ نے اس کا کمرہ دیکھ کر ”واؤ“ کہا۔ بیڈ کے سامنے کی دیوار پر اس نے شیطان کا پوسٹر لگایا جو پہلے نہیں لگایا تھا۔ کارل کا۔

نئے فرشتے سرائی کو اس نے دوسری دیوار پر جگہ دی اور بیڈ کی سائیڈ پر ماما مرکا ایک نیا اسکیچ فریم کروا کر رکھا

مار لریٹ۔ کے لیے وہ کوئی جگہ نہ ڈھونڈ سکا کہ وہ اسے کس جھے میں رکھے کہ اسے دیکھنے سے اسے خوشی ہو کرے۔

وہ خود کو بدل رہا تھا۔ یہ اس کا ماننا تھا۔ ابتدا اس نے چیزوں سے کی اور وہ سب ایسے کرتا رہا جیسے کسی کو یہ سب دکھا رہا ہو۔ کس کو؟ اس نے یہ بیٹھ کر طے نہ کیا اور عالیاں ”ہارٹ بریکر“ کے نام سے فریشرز میں مقبول ہو گیا۔ اس نے نئی آنے والی لڑکیوں کا جیسے دل ہی توڑ دیا، کیونکہ وہ اور دیرا جگہ جگہ ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے۔ چہل قدمی کرتے ہوئے، ساتھ ساتھ سائیکل چلاتے ہوتے، لان میں بیٹھے باتیں کرتے ہوئے لائبریری میں ساتھ بیٹھ کر پڑھتے ہوئے اور کبھی کبھی دیرا اس کے کندھے پر سر رکھ دیتی تو کوئی نہ کوئی تصویر کھینچ کر سب کو ٹیک کر دیتا اور پھر خوب گوسپ ہوتا۔ کبھی کوئی ایسی تصویر The Tab Manchester کا حصہ بھی بن جاتی، ایسے ہی کیمپس نیوز کے عنوان سے۔

اور ایک اور جوانی فریشرز میں بہت مقبول ہونے لگی ”عالیاں اور کارل کی“ سنتے کی رات یا اتوار کے دن وہ کسی ایک یا زیادہ فریشر کو بھگتا لیتے۔ سائیکلنگ اور سونمنگ میں جیت جیت کر انہوں نے اتنے پیسے کما لیے کہ کرسمس کی چھٹیوں میں آرام سے کسی بھی ملک میں دس دنوں تک دور وقت کا اچھا کھانا کھا سکتے تھے۔ کسی بھی مقابلے کے دوران عالیاں کا رویہ اتنا تند خو ہو جاتا جیسے جیتنا اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا ہو۔ وہ معمولی ہیزوں اور اشاروں کو اہمیت دینے لگا۔ ہال میں کبھی کبھار کے ہونے والے خود ساختہ ٹھیٹر میں وہ ہنسا ہنسا کر سب کو لوٹ پوٹ کر دیتا۔ وہ کئی کام ایک ساتھ کرنے لگا تھا۔ جیسے اس کے پاس وقت کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ موجود ہو اور اپنی توانائیوں کو وہ کہیں بھی لگا دیتا چاہتا ہو۔ براہائی کے علاوہ بھی اسے بہت کچھ سوچنے لگا تھا۔ وہ بولتا تو خود کو روکنا نہ چاہتا۔ خاموش ہوتا تو کبھی بول پڑنے پر مائل نہ دکھتا، ہنستا تو اس کے قمقمے کانوں کو پریشان کرتے کہیں کھڑا ہوتا تو

اپنے گرد و جمع اکٹھا کر لیتا اور اس کے چلنے پھرنے کا انداز ایسا ہو گیا کہ شاید وہ غصے میں آیا جاتا ہے۔ اس میں تکبر نہ جھلکا، لیکن وہ شان بے نیازی کا قائل نظر آنے لگا۔ اس پر نظر اٹھتی، ٹھہرتی اور یہ سوچ پیدا کرتی ”کیا یہ عالیاں ہے یا نہیں۔ تو پھر عالیاں کہاں ہے؟“

کئی فریشرز کو اس نے کوڑے، دان میں بند کیا اور کتوں کو اسٹور میں لاک کیا کہ گمان گزرنے لگا کہ وہ سنگدل ہو گیا ہے۔ جب وہ چپ، ہوتا تو یہ گمان بھی گزرتا کہ کسی کے بارے میں وہ بے حسی سے سوچ رہا ہے۔ کسی سے لڑ رہا ہے۔ دلائل دے رہا ہے۔ ثبوت مانگ رہا ہے، وہ جنگ کی حالت میں لگتا۔ دودو لڑتا ہوا بھی۔ ڈھیر صورت شکست خوردہ بھی۔ وہ اختتامیہ بھی لگتا اور شروعات بھی۔

کتنی ہی علامتیں اس میں سراٹھا کر کھڑی ہو گئیں جس میں سب سے نمایاں ”میں تکلیف میں ہوں“ تھی کتنے ہی اشارے اس کی سمت، ابھر کر معدوم ہو جاتے جس میں سب سے نمایاں ”مجھ سے دور رہا جائے“ ہوتے۔

وہ ایک ایسے میدان کی صورت اختیار کر گیا جس میں جا بجا قبریں کھودی جا رہی ہوں، کہیں کسی گلستان کی آبیاری کی تیاری نہ کی جا رہی ہو، نہ اس کی اجازت لی اور دی گئی ہو۔ ایک دور افتادہ عمارت کی چھت سے رہے سے کودنے کا ٹاسک اس نے ایسے جیت لیا کہ کوئی اسے ہرانے کے بارے میں سوچ نہ سکا۔

ہاں ایسے وقتوں میں وہ بے رحم لگنے لگتا جیسے وہ ایسا گوریلا کمانڈو ہو جو بغاوت کا ارادہ باندھ چکا ہو۔ اس کی سائیکل سڑک پر ایسے دوڑنے لگی جیسے وہ کوئی میزائل ہو جسے ہدف کی طرف داغ دیا گیا ہو۔

اور نچائی سے پانی میں الٹی چھلانگیں لگاتے اس نے اپنے ساتھ بے وردی کا رویہ اپنا لیا کہ کارل نے اسے روک کر پوچھا۔

”تمہارا داغ کام کر رہا ہے نا۔ بس کرو۔“ وہ ہنس کر کارل کو پرے کرتا اور پھر سے شروع ہو جاتا۔ سب دوست بس اسے دیکھتے ہی جاتے۔ سائی

نیچے گرا ہوا ہی تھا۔
کارل نے اس کے جڑے پر پوری قوت سے ٹھونسا
مارا کہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا وہ ہٹا کر رسی پر
چڑھ گیا اور حفاظتی بیلٹ کھول دی۔
”اب دیکھو مجھے۔ اور یہ جانو کہ کیسے جان نکلتی
ہے۔“

عالیان نے اپنے لب بھینچ لیے اور اسے افسوس
ہوا۔ کارل بے دردی سے رسی پر چل رہا تھا جیسے اسے
بھی اپنی جان کی پروا نہیں۔ لیکن عالیان کو اس کی
پرواہ تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ پہاڑ اس کے پیروں
تیلے سے کھسک رہا تھا۔

فریشرز کھڑے ان دونوں کی شکلیں دیکھ رہے تھے
۔ سالی پھر سے زہر لب وعائیں پڑھنے لگا تھا اور عالیان
کارل سے اپنی نظریں نہیں ہٹا رہا تھا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے، جان اس وقت نہیں نکلتی جب
اپنی جان نکلتی ہے۔ جان اس وقت نکلتی ہے جب
اپنے کسی جان سے، پیارے کی جان نکلتی ہے۔ اور اس
نے یہ جانا کہ ہم اپنے پیاروں کی جانوں کے حق دار ہیں
اپنی نہیں۔“ اس نے بے بسی سے سر اٹھا کر آسمان کی
طرف دیکھا کہ اتنا کچھ جان لینے پر بھی وہ جان لینے
والوں جیسا کیوں نہیں ہو رہا۔

اور یہ کہ زندگی کے سب ہی اجالے ”شب گزیدہ“
کیسے ہو گئے اور ارٹاکاز کے سانٹوں نے ”عائشہ نیازی“
کے کرب آمیز چنے کس دھاگے سے بن لیے۔
”سراب مسلسل“ ”داستان حیات“ میں کس رخ سے
داخل ہو کر پناہ گزین ہوا اور قطرہ شبنم ”بہ نوک خاری
رقصم“ ہونے پر راضی کیسے ہو گئے۔



عالیان اور ویرا کی جو تصویریں ادھر ادھر گھومتی
تھیں وہ امرتہ کی نظروں سے بھی گزر رہی جاتی تھیں۔
شہزادہ خاص اسے وہ تصویریں موبائل پر بھیجتی تھی۔
وہ ان تصویروں کو دکھ سے دیکھتی نہ غصے اور حسد سے۔
وہ عالیان اور ویرا کی تصویریں ہوتیں اور وہ دونوں ہی

زہر لب وعائیں دہراتا اور یہ دعائیں تب بھی دہرائی
گئیں جب وہ دو اونچی پہاڑیوں پر تنی رسی پر چل رہا
تھا۔

کارل پہلے ہی اس بار جا چکا تھا۔ انہیں سب سے کم
وقت اسکو کرنا تھا۔ اور جب وہ رسی پر چڑھا تو اس نے
حفاظتی بیلٹ کھول دی۔ اور اونچائی سے نیچے چھانکا۔
کارل کے دماغ میں چھناکا ہوا اگر اس کے دو پر ہوتے تو
وہ اڑ کر اسے منہ میں دبوچ کر اس طرف لے آتا۔

وہ رسی پر چل رہا تھا اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔
وہ بہت بلندی پر تھے اس کی مدد کے امکان صفر
تھے۔ ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان
سے اپنا سانس بحال رکھنا مشکل ہو گیا۔

”یہ یا گل کیا کرنے جا رہا ہے؟“ کارل کا اس نہیں
چل رہا تھا کہ کیا کر گزرے۔

”میرا خیال تھا یہ ٹھیک ہو گیا ہے؟“ سالی بڑبڑایا۔
وہاں آٹھ لڑکوں کا گروپ موجود تھا، تین فریشرز اور
باقی وہ سینئرز، فریشرز نے اسے ایک چیلنج جانا کہ وہ انہیں
کہہ رہا ہے کہ ایسے کر کے دکھاؤ تو تمہیں جانیں اور
ان کو کوئی ارادہ نہیں تھا اس کے چیلنج پر بھڑکنے کا۔ وہ
کھیلنے آئے تھے، جان پر کھیلنے نہیں اور وہ جان پر کھیلنے
ہی آیا تھا۔ سب سے معمولی چیز ”عالیان“ کو وہ کہیں
بھی اٹھا کر پھینک دینا چاہتا تھا۔

کارل اور سالی کو اس کی ذہنی حالت کے بارے میں
ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو گیا۔ وہ انہیں دھوکا دیتا رہا تھا اور
اس کے دھوکے میں آ گئے تھے۔ وہ اتنی اونچائی پر
اکیلا کھڑا تھا اسے نیچے جا گرنے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔
اس نے سب سے کم وقت اسکو کر لیا تھا۔ کارل
نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

”اگر تم مرنا چاہتے ہو تو مجھے بتاؤ“ میں تمہیں گولی
مارنے کا حوصلہ پیدا کر لوں گا۔ اس کے لیے تمہیں یہ
سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اسے غصے کی
ایادہ کی وجہ سے ہنسنے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے مار دو گولی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا
اور ہانک کر نیچے دیکھا اتنا اونچا آ کر بھی وہ کہیں بہت

اسے پیارے تھے۔ ہاں کبھی کبھی ان تصویروں کو دیکھتے اسے سانس لینے میں مسئلہ ہوتا اور ایک بار اس نے محسوس کیا کہ جسے ہم سارے کا سارا اپنا سمجھتے ہیں وہ سارے کا سار کسی اور کا ہو جائے تو ایسا لگتا ہے کوئی ہمارے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا رہا ہے اور ہمیں دکھا بھی رہا ہے کہ دیکھو کیسا لگتا ہے۔

اس نے عالیان کے پاس جانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ نہ اپنی غلطی کی معافی مانگنے کی وہ اسے اپنی صورت ہی نہیں دکھانا چاہتی تھی کہ اسے پھر سے تکلیف ہو۔ اس نے ایک خط لکھ کر سائی کو دے دیا تھا کہ وہ اس کے پاکستان جانے کے بعد عالیان کو دے دے۔ خط میں اس نے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی تھی اور کچھ نہیں۔

ان ہی خزاں رسیدہ دنوں میں اس کا سامنا پال سے ہوا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ خاص اس سے ملنے آیا ہو۔ اس سے پہلے بھی اس کا اس سے سامنا ہوتا رہا تھا لیکن وہ راستہ بدلتی لیتی تھی۔

”میں اب تم سے معذرت کرنے کے قابل ہو سکا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر دوستانہ انداز میں کہا۔ اس کے پہلے ہی جسے پر امرہ حیران رہ گئی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”مجھے حقیقتاً اب افسوس ہوا ہے کہ میرا رد عمل کس قدر غلط تھا۔ میں نے تمہیں نقصان پہنچانا چاہا بدلے میں تم نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ تم نے یہ ثابت کر دیا کہ تم ہر حال مجھ سے بہتر انسان ہو۔ امرہ! مجھے یہ جلد ہی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ پیغامات تم مجھے پوسٹ کرتی رہی ہو۔“

امرحہ ذرا سا دوپٹکی۔ اس واقعے کے بعد امرہ اسے پیغامات پوسٹ کرتی رہی تھی۔ وہ ہفتے میں دو بار ایسا کرتی وہ باقاعدگی سے لیٹر اسے ٹائپ کر کے بھیجتی رہی۔

”شروع کے پیغامات چھوڑ کر میں نے بعد میں آنے والوں کو ذرا توجہ سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر میں نے ان پر سوچنا شروع کر دیا اور پھر میں ان سے

متاثر ہونے لگا۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہوتی تھی کہ عام سمجھ بوجھ والے انسان کو اچھی نہ لگے۔ چند ماہ پہلے میں نے مذاہب پر کچھ کتابیں لے کر پڑھیں اور مجھے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک کتاب میں وہ لکھا تھا جو تم مجھے لکھ لکھ کر پوسٹ کرتی رہی تھی۔“

”میں تمہیں قرآن کی آیتیں لکھ کر بھیجتی رہی تھی۔“

”معلوم ہو گیا ہے مجھے تم نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ کیا تم مجھے برا انسان سمجھنا چھوڑ سکتی ہو امرہ۔“

امرحہ مسکرا دی اور کہا۔ ”پال! تم نے لاعلمی کے باعث میرے مذہب کے بارے میں جو کہا تو میں نے تمہیں معاف کر دیا مگر میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے تو میں یا کوئی بھی مسلمان اسے برداشت نہ کرتا۔“

کچھ دیر اور باتیں کر کے جب پال چلا گیا تو امرہ کو لگا جیسے وہ کسی امتحان میں پاس ہوئی ہے۔ چلو اس کے ہاتھ کوئی تو کامیابی آئی۔ اس واقعے نے اس کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ عقل اور سونہ بوجھ سے کیے گئے عمل بے کار نہیں جاتے، عقل کرشمہ ساز ہے اور یہ معجزوں کی رتھ کی سوار ہے۔

”سائیکل پر جایا کرو تا“ اپنی تم تو سائیکل کو بھول ہی گئیں۔“ سادھنارات کو اس کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔

”دل نہیں چاہتا سائیکل چلانے کو۔“ وہ پڑھ رہی تھی۔

”تمہارا تو اب زبان ہلانے کو ہی دل نہیں چاہتا۔“ سادھنات نے اسے ہنساتا چاہا۔

”میری زبان نے بہت کمالات دکھائے ہیں یا اس لیے؟“ اس نے ہنس کر کہا لیکن بات مذاق نہیں تھی۔

”اگر انسان سے غلطی نہ ہو تو وہ انسان نہ ہو۔“

”اگر غلطیاں ہی ہوتی رہیں تو اُھی وہ انسان نہ ہو۔“ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

اس کے انداز پر سادھنات خاموش ہو گئی اور کچھ دیر

ٹھہر کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے دن یونیورسٹی سے وہ ہسپتال آگئی کارل کا معمولی سا ایکسٹرنٹ ہوا تھا ایک امیر زادے کی کار کے ساتھ اور کارل نے سڑک پر چلا چلا کر ایسے ہنگامہ کیا جیسے اس کی ساری ہڈیاں چور چور ہو چکی ہوں۔ وہ خود کو اس امیر زادے کے خرچ پر پرائیویٹ ہسپتال تک لے آیا تھا اور مزے کر رہا تھا ویسے اسے چلنے میں تھوڑا بہت مسئلہ تھا۔

امرحہ دو دن بعد اس کے پاس جانے کا فیصلہ کر سکی اور کاؤنٹر پر اس کے پارے میں پوچھا تو کاؤنٹر پر موجود دو لڑکیوں نے اسے ذرا گھور کر دیکھا اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”تم درست ہو اس کی۔“ ایک نے منہ بنا کر پوچھا۔

امرحہ نے سر ہلادیا۔

”ٹھیک ہے۔ ویسے زیادہ دیر تک ہسپتال میں رہنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ کتنا اچھا ہو اگر وہ تم سب کے ساتھ یونیورسٹی نوائس کر لے۔ دو دن بہت زیادہ دن ہوتے ہیں ہسپتال میں قیام کے لیے۔“ جس نے منہ بنایا تھا اس نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ امرحہ اس کی بات سمجھ نہ سکی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے دوست سے کہو کہ وہ جلد ہی ہسپتال سے ڈسچارج ہو جائے۔ یہ اس کی صحت کے لیے اچھا ہو گا۔“ دوسری نے ذرا مسکرا کر کہا۔ ”اور دوسروں کی صحت کے لیے بھی۔“ پہلی کا منہ پھرتا ہوا بن گیا۔

امرحہ کارل کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور اپنی پشت پر پائوں کی آواز سنی۔

”پتا نہیں ڈاکٹرز کب ڈسچارج کریں گے اسے؟“ ”جب ہسپتال اسٹاف ہسپتال کے رومز میں شفٹ ہو جائے گا تب۔“ دوسری فوراً بولی۔

امرحہ اس کے کمرے میں آئی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کا خیال تھا عالیاں اپنی جاب پر ہو گا پر وہ سامنے ہی بیڈ کے ایک طرف بنی گھڑکی کی چوکھٹ

میں بیٹھانٹ پڑ چکھ بنا رہا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر سب نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ عالیاں نے بھی۔ وقت جن پروں پر اڑ کر آیا تھا وہ پر اس نے وہیں جلا دیے۔

وہ وہیں کھڑی رہ گئی اور فیصلہ نہ کر سکی کہ اندر جائے یا باہر نکل آئے۔

”آہ۔۔۔ امرحہ۔۔۔ آجاؤ۔۔۔ پہلے یہ بتاؤ خالی ہاتھ تو نہیں آئی ہوتا؟“ کارل بیڈ سے اچھل کر کھڑا ہوا اور لپک کر اس کے قریب آیا۔

سائی اور شاہو بیز مل کر دو وار پر ایک پوسٹر لگا رہے تھے جس پر لکھا تھا ”جلدی ٹھیک ہو جاؤ کارل۔ اور وہ جلدی کبھی نہ آئے۔“ پوسٹر پر لاتعداد دستخط موجود تھے جو یقیناً ”ہل مہشس اور یونی فیلوز نے کیے تھے۔“

شاہو بیز اور سائی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور خیر مقدمی انداز سے مسکرا رہے تھے۔

”لاؤ اب یہ چاکلیٹس مجھے دے دو۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس سے چاکلیٹ کا ڈبا تقریباً ”چھین ہی لیا اور انہیں بیڈ کی سائیڈ پر رکھے ایک باکس میں ڈال کر اسے لاک کر دیا اور چھوٹی سی چابی منہ میں دبالی۔ امرحہ کے تاثرات سے وہ سمجھ گیا کہ وہ اسے بیمار نہیں سمجھ رہی اور وہ اپنی لائی چاکلیٹس واپس ہی نہ مانگ لے۔ اس نے کراہنا شروع کر دیا اور اپنی زخمی کنہی اور پیر آگے کر کے دکھایا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں میں بیمار ہوں یہ دیکھو۔“

عالیاں نے ایسے ظاہر کیا جیسے کمرے میں کوئی آیا ہی نہیں اور وہ پنسل کے ساتھ نوٹ پیڈ پر مصروف رہا۔ ”میں دو دن تکلیف سے تڑپتا رہا اور تم اب آرہی ہو امرحہ؟“ کارل نے نوانت نکال کر کہا۔

”امرحہ! جاتے جاتے، ہسپتال اسٹاف کی خبر گیری بھی کرتی جانا ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ دو دن تکلیف سے تڑپتے رہے۔“ شاہو بیز نے کہا۔

”تم کب تک رہو گے یہاں؟“ امرحہ نے پوچھا۔

”جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتا۔“

”لیکن تم مجھے ٹھیک ہی لگ رہے ہو۔“
”نہیں میں ٹھیک نہیں ہوں نا!“ اس نے آنکھ مار کر کہا۔

تھوڑی دیر بیٹھ کر امرجہ اٹھ آئی۔ سائی امرجہ کے ساتھ باہر تک آیا اور اسے ہمدردی سے دیکھنے لگا جو کمرے سے باہر تک عجیب حالت میں چلتی آئی تھی۔ ”تم بیٹھی ہی نہیں آ جاؤ واپس چلتے ہیں۔ کارل اتنے مزے مزے کے لطیفے سنا رہا ہے نرسز کے بارے میں۔ اور نہیں پتا ہے ہسپتال کے رومز سے بھی کھانے پینے کی چیزیں غائب ہونا شروع ہو گئی ہیں اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ نرسز بھی ایسے چلا سکتی ہیں۔ میرے سامنے ایک نے چلا چلا کر ہسپتال سربراہ اٹھالیا۔ اس کی کلائی پر جو کیراچکا تھا وہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بے چاری اسے ایک انجکشن لگانے آئی تھی رات کو۔ کون تھا جو اپنے اپنے روم سے نکل کر اس نرس کو نہیں دیکھ رہا تھا۔“

سائی نے اسے ہنسانے کے لیے یہ سب کہا تھا اور اس کا دل رکھنے کو وہ ہنس دی اور چلی آئی۔ اور اندر عالیان کارل کا لنگرا اسکینچ بنا چکا تھا اور اس کے زخمی ہاتھ میں ایک عدد چاکلیٹ کا ڈبا بھی تھما دیا تھا۔ اور کارل کی آنکھیں۔ کوئی دیکھتا تو عالیان سے پوچھتا۔ یہ کون سا کارل ہے جس کی آنکھیں اتنی سیاہ ہیں۔ اتنی سیاہ کہ ان میں جھانک کر مشرق کی ساری رمزیں بوجھی جاسکتی ہیں۔ سارے قصے کہانیاں پڑھی جاسکتی ہیں اور جو اتنی محفوظ ہیں کہ ان میں اتر کر سارے دروازے بند کر کے قید ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسی پناہ گاہیں جو امن کو میسر نہیں ان کے مالک ہونے کا اعتراف صرف ایک انسان ہی پاسکتا ہے۔

ایسا انسان جس کے ساتھ لفظ ”محبت“ جڑا ہو۔ عالیان کی پٹیل آنکھوں کی پٹلیوں کو اور سیاہ کر رہی تھی اور وہ بہہ ہانتا نہیں تھا کہ وہ یہ کر کیا رہا ہے۔



فریشر میں سے ایک لڑکی ایما کے ساتھ کارل کی

دوستی اتنی بڑھ گئی کہ لڑکی کو کارل کو پروپوز کرنا پڑا اور کارل نے یہ اعزاز آخر حاصل کر ہی لیا کہ کوئی اسے بھی پروپوز کر سکتا ہے۔ لڑکی کا تعلق لندن سے تھا اور وہ کسی ہال میں رہنے کے بجائے ایک بہت بڑے گھر میں رہ رہی تھی۔ یعنی وہ اتنی امیر تھی۔

یونی فیلوز کو کارل کی قسمت پر رشک آیا اور لڑکی کی قسمت پر افسوس ہوا، پھر انھی یونی فیلوز کو لڑکی کی قسمت پر رشک آیا اور کارل کی قسمت پر افسوس بھی نہ ہوا۔

کارل نے کوشش کی تھی کہ وہ ایک عام انسان بن کر رہے، لیکن صرف ایک دانہ وہ عام انسان بنے رہنے سے چوک گیا۔ ایمان کی برائے ڈے پارٹی پر جس میں لندن سے آیا اس کا خاندان بھی شریک تھا۔ اس نے کچھ ایسے پرائٹ (مذاق) کر ڈالے کہ سب دنگ رہ گئے کہ پرائٹ اور دہشت گردی میں کوئی تمیز نہیں کیا۔؟ ان میں سب سے معمولی اور بے ضرر پرائٹ صرف اتنا سا تھا کہ اس نے سرخ کارپٹ پر نظر نہ آنے والی ڈوری کی بارودی سرنگ بچھا دی جس سے پیر نہیں الجھتے۔ پھر اس نے ڈوری کے سرے کو آگ دکھا دی۔ اور وہ ڈوری کسی چھلاوے کی طرح سانپ بنی، پھلجھڑی کی طرح کارپٹ پر رقص کرنے لگی۔ مہمانوں کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ بھاگ کر کہاں جائیں ہر طرف اس پھلجھڑی کا جال بچھا بھڑک جاتا۔ یہ سب سے معمولی اور بے ضرر پرائٹ تھا۔ باقی کے معمولی اور غیر اہم پرائٹ۔ بقول مہمان ”خدا کی پناہ۔“

بس اتنی سی بات تھی اور ایمان نے اس کے منہ پر انگوٹھی دے ماری کہ وہ ایک دیوانہ انسان ہے۔ انگوٹھی سائی نے بیچ کی اور الفاظ عالیان نے یاد کر کے باقی کے ہال میٹس کو سنائے۔ شاہ ویز نے نیلا گاؤں پہن کر ایما بن کر۔ سانچے کی ہو ہو نقل اتار کر دکھائی اور ہال میں ”ایما برتھ ڈے، پارٹی“ کے عنوان سے ڈرامہ ٹھیٹر کیا گیا۔ جس نے ٹھیٹر ڈراموں کی تاریخ کو بدل ڈالا اور سب کامیڈی ڈراموں کا ”باپ ڈراما“ ہونے کا خطاب حاصل کیا۔

ایمان تو پاؤں تھی کارل تو صرف اس کی برتھ ڈے پارٹی کو یاد گار بنانا چاہ رہا تھا۔
”یاد گاہ۔“

ویرا کے لیے وہ یاد گار لمحہ تھا۔ ان سب کے مشترکہ دوستوں کی برتھ ڈے پارٹی تھی جس میں ان دونوں نے گانا گایا تھا۔ اس نے عالیان کو روسی گیت کی مشق کروائی تھی اور وہاں موجود سب لوگوں کا ماننا تھا کہ اس سے بہترین گانا انہوں نے پہلے نہیں سنا، پھر ویرا جب اکیلی گٹار پر گانا گانے لگی تو دور کوٹنے میں کھڑے ہو کر عالیان اسے دیکھنے لگا۔ اس کا عکس پانی کی طرح جھلمل کر رہا تھا۔ بن اور مٹ رہا تھا، ٹھہر نہیں رہا تھا۔
”ویرا ایک اچھی لڑکی ہے۔“ اس نے خود سے کہا،
خود کو یاد دلایا۔

اس کی صورت بن اور بگڑ رہی تھی جو اچھی بات نہیں تھی۔ اسے تو نقش ہو جانا چاہیے تھا۔
اس نے ویرا کے پیاسے کئی بار بات کی تھی۔ وہ اس سے اس کی دلچسپیوں کے بارے میں پوچھتے اور اس سے بات کر کے بہت خوش ہوتے۔

ماما مہر ہفتے میں دو بار اس سے مل کر جاتیں۔ اور وہ کسی ریستورنٹ یا ہوٹل میں ڈنر کر لیتے۔ فلم دیکھنے چلے جاتے، پہلے ماما مہر نے اسے چھپا کر رکھا ہوا سا تھا کہ ولید کے آدمی اس تک نہ پہنچ جائیں اب اس احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ ولید کے آدمی اب بھی اس کے پاس اسے مختلف بہانوں سے منانے آئے تھے اور وہ ان سے بہت اچھی طرح سے نبھتا تھا۔

اور ایک بار وہ سیکرٹ روم بھی گیا۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ اس نے ایسے ہی دیواروں کو دیکھا اس کی نظروں نے کچھ ڈھونڈنا چاہا۔ امرجہ کی لکھائی پر اس کی نظریں ٹھہر گئیں اور اس نے نظریں پھیر بھی لیں۔ تو ہر وہ وہاں کیوں آیا تھا؟ اس نے کانڈ پر چند سطریں لکھیں۔

”ویرا ایک اچھی لڑکی ہے۔ بہت اچھی لڑکی۔“ وہ کانڈ کو گھورتا رہا، ”کیا اسے یہ لکھنا تھا۔ ہاں۔ پر کیوں۔؟“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے دل کی وسعت کہاں کھو گئی ہے۔ میں ظالم ہوں یا مظلوم۔ میں اچھا کر رہا ہوں یا میرے ساتھ برا ہو رہا ہے۔“
دوسرے کانڈ پر لکھ کر اس نے دیوار کے ساتھ چپکا دیا اور ماچسٹر کی حدود سے دور نکل گیا۔

شام نے اپنا پیرا بن رات کے حوالے کیا۔ رات تین بجے کے قریب، وہ ایک دم سے اٹھی اور بستر ایسے چھوڑا جیسے قیامت آگئی ہو۔ کوٹ اور جوتے اس نے کسے پٹنے اسے معلوم نہیں ہوا اور وہ کمرے سے باہر بھاگی اور بیرونی دروازے کو پار کیا جو ان لاک تھا۔ اور تیزی سے شیڈ کی طرف بڑھی اور اپنی سائیکل نکالی۔ ابھی وہ اس پر بیٹھ کر اسے اڑانی کہ سادھنا کی آواز اس کے پیچھے سے آئی۔

”امرحہ۔ کہاں جا رہی ہو؟“

وہ پسینہ پسینہ ہو چکی تھی اور سانس قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس نے سادھنا کی طرف دیکھا۔ پھر خود کو اور سائیکل کو۔۔۔ ”Analm ہال میں آگ لگی ہے۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے کسی سیلاب کی طرح نکل رہے تھے۔

”تمہیں کس نے بتایا؟“ سادھنا اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

”مجھے۔؟“ اب وہ چونکی اور یاد کرنے لگی۔

”ہاں۔ کس نے بتایا۔ سائی نے یا کارل نے؟“
وہ خاموش سادھنا کو دیکھتی رہی پھر سائیکل کو واپس رکھا اپنے گال رگڑے اور گھر کے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ اس نے خواب دیکھا تھا یا کچھ اور تھا اس نے ہال میں آگ لگی دیکھی تھی۔ سادھنا کے سامنے وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”بتاؤ امرحہ تمہیں کس نے بتایا؟“ سادھنا نے اس کا شانہ ہلایا۔

”کسی نے نہیں۔ میرا وہم تھا شاید۔“

سادھنا بہت دیر تک اسے دیکھتی رہی ”امرحہ! ہال میں واقعی آگ لگی تھی ابھی دس منٹ پہلے ویرا مجھے

کا ایک مذاق سمجھا پھر اس کی سنجیدگی اور مکمل فن دیکھ کر انہوں نے مذاق کا پہلو ترک کر دیا۔

ڈانس فلور پر باقی سب رک کر پیچھے ہو گئے اور وہ اکیلی ویسے ہی محور قص رہی جیسے اس کا محبوب اس کے ساتھ محور قص ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر مکمل معصومیت عڑی۔ کے انداز میں ایسی بے خودی تھی کہ گمان ہوتا تھا کہ وہ کسی نہ نظر میں آنے والے وجود کے ساتھ موجود ہے۔ سب اسے بہت فرصت سے دیکھ رہے تھے اور کوئی یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ رقص روک دے۔ ایسے رقص قسمت سے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سب نے اپنی حرکات کو جلد کر لیا کہ مبادا کوئی آواز ہو اور وہ چونک جائے۔

کچھ دیر گزری، اس نے آنکھیں کھولیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کرتی رہی ہے بلکہ وہ شرمندہ نہیں ہوئی بلکہ وہ مسکرائی جیسے ”ملاقات محبوب“ تمام ہوئی۔ بخوشی اور وہ ڈانس فلور سے ہٹ گئی۔

وہاں موجود ایک شخص اس کی کیفیت کو سمجھنے کا دعوٰی کر سکتا تھا۔ وہ شخص عالیان تھا۔ کچھ دن پہلے وہ کیفے کے اسٹور میں آیا تھا اور اسٹور میں آکر باہر جانا بھول گیا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھ گیا اور کتنا ہی وقت گزار دیا وہ تب چونکا جب اس کا فون بجایا۔ ویرانے اسے کچھ نوٹس کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون کیا تھا۔

ویرا کی آواز اسے واپس لے آئی اور وہ اس سے خائف نہیں ہوا۔ ویرا سے زیادہ سمجھ دار لڑکی اس نے اب تک نہیں دیکھی تھی۔ اس کا دل بہت بڑا تھا۔ وہ جلد برا نہیں مانتی تھی۔ اس کی باتیں سننے میں مزا آتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ دل دکھانے والوں میں سے ہرگز نہیں تھی اس نے ایک بار اسے بادام کیک بنا کر کھلایا تھا اور وہ بے چاری خاموشی سے کھا گئی تھی۔ بچے ہوئے آخری ٹکڑے کو کھانے پر عالیان کو معلوم ہوا کہ اس نے اس سے بد مزہ کیک ساری زندگی نہیں بنایا ہوگا۔

اور امرحہ نے بادام کیک بنانا سیکھ لیا تھا۔ اس نے وہ کیک سادھنا کے لیے بنایا تھا اس کی سالگرہ کے لیے۔

بتا کر اس طرف لٹی ہے۔ سب ٹھیک ہیں وہاں۔“

”تو دیر جا چکی ہے۔“ وہ واپس اپنے کمرے میں پلٹ آئی اور ان دعاؤں کو دہرانے لگی جو تا عمر اسے عالیان کے لیے دہراتے رہنی تھیں۔ پھر اس نے سائی کو فون کیا اور احوال پوچھا وہاں سب ٹھیک تھا، حادثاتی آگ بھی جس پر قابو پا لیا گیا تھا۔ امرحہ نے فون بند کر دیا تو سائی عالیان کے پاس آیا۔

”کسی نے امرحہ کو آگ کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن اسے معلوم ہو گیا۔ اگر فون پر تم اس کی آواز سن لیتے تو کانپ جاتے، عالیان! تم اسے خود سے الگ ہی رکھو لیکن اسے ناپسند نہ کرو۔ اسے ایک ایسے شخص کا مشورہ مان کر اس پر عمل کرلو، جس نے اب تک کی عمر میں سب سے صرف بے لوث محبت کرنا ہی سیکھا اور سکھایا ہے۔“ سائی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

عالیان کی آنکھوں کی پتلیاں جھللا گئیں اور وہ سائی کے پاس سے اٹھ آیا۔ غصہ اٹھا، دکھ، پچھتاوا، بے رحمی، وہ ان سب کا ملغوبہ بن گیا تھا۔ وہ آج جو بن گیا اس نے ایسا بننے کے بارے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اب تک جو اس کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ ہو گا۔ وہ بیک وقت ایک رحم دل اور بے رحم انسان بن گیا۔ ظالم اور معصوم، جلد باز اور صابر، ذہین اور سوداوی۔ آسان اور مشکل۔ وہ اپنی ذات کی بھول دھلیوں اور اپنے فیصلوں کی گرداب میں پھنس چکا تھا، وہ اب ایک ایسے شخص کی کہانی بن گیا جس کے پاس سب ہوتا ہے بس اپنا آپ ہی نہیں ہوتا، جو سب کچھ ڈھونڈ نکالتا ہے سوائے اپنے۔

پارٹ راک میں ایک رات اس کی نظر ایسی لڑکی پر ٹھہر گئی جس نے سرخ رنگ کی فرائڈ پہن رکھی تھی اور بالوں کو کھلا بھوڑ رکھا تھا۔ وہ ڈانس فلور پر ایسے ناچ رہی تھی جیسے کوئی اور بھی اس کے ساتھ ناچ رہا ہے۔ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے، کوئی اسے بانہوں میں تھام کر گھما رہا ہے۔ آس پاس والوں نے اسے پہلے لڑکی

کے بہت سے دوسرے ڈیپارٹمنٹس کے دوست اسے ڈھونڈتے اس کے پاس آتے کہ وہ کہاں گم ہے، نظر کیوں نہیں آتی اور اس کے ایشین فلیگ نے لہانا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کی سائیکل کسی کو آج کل گرا کیوں نہیں رہی۔۔۔ اور اب ریس کب ہوگی کارل کے ساتھ۔ بلکہ اب تو فٹ بال میچ ہونا چاہیے۔

کارل کے ساتھ اس کی سائیکل ریس اتنی مقبول ہوئی تھی جیسے اس نے ورلڈ سائیکلسٹ کا میڈل جیت لیا ہو۔ بہت بڑی تعداد آئی تھی اسٹوڈنٹس کی ریس دیکھنے۔ وہ سب امرتہ کو سپورٹ کرنے آئے تھے۔ اتنی اہم تھی امرتہ ان کے لیے۔۔۔ اور اب بھی وہ اسے اپنی پارٹیز میں بلانا نہیں بھولتے تھے۔ دائم نے نوال کی برتھ ڈے پارٹی پر اسے بلایا، لیکن وہ بار بار کے اصرار پر بھی نہیں گئی۔

اخبارات میں ویرا کے آرٹیکلز دھڑا دھڑا رہے تھے۔ وہ ان آرٹیکلز کو پڑھتی اور ان کے تراشے کاٹ کر اس نے ایک فائل بتانی شروع کر دی۔ اسے یہ سب پاکستان اپنے ساتھ لے کر ہانا تھا۔ اب حقیقت میں وہ ویرا کو اپنے دل کے بہت قریب محسوس کرتی تھی۔ ایک ایسی دوست جو اسے اب تک کی زندگی میں نہیں ملی تھی۔ اس نے کارل کو پھرا لگوایا کہ امرتہ ہر حال میں جیت جائے۔۔۔ ویرا کے لیے اس کی جیت اتنی خاص تھی۔۔۔ وہ فہرست بناتی تو تھک جاتی جو جو کچھ ویرا نے اس کے لیے کیا تھا۔ وہ اسے اپنے ساتھ روس لے جانا چاہتی تھی اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی۔ اور امرتہ واقعی میں اب اس کی منگنی میں بند ہو جانا چاہتی تھی۔

”اختتام“ وقت کا ہو یا کسی عمل کا۔۔۔ کتنا بھی خوشگوار ہو، دکھی کر جاتا ہے کسی بھی چیز کا ختم ہو جانا دل پر آری چلا جاتا ہے۔

سب ختم ہو رہا تھا۔ سب فارغ وقت میں وہ البم بناتی رہتی۔ کارل، ویرا، سائی اور عالیان کی مختلف تصویریں کاٹ کاٹ کر چپکاتی

سادھنا اس کا اتنا خیال رکھتی تھی اسے بھی کچھ اس کے لیے کرنا چاہیے تھا۔ ویرا نے اخبار کے دفتر یا قاعدہ جاب کر لی تھی اور وہ کافی مصروف رہنے لگی تھی۔ امرتہ کا خیال تھا ویرا ایک بہت اچھی صحافی بن سکتی ہے۔ ویرا اسے اپنے آئین بھی لے کر گئی تھی اور وقت نکال کر وہ اسے اپنی سائیکل پر بٹھا کر ماسٹر گھماتی رہتی تھی اور ایک بار وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چمکاتی رہی۔

امرتہ کا دل افسوس بھر گیا۔ سائی ٹھیک کہتا ہے۔ سب اس کے ساتھ کتنے اچھے ہیں یہ وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتی اور اگر وہ ویرا کو بتا دے کہ عالیان اس کے لیے کیا ہے تو ویرا شاید بہت آرام سے عالیان کو پہچانے سے ہی انکار کر دے۔ لیکن اب اس کی ضرورت اتنی باقی نہیں رہی تھی۔

عالیان کے باپ کی آمد سے ویرا واقف ہو چکی تھی، لیکن اسے کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ امرتہ نے وہ سب کیا تھا۔ اسے بہت اوپر اوپر کی عام سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ سادھنا، کارل، سائی، لیڈی مہر، کسی نے دوبارہ کسی کے سامنے بھی اس واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ عالیان امریکہ گیا تھا تو ویرا کو یہی معلوم تھا کہ وہ ماما مہر کو لے کر شارلٹ کے گھر گیا تھا۔

عالیان اور ولید البشو کی ملاقات کیسی رہی۔ اس نے یہ بھی معلوم کرنا نہیں چاہا تھا۔ لیڈی مہر نے بس اسے اتنا کہہ دیا تھا کہ وہ عالیان سے اس بارے میں کوئی بھی بات نہ کرے اور اس نے ایسا ہی کیا۔



ویرا اسے بہت کم ملاقات ہو پاتی تھی اس کی رات کو وہ بہت دیر سے واپس آتی اور یونی میں وہ اس کے ڈیپارٹمنٹ جا نہیں سکتی تھی۔ ویرا کی اسٹڈی ٹف تھی تو اسے لائبریری سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔

امرتہ نے پہلی بار کے تجربے کے بعد وقت سے پہلے اپنی اسائنمنٹ بنانا سیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی اس کے پاس پڑھنے کے علاوہ اور کام ہی کیا تھا۔ یونی میں اس

لگتے لیکن وہ باز نہ آتا۔

کارل اور وہ ایک ساتھ واپس آتے اور کسی نہ کسی ال میٹ کے کمرے میں گھس جاتے، پیرا منگواتے، فلم دیکھتے اور دو گھنٹے سو کر یونی آجاتے اور کلاس میں اپنی آنکھیں بمشکل کھولتے پائے جاتے اور ایسے ہی وہ اونگھ رہے تھے کہ شاہ ویز نے دونوں کے ٹاک کے نکتوں میں دو عدد نسلیں اڑس دیں اور تصویر کھینچ کر The Tab Manchester میں بھجوا دیں۔

امرہ نے وہ تصویر دیکھی تو بے اختیار ہنس دی اور تصویر کو محفوظ کر لیا۔

دوسری طرف عالیان نے خوب جم کر خریداری کی چھٹیوں میں نور پر جانے سے پہلے۔

”تم کتنا بدل گئے ہو، کتنی فضول چیزیں اٹھالائے ہو؟“ سالی نے اس کی خریداری دیکھ کر کہا۔

”ہاں۔ تاکہ اگلی بار اگر ولیر مجھے دیکھے تو اسے یہ نہیں لگنا چاہیے کہ میں بک سکتا ہوں کیونکہ شاید میں نے حسرت زدہ زندگی گزاری ہے۔“

”چیرٹی کے لیے فضول خرچی نہیں کرتے تھے۔ نیکی کرتے تھے، صرف ایک انسان کو دکھانے کے لیے فضول خریداری کر رہے ہو۔ نیکی ضائع کر رہے ہو۔“ سالی نے تاسف سے کہا۔

نئی خریدی گئی شرٹس کو اپنے ساتھ لگا کر دیکھتے عالیان کے ہاتھ رک سے گئے۔

”میں بہت برا ہو گیا ہوں۔۔۔ ولید البشر جیسا۔۔۔؟“ سنجیدگی سے وہ پوچھ رہا تھا۔

اس کے سوال پر سالی سہم کر اسے دیکھنے لگا۔ ”تم کیا کیا سوچنے لگے ہو عالیان۔“ اس نے نرمی سے کہا۔ کارل آیا ساری خریداری کو دیکھا، دو شرٹس اٹھائیں، ایک جوڑا جوتے، ایک بڈ اور اپنے کمرے کی طرف یہ کہتے بھاگ گیا۔ ”کرسمس کا گفٹ میں الگ سے لوں گا۔“

”کرسمس۔“ کرسمس کی چھٹیوں سے چند دن پہلے فٹ بال میچ کی دھوم مچی اور کافی زور و شور سے اس سے متعلق خبریں

رہتی، ساتھ ان کی کسی باتیں لکھتی جاتی۔ ایما برتھ ڈے پارٹی کی جتنی تصویریں یونی میں پھیلی تھیں وہ سب اس نے حاصل کر لی تھیں۔ ہال میں ہونے والے ”ایما برتھ ڈے پارٹی“ ڈرامہ کی تصویریں بھی اسے مل گئی تھیں جس میں عالیان ایما کا باپ بناتھا، سالی ایما کی ماما اور شاہ ویز ایما اور وہ سب کارل پر قہرین کر برس رہے تھے اور باقی ہال میٹس ہنس ہنس کر مرنے کے قریب ہو گئے تھے۔

اس نے اس البم میں اپنا سارا جہان سمیٹ لیا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر ہنستی اور روتی رہتی۔ وہ ان سب کو اپنے سینے سے لگا کر رکھنا چاہتی تھی۔ اس کا دل ان سب سے آباد رہنے والا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے والے تھے۔

لیڈی مہر کو کمائیاں سنانا بھی اس نے بند نہیں کیا تھا۔ اسے آخر کار خود سے کمائی بنانا آ گیا تھا۔ اس نے اپنے خاندان کی پسند کی شادی کرنے والوں کے قصے کمائی بنا کر سنا دیے، جسے بہت پسند کیا گیا۔ این البتہ درمیان میں بہت سوال پوچھتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر لڑکا لڑکی شادی کرنا چاہتے ہیں تو فلاں ماموں کو کیوں مسئلہ ہے، یا فلاں تایا جی یا دادی جی یا بابا جی کو۔ اور آخر پھوپھو جی اپنی بیٹی کی شادی کسی اور لڑکے سے کیوں نہیں کر دیتیں اسی ایک لڑکے سے کیوں۔ اور خالہ جی نے شادی میں نہ آنے کی دھمکی کیوں دی اور آخر اس بات کا کیا مطلب ہے کہ ”تم آج سے ہمارے لیے مر گئے۔“

نشست گاہ میں آتش دان کے پاس ویرا کے علاوہ وہ سب ہوتے کرسمس آنے والی تھی تو وہ لیڈی مہر کے بچوں اور ان کے بچوں کے لیے تحائف بھی پیک کرتے جاتے۔ ایک پہاڑ تھا تحائف کا جو انہیں پیک کرنا تھا۔ وہ اور سادھنا مل کر ان تحائف کی خریداری بھی کرتے جو لیڈی مہر کو بہت پسند آئے۔

عالیان جاب پر جانے سے پہلے گول دائرے کی صورت سائیکل چلاتا ہی جاتا، چلاتا ہی جاتا، خود کو چکروں میں لے لیتا، اسے ایسا کرتے دیکھ کر چکر آنے

سنی گئیں۔ فریشر اور عالیان، کارل کی دو ٹیموں کے درمیان پہنچ تھا آپس میں انہوں نے انعامی رقم بھی ملے کی تھی۔

کارل امرحہ کے پاس آیا ”ہمارا میچ ہے۔ ٹیم کا حصہ بننا ہے تمہیں۔“

”مجھے کھیلنا آتا ہے نہ مجھے اس میں دلچسپی ہے۔“

”تمہیں صرف بھاگنا ہے۔ برف پر بھاگ تو لوگی تا۔۔۔ ورنہ گرتی رہنا۔۔۔ گول کرنے کی ضرورت نہیں نہ ہی ڈیفنس۔۔۔ تم بہت انجوائے کرو گی امرحہ۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں مجھے فوراً ہاں کہہ دینی چاہیے۔“

”میرا نہیں خیال۔“ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی دیوار کے ساتھ پشت ٹکا کر کھڑی تھی۔

”دیکھنے آؤ گی؟“ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”نہیں۔“ وہ بلاوجہ کتاب کا کونا مروڑنے لگی۔

”تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم کبھی دوست رہے ہیں۔“

”یاد ہے سب اور یہ بھی کہ وہ سب کبھی تھا۔“

”میں تمہیں برف میں دبانا چاہتا ہوں۔“

”مجھ میں برف میں دبنے کی اب طاقت نہیں رہی۔۔۔ تم مجھے زمین میں دفن کرسکتے ہو۔“

”آخر یونیورسٹی کی ہر لڑکی مجھ سے دور کیوں بھاگتی ہے؟“ اس نے اس کی آخری بات کے اثر کو زائل کرنا چاہا۔

”آخر تم ہر لڑکی کو دور کیوں بھاگادیتے ہو؟“

”اتنا پھاتا ہوں میں۔۔۔“ اس نے منہ سے لٹکا لیا پھر ایک دم سے ہنس کر بولا۔

”اب تو آؤ گی نا؟“

امرحہ نے ٹال میں سر ہلایا ”تمہاری آفر کا شکریہ لیکن میری طرف سے معذرت۔“

”تم ایک اچھا سوال گئے گی ہو۔ بالکل عالیان کی طرح۔“ چڑ کر کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔

”عالیان!“ اس نے اس نام کی سرگوشی ایسے کی جیسے کوئی جرم کر رہی ہو۔ کارل کو جاتے دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ اس کے پیچھے جائے ورنہ فائل اس کے سر

پر دے مارے اور کہے ”ہاں بڑی میں ضرور کھیلوں گی ہم فریشر کو ہرا دیں گے۔“ لیکن وہ یہ نہ کر سکی۔

دیرانے بھی اسے منانا چاہا میچ کے لیے، لیکن اس نے طریقے سے اسے منن کر دیا۔ این گئی تھی اور اپنے موبائل سے اسے میچ دکھا رہی تھی۔ اس میچ کی دھوم مچی تھی۔ وہ برف پر بھاگ رہے تھے، گر رہے تھے، لڑ رہے تھے، ایسا بھی فریشر کی ٹیم کا حصہ تھی اور کارل نے اتنی بار اسے برف پر گرایا کہ بے چاری کے منہ سے خون نکلنے لگا اور وہ فرسٹ ہاف سے پہلے ہی میچ چھوڑ کر چلی گئی۔

تینوں گول عالیان نے، کیے تھے اور وہ برف پر ایسے بھاگتا رہا جیسے زمین کو روندنا چاہتا ہو اور فٹ بال کو اس نے ایسے پیروں کے نشانے پر رکھ کر اچھلا جیسے سنگ باری کر کے کسی کو مار ڈالنا چاہتا ہو۔ عالیان کارل کی ٹیم جیت گئی۔

اس رات اسے پھر نیند کی گولیاں کھا کر سونا پڑا۔ اسے عالیان، دیرا، کارل کے پر جوش بحرے رات بھر سنائی دیتے رہے۔ وہ اپنے دل کے مقام کو مسکتی رہی۔ نیند کی گولیاں بھی نیند لا۔ نے میں ناکام ہو گئیں تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اپنے بستر پر اور گہرے گہرے سانس لینے لگی اور میچ کی ریکارڈنگ نکال کر عالیان کو برف پر گرتے، اٹھتے، فٹ بال کی طرف لپکتے دیکھنے لگی۔ اور اس نے یہ بھی جان لیا کہ اسے اب صرف بڑھنے سے ہی سروکار نہیں رہا۔ ایک عالیان میں کتنے ہی نئے انسان گھس آئے ہیں۔

اور پھر کرسمس کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور سب جانے لگے۔ انجسٹرانج ہسول سے خالی ہونے لگا۔

”ہمارے ساتھ چلو امرحہ!“ سائی نے اس کی منت کی۔

”مجھے نہیں جانا، دادا نے منع کیا ہے۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”ہاں۔۔۔ پھر سچ یہ ہے کہ مجھے نہیں جانا۔“ اس نے بے تاثر انداز میں کہا۔ جسے دیکھ کر سائی افسردہ سا ہو کر خاموشی سے چلا گیا۔

اس نے اسے تھپڑ مارا تھا اس نے اسے فاصلہ رکھ کر بھی نہیں دیکھا تھا، اس سے بات نہیں کی تھی۔ ہسپتال میں وہ سر جھکا نہ بیٹھی رہی تھی۔ یہ سب اس عہد کا حصہ تھا جو اس نے خود سے کیا تھا کہ وہ اسے اور تکلیف نہیں دے گی۔ لیکن اپنے لیے وہ اور تکلیف اکٹھی کرنے یہاں اس کے تصورات سے لپٹنے آگئی تھی۔

سفید مائچسٹر میں خون آلود یادیں اپنی بنیادوں سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور زندگی نے اس کے اشکوں پر ترس کھا کر پیچھے کی طرف اپنی سواری موڑ لی۔

تین سین نے چراغاں کرنے کے لیے دھپک راگ کی چوکڑی جمائی۔

سفید دھند میں جھنڈا اٹھانے لگے اور آسمانی مرغولوں کو چاک کرنا عالیاں اس کی طرف بڑھنے لگی۔

دائیں سے۔۔۔ بائیں سے۔۔۔ آگے سے۔۔۔ پیچھے سے۔۔۔ ہر طرف سے، لیکن اب اسے اس سے بھاگنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی وہ اس کی طرف آئے اور وہ آ رہا تھا۔

”جو حقیقت میں واقع نہ ہو سکے وہ قرب کی چاہ واقع کروالیتی ہے۔“

وہ ایڑی کے بل گھوم گئی اور اس نے ہر طرف سے اسے اپنی طرف آنے دیا۔ اسے اس خواب کے سراب ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

”عالیاں۔“ اس نے، سرگوشی کو جھٹکا اور آواز کو بلند ہو جانے دیا۔

وہ یونی محراب کے پاس تھی۔ اس محراب کے ساتھ وہ گمرنگا کر اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس نے اس مقام پر اپنے گل رکھ دیے اور دونوں ہاتھوں سے اس جگہ کو تھام لیا۔

بے اختیاری، بے خودی کی ہم جولی ہے اور یہ دونوں ہم جولیاں ”محبت“ کی صفوں میں اول ہیں۔

اس کی بے اختیاری نے اس کی خوشبو کو جالیا اور بے خودی اس خوشبو میں جھومنے لگی۔ ایک بجہ اپنی ماں کو نظم سناتا ہوا فٹ پاتھ سے اس کے پاس سے گزرا

وہ رانے بھی اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا کہ ان چھ لوگوں کا گروپ جا رہا ہے وہ بھی چلے، لیکن اس نے بہت عام سے انداز میں پڑھائی کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔

”پھر تو یہ موقع نہیں ملے گا نا امرجہ، ایک ساتھ ہونے کا شاید یہ آخری چانس ہے۔“ اس نے ویرا کو مسکرا کر دکھادیا لیکن ساتھ پھر بھی نہیں گئی۔

عالیاں، کارل، سائی، ویرا، شاہ ویز اور ان کا ولی دوسرا مشترکہ دوست مل کر جا رہے تھے لیڈی مہرنے سائی کو بلا کر ہدایات دی تھیں کہ ہر وقت عالیاں کے ساتھ ساتھ ہی رہنا ہے۔

ات، ان سب کے جانے کا انتظار تھا۔ اسے ایک اہم کام کرنا تھا جس کا موقع پھر کبھی نہیں ملنا تھا اور جب وہ سب چلے گئے تو وہ یونی آگئی۔



”برف جدائی کی پیامبر ہے یہ ہمارے درمیان حائل ہے۔“

آسمان سے یہی پیامبر نازل ہو رہا ہے۔ کسی دل گرفتہ پری کی فراق دیدہ انگلیوں سے نکلتے بربط کے ساز کی مانند دھند اپنی دلربائی کے قصے بیان کرنے سے زیادہ فراقیہ قصوں پر رونے پر قائل تھی۔ وہ جیسے ہی پونیورسٹی کی سڑک پر آئی۔ دھند نے دروچینا کی طرح اس سے لپٹ جانا ضروری سمجھا۔

وہ بزنس ڈیپارٹمنٹ نہیں جاسکتی تھی وہ اس کی بیرونی دیواروں کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اور ان دیواروں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے جن کے پاس جن کے ساتھ وہ لگ کر کھڑا ہوا کرتا تھا۔ اس نے ساری دیواریں چھوڑ ڈالیں اور وہ ان درختوں کے پاس آگئی جن کے قریب وہ کھڑے ہوئے تھے۔ اس جھمے میں جہاں کبھی وہ بیٹھے تھے۔ ان کونوں میں جہاں بیٹھ کر وہ کتاب پڑھا کرتا تھا اور کافی پیتا تھا۔

وہ نفوسوں سے ان جگہوں کی نظریں اتار رہی تھی۔ اب اسے ڈر نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ لے گا اس لیے اس نے اپنے گیلے گل صاف نہیں کیے۔ جب سے

تکئیں اور سرخ لباس پہنے لڑکوں نے ڈرم اسٹک کو
ہوا میں بلند کر لیا۔

”ہاں۔“ اس نے وہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر
بجالی جو تا عمر نہیں سمجھنے والی تھی شاید سرخ لباس والوں
نے اپنے اٹھے ہاتھوں کو ڈرموں پر بے قابو ہو جانے
دیا۔ رنگ پھیل گئے۔ خوشبو بکھر گئی۔ چراغ جل
اٹھے۔ دن بج گیا۔ بہار نکل آئی۔ ایک امرجہ اور
ایک عالیان کے گرد ساری ریڈ ڈانرے میں چکرانے
لگی۔ تو ان کی بہار کا ماخذ وہ تھے۔ ہاں اس بار ان کی
بہار کا ماخذ وہ تھے۔ مشرق کی سندری اور عرب کا
سلطان۔

امرجہ نے ہاتھ پھیلائے اور کچھ برف اس میں
اکٹھی کی اور اس مٹتے بنتے ہیولے کی طرف اچھال دی
جو وہاں نہیں تھا اور صرف وہاں ہی تو تھا۔
”تم اتنی دیر سے آئے عالیان۔ اس نے ہاتھ برسھا
کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ کھڑا کر لیا اور وہ
کھڑا ہو گیا۔

”کیا تم میرا انتظار کر رہی تھیں؟“ اس کی ٹھوڑی کو
چھو کر اس نے شرارت سے پوچھا۔

”کیا نہ کرتی؟“ ہونٹ کا کونا دانت میں دبا کر اس
نے کہا۔

”میں ایک برا انسان ہوں میں نے تمہیں انتظار
کروایا۔“

”دیکھو عالیان! تمہارا ماچسز برف میں ڈوب رہا
ہے۔“ اس سفید ماچسز کی طرف ہاتھ کیا۔

”دیکھو ذرا۔ میرے ماچسز کو کون دیکھ رہا
ہے۔“ اس نے دو انگلیوں سے اس کی ناک پکڑ لی۔

”مجھے امرجہ کہتے ہیں۔ کون نہیں۔“ اپنی ناک
چھڑوا کر اس نے اس کی ناک موز کر کہا۔

”کیا میں تمہارے لیے برف اکٹھی کروں امرجہ؟“
اس نے اس کے منہ کے سامنے آکر پوچھا۔ ان

دونوں کی آنکھوں نے طویل سفر طے کیا جس کے کبھی
نہ ختم ہونے کی دعائیں کی جاتی ہیں۔

”برف کیوں؟“

اس نے اپنی حالت میں پھر بھی تبدیلی نہیں کی۔ کچھ
وقت ایسا ہی گزر گیا۔

ارواح سے مبرا ہستیوں نے جانا کہ ”محبت کی
عبادت“ کی جارہی ہے۔

پھر وہ اسی کے انداز میں کمر کو ٹکا کر ایک ٹانگ کو
ترچھی کر کے کھڑی ہو گئی۔ زندگی کی سواری نے ان
سب یادوں کو اس کے پاس اتارنا شروع کر دیا جو مطلق
العنان بنی اس کی ذات پر حکمرانی کرنے پر ناذاں تھیں۔
”تمہیں بات کرنے کی تمیز سیکھنی چاہیے۔“

”تمہیں ٹھکان اتارنے کی مشق کرنی چاہیے۔“
وہ اپنی مرضی سے ایک ایک منظر کو بار بار دہراتی
رہی۔

”لاہور خالی ہر چکا ہے۔ اس کے پاس سب نہیں
رہا۔ تم تو یہاں ہو۔“

”امرجہ! دیکھو میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔“
وہ قلابازیاں لا رہا تھا۔ محراب کے ساتھ ٹکی کھڑی

امرجہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔
”میں سارا ماچسز اکٹھا کر لاؤں گا۔“ وہ ہاتھ سینے پر

باندھ کر کھڑا ہو گیا۔
”جاؤ کبر لاؤ۔“ امرجہ اسے جواب دے رہی تھی۔

”ان کے ہاتھ میں بورڈز ہوں گے۔“
”ضرور ہو۔ نے چاہیں۔“ وہ پورے دل سے

مسکرائی۔
ساری ڈریگن ریڈ محراب کے سامنے جی کھڑی

تھی اور اس میں وہ مسکراتی ہوئی کھڑی تھی۔
”ایک بورڈز تم بھی تیار رکھنا۔“ اس نے اس کے

گال چھو کر کہا۔
”وہ تو میں نے کب سے تیار کر لیا۔“ کہہ کر وہ ریڈ

میں بھاگ گئی اور وہ اس کا نام لیتے ہوئے اس کے پیچھے
بھاگنے لگا اور پیچھے سے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

”مجھ سے شادی کرو گی امرجہ؟“
دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ساری ریڈ ان

کے گرد اکٹھی ہونے لگی۔ سارا ہجوم ان دو کے گرد
سمٹ آیا۔ چینی ساختہ ڈرموں کی قطاریں سجادی

پھر۔ پھر اسے آنکھیں کھول دیں پڑیں اور ان کی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرنا پڑا۔ وہاں کھڑے کھڑے اسے کئی پہریت چکے تھے پھر بھی وہاں تا عمر کھڑی رہنے پر بضد تھی۔

اور یادوں کے ریوڑ پر ہنر مارے گئے اور وہ لا پتہ ہونے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ زندگی اپنی سواریاں لیے آگے دوڑ گئی۔

داوانے اس کی منت کی کہ وہ بھی کہیں گھومنے کے لیے چلی جائے اور خود کو اپنی جگہ کے حلیم سے دور لے جانے کی ایک کوشش اس نے بھی کر دی تھی اور سامان باندھ کر این کے پیچھے فرانس چلی گئی۔ اس کے ساتھ گھومنے کی کوشش میں مصروف رہی اور نئے سال کے آغاز پر ایفل ٹاور سے جنم لیتے جشن کو غیر دلچسپی سے دیکھتی رہی۔

اسے وہاں موجود مجمع کے وہاں موجود ہونے کی قطعاً سمجھ میں نہیں آئی مگر نہ ہی اس بات کی کہ وہاں اتنا شور و ہنگامہ کیوں تھا اور ساری دنیا کی آتش بازی جو ایفل کے جسم سے پھوٹ رہی تھی وہ کسے اور کیوں اچھی لگ رہی ہے۔ ایک دوسرے کو کندھوں پر اٹھائے وہ کیوں ناچ رہے ہیں۔ وہاں کیا تھا جو اتنا اچھا تھا کہ وہ سب اپنی نظریں ہٹانے کے لیے تیار تھے نہ مسکراہٹ کے لیے۔

امرحہ نے بے بسی سے اپنی ہتھیلیاں مسلیں ”یہ سب اتنے خوش کیوں ہیں؟“

میسوت کر دینے کو کوئی منظر تیار نہ ہوا۔ دیوانہ بنا ڈالنے پر کوئی عالم قادر نہ رہا۔ بے مثال عجائبات اپنی مثال ”گھومنے لگے۔ فراق یار نے سب ماند کر ڈالا تھا۔“

عالیان نے میڈرڈ کے آسمان پر بنتے مٹتے آتش رنگوں کے جلووں پر نظریں گاڑنی چاہیں اور وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ اس پر ٹھکن سی سوار ہو گئی جبکہ ابھی تو رات شروع ہوئی تھی۔ اس کے آگے کھڑے کارل ویر اور سانی اچھل کود کر رہے تھے اور وہ بے بسی سے کھنڈر کھنڈر سا ادھر ادھر کچھ تلاش کر رہا تھا۔

”ناک تم اس سے اپنی پسند کا گھر بنا لو۔ بلکہ آؤ چلو یہاں بیٹھ کر گھر بناتے ہیں۔“ اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے برف کے ڈھیر کے پاس لے جانے لگا۔

”نہیں عالیان تم یہاں میرے پاس کھڑے رہو کہیں مرت جاؤ وعدہ کرو۔ کہیں نہیں جاؤ گے۔؟“ اس کی آواز میں سارا بچا کھچا درد سمٹ آیا۔

دونوں ایک ساتھ جڑے محراب میں دیکے تھے۔ ان کے سر ایک دوسرے سے مٹس ہو رہے تھے اور دائیں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اپنی لکیوں سمیت ایک دوسرے میں مدغم ہوئی تھیں۔

”نہیں جاؤں گا۔“ اس نے اس کے گال پر پھونک ماری۔ اور۔

عرب کی ریت نے اڑ کر آمنہ کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ سیاہ پنچے میں لپٹے آنسوؤں سے بھیلے چہرے کو اس نے زمین پر سجدے کے لیے تیار کیا۔ وہ محمد بخش کے لیے خدا سے اس کی ساری رحمتیں مانگنے والی تھی۔ اور پھر وہ خود کو خدا کے حوالے کر دینے والی تھی۔ آمنہ ایک درویش صفت عورت۔ اس مرد سے دستبردار ہونے جا رہی تھی جس سے وہ وابستہ ہوئی تھی۔

اس نے آنکھیں بند کیں اور ان آنکھوں کے پردوں پر محمد بخش کو پایا اس نے آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ عالیان نے امرحہ کی۔ ”اگر میں برف ہوئی تو تمہارے قدموں پر گر جاتی۔“

”تم برف ہو تیں تو میں بھی برف ہوتا۔ مجھے یہی ہوتا ہے جو تمہیں ہوتا ہے امرحہ۔“ اس نے دونوں ہتھیلیاں اس کے گالوں پر رکھ کر کہا۔

وہ ہنسنے لگی۔ ”یارم۔ یارم۔“ وہ گنگٹانے لگی۔ ”مجھ پر جو راز کھولا گیا ہے وہ تم ہو امرحہ۔“ ناک پھر اس کے ہاتھ میں تھی۔

”کیہ ماراز؟“ ”یہی کہ زندگی کیا ہے۔ زندگی امرحہ ہے۔“ وہ ہنسنے لگی اور اس نے اپنا سر دیوار کے ساتھ جڑ دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اور۔

سب سے نظریں بچا کر اس نے کہیں دور نکل جانا چاہا۔

”کہاں جارت، ہو عالیاں؟“ ویرا نے پوچھا۔
”میں کچھ کھانے کے لیے لینے جا رہا ہوں۔ بس ابھی آیا۔“ اس نے جھوٹ بولا اور تیزی سے ہجوم میں خود کو گم کر لیا کہ ایرا اسے لپک کر آنے لے۔ وہ چلتا رہا چلتا رہا اور میڈرڈ کے ایک گم نام سے چھوٹے سے کیفے میں بیٹھ گیا۔

وہ کافی کی کتنی پیالیاں پی چکا تھا وہ کتنی بھول چکا تھا اس نے اپنا سر لکڑی کی میز پر رکھا تھا اور نظریں گلی میں ساز بجاتے اس نوجوان پر نکا دی تھیں جس کے سامنے کئی بچے اور بوڑھے ناچ رہے تھے۔

”اتنے بھدے ساز اور آواز پر یہ سب کیسے ناچ سکتے ہیں اور آخر وہ کیا وجہ ہے جو انہیں ایسے ناچنے پر مجبور کر رہی ہے۔“ وہ سوچنے لگا۔

ساز کا تار ٹوٹا اور اسے ایک تھپڑ کی گونج سنائی دی۔
”بہت محبت کرتی ہوں میں تم سے۔“

اچھا تو ساز اس لیے رکا۔ اور تار یوں ٹوٹا۔
اس نے میز پر پڑے اپنے سر کا سرخ بدل لیا اور اس بار اس کی نظر ایک ٹوٹے ہوئے لیمپ پوسٹ پر جا ٹھہری۔ جو کبھی روشن ہوتا ہو گا۔



ویرا کو جب اس کے فرانس جانے کا معلوم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئی۔

”تم میرے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟“ وہ بہت سخت ناراض تھی۔

”تم نے فرانس نہیں جانا تھا اور مجھے فرانس دیکھنا تھا۔“ وہ اپنے کپڑے الماری میں رکھ رہی تھی۔

”تم کہتیں نہ ہم فرانس چلے جاتے، تم نے تو کہا کہ تمہیں جانا ہی نہیں ہے۔“

”تم تین چار بار فرانس جا چکی ہو، میرے ساتھ پھر سے جاتیں تو تمہارا نور خراب ہو جاتا۔“

”تمہارے ساتھ ہوتی تو اس بار فرانس دیکھنے کا مزا

آجاتا۔“ ویرا نے منہ پھلایا۔
سائی اس سے اتنا ناراض ہو گیا کہ خفگی کی زیادتی سے اس سے بات ہی نہیں کی۔
”امتحانات شروع ہو گئے۔“

امتحانات کی تیاری کے لیے وہ علی لرننگ نہیں گئی۔ اس نے گھر میں ہی تیاری کر لی اور دل لگا کر پڑھنے کی کوشش کی تاکہ اس کا رزلٹ اچھا رہے۔ سب کتابوں میں گم ہو گئے کارل تک صرف لائبریری میں پایا جاتا البتہ ایما کو علی لرننگ میں زوردار کرنٹ کا جھٹکا دے کر اسے فلور پر لڑکھڑا کر اس نے اس کے دائیں ہاتھ میں فرہکچو کر دیا اور کوئی ایک بھی زندہ یا مردہ ثبوت نہ چھوڑا جو یہ ثابت کر سکتا کہ یہ سب اس نے کیا ہے۔ ایما نے انگوٹھی اس کے منہ پر دے ماری تھی۔ وہ اسے ہی اٹھا کر کہیں دے مارنا چاہتا تھا۔

عالیاں کبھی کبھی علی لرننگ کے ہال میں ایسے ہی گشت کرتا پایا جاتا تو کارل اسے گمیٹ کر اسٹڈی روم میں لے جاتا کبھی دور سے ہی چلاتا۔

”تمہارا داغی توازن ٹھیک ہو جائے تو اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ جانا۔“ امتحانات ہو گئے۔ رزلٹ بھی آ گیا۔
”چوتھا اور آخری سمسٹر شروع ہو گیا۔“

وقت نے اپنی طنائیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور وہ خلاف توقع ست روی سے گزرنے لگا۔ زندگی ایسی اداکارہ بن گئی جو میک اپ اتارے اگلا سوانگ رچانے سے پہلے پر سکون بیٹھے رہنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے ہاتھ گود میں ہوں اور وہ بے بڑی بروی اور بے حسی سے اپنا دھلا چہرہ آئینے میں دیکھ رہی ہو۔

شٹل کاک میں لیڈی مہر کے ایک ساتھ چار بچے آ گئے تھے۔ ڈینس اور مارک دو دن رہ کر چلے گئے جبکہ شارلٹ اور مورگن رہ گئیں۔

”جو رڈن آیا ہے؟“ این نے شارلٹ سے ملتے ہی پوچھا۔

”نہیں۔“ شارلٹ پوری جان سے قہقہہ لگا کر ہنسی۔

ویرا کو عالیاں کی فیوچر وائف کی حیثیت سے لیڈی

اس نے مائیک پر کچھ ابتدائی کلمات کہے اور ہال میں بیٹھے ڈنر کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور پھر وہ شروع ہو گئی۔ عالیان ویرا کی فرضی داستان عشق سنانے۔

”ایک دن ایک لڑکی اپنی ہی دھن میں گنگنائی ہوئی سائیکل چلاتی جا رہی تھی کہ ایک بھلکڑے لڑکے کی سائیکل کے ساتھ اس کی ٹکر ہو گئی۔ لڑکی ویرا اور لڑکا عالیان۔“

شارلٹ نے ہاتھ اس کی طرف اٹھا کر اشارہ کیا۔ سب گردنیں عالیان کی طرف مڑ گئیں۔ عالیان کو مسکراتا ہوا۔

”یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی سائیکلوں کی پہلی ٹکر تھی۔ ایک رات ویرا اپنے گھر جا رہی تھی کہ کچھ غنڈے اس کے پیچھے آئے اور انہوں نے اسے دوچ لیا اور ٹھیک اسی دوران عالیان آیا جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے کہ ہیرو ٹھیک اسی سڑک اسی گلی سے گزر رہا ہوتا ہے جہاں ہیروئن مصیبت میں گھری ہوئی ہے اور ہیروئن وہ تھی منی سی بچی سی بن جاتی ہے جو ایک پھٹیا گھونسا کسی غنڈے کو نہیں مار سکتی اور عام حالات میں وہ انسانوں کو اٹھا اٹھا کر پٹا کرتی ہے یعنی وہ جانتی ہے کہ اسے ہیرو کے ہوتے اپنی بہادری نہیں دکھانی۔“ آخری جملہ شارلٹ نے سرگوشی صورت ادا کیا ہونٹوں کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر اور ہال میں ہنسی گونج گئی۔

عالیان نے اپنا سر جھکا لیا اور ایک ہاتھ سے آنکھوں پر چھبھاتا لیا ”یہ کیا کر رہی ہے شارلٹ۔“

”ماما کا اس کے بارے میں خیال بالکل ٹھیک ہے جو روڈن کی جگہ اسے فلموں میں کام کرنا چاہیے دوسری مسٹر بین آرام سے بن جائے گی۔“

مورگن کے انداز اور الفاظ پر عالیان بلند قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”خدا کے لیے ایسے ہی قہقہے لگاتے رہنا پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔“ مورگن نے محبت سے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر کہا۔

مہر نے ان سے ملوایا۔ ہفتے کے دن شارلٹ اور مورگن عالیان کو ساتھ لے کر اپنی اپنی سائیکلوں پر مائیکسٹر کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور ان دونوں نے عالیان کی جیب میں ایک پونڈ نہیں رہنے دیا۔ ان تینوں کی آپس میں اچھی دوستی تھی اور وہ رابطے میں رہتے تھے۔

”تم مائیکسٹر میں شادی کرو گے یا روس میں؟“ ریسٹورنٹ میں ڈنر کرتے شارلٹ نے آنکھ مار کر پوچھا۔

”مجھے ہمیشہ یہ شک کیوں رہا کہ ماما کے گھر میں ہی تمہاری ولہن موجود ہے۔“ مورگن بولی۔

”تم کچھ نیا تو کرتے عالیان؟“ شارلٹ کے وانت ہی اندر نہیں ہو رہے تھے۔

”نیا کیا؟“

”یہی کہ تم کو دوتے پھاندتے چھلانگیں لگاتے“

دلن کے کارندوں کی فوج کو جل دیتے بڑے سے فانوس پر جھول جاتے، اور فانوس سے لہرا کر عین اپنی ہیروئن کے سامنے جا کھڑے ہوتے اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھگالے جاتے۔ پس اس کی لمبی سفید پوشاک جو اسے ٹھیک سے بھاگنے نہ دے رہی ہوتی تو تم اسے اٹھا لیتے۔“

”تم اتنی فلمیں دیکھنے لگی ہو شارلٹ؟“ عالیان نے تاسف سے کہا۔

”تمہیں کیا پتا عالیان کہ ہر لڑکی کے دل میں ایک ایسے ہیرو کی متنی خواہش ہوتی ہے جو ہر خطرے کو پھلانگتا اسے اڑالے جائے۔ اور دنیا بس دیکھتی رہ جائے۔“

”تو تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں ایک ہیرو مل گیا۔“ عالیان ہنس دیا۔

”ہیرو پر فلم کر کا۔ میرا تو وہ صرف شوہر ہے۔ ایک گھونسا تک تو وہ کسی غنڈے کو مارنا نہیں چاہتا۔“ کہہ کر شارلٹ انہی اور اجازت لے کر ہال کے مائیک کے سامنے کھڑی ہو گئی اور عالیان مورگن کو مسکرا کر دیکھا یعنی میں شروع ہونے جا رہی ہوں۔

وہ گردن موڑ کر شارلٹ کو دیکھنے لگا جس کی کہانی اختتامی مراحل میں داخل ہو چکی تھی اور وہ ویرا کو امیر زادی کے غنڈوں سے پناہ گزین ہسپتال میں ”کوا“ تک لے آئی تھی۔

اس کا انداز ایسا ہو گیا تھا کہ کھاتے کھاتے سب اسے بہت انسہاک سے سن رہے تھے۔ چند ایک نے تو کھانا کھانا ہی چھوڑ دیا تھا ”ویرا کو مے میں تھی نا۔“ شارلٹ کے تو با میں ہاتھ کا کام تھا بیٹھے بیٹھے کہانی سن لیتا۔ ماما مہر کو تو وہ ہنسا ہنسا کر دیرا کر دیا کرتی تھی۔ جھٹ پٹ کہانی بنا کر سنایا کرتی تھی انہیں ”عالیان“ کو نہیں معلوم تھا لیکن اس نے ”عالیان“ اور امرہ کی فرضی محبت کی کہانی بھی انہیں سنائی تھی جس میں وہ امرہ کو پاکستان لے گئی تھی اور عالیان کو اسے تلاش کرنے کے پیچھے لگا دیا تھا۔ لیکن کیا سب اس نے مزاحیہ انداز میں تھا۔

ڈنر کے بعد وہ انہیں گھر تک چھوڑنے آیا اور ہال تک واپس آتے آتے اس نے ”مستہ جواب دے گئی۔“ مجھے لگتا ہے اس بار وہ لہا بھاگے گا۔“

ٹھنڈ میں اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔ دوسروں کے سامنے نارمل بنے رہنا آسان نہیں ہوتا رات کے اندھیرے میں وہ ایک سناٹا سڑک پر سائیکل کو گول دائرے میں چلانے لگا چلا تا رہا۔ چلاتا ہی رہا۔

ولید البشو کے ساتھ باقاعدہ قانونی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ماما مہر کا وکیل کیس ہینڈل کر رہا تھا اس پر اور اس کے آدمیوں پر ہراساں کرنے کا دعوا کیا گیا تھا کیونکہ اتنا سب ہو جانے پر بھی ولید البشو باز آنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

ٹھنڈی رات اس کی گرم سوچوں کی گواہی نہی۔ کیا اس کی سائیکل دائرے میں اس لیے چکرار ہی ہے۔ کہ ولید البشو اس کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں یا اس لیے کہ ابھی کچھ دیر پہلے ڈنر ہال میں شارلٹ نے اس کی اور ویرا کی محبت بھری کہانی سنائی۔ یا اس لیے کہ اس کہانی میں کروڑوں کے نام بدل گئے۔

”عالیان نے ویرا کو اٹھایا“ اس کی ناک اور پیشانی سے نکلنے خون کو صاف کیا اور اسے گھر تک چھوڑنے اس کے ساتھ گیا۔ جبکہ وہ اسے ٹیکسی بھی کروا کر دے سکتا تھا۔“ شارلٹ نے آخری بات پھر سرگوشی صورت کہی۔

”کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے لیکن میں آپ کو کچھ ہائی لائٹس سنا دوں تاکہ آپ کا تجسس برقرار رہے۔ ویرا کو ایک اور لڑکا بھی پسند کرتا ہے جو اپنے کالج کا باکسر ہے۔ جی ہاں باکسر۔ اور عالیان کو ایک امیر باپ کی بیٹی پسند کرتی ہے جو کرائے کے غنڈوں کے ذریعے لوگوں کا حلیہ بگاڑ دینے کو برا نہیں سمجھتی۔“ ”تمہیں یاد ہے میری شادی کی پارٹی میں تم نے گانا گایا تھا اور کسی راک اسٹار کی طرح گٹار بجاتے رہے۔ تھے جوش نے میرے کان میں کہا تھا ”عالیان پارٹی میں موجود کسی اور کے لیے یہ پرفارمنس دے رہا ہے ہمارے لیے نہیں۔“

”لیکن میری شادی میں تو ویرا تھی ہی نہیں۔“ مورگن نے گلاس کو منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

”باکسر کو معلوم ہو چکا ہے عالیان کے بارے میں اور وہ اپنے دوستوں کو لے کر یونیورسٹی سے گھر آتے عالیان پر ہلہ بول دیتا ہے۔ اور یہاں ایک بھرپور ایکشن سیریا ہوتا ہے۔“

شارلٹ ساتھ اداکاری کر کے بھی دکھا رہی تھی۔

”اور شارلٹ کی شادی میں ویرا موجود تھی اور میری فرمائش پر بھی تم نے گانا نہیں گایا تھا۔ سنو عالیان! کیا تم نے وہ چند فلمیں دیکھی ہیں جن میں عین شادی کے وقت دلہن کئی سو مہمانوں کی موجودگی میں اپنی لمبی سفید فرائ سنبھالتی بھاگ جاتی ہے؟“

”ہاں۔ ایک تو اسپانڈرمن ہی ہے نا۔“ اس نے شارلٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”سنو ہمارے اسپانڈرمن۔ مجھے لگتا ہے اس بار دو لہا بھاگے گا۔“

”کون۔؟“

”تم۔“ مورگن نے پورے وثوق سے کہا۔

جانا کر رہا ہے خاندان میں۔۔۔ ویسے بھی اب تو تم خود بہت سمجھ دار ہو گئی ہو۔۔۔ خود کو بدل لیا ہے اب معاشرے کو بدلنا۔ سن رہی ہو امرجہ۔۔۔؟

”جی دادا۔۔۔ اس نے۔۔۔ نانہ ہو تا پر وہ کہہ دیتی اور گہرا سانس بھرتی۔

”اچھا بتاؤ۔ ابھی میں نے کیا کہا۔۔۔؟“

”آپ نے؟“ وہ یاد کرتی۔۔۔ ”آپ نے کہا حماد نے ایک ہیوی بائیک لے لی ہے، اور جب وہ چلاتا ہے تو آپ کو بہت ڈر لگتا ہے۔۔۔“

”امرجہ! یہ تو میں نے ایک گھنٹہ پہلے کہا تھا۔ یعنی اس کے بعد کی باتیں تم نے سنی ہی نہیں۔۔۔؟“

”سنی ہیں دادا۔۔۔! وہ جھوٹ پر اصرار کرتی۔

دادا خاموشی سے اسے کچھ دیر دیکھتے اور پھر سے شروع ہو جاتے اپنی باتیں دہرانے سائی کو بھی اس کے سامنے اپنی باتیں دہرائی جاتیں۔

”میں تمہیں کل فون کر رہا تھا۔ تم نے بات کیوں نہیں کی؟“

”میں مصروف تھی سائی۔“ وہ کینٹین میں بیٹھی تھی اور سائی اسے ڈھونڈتا وہاں آیا تھا۔

”جب مصروفیت ختم ہو گئی تھی تب فون کر لیتیں مجھے۔“

”تب بھول گئی تھی۔“ اس نے جھوٹ بولا وہ سائی سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی وہ اسے کئی بار انکار کر چکی تھی لیکن وہ بار بار اصرار کر رہا تھا۔

”میں نے تمہارے لیے بھی آن لائن ٹکٹ بک کروادی ہے۔“

”سائی! میں کہہ چکی ہوں مجھے نہیں جانا۔“ اسے غصہ سا آگیا۔

”ساری یونی جا رہی ہے۔ تم کیوں نہیں؟“

”بس نہیں۔۔۔ مجھے کوئی شوق نہیں فٹ بال میچ دیکھنے کا۔“

”میچ نہ دیکھنا ہمارے ساتھ بیٹھ جانا۔“

”سائی۔۔۔ نہیں تو نہیں۔۔۔“

”امرجہ! میری دوستی میں کیا کمی رہ گئی جو تم ٹھیک

سڑک پر لاتعداد گول دائرے بن گئے ہیں، ہر دائرہ اس سوچ کے گرد چکرار رہا ہے کہ کہانی میں ایک کردار کی جگہ جب دوسرا کردار لینے لگے تو پرانا کردار اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔

”موت!“

کہانیوں میں ہو یا حقیقت میں اسے خوش آمدید نہیں کہا جاسکتا۔

”موت۔“

سایہ بن کر آئے یا سایہ بنا کر ساتھ لے جائے اس کی نحوست کم نہیں ہوتی۔



”باہر جتنے بھی شور ہنگامے، میلے، سجالے جائیں عالم وجود میں بھوتے دل میں تغلیف نہیں ہوتے۔“

مہوگ (کوئل قسم کا پرندہ) اس کے ذہن سے آزاد کروالیا گیا۔ امرجہ کے لیے رانی امرجہ کو آواز دے کر بلا لیتا بھی مشکل ہو گیا اور یہ بھی آسان نہیں رہا تھا کہ امرجہ دادا کے ساتھ رانی امرجہ بن کر باتیں کرتی رہتی۔ دادا اس کے لیے پہلے جیسے ہی ہو گئے تھے وہ دادا کے لیے پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ باتیں کرتے دادا کو اب درمیان میں کئی بار پوچھنا پڑتا۔

”سن رہی ہو امرجہ؟“

وہ سر ہلا دیتی۔

”واجدہ سارا گھرانہ سیر کر رہا ہے۔ خاص کر تمہارے لیے حماد کا بڑا کمرہ خالی کروایا ہے۔ ڈیزائنوں سے کہہ رہا تھا کہ میری بیٹی نے ماچسٹر سے آنا ہے اس کے مزاج کے مطابق کمرہ ڈیکورٹ کرنا ہے، بہت بڑھی لکھی ہو گئی ہے اب وہ۔ جب تم واپس آؤ گی تو تمہیں سب بدلانا ہوا ملے گا۔ سب بہت خوب صورت ہو گیا ہے یہاں۔۔۔ بہت سے پھول لگوائے ہیں تمہارے لیے لان میں۔واجدہ کہہ رہا تھا تمہیں ایک کار بھی لے دے گا۔ اور ہاں میں تمہیں پارک لے جایا کروں گا تم وہاں سائیکل چلاتا۔ خاندان والوں سے، تو سمجھو،واجدہ نے رابطہ ہی ختم کر دیا ہے بہت کم آتا

”مجھے پتا ہے ٹرافی انگلینڈ کی ہے۔ کوئی فائدہ نہیں وہاں جانے کا۔“

”اچھا تو تم نے کرشل ہال میں پہلے سے ہی سارا میچ دیکھ لیا۔ اب بڑی یہ بھی بتا دے کہ کس کس کھلاڑی کو کس کس کھلاڑی سے پیٹ میں منہ پہ کمر پر لائیں اور گھونٹے پڑیں گے۔؟“

”ہی ہی۔“ عالیان نے دانت نکالے۔
 ”جوانی میں تم بنا دانتوں کے کچھ اچھے نہیں لگو گے۔“ ٹرافی ہماری ہے اور اسے لینے ہم برازیل برازیل
 جارہے ہیں بس۔“ کارل۔ نے دانت نکالے بغیر کہا۔
 ”برازیل چلو گی امرچہ؟“ کارل امرچہ کے پاس بھی آیا اسے منانے۔

”میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“ امرچہ نے بہانہ بنایا۔

”میرے پاس ہیں۔“ وہ مسکرایا۔
 جس کی وجہ سے اس نے لائبریری کی کتابوں پر بھاری فائن بھرا تھا۔ وہ اپنے پیسوں پر اسے برازیل لے کر جا رہا تھا۔ امرچہ نے بہت نرمی سے اسے دیکھا۔
 ”شکریہ کارل۔ تم بہت اچھے ہو۔“

”میں برا بھی بن جاؤں گا اگر تم برازیل نہیں آئیں۔“

وہ مسکرا دی اور ایک چائلڈ بیک میں سے نکال کر اس کے آگے کی جو اس نے پکڑ لی۔

”تم ایک خوش قسمت انسان ہو۔ کیونکہ تم کارل ہو۔“ کہہ کر وہ لائبریری سے نکل آئی۔

عالیان ’کارل‘ ویرا اور شاہ ویز جنھے کی رات کو ہی برازیل چلے گئے۔ سائی نے ٹھیک کہا تھا ساری یونیورسٹی ہی برازیل لینڈ کر رہی تھی۔

اس نے دادا سے میچ کا ذکر بھی نہیں کیا تھا لیکن ساوحنانے بتا دیا۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو کہ تمہیں میچ سے دلچسپی نہیں۔ تمہیں تو ویوز کا حصہ بننا تھا نا۔ یا تم مجھے معاف کرنے کے لیے تیار ہی نہیں امرچہ؟“ دادا اسے عالیان نہیں دے سکے تھے۔ وہ اب اسے سب دے

ہونے کے لیے تیار ہی نہیں۔ تمہارے لیے دنیا میں صرف ایک ہی انسان اہم ہے۔ باقی سب کی اہمیت صفر؟“ سائی نے افسوس کا کھلا اظہار کیا۔

”میرے لیے تم بھی بہت اہم ہو سائی۔“
 ”تم اس کے ساتھ فرانس چلی گئیں، لیکن تم نے مجھے انکار کر دیا۔ اب تم خود کو ایسے محدود کر لو گی اور اب تم ہر انسان کو اپنا دشمن سمجھو گی؟ تم نے ایک چیک دائم کو بھی دے دیا ہے۔ اب تو تم تھوڑی بہت تفریح کر سکتی ہو نا۔ تم میرے گروپ کے ساتھ چلو۔“

”سائی! تم مجھے بے جا مجبور کر رہے ہو جبکہ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔“

”چلو مجبور ہی سہی ہر انسان مرا جا رہا ہے برازیل جانے کے لیے۔ سارا مانچسٹر خالی ہو جائی گا۔ انگلینڈ اور برازیل آمنے سامنے ہوں گے۔ تم دیکھنا اسٹیڈیم میں کیسا ماحول ہو گا، تمہیں اتنا مزا آئے گا کہ حیران رہ جاؤ گی۔“

”سائی! تم سب جا رہے ہو۔ تو اس خالی مانچسٹر کی حفاظت کے لیے مجھے نہیں چھوڑ دو۔“

”تم میری حفاظت کے لیے میرے ساتھ چلو۔ تمہیں بہت زیادہ مزا آئے گا۔“

”مجھے اب کہیں مزا نہیں آتا سائی۔“

”بہت پار کی طرح تم مجھے پھر انکار کر رہی ہو۔“
 امرچہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس زمینی فرشتے کی طرف جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہا تھا۔ جس نے اسے اکیلا نہیں ہونے دیا تھا۔ جو رحمت تھا اس کے لیے۔ جو بہت مہربان رہتا تھا اس پر۔
 ”مہربان!“

کارل نے فریشرز پر صرف اتنی مہربانی کی کہ انہیں ترکیب سے بھر کا کر ان سے شرط لگا لگا کر انہیں مختلف کھیلوں کی جگہوں میں ہر اکرفٹ ہال میچ کی ٹکٹ کے لیے مجھ سے زیادہ پیسے اکٹھے کر لیے۔ عالیان جانا نہیں چاہتا تھا اور کارل اسے لے جائے بغیر چھوڑ نہیں رہا تھا۔

رہے تھے۔
اس کی بات نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس کی آنکھیں غم ہو گئیں، جو مشکل سے ہی خشک رہتی تھیں اب۔

”تمہارا آخری سسٹر ہے، پھر تم واپس آ جاؤ گی، جاؤ گھوم آؤ۔“ دادا نے ویرا کا نام نہیں لیا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ اسے ویرا کے نام سے تکلیف ہوتی ہوگی، جبکہ ایسا نہیں تھا۔ ویرا کی دوستی اور محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، بس اس نے اپنے گرد دائرہ کھینچ لیا تھا۔ ویرا نے تو اسے ساتھ لے جانے کے لیے باقاعدہ منت کی تھی۔

”تم اتنا کیوں بدل گئی ہو امرجہ؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ چلو ہمارے ساتھ۔“
”میں کب بدلی ہوں ویرا؟“
”تم کتنی شدت سے مجھے انکار کر رہی ہو، ہر بار کر دیتی ہو۔ تم آؤں گی، کیوں بن گئی ہو۔ ایسا لگتا ہے تمہارے بھیں میں کوئی اجنبی ہمارے درمیان گھس آیا ہے۔ اب تم عالیان کی بات بھی نہیں کرتیں، اسے تنگ کرنے بھی نہیں جانتیں اور بھی بہت کچھ ہے جو میں سنوس کرتی ہوں، لیکن میری عقل اسے تسلیم نہیں کرتی، مجھ کو ہم لگتا ہے سب۔“

”سب تمہارے وہم ہی ہیں ویرا۔ میری پڑھائی بہت ٹف ہو گئی ہے، میرا زیادہ وقت اسائنمنٹ بنانے میں گزرتا ہے۔“

ویرا خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ”روس تو چلو گی نا؟“
”ہاں۔“ اس نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔
”جلدی نہیں آنے دوں گی وہاں سے۔“ اس نے بھی انگلی اٹھا کر ہی دھمکایا۔

اور دونوں تہقہ لگا کر ہنسنے لگیں۔ ویرا نے اس کے دونوں گال پکڑ کر مروڑے۔
”مرجہ دل لاسٹ ڈک۔“ اپنا سر بھی دائیں بائیں ہلایا۔

”ویرا دی اجعز نیل۔“ امرجہ نے دونوں ہاتھوں

سے اس کے بال مٹھیوں میں بھر کر کھینچے۔
☆ ☆ ☆

گزر چکا وقت ریت پر نقش ہے اور وہ پھونکوں سے اس نقش کو مٹا رہا ہے۔
ماضی مٹ چکا ہے۔
اس نے قدم رکھا۔

گھنٹیوں نے فانوسی راگ، تخلیق کیا اور پھر بجا دیا۔
اس نے خود کو دھند میں گھرے ہوئے پایا۔

ہوا کی گرہ پر ان گنت فانوسی ذرے جتلانے رقص ہوئے۔ وہ کس طرف جائے اس کا فیصلہ اس نے اس کی خوشبو سے کیا اور وہ دھند کے لہاؤں کو نرمی سے ہٹاتے اس کی خوشبو کی اور بڑھنے لگا۔

اب گھنٹیاں مہورز (عاشق) کے حکم کی بجا آوری کرتیں۔ ”محرم“ کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے کو لپکیں۔

اس کی چال میں تیزی تھی، پھر بھی فاصلہ مٹ نہیں رہا تھا۔ البتہ خوشبو قریب آتی جا رہی تھی۔ دور اسے موٹے تنے کا پھیلا ہوا درخت نظر آیا اور دھند کے سنگ پریم پریت کا سرگم بننے گھنٹیوں کی آوازیں اللہ رکھا رحمان کی دھنیں بنیں، دل کو آ لینے کو ہوئیں۔ اور دل پر قابض ہو کر مودب ہو گئیں۔

”احترام واجب ہے۔“
”سہان عشق ہے۔“

ہلکی ہوا اس کے بال اڑا رہی تھی۔ گھنٹیاں سرخ پیغامات کے ساتھ بندھی شاخوں سے ٹنگی جھول رہی تھیں۔ ایک ہاتھ ایک شاخ کے ساتھ ایک پیغام باندھ رہا تھا۔

”وہ امرجہ تھی۔“
”مرجہ کیا کر رہی ہو؟“

آواز جادو کی طرح چھو منتر ہوئی۔
وہ خوشی سے پلٹی۔ ”تم آگئے عالیان؟“

”ہو نو اس۔“ کی روح میں سرایت ہو کر ساکت کر دینے والی شاعری رحمان کے سروں سے ہم کلام

کرتے تھے۔

”مرجہ کیا کر رہی ہو؟“
آواز جادو کی طرح چھو منتر ہوئی۔

وہ خوشی سے پلٹی۔ ”تم آگئے عالیان؟“
”ہو نو اس۔“ کی روح میں سرایت ہو کر ساکت کر دینے والی شاعری رحمان کے سروں سے ہم کلام

کرتے تھے۔

”نہیں۔ اب ہم دوست نہیں بن سکتے۔“ اس نے اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھا۔
 ”کیوں؟ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟“
 ”نہیں۔ یہ نہیں کر سکتی۔“
 ”محبت کرتی ہو؟“

”محبت۔ یہ بھی نہیں۔“
 ”کوئی جذبہ تو ہو گا تمہارے پاس میرے لیے؟“
 کشتی چٹیلی جھیل پر رواں دواں تھی اور پھر وہ ایک دوسرے پل کے اندھیرے میں جا چھپی۔ ابابیلوں کے جھنڈ پیچھے رہ گئے اور کونکلوں کی کونکوں نے اندھیرے کے سروں کا پیچھا کیا۔
 دوب (عمدہ گھاس) ٹمھل کی طرح بچھ گئی۔
 اندھیرے سے روشنی میں آتے اس نے اپنا ایک ہاتھ اس کی کمر میں پایا اور دوسرا اس کے ہاتھ میں پیوست۔
 ”شوق دید و اجاب ہے۔“
 ”سماں رقص ہے۔“

وہ سرخ پوشاک میں تھی اور اس کے بالوں میں لہریں تھیں۔ دوب الی، ہیوارنٹن پر وہ محور قص تھے۔ وہ شرمناک ایسے ہنس رہی تھی جیسے اسے اس پر اعتراض تھا۔

”نیلے سمندر میرے لیے سیاہ ہیں۔“ گنگناہٹ صورت اس نے سرگوشی کی۔
 ”تمہاری آنکھوں کی سیاہی میں بس جانے کا خط مجھے بہت پیارا ہے۔“
 وہ مسکراتے لگی۔ ”اور۔“

”میرے پیروں تلے کچھی سب ہی راہیں تم تک آتی ہیں۔ تم یہ جان لو میری سانسیں تم سے ہو کر آتی ہیں۔“

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ ”اور۔“
 ”مرحہ مجھے انتظار رہے گا کہ انتظار کب ختم ہو گا۔“ کہتے وہ اداس ہو گیا۔

”مجھے انتظار رہے گا کہ انتظار ختم ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔“ کہہ کر وہ بیٹھ گئی۔ بے تحاشا پھول اُگ آئے۔

ہو کر ”سماں یار“ میں ڈھل گئی۔
 ”یہ سب کیا ہے؟“ وہ اس سے زیادہ خوش ہوا۔
 ”ہماری کہانی تم نے یہ پیغامات مجھ سے نہیں لیے تو میں نے یہاں باندھ دیے۔“ وہ چل کر ایک پیغام کے پاس گیا اور اسے پڑھنے لگا۔

”میں اپنی ابتدا پر تمہارا نام لکھتی ہوں اور میری انتہا تمہارے سوا کچھ نہیں۔“ بڑھ کر وہ مسکراتے لگا۔
 مرحہ۔ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے لے گئی اور دائیں بائیں جھول کر شرارت سے مسکراتے لگی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر شاخوں سے جھولتیں کھنٹیوں کو ترنم سے ایسے بجا ڈالا جیسے ”اسد اللہ خان غالب“ کے کلام سے لبالب ہوئے چاندی کے ظروف وادی کیلاش کی پربوں کی نازک انگلیوں تلخ بجائے۔
 ”ارنگا زواج ہے۔“

”سماں یار ہے۔“
 کشتی کی لمبی ٹوک جو پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ دھندلے اندھیرے پل کے نیچے سے نکلی اور اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر اس پر اچھال دیا۔

”عالیان ہے۔“
 اور ایک ایسی مسکراہٹ خود پر سجالی۔ جیسے وہ پرستان کی ملکہ ہو اور اپنے پری زاد کے ساتھ بکھی پر سوار گلستان کا پرواز پر جاری ہو۔
 ”مجھے تمہاری مسکراہٹ یاد آتی ہے اور میں خود مسکراتا بھول جاتا ہوں۔“ عالیان نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور دن سے روشن اس کی آنکھوں کو پایا۔

”میری ساری مسکراہٹیں تم نے لے لیں اب کہتے ہو مسکراتا بھول گئے۔ تم آنکھوں کی پتلیاں گول گول گھمایا کرتی تھیں؟“
 ”تم کہا کرتے تھے تو کرنی تھی اب تم کہتے ہی نہیں۔“ وہ اٹھلا گئی۔

”مرحہ۔ چلو ہم پھر سے دوست بن جاتے ہیں۔“
 اس کے ہاتھ کی پشت کو اس نے باری باری اپنی آنکھوں سے لگایا۔

وجود کی طرف موڑ کر اسے نہ کھلا۔ اس کے آس پاس خون ہی خون تھا۔ وہ اپنی جگہ بتہنا کھڑا تھا۔ اور ذرا دور اس کی بند ہو جانے پر مائل آنکھیں اس پر پکی تھیں۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ اس کی طرف نہیں بڑھ رہا تھا۔

وہ کھڑا تھا۔ وہ کھڑا رہی رہا۔
”اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔“
”یہ توبہ باف ہیں۔“

اپنے لمبے لمباؤں میں لپٹی وہ ”چاہ توبہ“ کے گرد دائرہ بنا کر بیٹھ گئیں۔ پیشانی سے پھیچ کر کناروں کو ناک تک لائیں اور ایک ساتھ اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا لیے۔ اندھیری رات ان پر سایہ نکلن تھی اور ”آب توبہ“ زمین کی تہوں میں جل جھل ہو رہا تھا۔

انہوں نے دعا کی ابتدا کی۔ ”اے خدا۔“
اور آنکھیں بند کر لیں۔
عالیان نے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ نہیں رہا تھا اور اس کے دل نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔ اسے بہت دیر میں یاد آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے اٹھنے کی ہمت کی، لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی۔

مارگریٹ کے مرنے کے بعد اس کے ساتھ یہ ہوتا رہا تھا۔ وہ اپنی من پسند جگہوں پر اس کے ساتھ پایا جاتا رہا تھا۔ اب پھر یوں۔ امرتہ کے ساتھ۔
جسم کی گرمی سے اس کا منہ جل رہا تھا۔ اٹھ کر وہ

واش روم میں گیا اور منہ دھو کر نچ پانی پیا۔ وہ برازیل میں تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں دوسرے سنگل بیڈ پر موجود کارل بے خبر سو رہا تھا۔ وہ ٹیرس پر آگیا اور بہت دیر تک شہر کی ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی کیفیت واپس بائیسٹر کی طرف بھاگ جانے کی سی ہو گئی تھی۔ ششکاک کی طرف۔ کھڑکی کے نیچے۔

اس پر ہلکی سی کپکپی طاری تھی اور اس کے ہاتھ واضح کانپ رہے تھے۔ اس کا ٹیرس کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھ کر رونے کو دل چاہا۔ بہت زیادہ روتے رہنے کا۔

”بتاؤ تم کس کے لیے جان دے سکتی ہو؟“ وہ بھی اس کے پاس نیچے بیٹھ گیا۔
”جان تو کب کی دے دی۔“

”ہم نے بہت گریز کر دی تا امرتہ؟“
”ہاں بہت۔ اور اب سوچنے کا وقت نکل گیا۔“

”میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔“
”میں تمہیں بھول ہی نہیں پائی۔“
”تمہیں مجھے یہ بتانا چاہیے تھا۔“

”تمہیں یاد رکھتے رکھتے میں سب بھول گئی، تمہیں بتانا بھی۔ تمہیں یاد رکھتے میں نے کچھ اور یاد رکھنا ضروری نہیں سمجھا۔“

”میں عایان نہ ہوتا تو تمہارا خواب ہوتا جسے تم ہر رات دیکھتیں۔“

”میں امرتہ ہو کر بھی عایان ہی ہوں، تم میرے اندر بس چکے ہو، میں نے اپنا آپ رخصت کر دیا ہے، عایان۔“

”تم ایک جاوگر ہو امرتہ۔“ وہ خود کو اس کی آنکھوں کے اتنے قریب لے گیا کہ اس کی پلکیں امرتہ کے گلابی گالوں پر لرزنے لگیں۔

”تم میرا سحر ہو عایان۔“
”تم۔۔۔ محبت مجھ پر فرض ہے۔“

”میں نے اس فرض کو قضا نہیں ہونے دیا۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“
”پتا نہیں۔“

”رک جاؤ۔“ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”روک لو۔“ اس نے گردن موڑ کر کہا خود کو

نہیں۔
تیز روشنی نیم اندھیرے میں بدل گئی۔ خوف اور درد کی تسلیی مقام نامعلوم سے اڑانی ہوئی آئیں۔ وہ

سب سیاہ تھیں۔ انہوں نے کابل بجا۔
”دعا واجب ہے۔“

”سماں ہاتھ ہے۔“
اس نے جھٹکے سے گردن کو اس کے گرتے ہوئے

وہ ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو ہاتھوں میں تھام لیا اور پھر اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ خواب کے آخری حصے کو دہراتا۔ نون بیڈ سائیڈ سے اٹھا کر واپس میسر پر آکر اس نے سائی کو فون کیا۔
”تم انیک ہو سائی؟“

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ کیوں کیا ہوا۔ اس وقت فون کیا تم نے؟“ سائی خود بھی نیند سے جاگا ہوا لگ رہا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں ہوا۔ بس ایسے ہی فون کیا۔“ سائی کچھ دیر خاموش رہا۔ ”تمہیں کچھ کہنا ہے مجھ سے؟“

”ہاں۔۔۔“
”کہو۔۔۔“

”میرا بہت رونے کو دل چاہ رہا ہے۔ مجھے روشنی میں بھی اندھیرا نظر آ رہا ہے۔“

”تم ہمارا گریٹ کو یاد کر کے سوئے تھے؟“
”نہیں میں نے بہت اچھے تصورات کے ساتھ یاد کیا۔ میں نے ان کے ساتھ بہت اچھی باتیں کی۔ میں اب کی اپنی کیفیت ٹھیک سے سمجھ نہیں پا رہا سائی۔“
”تمہیں ایک اچھی نیند لینی چاہیے۔“

”ہاں۔۔۔ شاید۔ سائی! تمہاری آمرہ سے کب ملاقات ہوئی تھی؟“

سائی اپنے بستر پر پورا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے جیسے صدیاں بعد آمرہ کا نام لیا تھا۔

”آرہ! ملاقات ہوئی تھی۔ تم اسے فون کر سکتے ہو۔“ سائی خوشی سے بولا۔

”ٹھیک ہے وہ؟“ اس کی کپکپاہٹ کچھ کم ہوئی۔
”ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ بہت اچھا لگا تم نے اس کے بارے میں پوچھا۔“

”شکریہ سائی۔ تم سو جاؤ اب۔۔۔“ شاید اس نے سائی کو بلاوجہ پریشان کیا۔

”تم سمجھ لے۔“
فون کو وہ ہاتھ میں لے کر سوچتا رہا۔ پھر ہوٹل کے

کاؤنٹر تک آیا اور آمرہ کو فون کیا۔
”ہیلو۔۔۔“ آمرہ کی آواز آئی۔

وہ خاموش رہا۔ وہ بات کہاں سے شروع کرے گا اور کہاں ختم کرے گا۔ اور کسے گا کیا۔ تو وہ خاموش ہی رہا۔ آمرہ نے فون بند کر دیا۔

”میں نے تمہیں بہت یاد کیا آمرہ!“ فون بند ہو چکا تو وہ بڑبڑایا۔

”میں نے تمہیں وہ سزا دی جو خود میں نے بھگتی۔“ وہ کمرے میں واپس آ گیا اور میسر پر کھڑا ہو گیا۔ اسے نہیں لگتا تھا کہ اسے نیند آ سکے گی اب۔

آنکھیں جاگتے رہے، کا عہد باندھ چکی تھیں۔ وہ سائی اور اس کے ساتھ برازیل آ چکی تھی۔ وہ کافی دیر سے میسر پر کھڑی تھی۔ اندر اس سو رہی تھی۔ ابھی جو فون آیا تھا اس نے جان لیا تھا کس کا تھا۔

اس شخص کو شبہ تھا کہ وہ اس کی خاموشی کو پہچان نہیں سکتی اور اسے یقین تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔

کلام کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہوگی، پہچان کے لیے نہیں۔ کیا وہ اسے پھر سے یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے اسے کتنی تکلیف کاٹنی پڑی۔ وہ کس تکلیف سے گزرا۔ اس کی اچھی بھلی زندگی کو اس نے اندھا کنواں بنا دیا۔ روشنی اندر جاتی ہے نہ اندھیرا باہر نکلتا ہے۔

وہ سب جو وہ اسے نہیں کہہ سکا۔ وہ اب کہنا چاہتا ہے۔ آمرہ کو خوف محسوس ہوا۔ خوف سے اس کا وہم کسی اثر دھم کی طرح دیو بیکل ہو گیا۔

اب وہ نئے سرے سے سوچ رہا تھا۔ پہلے دن سے پہلی ملاقات سے۔ پہلے جملے سے۔ ایک لڑکی جس کی آنکھوں کا ااجل ایسے پھیل گیا ہے کہ گالوں کو بھی سیاہ کر گیا ہے۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہے۔ وہی لڑکی ڈریگن ڈریس میں اس کے ساتھ کھڑی ہے اور پھر وہی لڑکی ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ وہ چھپ کر بیٹھتا ہے تو بھی۔ یہ کیسی لڑکی ہے جو اس کے سائے سے زیادہ اس کے ساتھ ہے۔

روح سے زیادہ اس پر سوار ہے۔

”تم کہتے ہو تم ماما مارگریٹ نہ بن جاؤ اور مجھے یہ خوف ہے کہ تم ولید البشر بن جاؤ گے“ اپنا کر چھوڑ دینے والے۔“ ماما نے کہا تھا۔
اس نے اپنا سر تھام لیا۔

سراٹھا کر اس نے چند گہرے گہرے سانس لیے۔ کچھ بھی تھا۔ وہ خوش تھی کہ عالیان نے اسے فون کیا تھا۔ برا بھلا کہنے کے لیے ہی سہی۔ وہ اسے یاد تو رکھتا تھا۔ اس کا نام بھولا نہیں تھا۔ دنیا میں کوئی امرہ بھی ہے اس میں یہ احساس زندہ تھا۔

زندہ رہنے کے لیے بہت ضرورتیں درپیش ہوں گی، لیکن جینے کے لیے صرف ”ایک“ امرہ کے لیے۔ ”ایک عالیان“ عالیان کے لیے۔ ”ایک امرہ“



آئیے برازیل اسٹیڈیم کے اندر چلتے ہیں۔ سیریز کا فیصلہ کن میچ ہے۔ انگلینڈ اور برازیل آمنے سامنے آنے والے ہیں۔ لگتا ہے سارا برازیل اٹھ کر اسٹیڈیم میں آگیا ہے۔ میچ شروع ہونے سے پہلے ہی لگ رہا ہے۔ میچ ختم ہونے کے قریب ہے۔ دونوں ٹیمیں ایک ایک گول کر چکی ہیں اور اب دونوں ٹیموں کے شاہتین مرے جارہے ہیں کہ بس ان کی ٹیم فیصلہ کن گول کر دے۔ برازیلین شاہتین کچھ تندی میں تھے۔ وہ انگلینڈ کے شاہتین اور کھلاڑیوں کے نام لے لے کر فقرے چست کر رہے تھے۔ انہیں بتا رہے تھے کہ انگلینڈ ٹیم کس بری طرح سے ہار جانے والی ہے۔ یہ سب ہونا معمول ہے۔ فٹ بال کی دنیا میں جو نہیں ہوتا وہی کم ہوتا ہے۔ شاہتین جتنا زیادہ کرتے ہیں۔ کم ہی کرتے ہیں۔ فٹ بال فیور اسٹیڈیم کے اندر اتنے ہائی نمپر بچے ہوتا ہے۔ جیسے وہاں اہتمام سے ایک آتش فشاں پھٹنے والا ہو۔ اس فیور کا تصور اسکرین سے میچ دیکھنے والے کر ہی نہیں سکتے۔

وہ۔۔۔ ویرا۔۔۔ کارل اور چند دوسرے یونی فیلوز آگے پیچھے بیٹھے تھے۔ انہوں نے انگلینڈ ٹیم کی شرٹس پہن

رکھی تھیں اور کارل، ویرا نے اچھل اچھل کر سارا اسٹیڈیم ابھی سے سر پر اٹھالیا تھا۔ عالیان خاموش بیٹھا انہیں ناچتے دیکھ رہا تھا۔

ایسے ہی ناچتے کودتے کارل۔ نے ایک پیاری سی بچی کی گود میں رکھے سینڈویچز غائب کر دیے۔ بچی جس کے ماما پاپا اس کے پاس ہی کھڑے، اپنی دھن میں اچھل رہے تھے، تاکہ وہ اسکرین پر نظر آسکیں۔ ایک دم سے اپنی گود کو خالی پا کر رونے لگی اور اپنے اچھلتے کودتے باپ کی شرٹ کھینچنے لگی۔

”شرم کرو لٹل اینجل کو رلا دیا۔“ عالیان نے تیزی سے چلتے اس کے جڑے کو دونوں ہاتھوں میں سختی سے دبا کر کہا۔ بچی ان سے ذرا سی دور ہی بیٹھی تھی۔

”اینجل تو کسی نہ کسی طرح زندہ رہی لیتے ہیں ہم شیطانوں کو اپنا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ مجھے بھوک لگی تھی، میں نے محنت کی اور خوراک حاصل کر لی۔ ویسے بھی اس کا باپ اسے اور لے دے گا۔ میرا تو کوئی باپ نہیں ہے نا جو مجھے لے کر دے گا۔“

”میں ابھی بچی کے باپ کو بتا ہوں۔“ عالیان اس کی طرف جانے لگا۔

”اگر تم نے یہ کہا تو برازیل میں فٹ بال کی تاریخ کا سب سے بڑا ہنگامہ ہو گا اور وجہ صرف سینڈویچ ہو گا۔ ایک سینڈویچ کے لیے تم نجانے کتنے شاہتین کو مروا دو گے اور کتنوں کو زخمی کرو کر عمر بھر کے لیے معذور کر دو گے۔“

”یہ میں کروں گا؟“ عالیان نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر کہا۔

”ہاں تم۔۔۔ صرف تم۔“ اس نے بھی عالیان کے بال مٹھی میں جکڑ لیے۔ برازیل اسٹیڈیم میں دو لڑکے ایک دوسرے کے بال مٹھیوں میں جکڑے کھڑے تھے۔

بچی کے ہاتھ میں اب ایک بڑی آئس کینڈی آچکی تھی اور کارل اب آئس کینڈی کو دیکھنے لگا تھا۔ بچی کے باپ نے پھرئی سے بچی کو چپ کرا دیا تھا۔

”تمہاری لٹل اینجل کی پسند اچھی ہے۔ مجھے یاد

آیا کہ میں آئس کینڈی کو بہت دنوں سے بہت مس کر رہا تھا۔" کارل نے آنکھیں گھول گھما کر کہا۔
 عالیان ہنس دیا۔ "تم ایسے کیوں ہو؟"
 "لڈل اینجیل سا؟" کارل نے معصومیت سے
 آنکھیں ہٹھائیں۔ "Big Devil (بگ ڈیول) سا؟"

"کیا میں بگ ڈیول ہوں۔۔۔ نہیں نا؟ اس نے پیچھے بیٹھی قصبہ گو کی طرف رخ موڑ کر کہا اور رشوت کے طور پر جیب سے چاکلیٹ نکال کر آگے کی۔
 عالیان پھر مسکرا دیا۔ "بند کرو اپنا ڈراما۔"
 "ویاے تم بہت گم صم سے ہو۔ کچھ ہوا ہے؟"
 "میں ٹھیک ہوں۔ ہونا کیا ہے؟" کارل کی نظروں سے وہ فرار نہیں سکتا تھا۔

"کچھ ہے تو بتاؤ فرش۔ کیا تم شور سے پریشان ہو۔ یونوی سارا اسٹینڈیم خالی کروا سکتا ہوں۔ ابھی جا کر کسی برازیلیئر، فین کو دیوچ لیتا ہوں اور اس کی ٹیم کے بارے میں کچھ بھڑکتا ہوا جملہ کہہ دیتا ہوں۔ بس پھر گیم شروع۔ اور ہاں جو افواہ میں ہم کی یہاں پھیلا سکتا ہوں۔ وہ ہم بننے سے اب تک کسی نے نہیں پھیلائی ہوگی۔ بس پھر اسٹینڈیم خالی۔"

"اتنے پیسے لگا کر ہم میچ دیکھنے آئے ہیں خالی اسٹینڈیم نہیں۔"
 "تا نہیں کیوں، لیکن مجھے میچ دیکھنے سے زیادہ دلچسپی کسی اور چیز کو دیکھنے میں ہے۔ بڑی اگر میں شائقین کو آپس میں لڑوا دوں، کیسا رہے گا۔ میچ واقعی بار دیکھ چکے ہیں ہم، اب ذرا یہ بھی تو دیکھیں براہ راست ہنگامہ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔"

"پیشے کی خلی بوتلیں تمہارے سر پر آکر لگیں گی نا تو مزا آجائے گا۔ براہ راست ہنگامہ دیکھنے کا۔"
 "وہ انسان ابھی بنا نہیں جو کارل کے ساتھ یہ کر سکے۔" کارل ادھر ادھر دیکھنے لگا اور کس کے پاس سے کھانے کی چیز اڑائی جاسکتی ہے۔
 "وہ بنا بنایا انسان تمہارے ساتھ بیٹھا ہے۔"
 "تم بھی کارل ہی ہو۔" کارل نے اس کے دونوں

گال پکڑ کر موڑے۔
 میچ شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ بڑی بڑی اسکریٹوں پر اسٹینڈیم میں موجود شائقین دکھائے جا رہے تھے۔

"یہ مقامی شائقین تو ابھی سے پاگل ہو رہے ہیں۔" کارل نے ذرا دور موجود ایک لڑکے کی طرف اشارہ کیا جو اپنی ٹیم کے حق میں عجیب و غریب نعرے لگا رہا تھا۔

"تمہارا بھی نشہ ٹوٹ رہا ہوگا، جا کر تم بھی اس کے ساتھ تھوڑا پاگل ہو جاؤ۔" عالیان نے اسے اسی لڑکے کی سمت دھکا دیا۔

امرحہ نے سائی کو مڑم کر دیا تھا کہ وہ ویرا کو نہ بتائے کہ وہ وہاں موجود ہے۔ انہیں سائی کی آمد کا پتا تھا۔ اس کی نہیں۔ ویسے بھی کل انہوں نے چلے جانا تھا۔ اس اور امرحہ نے بھی انگلینڈ ٹیم کی شرتس پہن رکھی تھیں۔ اس لیے اچھل رہی تھی جیسے وہ چلائی نہ ہو، بلکہ برطانوی ہو اور اس کا ایک آدھ بھائی یا دوست ٹیم میں شامل ہو۔ اس نے ٹیم کی نمائندگی کرتی بسی سی ٹوپی بھی پہن رکھی تھی اور منہ کو پورا رنگا ہوا تھا، ساتھ ہاتھ میں بورڈ پکڑ رکھا تھا۔ "رائی ہماری ہے۔" جس پر پیچھے کہیں سے کسی نے کلمہ بال پھینک کر اسے بد نما کر دیا تھا۔ یعنی رائی انگلینڈ کی نہیں برازیل کی ہے۔

منظر کچھ ایسا تھا جیسے ورلڈ کپ فائنل ہو۔
 امرحہ کچھ بستر محسوس کر رہی تھی وہاں آکر۔ ویسے بھی رات کو جو عالیان نے کل کی بھی اور کسی بھی وجہ کو لے کر کی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت بڑی بات تھی۔ وہ بھی کھڑی ہو کر اس کے ساتھ اچھلنے لگی اور سیرسل کے طور پر بتائی جانے والی "ویز" کا حصہ بننے لگی۔ پورے اسٹینڈیم میں لہریں گھوم رہی تھیں اور یہ قابل دید منظر تھا۔

وہ ہنسنے لگی۔ اسے سب اچھا لگا۔ جیسے سارے غم بس مٹ گئے۔
 امرحہ۔ "عالیان۔ ویرا" کارل ایک ساتھ چلائے۔

اسکرین پر اچھلتی این کے قریب وہ کھڑی تھی اور اپنی طرف آنے والی "تھر" کی طرف دیکھ رہی تھی اور خوش قسمتی سے ان تینوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ویرا نے فون کیا۔

"تم کہاں ہو؟"

امرحہ ہنس دی۔ "اسٹیڈیم" "پاگل۔ گندی بچی سے بتائیں سکتی تھیں؟"

"میں نے سوہا سربراہیوں۔"

"سربراہی اسکرین پر آگے۔" ویرا ہنسی۔ وہ بہت خوش تھی اسے دیکھ کر۔

"این اور امرحہ سائی کے ساتھ ہیں۔" ویرا نے ان سب کو بتایا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تمہارے ساتھ امرحہ بھی ہے۔" عالیان نے سائی کو فون کیا۔

"اس نے منع کیا تھا عالیان۔"

عالیان خاموش ہو گیا اور اسکرین کی طرف ہی دیکھتا رہا کہ وہ پھر سے نظر آجائے، لیکن اب گراؤنڈ میں کھلاڑی آتے نظر آرہے تھے۔

میچ شروع ہو گیا۔

فرسٹ ہاف میں انگلینڈ کی ٹیم نے ایک گول کر دیا۔ لیکن انگلینڈ کے شائقین سے زیادہ برازیلیں شائقین دیوانے ہو رہے تھے۔ "غصے سے" انہیں ریفری کا برازیل ٹیم کے ایک اہم کھلاڑی کو ریڈ کارڈ دکھائے جانے سے اختلاف تھا۔ ان کے آس پاس موجود شائقین ریفری کو گالیاں دے رہے تھے کہ اگر وہ یہ فاول نہ کرتا تو ٹیم دو گول کر چکی ہوتی اور مخالف ٹیم کو گول کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔

"بچوں بچ کر۔ برازیلیوں کے زرخے میں گھرے بیٹھے ہو۔" ویرا نے مذاقاً کہا۔

"اگر دو سر گول بھی انگلینڈ نے کر دیا تو انہوں نے انگلینڈ ٹیم کے کھلاڑیوں کی بجائے ہماری گردنیں دیوچ لینی ہیں۔" عالیان ہنسنے لگا۔

وہ یہ سب مذاق میں کہہ رہے تھے۔ اسٹیڈیم میں ایسا کریز معمول کی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر بھی مقامی

شائقین کے تیور کافی بگڑ رہے۔ تھ۔ ان کا خیال تھا سارے ریفری انگلینڈ ٹیم کے سرے کھلاڑی فاول کھیل رہے ہیں۔

امرحہ کے پیچھے بھڑکتے ہوئے فاول فاول کے امرے لگنے لگے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے سائی؟ پیچھے وئی لڑائی ہو رہی ہے کیا؟" امرحہ سم گئی۔

"یہ سب ہوتا رہتا ہے امرحہ۔ آخری منٹوں میں دیکھنا کیا ہوتا ہے۔"

دو سراہاف شروع تھا۔ انگلینڈ کا ڈیفنس اچھا تھا۔ مخالف ٹیم کی سرٹوڑ کو ششوں کو وہ ناکام ہتا رہے تھے۔

دو سراہاف ختم ہونے سے پندرہ منٹ پہلے ویرا کو ایک میسج آیا۔ موبائل پر جسے پڑھ کر وہ تھوڑا سا پریشان ہو گئی۔

"کیا ہوا۔" شاہویر نے پوچھا۔

میرے جرنلسٹ دوست کا میسج آیا ہے۔ وہ بھی یہاں موجود ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے کسی متوقع ہنگامے کی خبر ملی ہے۔

"کیسے ہنگامے کی؟"

"زیادہ اسے بھی نہیں معلوم اس کا کہنا ہے کہ کوئی حکومت مخالف گروپ ہے جو اپنے مفادات کے لیے کوئی ہنگامہ کروانا چاہتا ہے۔ شاید غیر ملکوں کو نشانہ بنانا ایسا ہی کچھ۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ ایسی خبریں پھیل ہی جاتی ہیں، سکیورٹی بہت اچھی ہے، پولیس جانتی ہے کیسے امن رکھنا ہے اور جو خبر تمہیں ملی ہے وہ حکومت کو بھی تو ملی ہی ہوگی نا۔" کارل نے کہا۔ "ویسے اچھا ہے ہنگامہ ہو ہی جائے میں بھی تو دیکھوں یہ فلم ہٹا نکٹ کے۔"

"اور پھر تمہارا دوست کنفرم بھی نہیں ہے۔"

عالیان نے کہا۔

ویرا نے سب دوستوں کو میسج کر دیا کہ میچ ختم ہوتے ہی فوراً "اسٹیڈیم" سے نکل جائیں۔ خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ کوئی بد مزگی نظر آئے تو پرسکون رہیں۔

ویرا نے سب دوستوں کو میسج کر دیا کہ میچ ختم ہوتے ہی فوراً "اسٹیڈیم" سے نکل جائیں۔ خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ کوئی بد مزگی نظر آئے تو پرسکون رہیں۔

ویرا نے سب دوستوں کو میسج کر دیا کہ میچ ختم ہوتے ہی فوراً "اسٹیڈیم" سے نکل جائیں۔ خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ کوئی بد مزگی نظر آئے تو پرسکون رہیں۔

ویرا نے سب دوستوں کو میسج کر دیا کہ میچ ختم ہوتے ہی فوراً "اسٹیڈیم" سے نکل جائیں۔ خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں۔ کوئی بد مزگی نظر آئے تو پرسکون رہیں۔

آخری پندرہ منٹ میں برازیلیوں نے
ایڑی چوٹی کا زور لگادیا، لیکن آخری چھٹے منٹ میں گول
انگلینڈ نے کر دیا۔

جوش اور افسوس سے دونوں ٹیموں کے شائقین
نے اسٹیڈیم سربراہ اٹھالیا۔ سائی ویرا کا پیغام پڑھ چکا تھا۔
اس نے امرجہ اور اس کو چلنے کے لیے کہا۔ عالیان اور
ویرا اٹھ چکے تھے۔ جبکہ اچھلتا کودتا کارل پہلے ہی کہیں
غائب ہو چکا تھا۔ ویرا نے اب واضح خطرے کی بوسونگھ
لی تھی۔ کہیں کوئی ایک ایسا نعرہ گونجتا کہ اس حصے میں
بات بڑھ جاتی۔ میچ کے دوران گلی گلوچ، ہاتھ پائی،
تو تراخ، خالی بوتلیں پھینکنا عام باتیں تھیں، لیکن ایسی
تندی اور طیش نہیں ہوتا تھا جو اب دکھائی دے رہا تھا۔
جیسے سب جان بوجھ کر کیا جا رہا تھا۔

”سائی نکل چکا ہے؟“ عالیان نے پوچھا۔

”ہاں۔ اس نے کہا وہ جا رہا ہے۔“ ویرا نے فون
کان سے ہٹایا۔

وہ دونوں اسٹیڈیم سے باہر آگئے اور ابھی وہ سڑک
تک آئے ہی تھے کہ پولیس کی نفری تیزی سے اندر
اسٹیڈیم کی طرف بھاگتی ہوئی نظر آئی۔ ان کا انداز
الٹ تھا۔ ایک دم ہی اسٹیڈیم کے باہر اسٹیڈیم کے
اندر کچھ ہو جائے، کا منظر نمایاں ہو گیا۔

”چلو عالیان۔۔۔ جلدی چلو۔“ ویرا آگے کو بھاگی وہ
بھی سڑک پر اس کے ساتھ بھاگا اور ذرا دور جا کر رک
گیا۔

”کیا ہوا؟“ ویرا پلٹی۔

”مرجہ!“ اس کے چہرے کے سارے رنگ اڑ گئے
اور اسے دیکھ کر ویرا کی اپنی شکل پر سائے سے لہرائے
ویرا نے فون نکالا۔ امرجہ کو فون کرنے کے لیے۔
لیکن عالیان پہلے ہی کال ملا چکا تھا۔

دوبارہ ٹیل ہوئی۔ ”ہیلو!“ امرجہ کی آواز آئی۔

”مرجہ! تم کہاں ہو؟“

الفاظ پورے، ادا نہیں ہوئے کہ فون بٹید ہو گیا۔ اس
نے دوبارہ کال ملائی، لیکن فون بند جا رہا تھا۔

اس کا فون بند جانا ہی تھا۔ اس کے فون کی بیڑی نکل
چکی تھی اور وہ کہیں دور گر گیا تھا اور وہ خود بھی گر گئی
تھی۔ وہ بس نکل جانے کو ہی تھے کہ بھڑکا ہوا ایک
گروپ اوپر سے کشم کشا ہوتا ان کے اوپر آکر گرا۔
امرجہ کا سر ایک سخت چیز سے ٹکرایا اور اس کے سر
سے خون نکلنے لگا۔ سائی نے جلدی سے اسے اٹھایا۔
ایک مقامی فین نے سائی کو دھکا دیا، سائی بھی دور جا
گرا۔

میچ کا آخری منٹ ختم ہو چکا تھا۔ انگلش ٹیم جیت
چکی تھی اور فوراً ہی اسٹیڈیم میں مختلف جگہوں پر
گروپ کے گروپ آپس میں الجھ کر کشم کشا ہو گئے
اور ایک دوسرے پر مختلف ٹھوس چیزیں پھینکنے لگے۔
اس سارے عمل کو تمس سیکنڈ بھی نہیں لگے ہوں
گئے، جیسے کہ سب کچھ پلان تھا کہ ایسا ہی ہونا ہے۔

اسٹیڈیم کی اندرونی حالت ایک دم سے بدلی اور عام
شائقین سہم گئے۔ منظر ہولناک ہو گیا۔ شور بڑھ گیا
اور ہنگامے کے آثار نمایاں ہو گئے جو چھپا ہوا تھا وہ نکل
آیا۔ اسٹیڈیم نے جنگ کا میدان بدلنے میں ایک منٹ
کا وقت بھی نہ لیا۔ این کہیں آگے نکل چکی تھی۔
امرجہ کو سر پر چوٹ کی وجہ سے، بری طرح سے جکڑ
آ رہے تھے۔ سائی بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اکیلی دھکے
کھاتی، جگہ بتاتی آگے بڑھنے لگی کہ ایک ہی لڑکے
نے اس کا بازو دبوچ لیا۔ سیکورس فوج تیزی سے اندر
داخل ہو رہی تھی۔ ساٹھ ہزار شائقین کے ہجوم میں
ایک دم سے بھگدڑ مچی۔ تیزی سے باہر نکل جانے کا
انداز ایسا ہو گیا جیسے قیامت آگئی ہو۔ خالی بوتلیں اور
جسم کے دوسرے حصوں پر آرٹگئے لگیں۔ دوبارہ
امرجہ کی کمر پر کوئی دھننی چیز آکر لگی۔ جس نے اس کا بازو
دبوچا تھا۔ پوری قوت لگا کر اس سے بازو چھڑوا کر وہ
آگے کو بھاگی تھی۔ لیکن اس کے بازو پر پھروہی گرفت
پڑی اور سرخ آنکھوں والے اس علوی کسی بھی لڑکے
نے اس کی گردن پر جھک کر کاٹنا چاہا۔ امرجہ نے پوری
شدت سے چیخ ماری۔

اس کا فون بند جا رہا ہے، یہ معلوم ہوتے ہی اپنا فون

سڑک پر ہی پھینک کر وہ رش میں مخالف سمت بھاگا۔
وہ ابھی اس کے پیچھے لپکی۔

”تم اس گیٹ کی طرف جاؤ میں دوسرے گیٹ کی طرف جاتی ہوں۔“ بھاگتے ہوئے ویرا چلائی۔

اس کے بھاگنے کے انداز میں اتنی شدت اور تیزی تھی کہ وہ بہت سوں کو پھلانگتا گرا تا دھکے دیتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک جھوم تھا جو منتشر یا ہر نکل رہا تھا اور پولیس کی نفی بڑھتی ہی جا رہی تھی جو جھوم میں نظم لائے کی کوشش کر رہے تھے۔ بچوں کے رونے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ بھگدڑ کا ماحول تھا۔

”مرچہ!“ وہ پوری قوت سے رش میں گھس کر چلانے لگا اس کی آواز میں ایسی گرج تھی کہ اتنی افرا تفری میں بھی بہت سوں نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”مرچہ!“ وہ پھر چلایا۔ اس کی سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ اگر ”مرچہ فوراً“ اس کے سامنے آجاتی تو وہ زمین پر گر جاتا۔ اس میں کھڑا ہونے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ وہم اسے ہولانے لگے تھے اور خوف نے اس کے دل پر پتے گاڑ دیے تھے۔

اسے الہام ہوا اور وہ گیٹ سے اندر ہو گیا۔ پولیس کی نفی کھڑی سب کو باہر نکال رہی تھی، لیکن وہ سر کو جھکا کر اس بار ہو گیا۔ اسے پورے اسٹیفیم کے ہزاروں چکر بھی لگانے پڑتے تو اسے تم لگتے اس انسان کے لیے جسے تلاش کیا جا رہا تھا۔

”مرچہ باہر ہو سکتی تھی۔ اسے یہ خیال آیا تھا، لیکن اس کا وجدان اسے بتا رہا تھا کہ وہ اندر ہی ہے اور ٹھیک نہیں۔“

اس نے اس کا بازو کسی خونخوار جانور کی طرح پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے گھسیٹ کر کسی خاص سمت لے کر جا رہا تھا۔ وہ چلا رہی تھی، خود کو آزاد کروانے کی کوششیں کر رہی تھی، لیکن اسی ہی کے دوسرے ساتھی نے اس کے گرد گھیرا سا بنالیا تھا اور اسے مضبوطی سے کمر سے پکڑ رکھا تھا اور وہ دونوں آپس میں اپنی زبان میں بات کر رہے تھے جسے ”مرچہ“ نہیں جانتی

تھی۔

عالیان تیزی سے اوپر اڑھ بھاگ رہا تھا اور اسے مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر گراؤنڈ کے اوپر پرواز کرنے لگا۔ یعنی معاملہ شدت اختیار کر چکا تھا۔

سیکورٹی فورس ہر طرف پھیل رہی تھی۔ کہیں سیکورٹی فورس اور شائقین میں تصادم ہو رہا تھا۔ کہیں شائقین اور شائقین میں۔ معاملہ ایسے بگڑ رہا تھا جیسے جلتی آگ پر اور تیل ڈالا جا رہا ہو۔

وہ اسے دوسرے گیٹ سے نکال کر باہر لے جا رہے تھے۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ اسے کسی گاڑی میں ڈال کر لے جانے والے ہیں۔ وہ معاشرے کے موقع سے فائدہ اٹھانے والے، ناسور تھے جو ہر جگہ پائے جاتے ہیں اور اپنی بدخامت سے باز نہیں آتے۔ کارل کو سائی مل چکا تھا اور اس نے ”مرچہ“ کے لاپتا ہونے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ دوسری طرف اندر سے کارل آیا تھا۔ اسے سائی شاہ ویز اور چند دوسرے اسٹوڈنٹس اسے باہر رش میں دیکھ رہے تھے۔ سائی نے سب کو فون کر کے بتا دیا تھا، کیونکہ ”مرچہ“ کا فون بند جا رہا تھا تو اسے ڈر تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔

کارل کی نظر دور ”مرچہ“ پر پڑی اور وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ وہ عام نارمل انداز سے نہیں چل رہی تھی۔ اسے ایک لڑکا گھسیٹ رہا تھا اور دوسرا اس کے منہ پر بار بار ہاتھ رکھ کر اس کا منہ دبا رہا تھا۔ کارل اس کے پاس پہنچا اس سے پہلے عالیان سیٹیں پھلانگتا ہوا ان کے قریب چلا گیا۔ وہ پیچھے کہیں سے تیزی سے بھاگتا ہوا آیا تھا اور اس نے آتے ہی ان لڑکوں کو لاتیں اور گھونسنے مارنے شروع کر دیے۔ کارل بھی پہنچ گیا اور جس کی گردن ہاتھ آئی اس نے دیوچ جلی۔

”مرچہ“ بری طرح سے خوف زدہ تھی۔ وہ کانپ رہی تھی اور اس کے سر سے خون نکل رہا تھا اور ناک منہ سے بھی۔

دو لڑکے پہلے ہی بھاگ گئے اور ایک کارل سے خود کو چھڑا کر بھاگا۔

”مرچہ“ پر نظر پڑتا ہی عالیان کی آنکھیں نم

ہو گئیں۔ اس نے ڈری سہمی امرحہ کو اپنے ساتھ لگالیا اور ہاتھ سے اس کی ناک منہ کا خون صاف کیا اور اس کے سر کے زخم کو دیکھنے لگا۔

”تمہیں کاپی چوٹ آئی ہے۔“ اس نے یہ کہا اور اس نے یہ سنا تو فوراً ”خود کو رونے سے روک نہیں سکی۔“

”نہیں زیادہ نہیں ہے۔ مجھے بالکل تکلیف نہیں ہو رہی اب۔“ ٹوٹ ٹوٹ کر الفاظ نکلے جیسے جذبات کی شدت سے الفاظ بکھرے گئے۔

اس کا سر عالیان کے سینے سے لگا تھا۔ اس سر پر مگی کتنی بھی بڑی چٹ میں درد کیسے اٹھ سکتا تھا بھلا۔

کارل نے ہلدی چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بھاگ گیا۔ اسے اپنے ساتھ لگائے عالیان باہر کی طرف آیا۔ اور گیٹ سے باہر ہونے سے پہلے ایک زوردار دھکا لگا کہ امرحہ کا ہاتھ عالیان سے چھوٹ گیا اور وہ گر پڑنے کے انداز سے بہت آگے نکل گئی۔

”سڑک سے دور کسی محفوظ جگہ کی طرف بھاگ جانا امرحہ۔“ عالیان پیچھے سے چلایا اور پورا زور لگا کر اس نے ہجوم میں سے جگہ بنا کر آگے نکل جانا چاہا۔ امرحہ نے دھکا کھاتے آگے بڑھتے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور عالیان کا دل دوہیں ٹھہر گیا۔

”اترا مو اذیب ہے۔ سماں عشق ہے۔“ ہجوم نے اسے ایک اور دھکا دیا وہ آگے نکل گئی۔ دھکے نے اسے لڑکھڑایا اور وہ اور پیچھے رہ گیا۔ امرحہ نے ہمر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”وقت نے ونا دی وہ وہ ہیں ٹھہرنہ گیا۔“ اگلے دھکے سے وہ باہر نکل گئی۔

سڑک کا منظر کچھ اور ہو چکا تھا۔ منٹوں کی گیم تھی، لمحوں میں بدل گئی۔ سیکورٹی فورس منتشر ہجوم سے سینے میں مشغول تھی۔ رات کا وقت تھا اور آنسو گیس کے دھو میں نے رات کو خطرناک بنا دیا تھا۔ ربڑ کی گولیاں فائر کی جارہی تھیں۔ مختلف اشکال کے ماسک پہنے ہوئے افراد سیکورٹی فورس پر ٹھوس چیزیں اور آنسو گیس اچھال رہے تھے۔ کہیں کچھ گروپس آپس میں

متصادم تھے، کس فورس کے ساتھ۔ ایک بڑا ہنگامہ برازیل اسٹیٹیم کے اندر اور باہر پھوٹ چکا تھا۔

ایک ایسا ہنگامہ جو سانچے میں بدلنے ہی والا تھا۔ ایمبولینس کے سائرن کی آوازیں چار سو گونج رہی تھیں۔ دور دور تک سڑک پر ایک جنگ کا عملی منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

”تصادم کی تصویر تھی اور بغاوت کی بو۔“ وہ سڑک پر نکل کر ایک سمت بھاگنے لگا۔ کارل اس کے پیچھے ہی تھا۔

”مرحہ کہاں ہے؟“ کارل نے چلا کر پوچھا۔ ”۳ سے میں نے سڑک سے دور نکل جانے کے لیے کہا تھا۔“ دو فائر فضا میں گونجے اور چٹخوں سے کان پھٹنے لگے۔ ان پر شیشے کی بوتلیں اڑھلی گئیں۔ ایک نے آگے بڑھ کر کارل پر حملہ کرنا چاہا جسے کارل نے پہلے ہی دو بوجھ لیا اور سڑک کے ایک طرف نیچے زمین پر پڑ گیا۔ وقفے وقفے سے، لیکن تیزی اور شدت سے آنسو گیس اچھالی جارہی تھی اور ربڑ کے فائر کیے جارہے تھے۔ کون دفاع کر رہا تھا اور کون حملہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ عالیان تیزی سے سڑک پر بھاگ رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ ”مرحہ!“

اس کے پیروں تلے کی زمین کھسکتی جارہی تھی اور اس کی آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔ اسے اپنا خواب یاد آ رہا تھا۔ اندھیرا۔ دھواں۔ تصادم اور خطرہ۔

نشانیوں اچھی نہیں تھیں۔ وہ ذرا دیر کو رک کر ہانپنے لگا۔ اس سے اگلا قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے پیروں کے پاس آکر ایک گیس کا گولا گرا۔ وہ تیزی سے دوسری طرف ہوا۔ اس کے بازو پر ربڑ کی گولی آکر لگی، لیکن وہ رکنا نہیں، اس کا جسم اسے حرکت کرنے سے جواب دیتا جا رہا تھا۔ اس کی کیفیت اس انسان سی ہو گئی، جسے اپنے کسی عزیز کے تابوت کو اٹھانے کے لیے کہا جاتا ہے اور وہ خود کو پہاڑ اٹھالینے کے قابل تو سمجھ لیتا ہے، لیکن وہ تابوت نہیں۔

برائیل اسٹینڈیم دھواں اگلنے لگا۔ چند ایک جگہ آگ بھڑک اٹھی۔ دھوئیں کے پھیلاؤ سے سڑک پر حرکت بحال ہو گئی۔

پوری قوت لگا کر وہ پھر بھاگا اور چلایا۔ ”مرحہ۔“ وہ ساری دنیا کو آگ لگا دے گا۔ اگر کچھ ہوا تو۔۔۔ وہ سب کچھ جلا ڈالے گا۔ اب وہ طیش سے سڑک پر بھاگنے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ راستے میں آنے والوں کو روند ڈالے، پھل ڈالے، ورنہ حلق پھاڑ کر اتنی شدت سے چلائے کہ سب اپنی اپنی جگہ ساکت ہو جائیں۔

اس نے پھر آواز دی۔ ”مرحہ۔“



اس کا دو ہٹا کب کا کہیں گر چکا تھا۔ اسے چلنے میں مسئلہ ہو رہا تھا۔ چند لوگ اس پر آکرے تھے اور اس کی ٹانگ جیسے ٹوٹ ہی گئی تھی۔ وہ بمشکل لنگر آ کر چل رہی تھی۔ دھڑکیں کے بادلوں میں اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت چھین ہو رہی تھی اور ان میں سے مسلسل پانی نکل رہا تھا۔

وہ کبھی ایسے کسی تصادم سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو زندگی میں پہلی بار فٹ بال میچ دیکھنے اسٹینڈیم آئی تھی۔ اسے تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ ہنگامی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے۔ اس وقت اس کی عقل بالکل ماؤف ہو چکی تھی اور وہ بری طرح سے سمجھ چکی تھی۔ اسے ہر ایک سے ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی اسے گھسیٹے گا یا مار دے گا۔ سڑک کا منظر انتہائی ہولناک ہو چکا تھا۔ اس کا دل چاہا واپس اندر بھاگ جائے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرف کو بھاگے اور پھر جس طرف بہت سے لوگ بھاگے جا رہے تھے وہ بھی بھاگنے لگی۔ سڑک پر وہ سب منتشر ہو گئے۔ سکیورٹی فورس کی نفی ہو رہی تھی، جاری تھی۔ پھر بھی تصادم بھگنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ تیزی سے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن اب وہ ڈیفنس کرنے کی پوزیشن میں آچکے تھے جو گروپس حملے کر رہے تھے ان

کے حملے بہت شدید تھے۔ صرف چند منٹ۔ انہی یہ سب ہونے میں صرف چند منٹ۔

عالیان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ٹھیک سمت بھاگ رہا ہے یا نہیں، بس اسے اس کا وجدان کہہ رہا تھا کہ اسے اسی سمت جانا چاہیے۔ ایک اور گولا اس کے پیچھے اور ذرا آگے آکر گرا۔ اور دھوئیں کے بادل پھیلنے سے پہلے اس نے امرحہ کو بہت دور دیکھ لیا۔

”مرحہ!“ وہ پوری جان سے چلایا کہ وہ اس کی طرف دیکھ لے، لیکن وہ بہت دور تھی اس سے ٹھیک سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ ڈر کر کھڑی تھی۔ اس سے ذرا آگے ایک گروپ میں تصادم ہو رہا تھا اور اس کے پیچھے گیس کے گولے پھینکے جا رہے تھے۔

فاصلہ سمٹاؤ وہ بھاگ کر اس کی طرف لپکا۔ سڑک کے دوسری طرف سے تصادم کے اس پار سے ویرانے اسے دیکھ لیا اور وہ اس کی طرف بھاگی۔

”مرحہ۔“ فاصلہ سمٹ چکا تھا۔ وہ اس سے کچھ ہی دور تھا۔ اب امرحہ نے گرین موڑ کر اسے دیکھا۔

”ارٹکاز واجب ہوا۔ سال یا ر غالب آیا۔“ اور اتنی دور سے وہ عالیشان کے اس طرح اپنی طرف بھاگتے آنے پر فدا ہو گئی۔

”محبت قہج کا عالم ہے۔ اس میں رات نہیں ہوتی۔“

وہ اس کے لیے کیسے بھاگا پھر رہا تھا۔ ”محبت ابد کی گھڑی ہے۔ یہ فنا نہیں ہوتی۔“

جو ہو چکا تھا اب تک۔ وہ وہیں مٹ چکا۔ ”محبت، طرب کا سار ہے۔ اس میں آہ نہیں ہوتی۔“ جو فاصلہ تھا وہ کم ہونے لگا۔

”کہیں مت جاؤ۔“ دھوئیں کے بادلوں نے دو لوگوں کی ایک سوچ کو چالیا۔ ”اب کہیں مت جاؤ۔“

وہ عالیشان کی طرف گھوم چکی تھی اور اس کی طرف آرہی تھی۔

اور ایک بھڑکے ہوئے لڑکے نے انگلیںڈ ٹیم کی

ٹکلتی جب اپنی جان ٹکلتی ہے۔ یہ جان اس وقت ٹکلتی ہے جب جان سے پیارے کی جان ٹکلتی ہے۔
 ”دعا واجب کر دی گئی۔ سماں ہجر کی منادی ہوئی۔“
 اس کے جسم نے جان چھوڑ دی اور وہ گھٹنوں کے بل سڑک پر گرنا چلا گیا۔ اس کا اپنا جسم ٹکڑوں کی صورت منتشر ہوا۔

دنیا میں کوئی دہائی دینے کے لیے تیار ہوا۔
 امرحہ کے سر پر پہنچنے سے، پہلے کارل نے عالیان کی طرف دیکھا اور اس نے جانا کہ اگر ایک مرحہ کا تو دوسرا مرنے جا رہا تھا۔ کیونکہ عالیان نے اس انسان کی بند ہوئی آنکھیں دیکھ لیں، جن میں اس نے خود کو بند کر لیا تھا۔

اس کی آنکھ سے خون ٹپکنے لگا، جس کا رنگ سرخ نہیں تھا۔

امرحہ کے وجود سے عالیان کی اپنی زندگی قطرہ قطرہ بننے لگی جس کا رنگ سرخ نہیں تھا۔

اے آنکھ تو کیوں روتی ہے؟

قافلے والے چلے گئے

اے آنکھ پھر تو کیوں روتی ہے؟

وہ مجھے پیچھے اکیلا چھوڑ گئے

اے آنکھ تو رونا بند کر

اس قافلے میں میرا محبوب تھا

افسوس! ہاں پھر تو روتے

سانسیں روک لی ہیں اور دل دھڑکنا بھول گیا ہے

(امرحہ اور عالیان کے درمیان اس کشمکش کا فیصلہ وقت کس انداز میں کرے گا۔ عالیان کی زندگی میں امرحہ ایک خوب صورت ”یاد“ بن کر زندہ رہے گی؟

(آخری قسط آئندہ)

شرٹ پہنے ایک لڑکی کے سر پر شیشے کی وزنی بوتل سے ضرب لگائی۔

وہ لڑکی جو امرحہ تھی۔ دیر بجلی کی سی تیزی سے امرحہ کی طرف لپکی۔

کارل اور سالی بھی آگے پیچھے اس کی طرف آرہے تھے۔ اس کے سر پر ضرب لگتے دیکھ کر ساری زمین عالیان کے پیروں تلے سے کھسک گئی اور وہ بھاگتے بھاگتے رکت گیا، کیونکہ۔

دو فائر ہوئے۔

برازیل، انڈیم کے باہر پھیلا سارا دھواں عالیان کی آنکھوں میں گھس آیا۔ سارا بھاگتا دوڑتا ہجوم اس کے جسم کو روندنے لگا۔

وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

ایک فائر بڑی گولی کا تھا۔

دیر اپوری شدت سے چلائی اور کتنے ہی لوگوں کو پھلانگتی ہوئی اس کی طرف آئی۔

”فریز!“ دو سرفائر بڑا نہیں تھا۔

کارل اور سالی نے کتنوں کو ہی دھکے دے کر گرا کر اس تک پہنچ جانا چاہا۔ وہ دونوں اس سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ گئے۔

”فریز!“

”کچھ فیملے صرف دائمی جدائی کے ہاتھوں ہی طے پاتے ہیں اس سے پہلے خبر ہوتی ہے، نا احساس۔“

اطراف میں پھیلا دھواں فورس کی نفری بھاگتے دوڑتے اجسام۔ سب ہی۔

”فریز۔“

سب جا رہا ہو گیا۔

وہ سڑک پر گھٹنوں کے بل گری اور پھر اس کی پشت سڑک سے ہٹ گئی۔ خون اس کے گرد پھیلنے لگا۔

”امرحہ!“ اس نے چلانا چاہا، لیکن چلا نہیں سکا۔ وہ وہیں اس سے کچھ دور کھڑا تھا۔ وہ جو امرحہ کا عالیان تھا۔ اس نے اس کی طرف بھاگنا چاہا، لیکن بھاگ نہیں سکا۔

تویہ ثابت ہو گیا۔ ”جسم سے جان اس وقت نہیں



سحر ساجد

عربی رقص

قیوم صاحب کی بیگم چودھویں بچے کی پیدائش پر فوت ہو جاتی ہیں۔ کثرت عیال کی وجہ سے قیوم صاحب بچوں کی طرف سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ سو حارث قیوم کی تمام تر ذمہ داری زینب آپا پر آ جاتی ہے جو اس سے سولہ سال بڑی ہیں۔ حارث قیوم شروع سے ہی بد تمیز جھگڑالو اور ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ اپنی حرکتوں اور زبان درازی کی وجہ سے سارے بہن بھائی اس سے نالاں اور دور رہا کرتے تھے۔ صرف زینب آپا اس سے محبت کرتی تھیں۔ اس کا خیال رکھتیں جبکہ وہ زینب آپا سے بھی بد تمیز ہی۔ سے پیش آتا تھا۔ حارث قیوم کھیل گود میں لڑائی جھگڑے میں اکثر ہی خطرناک چوٹیں لگوا لیا کرتا تھا مگر اسے تکلیف کا احساس زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی سخت بڑی تھا۔ وہ آپا اور بڑے بھائیوں سے مار کھا کھا کر بھی بہت ڈھیٹ ہو گیا تھا جبکہ زینب آپا اس کی چھوٹی چھوٹی تکلیف پر رڑپ جاتی تھیں۔ زینب آپا بیاہ کر چلی گئیں تب بھی اس کی دل پل کی خبر کاتیں اور ہر موقع پر سب سے پہلے اس کے پاس پہنچ جاتیں۔ حارث قیوم کو اپنے بہن بھائیوں سے نفرت تھی، مگر زینب آپا کے لیے بھی دل سے محبت اور احترام نہ رکھتا تھا۔

زینب آپا کے میاں شیخ بھائی سعودی عرب میں رہتے تھے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد انہوں نے زینب آپا کو بلوا لیا۔ اس وقت حارث سولہ سال کا تھا۔ زینب آپا کو شدید رنج تھا حارث کو چھوڑ کر جانے کا مگر ان کے رونے دھونے سے وہ شدید



کاؤلیٹ

جزر ہاتھا۔ ان کے سعودی عرب جانے کے بعد زینب آپا کو اطلاع ملتی ہے کہ اس نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک لڑکی کو اغوا کر کے عہدیت دری کی ہے۔ نابالغ ہونے پر اسے صرف قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے ابا اور بھائیوں نے اس سے قطع تعلق کر لیا مگر زینب آپا نے سعودی عرب میں رہتے ہوئے بھی اس کا خیال رکھا۔ اگرچہ وہ اس کی اس حرکت پر بے حد شرمندہ اور ملول تھیں مگر اکثر اسے فون کرتیں۔ پاکستان میں مقیم اپنی سہیلی کے ہاتھ اس کی ضرورت کی چیزیں بھیجواتی رہتیں۔ وہ فون پر روتے ہوئے کہتا۔ مجھے چھڑالو دو چار لاکھ روپے انہیں دے دو اور جیل سے لگا دو۔ زینب آپا اس سے کہتی ہیں کہ جیل میں اچھا رویہ اور کردار رکھو۔ تمہاری سزا تم یا معاف کر دی جائے گی۔ پھر میں تمہیں سعودیہ بلوالوں گی۔ حارث دل میں زینب آپا کو خوب گالیاں دیتا ہے۔ ساڑھے دس سال جیل میں گزار کر بالآخر زینب آپا اسے سعودیہ بلوالیتی ہیں۔ زینب آپا کی اولاد نہیں ہوتی، شفیق بھائی ان سے بے حد محبت کرتے ہیں اور ان ہی کی خاطر وہ حارث کا بھی خیال رکھتے ہیں، حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ حارث آپا سے بہت بدتمیزی کر جاتا ہے۔ سعودیہ آکر بھی وہ اکثر زینب آپا کو طعنہ دیتا کہ تم نے میسے بچائے اور میرے ساڑھے دس سال ضائع کیے۔ زینب آپا اس کی ساری بدتمیزیاں برداشت کرتیں، کیونکہ وہ اسے ماں کی طرح چاہتی ہیں اور شفیق بھائی ان کی خاطر حارث کی بدتمیزیاں نظر انداز کرتے رہتے۔ حارث سعودی عرب دراصل اپنے ساڑھے دس سال ضائع کر دینے پر زینب آپا سے بدلہ لگنے آیا ہے۔ وہ یہاں آکر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ زینب آپا اور شفیق بھائی عمرہ کرنے جاتے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں وہ ایک فلپائنی عورت کو گھر لے کر آتا ہے مگر قم کے معاملے میں جب بات نہیں بنتی تو وہ اس کے ساتھ زیروستی کرتا ہے اور تہہ خانے میں بند کر دیتا ہے۔ اتفاق سے

نکٹ بھول جانے پر زینب آیا اور شفیق بھائی کو دوبارہ گھر آنا پڑتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ دونوں فتنہ رہ جاتے ہیں اور پھر بے حد مجبور ہو کر زینب آپا شفیق بھائی کو پولیس بلانے کی اجازت دے دیتی ہیں۔

۲

دوسری قسط

جب پولیس اس فلپانی عورت اور حادثہ کو پکڑ کر لے جا رہی تھی تو وہ اک شاک کے عالم میں تھا۔ دس سال پہلے وہ جیل "زینب آپا" کی وجہ سے نہیں گیا تھا مگر وہ "زینب" کی وجہ سے ہی دس سال قید میں رہا تھا اور آج سے آج وہ "زینب" ہی تھیں جس کی وجہ سے وہ دوبارہ قید میں جا رہا تھا۔ وہ زینب جو کہ اس کے لیے "ننھا" ہو سکتی تھیں ہاں! وہی زینب۔ وہ شدید قسم کے شاک کا شکار ہوا تھا۔

اس رات زینب اور شفیق نے محض ایک گلاس پانی کا پی کر روزہ رکھا تھا۔ اور جب زینب نے آسمان کی طرف منہ کر کے سوال پوچھا تھا تو جواب میں وہ آیت آئی تھی۔

"ہرگز نہیں چھو سکتے نم نیکی کو یہاں تک کہ تم خرچ کرو جس سے تم محبت کرتے ہو۔"
اور زینب کو کرنا پڑا انہیں ثابت کرنا پڑا۔
"کیا انہیں حادثہ سے بڑھ کر کوئی چیز باری ہو سکتی تھی؟" اس کا جواب "نہیں" بھی ہو سکتا تھا مگر اب یہ جواب نفی میں نہیں تھا۔ اب یہ "ہاں" تھا۔
انہیں "اللہ" سب سے بڑھ کر باریا تھا۔

☆ ☆ ☆

بعض اوقات زندگی اتنی مشکل لگتی ہے کہ مرنا جینے کی نسبت زیادہ آسان لگتا ہے۔
وہ بھی ایسا ہی چاہنے لگی تھیں۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کا تعلق اس مذہب کے پیروکاروں میں سے تھا جہاں مرنا اپنے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ جس کی

"کیا اس عورت کی قسمت میں کوئی سکھ۔ کوئی خوشی نہیں ہے؟" شفیق بھائی نے انہیں پرسنٹ، کا دروازہ کھول کر اندر جاتے دیکھ کر غم سے سوچا تھا اور پھر وہ کال ملا۔ نے لگے تھے۔

ضبط، جبر اور پھر صبر۔ یہ کتنا مشکل ہے، یہ کوئی زینب قیوم سے پوچھتا۔

اس عورت کے ہاتھ پاؤں کھولنے کے بعد زینب آپا نے اس کا حلیہ ٹھیک کیا تھا اور اسے ساتھ لے کر وہ اندرونی حصے کا لاک ایک دفعہ پھر کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ اسے خاموش رہ کر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ حادثہ کے کمرے میں گئی تھیں۔

وہ ابھی تک بے سدھ رہا تھا۔ پرسنٹ میں ہونے والی کسی بھی قسم کی کارروائی کی آواز گھر کے اندرونی حصے میں نہیں آ سکتی تھی اور گھر سے باہر بھی مشکل سے جاتی۔ وہ چند لمحے حادثہ کو دیکھتی رہیں۔ انہیں بس اس پر ترس آ رہا تھا۔ بے انتہا ترس ایسا اور اتنا ترس جیسا آج سے پہلے انہوں نے کبھی بھی اس کے لیے محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے سر ہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ سے اس کا سر سہلانے لگی تھیں۔ کیوں؟ انہیں نہیں معلوم تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں وہ جاگ نہ پاتا مگر نہ معلوم اس وقت کیسے اٹھ گیا تھا۔
"آپا!" وہ نیند میں بو جھل آنکھیں بمشکل کھولے۔
حیرانی سے بولا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن میں بالکل بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کر چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مکمل ہوش میں آتا زینب آپا تیزی سے اٹھیں اور دروازہ باہر سے لاک کر دیا تھا۔

آسمان کا طواف کیا کرتی تھیں۔



شروع کی تحقیق میں فلپائنی عورت نے یہ ہی ثابت کرنا چاہا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا تھا، مگر جب پولیس نے گھر کی تلاشی لی تھی جائے وقوعہ کا معائنہ کیا تھا تو اس دوران حارث اور فلپائنی عورت کا سیل فون بھی قبضے میں لیا گیا تھا۔ اور بس۔۔۔ سب کچھ ثابت ہو گیا۔ طبی معائنے اور میڈیکل رپورٹس اس کے علاوہ تھیں کچھ شک و شبہ والی بات رہ ہی نہیں گئی تھی۔

حارث بری طرح سے ٹینشن کا شکار تھا وہ اک لبا عرصہ پھر سے جیل میں گزارنا نہیں چاہتا تھا۔

مگر وہ بھول رہا تھا اب وہ نابالغ نہ تھا اور نہ ہی یہ پاکستان تھا۔ یہ سعودی عرب تھا اور یہ وہ ملک تھا جہاں پہ اس قسم کے جرم کی سزا سرنامہ دی جاتی تھی اور ویسے ہی دی جاتی تھی کہ جس طرح دینے کا حکم تھا۔ مگر حارث کے لیے ایک گنجائش ابھی بھی موجود تھی۔ وہ ابھی غیر شادی شدہ تھا۔ اس لیے اسے سو کوڑوں کی سزا سنائی گئی اور وہ فلپائنی عورت۔۔۔ وہ شادی شدہ تھی گو کہ وہ غیر مسلم تھی مگر اس وقت اس نے سعودیہ میں رہتے ہوئے سعودی قانون کی خلاف ورزی کی تھی سو اس کے جرم کی بھی وہی سزا تھی جو سعودی قانون کے مطابق رائج تھی۔

یہ سزا سن کر حارث نے نجانے کیوں ”خوف“ کو اس طرح سے محسوس نہیں کیا تھا جس طرح سے کوئی عام انسان کرتا بلکہ اسے اس بات کی طمانیت زیادہ تھی کہ وہ قید سے بچ گیا تھا۔

مار کا کیا تھا۔ وہ تو بچپن سے کھاتا ہی آیا تھا۔ اب کی بار جوتے، تھپڑیا پھر پالی کا پپ نہ سہی ہنر سہی۔ کوڑے سہی کیا فرق پڑتا تھا۔

اسے ایک کھلے میدان میں لے جایا گیا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں کو دو شربلوں (سعودی پولیس کے سپاہی) نے پکڑ رکھا تھا۔ ایک مجمع کے سامنے لے جا کر

امانت تھیں وہ اپنے وقت پہ واپس لے لی جائے گی مگر تب تک انہیں جیسا ہی تھا۔

وہ زبان سے ”اللہ“ کو یہ ہی بتاتی تھیں کہ وہ اس کی ”رضا“ میں راضی ہیں اور یہ کہ وہ ”مان جائے“ والوں میں سے ہیں۔

مگر اندر کہیں۔۔۔ دل کی کسی تہہ میں چھپے کسی خانے میں پوشیدہ ایک ناراضی بھرا شکوہ بھی تھا۔ ”کیا زینب ابوم کی عبادت اس لائق نہیں تھی کہ اس کی ”دعا“ قبول کی جاتی؟“

”کیا زینب ابوم“ اس کے لیے اتنا بھی معنی نہیں رکھتی تھی کہ ”وہ“ اسے اس غم سے بچالیتا۔ ”کیا ضروری تھا کہ زینب قیوم کا اسی طرح سے امتحان لیا جاتا؟“

زینب کے شکوے کا کوئی ”جواب“ نہیں تھا۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ تمام تر شکوؤں کے باوجود اسے ”ماننا“ ہی تھا۔

”اس کے آگے ماننے کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا؟“ تو کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ ”شکوہ“ کیا ہی نہ جائے۔ مگر یہ شکوہ ”یہ کیا ہی کب جاتا ہے یہ تو خود بخود بے دھیالی میں دل میں ابل پڑتا ہے اور انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کیا اس کی اتنی بساط تھی کہ وہ اس ”لم یزل“ کے آگے کچھ کہہ سکے انسان صرف ”مان جائے“ کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ سوا اسے مان جانا چاہیے اسی میں بہتری ہے۔ باتیں کیجیے اسی میں بہتری ہے۔

سو زینب ابھی مان جاتی تھیں۔ تھوڑی سی ناراضگی۔۔۔ ہلکے سے شکوے کے بعد وہ بھی مان جاتی تھیں۔

ہاں! البتہ اب ”تسبیح“ گردش نہیں کرتی تھی۔ ان کی آنکھیں گردش کیا کرتی تھیں۔ کالے۔۔۔ تاروں بھرے آسمان پہ۔۔۔ تب جب ”وہ“ ساتویں آسمان پہ براجمان ہوا کرتا تھا۔ وہ غم۔۔۔ فریاد بھری آنکھیں۔۔۔ چاہتی تھیں کہ ان کے ”سوال“ کو جواب بخشا جائے۔ وہ ”دے دیا“ جائے۔ جس کی طلب پہ وہ

پشت پہ گوشت کے چمٹے اڑھڑنے لگے تو۔
تکلیف کی شدت سے اس نے بلبلایا کر زینب آپا کو
اوپر آواز میں گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ وہ انہیں
”بد دعائیں“ دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ”اللہ کرے
اس کی قبر میں کیڑے پڑیں۔“

کمال ہے۔! بھرے بیچ میں کوڑے کھاتے اس
شخص کو ”اللہ“ بھی یاد تھا اور کوڑے کھاتے ہوئے وہ
زینب کی قبر کو یاد کر رہا تھا۔

”تو کیا اسے اپنی قبر یاد نہیں تھی؟“
”کیا اسے اپنی قبر میں کیڑے پڑنے کا خدشہ نہیں
تھا؟“

حالانکہ وہ وہاں موند تھا زینب نہیں۔
”انسان کو ”اللہ“ کی ذات ہمیشہ دوسروں کے لیے
یاد آتی ہے۔ اپنی دفعہ وہ بھول جاتا ہے کہ کوئی ”اللہ“
بھی تھا۔“

”ہاں وہ بھی تو تھا۔“
وہ اب اوندھے منہ گر چکا تھا اور نیم غشی کی سی
حالت میں تھا۔ تکلیف سے اس کا دماغ ماؤف ہوتا
جا رہا تھا مگر پھر بھی۔ وہ ہلکی مدہم سی آواز میں۔ آہستہ
آہستہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔
”کیا؟“ وہ اب بھی زینب کو ”ثواب“ پہنچا رہا تھا۔



اس کی پشت پہ کچھ زخم اس طرح سے آئے تھے کہ
ٹانگے لگانا پڑے تھے اور بعد میں وہ ٹانگے خراب ہو گئے
تھے اور ان میں پیپ پڑ گئی تھی۔ وہ کمر کے بل لیٹ
نہیں سکتا تھا۔ وہ اوندھے منہ ہی لیٹ سکتا تھا۔ کرسی
کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ نہیں سکتا۔ ان خراب زخموں
نے اسے کسی کام کا نہیں چھوڑا تھا۔ جب زینب آپا
اس کے زخموں کو صاف کرتیں ان پہ مرہم لگاتیں تو وہ
ان سے ہمیشہ ایک ہی بات کہتا۔

”تم جیسی کوئی بہن نہیں ہو سکتی کوئی ”ڈائن“ ہی
ہو سکتی ہے۔“ زینب خاموشی سے اس کا زہر میں ڈوبا
ہوا نفرت بھرا لہجہ سنتیں اور اپنا کام کیے جاتیں ان کی

اس کو شرٹ اتارنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس نے
شرٹ اتار دی تھی۔ ان دونوں نے پھر سے اس کے
بازوؤں کو تنگی سے پکڑ لیا تھا۔

وہ اب صرف ایک پیٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک
سپاہی کے ہاتھ میں موٹا۔ کالا ہنر تھا جس کو اس نے
حارث کی کمر پہ برساتا شروع کیا تھا۔ یہ منظر اہل سعودیہ
کے لیے نیا نہیں تھا مگر ان کے لیے یہ نیا ضرور تھا کہ
”مجرم“ آگے سے بچنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا اور اگر
اسے کوئی تکلیف محسوس بھی ہو رہی تھی تو وہ اسے
اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا۔ وہ
جڑے جھٹپٹہ سامنے دیکھتے ہوئے ہنر کھا رہا تھا جو کہ

پوری قوت سے اس کی کمر پہ برسائے جا رہے تھے۔ ہر
دفعہ کوڑا لگنے پہ اس کے جسم کو جھٹکا لگتا تھا۔ مگر وہ ابھی
تک اپنے پاؤں پہ کھڑا تھا۔ ارد گرد کھڑے سعودی اپنی
زبان میں ”کچھ کہہ رہے تھے۔ وہ یقیناً“ اسے لعن
طعن کر رہے تھے وہ ان کی لعن طعن کو سمجھ نہیں سکتا
تھا تو اس پہ لزجہ بھی دے نہیں رہا تھا۔

وہ تو کہیں ”اور“ تھا۔ ہر دفعہ ”کوڑا“ لگنے پہ اسے
زینب آپا کا چہرہ یاد آتا۔ ہر دفعہ وہ انہیں ایک غلیظ گالی
منہ ہی منہ میں دیتا۔ ہر دفعہ جب تکلیف کی شدت
سے اس کے جسم کو جھٹکا لگتا تو ہر دفعہ وہ زینب آپا کے
چہرے پہ تھوک دیتا۔ ہر ہر کوڑے کے ساتھ اس کی
پشت کی جلد پھٹ جاتی تھی اور اذیت اندر سرایت
نہیں کرتی تھی۔ وہ نفرت تھی جو سرے لے کر پیر تک
اس کے خون میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا خوانا
”سفید“ نہیں ”کالا“ ہو رہا تھا۔

”سیاہ کالا۔“

جیسے جیسے کوڑوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی اس کا
ضبط جواب دیتا جا رہا تھا۔ ایک کے اوپر دوسرا۔
دوسرے کے بعد تیسرا۔ اور اسی طرح لگنے والے
کوڑوں کی وجہ سے اس کے جسم پہ لہریے دار خون کی
قطاریں گھٹی۔

اور جب اس کا ضبط جواب دے گیا۔ جب اس کی

خاموشی حارث کو اور چڑاتی تھی۔ اسے غصہ دلاتی تھی۔

”تم دیکھنا! ایک دن میں بھی ایسا زخم لگاؤں گا تمہیں کہ آپا! تم ساری عمر اسے بیٹھ کر چاٹتی رہو گی۔“ وہ مشتعل ہو کر بولتا۔

”شرٹ پہن لو حارث!“ وہ اپنا کام ختم کر کے مرہم کی ڈبیہ بند کرتے ہوئے یوں کہتیں جیسے کہ وہ سن نہیں سکتیں مگر بول لیتی تھیں اور وہ کھولتے دماغ سے انہیں ”ایسا زخم“ لگا۔ نے کے بارے میں سوچتا رہتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ”زخم“ تو وہ لگا چکا تھا اور وہ بھی ایسا کہ زینب ساری عمر اسے بھول نہیں سکتی تھیں۔

حارث ان دنوں بہت چڑچڑا اور شدت پسند ہو گیا تھا، جب وہ اوندرھے منہ لیٹ لیٹ کر تھک جاتا اور سیدھا لیٹ نہیں پاتا تھا تو وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کر دیتا۔ گرم چائے یا دودھ زینب کے ہاتھوں پر گرا دیتا۔ گالیاں دیتا۔ بہن کے بجائے ڈائن کہتا اور کہتا کہ اس نے اچھا نہیں کیا تھا اس کے ساتھ۔ وہ بدلہ لے کر رہے گا۔ اور زینب۔ کہا تھا نا کہ وہ عورت۔ عورت نہیں سراپا ”زخم“ تھی۔ اک نظر اس پہ ڈال کر نیچے گرے برتن سمیٹنے لگتیں۔ اور جہاں تک بات تھی شفیق بھائی کی تو وہ اپنے نام سے برہم کر شفیق تھے۔ یہ دونوں بہن بھائی کا معاملہ تھا وہ ان کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتے تھے۔



”ان نشانوں کو دیکھ کر تمہیں کچھ خیال نہیں آتا حارث! تمہیں تکلیف محسوس نہیں ہوتی؟“ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے پشت کیے کھڑا تھا اور ہاتھ میں ایک چھوٹا آئینہ تھا جس میں سے وہ اپنی کمر کو دیکھ رہا تھا اس نے تیز نظروں سے زینب کو دیکھا اور پھر شیشہ پھینک کر ان کے سامنے آیا تھا۔

”آتا ہے، خیال۔ ضرور آتا ہے اور کیوں نہیں آئے گا خیال،“ تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے یہ مجھے ہمیشہ یاد دلا میں گے کہ میری ماں جیسی بہن نے کیا کیا

تھا میرے ساتھ۔“

وہ اب لفظوں کو چبا چبا کر تلخ لہجے میں بول رہا تھا۔ بے اختیار انہوں نے خود کو گمراہ انس بھرنے سے روکا تھا۔ ورنہ وہ کوئی اور تلخ جملہ کہہ دیتا۔ وہ جانتی تھیں کہ ایسا ہی کوئی جواب آتا تھا پھر بھی انسانی جبلت سے مجبور ہو کر سوال کر دیا تھا۔ انہوں نے آگے برہم کر اس کے گھنے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر پیار سے اس کے گل پہ رکھا تھا۔

”کچھ نشان ایسے ہوتے ہیں حارث! کہ وہ زخموں سے برہم کر اذیت دیتے ہیں۔“

تب ایسے نشانوں کی تکلیف برداشت کرنا ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں نے بس تمہیں اس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

300/-	ساری بھول ہماری تھی	راحۃ جبین
300/-	او بے پروا جن	راحۃ جبین
350/-	ایک میں اور ایک تم	تزیلہ ریاض
350/-	بڑا آدمی	نسیم نذر قریشی
300/-	دیکھ زہد محبت	صائمہ اکرم چوہدری
350/-	کسی راستے کی تلاش میں	میمونہ خورشید علی
300/-	ہستی کا آہنگ	شمرہ بخاری
300/-	دل موم کا دیا	سائرہ رضا
300/-	ساڈا چڑیا دا چنبا	نفیسہ سعید
500/-	ستارہ شام	آمنہ ریاض
300/-	مصحف	نمرا احمد
750/-	دست کوزہ گر	فوزیہ یاسمین
300/-	محبت من محرم	سمیرا حمید

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

ملکتیہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”زینب!“ وہ کچن میں کام کر رہی تھیں جب ہی انہیں شفیق بھائی نے بلایا تھا۔ وہ مصروف سے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔
”کیا بات ہے؟“ اور شفیق بھائی نے سامنے کھلی الماری کی طرف اشارہ کر دیا۔

الماری کا سب سے محفوظ حصہ کھلا رہا تھا اور ان کے زیور۔؟ وہ اک لمحے کے لیے شاکد ہوئی تھیں۔
”اور میں سمجھی وہ آج ابھی تک سو رہا ہے۔“ پھر ہلکا سا ہنس کر بولی تھیں۔ اتفاق سے آج انہوں نے صبح کے بعد حارث کے کمرے میں نہیں جھانکا تھا۔ وہ صبح کافی دیر تک سونے کا عادی تھا۔

”زخم ٹھیک ہو گئے تھے نا اس کے۔ اب یہاں رہ کر کیا کرنا تھا اس نے۔“ وہ آگے بڑھ کر الماری بند کرتے ہوئے بولی تھیں۔

”زینب! میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔“ زندگی میں پہلی بار انہوں نے شفیق کو غصے میں کچھ کہتے سنا تھا۔ انہوں نے حیرت سے شفیق کو دیکھا تھا۔
”کسی خارش زدہ کتے کی طرح سڑک پہ پڑا ہوا تھا۔ اٹھا کر لایا اسے میں۔ علاج کرایا اور یہ ملا ”صلے“ میں۔“ وہ غصے سے بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ زینب پہلے حیران تھیں اب ششدر۔
”یہ شفیق تھے؟“

”اب بالکل نہیں چھوڑوں گا اسے میں۔ ابھی میں۔“ اب کی بار شفیق بھائی کو ٹھٹک کر رکنا پڑا تھا۔ زینب نے جو اچانک سامنے آکر دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”مانتی ہوں وہ جو کچھ لے کر گیا ہے۔ وہ سب آپ نے کمایا تھا مگر آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ نے وہ سب مجھے ”تحفتاً“ دیے تھے۔ وہ میری چیزیں تھیں۔ شفیق۔ میری۔ اب کہ معاملہ میرا اور اس کا ہے اور میں نے معاف کیا۔ معاف کیا اسے میں نے۔“

اور بس۔۔۔
شفیق بھائی کو ڈھیر کرنے کے لیے زینب کا ”کہا“ ہی

”تکلیف سے بچانا چاہا تھا۔“ اپنی تمام تر تندہی و تیزی کے باوجود وہ زینب آپا کے اس طرح کے محبت کے مظاہروں کے بعد سناٹے میں آجایا کرتا تھا۔ اک سکنہ سا ہو جایا کرتا تھا جو اسے کچھ کہنے۔ کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا۔ جیسے کہ اب۔ ابھی ابھی اس کے ساتھ ہوا تھا۔ زینب آپا نے ہمیشہ اسے حیران کیا تھا۔ وہ اب بھی اسے حیرت زدہ چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔



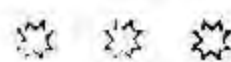
”یہ داغ۔؟“ اس نے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے بارو موڑ کر اپنا ہاتھ سامنتھا کے لمس والی جگہ پہ رکھا تھا۔ ”یہ ایک سزا ہے۔“ اور پھر وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا۔
”سزا“ وہ شدید حیران ہوتے ہوئے اس کے پیچھے سے آکر کھڑے ہوتے ہوئے بولی تھی۔

”جوانی کی سزا“ اس نے مزید سامنتھا کو حیران کیا تھا۔
”کیا؟ اس لبرل اور ماڈرن دور میں اب بھی کوئی ایسا ملک ہے جہاں ایسی سزائیں دیتا ہے۔“ سامنتھا انگلیں میں تیز لہجے میں بولی تھی۔

”وہ خدایا! کیا کسی مذہب میں ایک غلطی کی سزا اتنی بھیانک ہو سکتی ہے۔“ اس کے چہرے پہ خوف کے سے اثرات تھے اور حارث نے سوچا کہ وہ کیا کرنے آئے تھے اور بات کدھر جا پہنچی تھی۔ مذہب۔۔۔ جو اس کی زندگی میں شاید آخری مقام پہ بھی نہیں تھا مگر اس کو سامنتھا کے تاثرات مزادے رہے تھے۔

”یہ سزا اس لیے تھی کہ میں سنٹھل تھا اگر میں میڑ ہوتا تو وہ مجھے سنگسار کر دیتے۔“ اس نے مزالیستے ہوئے اسے بتایا تھا اور ہر سامنتھا۔! وہ فتنے چہرے کے ساتھ اس کی شکل دیکھ رہی تھی وہ ہنس پڑا۔ بے اختیار سامنتھا نے تھوک نگھا تھا اور پھر۔۔۔ اس کے بعد جو اس نے کہا تھا اس بات نے حارث کا چہرہ ”شق“ کر دیا تھا۔

وہ سفید پڑتے چہرے کے ساتھ یک ٹک سامنتھا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ یہ کیا کہہ دیا تھا اس نے۔



کافی تھا کجا کہ نم آنکھیں۔ جڑے ہاتھ اور التجا کرتا
لجسے۔ ”کیسی عورت ہو تم۔ کوئی نفرت۔ کوئی غصہ۔
کوئی منفی جذبہ ہے کہ نہیں تم میں۔ انسان نہیں ہو
کیا۔؟“ وہ بے چارگی سے زینب کے ہاتھ کھولتے
ہوئے بولے تھے۔

”انسان ہی ہوں۔ فرشتہ کیسے ہو سکتی ہوں۔ مگر
نامعلوم کیوں حارث کے نام پر۔ میرے۔۔۔ دل میں
”محبت“ کے علاوہ کوئی جذبہ ابھرتا ہی نہیں ہے۔“ وہ
اب شکستہ۔۔۔ سے انداز میں بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بول رہی
تھیں۔ شفیق بھائی چند لمحے خاموشی سے ان کے ہتھکے
سر کو دیکھتے رہے۔

”گنتی اعائیں مانگیں تم نے حارث کے لیے
مگر۔“

”میری دعاؤں کو کچھ نہ کہیں شفیق! حارث کے
لیے میں۔۔۔ کچھ ایسی دعا میں مانگی ہیں کہ مجھے یقین
نہیں آتا کہ اللہ ان کے بدلے میں مجھے کچھ اور دے
گا۔ وہ۔۔۔ وہ ہی مجھے دے گا جو میں نے اس سے مانگا
ہے۔ وہ۔۔۔ وہ کیسے ٹال سکتا ہے۔ کیسے؟“ نم۔۔۔ بھرایا لجا۔
اور شفیق بھائی۔۔۔ وہ دم بخود انہیں دیکھ رہے تھے۔

وہ صرف رقم اور زیور نہیں چرا کر لایا تھا۔ وہ پورا
بندوبست کر کے آیا تھا۔ پاسپورٹ، اپنے ڈاکو منٹس
سب کچھ۔۔۔ لے کر آیا تھا۔

اس کے بعد اس نے سب سے پہلا کام الخرج سے
نکلنے کا کیا تھا۔ وہ سیدھا ریاض آگیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس
نے بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد مختلف
کےپنیوں میں اپلائی کیا تھا۔ جیل میں سیکھا جانے والا
”ویلڈنگ“ کا ہنر اس کے کام آیا تھا۔

اس کے پاس رقم معقول تھی مگر رقم کے بجائے اگر
پہاڑ بھی ہوتا اور انسان اسے آہستہ آہستہ کھاتا رہتا تو وہ
بھی ایک دن ختم ہو جاتا۔ اسی لیے اس نے جاب کے
بارے میں سوچا تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن میں

مستقبل کے حوالے سے کوئی واضح تصویر موجود نہیں
تھی مگر اک بات طے تھی۔

اسے زینب آیا سے نفرت ہو چکی تھی اور اپنی پشت
پہ موجود نشانوں کے بدلے میں زخم لگا کر بھی اس کے
اندر جلتی آگ ٹھنڈی نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اور بھڑک
اٹھی تھی۔ وہ اس آگ میں ساری عمر جلتے نہیں رہنا
چاہتا تھا۔ وہ کچھ ایسا کرنا چاہتا تھا جس سے اسے تسکین
مل سکے۔ اسے یہ ہی نقطہ ابھی تک سمجھ نہیں آ رہا تھا
کہ اسے تسکین کس طرف سے مل سکتی ہے کیسے وہ
اپنے اندر موجود زہر سے شفا پا سکتا تھا۔

یہ وہ سوال تھا جس کا جواب وہ ہر روز ڈھونڈنے کی
کوشش کرتا اور ناکام رہتا۔ ان ہی دنوں اس کی ایک
امریکن بیس کمپنی کی طرف سے سلیکشن ہو گئی تھی اور
وہ برسر روزگار ہو گیا تھا۔ اس کی تنخواہ بہت زیادہ نہیں تو
اتنی ضرور تھی کہ اس جیسے انسان کا کافی اچھی طرح
سے گزارا ہو سکتا تھا۔

وہ زیور تو چرا لایا تھا مگر ابھی تک اسے سمجھ نہیں
آ سکا تھا کہ وہ ان کا کیا کرے، حالانکہ کچھ رقم خرچ
ہو جانے کے باوجود کافی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی
کہ اسے اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے چند ماہ ہی
ہوئے تھے کہ اس کی ٹرانسفر امریکن برانچ میں ہو گئی۔

وہ یقیناً اس معاملے میں ”خوش قسمت“ کہا
جا سکتا ہے ورنہ وہاں اس سے کافی زیادہ قابل اور سینئر
لوگ موجود تھے۔ مگر صرف وہ ہی ”چٹا“ گیا تھا۔

امریکا آتے ہوئے اس کے ساتھ دو حادثے ہوئے
تھے۔ پہلا حادثہ۔ جہاز میں بیٹھنے کے بعد کا تھا۔
حالانکہ وہ پاکستان سے۔۔۔ عودیہ جاتے ہوئے جہاز کا
سفر کر چکا تھا مگر تب تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اچھا خاصا
سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کھانے کے بعد وہ کچھ دیر سونا چاہتا تھا
وہ دوسرے مسافروں کی طرح فضائی سفر کے خوف کا
شکار نہیں ہوتا تھا۔ اپنی سیٹ کو آرام دہ بنانے کے بعد
اسے سوئے چند ہی لمحے ہوئے تھے کہ اسے وہی خواب

کرانے کے بعد کمپنی کے ایک آدمی کے ساتھ جا چکا تھا، مگر اس کا بیگ نہیں مل سکا تھا اور جس شخص کو ملا تھا اس نے اس رقم کو چیرٹی کر دیا تھا۔ یہ سب دراصل ایک غلط فہمی کی بنیاد پہ ہوا تھا۔ حارث اور اس شخص کا بیگ اتفاق سے ایک جیسا تھا۔ وہ غلطی سے لے گیا تھا اس شخص کے بیگ میں اتنی اہم چیزیں تھیں کہ وہ اسے فوراً کھولتایا استعمال کرنا وہ کافی عرصہ یوں ہی بند رہا رہا تھا۔ اور جب اس نے اسے کھولا تھا تو اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔ گو کہ وہ غیر مسلم تھا مگر وہ ایمان دار شخص تھا اس نے اریپورٹ پہ رابطہ کیا تھا۔ شکایت بھی درج تھی مگر مطلوبہ شخص (حارث) سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ تب تک وہ اس شہر سے دوسرے شہر شفٹ ہو چکا تھا اور اس طرح وہ رقم ”مفلحی کام کے لیے وقف“ کر دی گئی تھی۔

”وہ حلال کی کمائی تھی نا۔۔۔ حرام کاموں میں کیسے استعمال ہو سکتی تھی۔“



وہ پہلی رنگت اور نقاہت، زوہ چہرے کے ساتھ چھت کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی میل نرس اس کے ہاتھ سے ڈرپ اتار کر گیا تھا اسے ڈی جارج کر دیا گیا تھا۔

”چلو حارث۔۔۔ اٹھو گھر چلتے ہیں۔“ شفیق بھائی نے پیار سے کہا تھا۔

اور اس پیار بھرے لہجہ نے اسے ”حال“ سے اٹھا کر ”ماضی“ میں لا پٹا تھا۔ ماضی۔۔۔ کہ جس میں وہ جیتا تھا۔ اسے زینب آیا یاد آئی تھیں اور بہت بری طرح سے یاد آئی تھیں۔

”میں گھر نہیں جاسکتا۔“ اس نے کافی دیر بعد جواب دیا تھا۔ اور شفیق بھائی نے دیکھا کہ جواب دیتے ہوئے اس کے ہونٹ کسی بچے کی طرح کپکپائے تھے۔

”کہاں جاؤ گے پھر؟“ ان کے لہجے کی نرمی حارث کو نشتر چھوٹنے جیسی تکلیف دے رہی تھی۔

”آپ مجھے پولیس اسٹیشن لے جاسکتے ہیں؟“ اور اس بات نے شفیق بھائی کو ششدر کر دیا تھا۔ وہ ہونٹ

نظر آیا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ سیدھا آنکھیں کھولے جہاز کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں رہا تھا۔ اس کے چہرہ زرد تھا اور وہ یوں ساکت تھا کہ جیسے سانس نہ لے رہا ہو۔

”آپ ٹھیک ہیں؟“ اس کے ساتھ بیٹھے مسافر نے پوچھا۔ بلکہ اثبات میں سر ہلا کر وہ سیدھا ہوا تھا مگر یہ پہلی دفعہ تھا آنکھ کھلنے کے بعد بھی اسے یہ اطمینان نہیں ہو سکا تھا کہ وہ ”زندہ“ ہے۔ وہ مزید خوف کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ زمین پہ نہیں تھا۔ بلکہ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پہ تھا جہاں چاروں سمتوں کے علاوہ اوپر نیچے بھی موت تھی۔ پہلی دفعہ وہ کھل کر سانس نہیں لے سکا تھا بلکہ اس کا سانس اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اسے موت سے اتنا خوف اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ جہاز کریش ہو سکتا تھا۔ لینڈنگ ٹھیک سے نہ ہونے کی وجہ سے بھی جادلے کا شکار ہو جاتا۔ انجن فیل ہو جاتے یا پھر فیول ختم ہو جاتا۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ کچھ بھی۔۔۔ وہ سفر اس کی زندگی کا مشکل ترین سفر بنتا جا رہا تھا۔ وہ سارا سفر اس نے اسی خوف کی سی حالت میں کیا تھا۔ جب بھی زیادہ بلندی پہ پھر ہوا کے دباؤ کی وجہ سے جہاز کو جھٹکتے لگتے وہ بمشکل اپنے اوپر قابو پاتا۔ اتنی لمبی فلائٹ میں اک لمحے کے لیے نہیں سو سکا تھا۔ سارا سفر جیسے اس نے نگلی تلوار پہ کھڑے ہو کر کیا تھا اور اس نے پہلا اطمینان بھرا سانس تب لیا جب جہاز باحفاظت لینڈ کر گیا تھا۔

مگر یہ شروعات تھی۔ دوسرا حادثہ تب ہوا جب اس کی رقم والا بیگ گم ہوا تھا۔ وہ زیور بیچ چکا تھا اپنے پاس موجود ساری رقم اس نے اپنے ایک ہینڈ کیری میں ڈالی تھی (اتنی رقم بائے ہینڈ لے جانا بین الاقوامی طور پہ ممنوع تھا) اور جب امریکن اریپورٹ پہ وہ سامان لے کر باہر آیا تو اس کا ”ہینڈ کیری“ غائب تھا وہ کنور بیلٹ پہ یقیناً آگے پیچھے ہوا تھا۔ وہ پریشان ضرور ہوا تھا مگر اسے اتنا یقین تھا کہ یہ امر کا تھا۔ یہاں پہ چیزیں اتنی آسانی سے کھو نہیں سکتی تھیں۔ وہ شکایت درج

ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہمیشہ اسی طرح انہیں ”عیران“ کیا تھا۔ وہ ابھی نہیں بدلاتھا۔



امریکا آنے کے بعد حادثہ کی زندگی جیسے ایک نئے فیر میں داخل ہوئی تھی اور یہ اس کی زندگی کا تیسرا فیر تھا۔ پہلے دو فیر وہ برے طریقے سے گزار چکا تھا بلکہ برے نہیں۔ بدترین وہ اب ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ وہ ”انجوائے“ کرنا چاہتا تھا مگر خود کو اک عجیب سے ”خالی پن“ کا شکار پاتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسا اس ”رقم“ کو کھودینے کی وجہ سے تھا۔ مگر ایسا کیوں تھا۔ یہ اسے ہر بات کی طرح بہت بعد میں سمجھ آیا تھا۔

یہ اس کی زندگی کا عجیب ترین دور تھا۔ اس کے لیے جیسے ہر چیز کی کشش کھوئی جا رہی تھی۔ ہر چیز اس کے لیے اپنے معنی کھو رہی تھی وہ کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں کرتا تھا اسے کوئی چیز متاثر نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ”نفرت“ کو بھی بھول رہا تھا اس کی آگ جیسے ”سرد“ پڑ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا وجود بھی۔

اسے زندگی کا یہ فیر پہلے دونوں فیرز (Phases) سے بھی بدترین لگتا تھا۔ اسے لگتا جیل مشکل نہیں تھی۔ اینیب، آپا کے پاس زخم زخم پشت لیے سیدھا لیٹنے کی خواہش میں تکلیف وہ دور گزارنا بھی برا نہیں تھا۔ جواب ہو رہا تھا وہ سب سے سخت۔ سب سے برا تھا تب ہی۔ ہاں تب ہی۔ اس کی زندگی میں ایک بدلاؤ آیا تھا اور اس بدلاؤ کا نام تھا ہانا مارٹن۔ وہ اس کی زندگی کی پہلی عورت تھی جس نے اسے احساس بخشا تھا کہ اپنی مہربانہ وجاہت کی وجہ سے وہ امریکن عورتوں کے لیے کتنی کشش رکھتا ہے۔

ہانا نے اس کی زندگی کو نئی راہ دی تھی۔ وہ مدھواں کی طرح دن رات کام اس لیے کرتا تھا کہ دولت کمائے اور دولت اس لیے کماتا کہ عیاشی کر سکے۔ یہ اس کا ”انتقام“ تھا ”بدلہ“ تھا ”تسکین“ تھی مگر کس سے؟ زینب آپا سے؟ وہ خطی نہیں تھا۔

مگر بن گیا تھا۔ اس کی نفرت نے اسے بنا ڈالا تھا۔ ہر مرتبہ کسی کے ساتھ رات گزارنے کے بعد اسے عجیب سی فتح کا احساس ہوتا۔ وہ سرشاری کی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوتا۔

وہ بتا نہیں سکتا تھا کہ ہر دفعہ زینب آپا کو نچا دکھانے کے بعد کتنی طمانیت محسوس کرتا تھا۔

وہ تصور میں زینب آپا کو مخاطب کرتا اور کہتا۔

”اب کس طرح سے تم مجھے سزا دلواؤ گی۔ میری پشت کو کیسے زخم زخم کروا سکو گی۔ دیکھو! میں یہاں کس طرح سے آزاد ہوں جو چاہے کروں جس سے چاہے ملوں اب کہاں گیا تمہارا انصاف۔ تمہارا اسلام اور اس کی سزائیں۔ ہے کوئی۔ جواب مجھے سزا دے سکے۔ مجھے باندھ کر کوڑے مار سکے۔ ہے کوئی؟ ہاتھ لگاتا تو دور۔ مجھے کوئی ایک لفظ تک نہیں بول سکتا۔“

اس نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ اگلے دس سال اپنی مرضی سے گزارے گا اور وہ گزار رہا تھا۔

حادثہ زینب آپا اور ان کی محبت کا عادی ہو چکا تھا۔ جیسے کوئی ماں کی محبت، کرم، التفات اور مہربانیوں کا عادی ہوتا ہے اور وہ توقع نہیں کرنا کہ ماں کبھی اس سے ناراض ہو سکتی ہے یہ ہی حادثہ کے ساتھ ہوا تھا۔ اس نے زینب آپا کی محبت کو اپنا حق سمجھ لیا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کے منفی رد عمل کی توقع کسی سے بھی کرنا مگر زینب سے نہیں۔

اس نے فرض کر لیا تھا کہ زینب آپا صرف اور صرف اس سے ”محبت“ کے لیے بنی ہیں اور جب ان ہی زینب آپا کی بدولت اس نے کوڑے کھائے یہ زبردست نفسیاتی اور جذباتی ہچکچاتا تھا۔ اور اس دھچکے نے اسے نفرت میں دھکیل دیا تھا۔ اور اب اسی نفرت کی بدولت اس کا زینب آپا سے تعلق پہلے سے زیادہ مضبوط ہو چکا تھا۔ اس کے حواسوں پہ ہر وقت ”بہن“ سوار رہتی تھی وہ ہر وقت ان کے الٹوڑن میں گرفتار رہتا تھا۔ گوکہ زینب آپا وہاں اس کے پاس موجود نہیں تھیں مگر وہ انہیں یوں ہی مخاطب کرتا جیسے وہ ان کے سامنے بیٹھی ہوں اسے لگا کہ اب کی بار وہ بے بس

”ہاں۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہاں ایسا ہی ہوتا

ہے۔“ اس نے بھرپور یقین دلایا تھا۔

”کتنا ظالم اور بے دردی ہے تمہارا مذہب جو مذہب انسان کے ساتھ زندگی میں یہ کر سکتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد اس کے ساتھ کیا کرے گا۔“ وہ جھرجھری لے کر بولی تھی۔

”کیا۔ کیا کہا تم نے۔“ نا سمجھنے والے انداز میں سنجیدگی کے ساتھ اس نے سنا تھا۔ دوبارہ پوچھا تو سنا تھا نے اپنی بات دہرائی۔ حارث کا چہرہ فق ہوا اور پھر وہ خطرناک حد تک پیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا دل پورے زور سے دھڑکا تھا۔ وہ توقع نہیں کر سکتا تھا۔ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ آج رات جب وہ کسی کو اپنے اپارٹمنٹ پہ لے کر جائے گا تو وہ کال گرل اسے کیا کہہ دے گی۔ کیا سمجھا دے گی۔ یہ ظالم اور بے دردی والی بات نہیں تھی۔ جس نے حارث کا چہرہ فق کیا تھا۔ یہ مرنے کے بعد والی بات بھی نہیں تھی۔ وہ کیا بات تھی؟

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ سنا تھا نے حارث کے رنگ بدلتے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

آج اس کا خوف جاگتے ہیں اس پہ یک دم حاوی ہو رہا تھا۔ وہ ویسی ہی وحشت محسوس کر رہا تھا جیسی کہ کوئی بھی مرنے والا مرنے سے پہلے محسوس کرتا ہے۔ آج کسی خواب کی صورت نہیں رہی تھی۔ وہ بیٹھے بٹھائے ہنستے مسکراتے ایک دم سے اسی خوف کے زیر اثر جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ مگر مسلسل۔ مدہم مدہم۔ رے کے بغیر۔

ہمیشہ سیدھی برستی گولیاں۔ اسے احساس دلاتی تھیں کہ وہ مر چکا ہے۔ مگر جانے پہ اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تو زندہ ہے۔ موت اس کے لیے نہیں تھی۔ وہ ان تینوں کے لیے تھی جو اس کے ساتھ تھے۔ باقی سب کو مرنا تھا۔ اسے حارث نیوم کو نہیں مرنا تھا۔

”وے بلایا اسماں مرنا نہیں

گوریا کوئی ہو۔“

مگر آج۔ آج کیا ہوا تھا؟ آنکھیں بند کر کے اس نے تھوک نکل کر سنا تھا کو جواب دینا چاہا تھا۔ مگر اس پہ

تھیں کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

وہ زہن ابوم کو ہراتا رہا مگر دن بدن۔ روز بروز۔ ایک عبرت ناک شکست اس کا مقدر بنتی جا رہی تھی اور وہ حارث نیوم کے انتظار میں تھی۔ اس دن کے انتظار میں۔ کہ جب وہ حارث نیوم کو چاروں شانے جیت کر سکے۔ اور اسی طرح سے جیت کرے کہ وہ کبھی بھی اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ اور اس کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ پانچ سال۔ امریکہ میں گزارے جانے والے وہ پانچ سال۔ اسے لگتا کہ یہ ہی زندگی تھی۔ وہ مگن تھا۔ مسرور تھا۔ زندگی انجوائے کر رہا تھا۔ اپنی پر فارمنس کی بدولت وہ ایک۔ لیبر سے سپروائزر کے عہدے تک جا پہنچا تھا۔

اب کی بار زندگی اسے ”عیاشی“ کا دوسرا روپ بن کر ملی تھی۔ وہ پانچ دن پیسہ کماتا دو دن میں اڑانا اور اگلے ورکنگ آئے تک کنگلا ہو چکا ہوتا تھا۔ ہفتے کے پانچ دن جاب کے علاوہ بھی وہ مختلف کام کیا کرتا تھا۔ زیادہ پیسہ کمانے کے لیے اور پیسہ پھر اپنی واحد ”عیاشی“ پہ اڑانے کے لیے۔ وہ دنیا کا عجیب ترین مرد تھا۔

اور وہ حارث نیوم اگلے پانچ سال بھی یوں ہی مگن و مسرور اور عیاشی میں زندگی گزار دیتا۔

اگر سنا تھا کے ساتھ نہ ہوتا یا پھر کم از کم وہ رات اس کی زندگی میں نہ آتی۔ وہ بہت محفوظ ہونے والے انداز میں سنا تھا۔ باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ۔

”اگر میں شادی شدہ ہوتا۔ تو وہ مجھے سنگسار کر کے مار دیتے۔“ اس نے متبسم لہجے میں سنا تھا کو بتایا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ آخری دفعہ مسکرا رہا تھا۔ سنا تھا کا چہرہ فق ہوا۔ کتنے ہی لمحے وہ بے یقینی سے حارث کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تم سچ کہہ رہے ہو؟“ اور پھر امریکن لہجے میں نہ یقین کرنے والے انداز میں اس نے پوچھا تھا۔

واقعی سانس نہیں آرہی تھی۔ اسے ان ہیلر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔
 ”نہیں۔ نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے سمانٹھا کا ہاتھ ہٹایا تھا اور گرتے پڑتے اپارٹمنٹ سے باہر جانے لگا تھا۔

سمانٹھا کو پہلے تو سمجھ نہیں آیا کیا کرے، لیکن جب اس نے حارث کو اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اترتے دیکھا تو مڑ کر بھاگ کے اس نے حارث کی جیکٹ اور اپنا کوٹ اٹھایا تھا۔

جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ آخری چند سیڑھیوں پر حارث اپنا توازن قائم نہیں رکھ پایا تھا اور سیدھا کمر کے بل پھسلتا ہوا نیچے جا گرا تھا۔ مگر وہ تیزی سے اٹھا تھا اور گرنا بڑا باہر نکل گیا تھا اور جب سمانٹھا باہر آئی تو وہ ایک پول کے ساتھ سہارا لے کر کھڑا پائپ رہا تھا۔ سمانٹھا چند لمحے اسے یوں کھڑا دیکھتی رہی تھی۔

باہر شدید سردی تھی اور وہ بنا شرٹ کے تھا۔ مگر اسے جیسے پرواہی نہیں تھی۔ اب کہ اس نے غصے اور بے زاری سے سر جھٹکا تھا۔ پیچھے سے آکر اس نے حارث کی جیکٹ اس کے کندھوں پر پھیلانی تھی۔ حارث نے چونک کر مڑ کر دیکھا اور پھر سامنے۔ اندر قبر کا سانڈھیرا اور خاموشی تھی۔ باہر شور تھا، زندگی تھی، روشنی تھی، وہ محسوس کر سکتا تھا، ہاں۔ وہ محسوس کر سکتا تھا۔ زندگی کو قطرہ قطرہ اپنے اندر اترتے ہوئے وہ ٹھنن جیسی فضا جیسے آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھی۔ وہ کھل کر سانس لینے کے قابل ہو رہا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ وہ اپنے عین سامنے زندگی کو چلتا پھرتا دیکھ رہا تھا۔ ہاں۔ وہ بھی اسی ہجوم کا حصہ تھا جو سانس لیتا تھا۔ جس کا شمار حیات میں ہوتا تھا۔ ہاں۔ وہ بھی اسی کا حصہ تھا۔ وہاں اس پول کے سہارے کیکپاٹا کھڑا جو وہ دھندلائی آنکھوں سے یوں زندگی کو دیکھتا تھا جیسے کہ کوئی مرجانے والا دیکھتا ہے۔ وہ پول کے ساتھ گھسٹتا ہوا نیچے بیٹھتا چلا گیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے محسوس کیے۔ وہ رو رہا تھا۔ حیران کن

یہ خوف ناک انکشاف ہوا کہ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ اس کے ہونٹ محض پھر پھر اکر رہ گئے تھے۔ اس کے جسم پر یکدم ارزش اتر رہی تھی۔

”حارلیس (حارث) تمہیں کیا ہوا ہے؟“ سمانٹھا اب قدرے نگر بندی سے اس پر جھک کر اس کے کندھے کو ہلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ اور وہ۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اس نے کرسی کے دونوں بازوؤں کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

”پانی لاؤں، تمہارے لیے۔“ اس نے پوچھا۔ حارث نے سر ہلایا تھا۔ سمانٹھا کے جاتے ہی اسے محسوس ہوا کہ ابھی کرسی بھی اس کے ساتھ لرز نے لگے گی۔ اس کا جسم اتنا کپکپا رہا تھا وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔ وہ آج ابھی اس فوجی کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر وہ ہو رہا تھا۔ وہ آج کی رات برباد نہیں کرنا چاہتا۔ مگر وہ ہو رہی تھی۔

”مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ یہ بس اکوہم ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں کیسے مر سکتا ہوں؟ میں جوان ہوں۔ صحت مند ہوں، مجھے کیسے کچھ ہو سکتا ہے؟“

”اور اگر اس اپارٹمنٹ کی چھت ابھی تم پر آگرے تو۔“ اچانک اس کے ذہن کو اس خیال نے گرنٹ کی طرح چھوٹا تھا اور اس نے خود کو سانس کا مریض بننے ہوئے محسوس کیا تھا۔ بے ساختہ اس نے اندر گم ہوتے ہوئے سانس کو کھینچ کر باہر نکالا تھا۔

”اے خدا یا۔“ سمانٹھا پانی لے کر آرہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور وہ اس کی طرف، بھاگی تھی۔ وہ کرسی سمیت اونڈھا ہو چکا تھا۔

”حارلیس۔ حارلیس۔“ اسے آواز دیتے ہوئے سمانٹھا نے اسے سیدھا کیا تھا۔ وہ بری طرح سے گہری گہری سانس لے رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیا تم دے کے مریض ہو؟ تمہارا ان بیمار کہاں ہے؟“

وہ مسلسل اس کا سینہ مسلتے سوال پر سوال کرتے ہوئے بری طرح سے بوکھلائی ہوئی تھی۔ حارث کو

بات۔ حادث قیوم رو رہا تھا۔ وہ خوف سے زچ ہو کر رو رہا تھا یا پھر ایک بار پھر زندہ ہو جانے پر رو رہا تھا۔
”تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی نفسیاتی مسئلہ؟ یا پھر تم بیمار ہو؟“ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سامنتھانے پوچھا تھا۔

وہ ایک بار پھر چونکا تھا۔ مگر خاموش رہا تھا۔ ذرا سا رخ موڑ کر اس نے کندھے پر رکھے سامنتھانے کے ہاتھ کو دیکھا اور پھر۔ آہستگی سے اپنے نم چہرے کو صاف کیا تھا اور اب وہ بے حد تھکے سے انداز میں اپنی جیکٹ پہن رہا تھا۔ اس کے جسم کی کپکپاہٹ ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی۔

”حالیس! کوئی مسئلہ ہے کیا؟“ سامنتھانے پھر سوال دہرایا تھا اور اب کی بار اس نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”کیا۔“ اب کہ وہ بھی اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی تھی۔

”خوف۔“

”کس چیز کا۔“

”موت کا۔“

اب کی بار وہ حیران نہیں ہوئی تھی۔ وہ لا جواب ہوئی تھی۔ موت ایسی میز تھی جسے ہر کوئی آسانی سے ڈر سکتا تھا۔

”اوہ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“ اب کی بار وہ ذرا ہلکے سے لہجے میں بولی تھی۔ ”میں سمجھی شاید کوئی سیریس مسئلہ ہے۔“ اس نے ہاتھ لہرا کر بات کو اڑایا تھا۔

”ویسے تم کو تو واقعی ہی موت سے ڈرنا چاہیے۔ تمہارا مذہب ہی ایسا ہے۔“ اس نے یقیناً ہنستے ہوئے مذاق کیا تھا۔

اور حادث۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے اس کرنٹ بھی لہر کو اپنے اندر ہی روکا تھا۔ اسے باہر نہیں آنے دیا تھا۔ سامنتھانے ایک دفعہ پھر غلط بات کہی تھی۔ جیکٹ کے دونوں سروں کو مخالف سمتوں سے پکڑ کر اس نے کھینچ کر اپنے گرد لپیٹا تھا۔ وہ سر جھکانے

خاموش تھا۔

چند لمحوں تک وہ یوں ہی خاموش بیٹھے رہے اور پھر اس نے سامنتھانے کا ہاتھ اپنے گے آتا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے حیران نظروں سے سامنتھانے کو دیکھا۔

”ایم سوری میں تمہارے ساتھ رک نہیں سکتی۔ تم۔ تم بہت عجیب ہو اور کچھ خوف ناک بھی۔ ابھی اگر اوپر تمہیں کچھ ہو جاتا یا پھر تم سیڑھیوں سے جس طرح گرے ہو۔ تمہارے سر پر شدید چوٹ بھی لگ سکتی تھی۔ میں پولیس کو نہیں بھگت سکتی۔ سوری۔ سوری اگیں۔“

وہ پیسے اس کی گود میں رکھ کر جا چکی تھی۔ حادث نے اسے روکنا چاہا۔ اسے کہنا چاہا کہ اسے یوں مت اکیلا چھوڑ کر جائے۔ مگر وہ یہ نہیں کر سکا تھا۔ وہ اتنا تھک چکا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو پھر سے بہہ نکلے تھے۔ وہ کسی بچے کی طرح سسکیاں بھر رہا تھا اور اب وہ اپنی کمر پر رگڑ لگنے کی وجہ سے تکلیف بھی محسوس کر رہا تھا۔ وہ نارمل ہو رہا تھا، مگر پھر بھی وہ اپارٹمنٹ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ پھر سے اسی خوف کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وہاں وہ اکیلا نہیں تھا۔ وہ زندگی کے درمیان رہنا چاہتا تھا۔

وہ لوگوں کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے زندہ ہونے کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ مرنے کے بعد کا خوف نہیں تھا، جس نے حادث کی یہ حالت کی تھی۔ یہ موت کا خوف تھا۔ جس کا شکار وہ ہوا بیٹھا تھا۔



حادث کے جانے کے بعد زینب آیا کے لیے جیسے دنیا میں کرنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ روٹی نہیں تھیں۔ صبر کرتی تھیں۔ مگر تھیں تو انسان نا۔ تو کبھی کبھار خوب رو بھی لیا کرتی تھیں اور پھر ساری رات توبہ کرتے ہوئے گزار دیتیں۔ انہیں لگتا کہ رو کر وہ بے صبری کا مظاہرہ کر رہی تھیں اور شفیق بھائی کہتے تھے کہ جب وہ روٹی ہیں تو وہ انسان ہونے کا مظاہرہ کرتی ہیں



ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ ہی اس نے کسمسا کر گردن سیدھی کرنی چاہی تھی۔ مگر اک شدید تکلیف کی لہر تھی جو اس کی گردن میں سے ہوتی ہوئی سیدھا سر تک گئی تھی۔

”آہ“ بے اختیار اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی اور لاشعوری طور پر اس نے ہاتھ اٹھا کر گردن پر رکھنا چاہا تھا اور اس پر یہ بدترین انکشاف ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ حرکت نہیں کر سکا۔ کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ ایک دم بھر آنے والی آنکھوں کے ساتھ اس نے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے انگلیوں کو ہلایا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ حرکت میں آگئی تھیں۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے انیس ہاتھ بازو کو دبائے لگا تھا اور ایسا کرتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے بازو اور ہاتھ کو کچھ ہوا نہیں تھا۔ یوں ٹیک لگا کر بیٹھنے سے بری طرح سے سن ہو چکے تھے۔ ہاتھ اور بازو کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے وہ سکون کی لہر اپنے اندر اترتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔

اس کی یہ حالت سردی اور ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے اور سوئے رہنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ”میں یہاں کیوں سو رہا تھا؟“ اپنی کئی کراہوں کو دباتے ہوئے اٹنے ہاتھ سے سیدھے بازو کو پکڑے ہوئے وہ لڑکھڑا کر کھڑا ہوا تھا۔ اسے اس طرح کھڑے ہونے میں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کا ایک عضو سردی کی وجہ سے جم چکا تھا۔ مگر اب وہ اس تکلیف پر غور نہیں کر رہا تھا۔ وہ یہ سوچنے اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آخر وہ یوں کھبے کے ساتھ سر ٹکا کر کیوں سویا تھا۔ وہ بھی فٹ پاتھ پہ۔ اس کا سر بھی بھاری ہو چکا تھا۔ اس نے جھٹکے سے سر کو ہلایا۔ آنکھیں پورے زور سے کھول کر سامنے دیکھا تھا۔ اندرے فاصلے پہ اپنے اپارٹمنٹ کو جانے والی سیڑھیاں نظر آئی تھیں۔ ”میں یہاں کیوں؟“ جبران ہو کر سوچتے ہوئے

ورنہ تو وہ پہلے ہی کم بولتی تھیں۔ اس حادثے نے تو جیسے گونگا کر دیا تھا۔ انہیں پہلے چپ لگی پھر بیماری۔ ”تو حادثہ کما گیا زینب آپا کو۔“ شفیق بھائی نے کہا ”پاکستان چلتے ہیں۔ پاکستان کے ڈاکٹر زیادہ اچھے ہیں۔“ وہ نہیں اٹھیں اور کہنے لگیں۔

”یہاں بھی تو انسان بیمار ہوتے ہیں اور ڈاکٹر ان کا علاج کرتے ہیں۔ اب ہر کوئی تو اٹھ کر پاکستان نہیں جاتا نا۔ اور موت نے کون سا یہ دیکھ کر چھوڑ دیتا ہے کہ پاکستانی ڈاکٹر کتنے قابل ہیں۔“ ان کا ڈائلسنر ہو رہا تھا۔ ان کے گردے ختم ہو چکے تھے۔

شفیق بھائی کے لیے یہ برداشت کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان میں بھی زینب جتنا صبر آجائے۔ مگر زینب اپنے نام کی ایک ہی تھیں اور پھر ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ اسپتال کے بستر کی سفید چادر اور ان کے سفید چہرے میں فرق نظر آنا غائب ہو گیا تھا۔

شفیق بھائی ان کو اس حالت میں بھی لیٹے لیٹے اشاروں سے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر آنکھوں کے کناروں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر حیران نہیں ہوتے تھے پانچ سال بعد وہ وفات پا گئی تھیں۔

وہ بہت روئے تھے۔ اس لیے نہیں کہ زینب مر گئی تھیں۔ اس لیے کہ زینب غم سے مر گئی تھیں۔ انہیں زینب کے غم نے رلا دیا تھا۔ مرتے وقت تک حادثہ کے لیے ہاتھ اٹھتے رہے تھے اور اسے وہ یاد کرتی رہی تھیں اور شفیق بھائی کو یہ غم کہ سارے سکھ دینے کے بعد بھی زینب کے نصیب میں حادثہ نامی سکھ نہیں لاسکے تھے۔ یہ ان کے بس سے باہر تھا۔

اور زینب آپا کی وصیت کے مطابق انہیں سعودیہ کے ہی مقامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا اور یہ وہ ہی وقت تھا۔ یہ عین وہ ہی وقت تھا جب حادثہ امریکہ کے ایک شہر میں کسی سڑک کے فٹ پاتھ کے کنارے کھبے سے سر نکائے رو رہا تھا۔ ہاں۔ یہ وہ ہی وقت تھا۔ عین وہ ہی وقت تھا۔

وہ لڑکھڑاکر اس جھکی ہوئی حالت میں سیدھا ہوا تھا۔
اور پھر۔

اسے یاد آیا کہ اسے یہاں سامنا تھا چھوڑ کر گئی تھی اور اسے یہ بھی یاد آگیا تھا کہ وہ۔۔۔ وہاں کھبے سے ٹیک لگائے سامنے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ۔۔۔ رات بیتنے کے ساتھ لوگ کم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دکانوں کی جاتی لائٹس بھی ایک کے بعد ایک بند ہونا شروع ہو گئی تھیں اور وہ پھر سے خوف زدہ ہونا شروع ہو گیا تھا کہ وہ تنہا ہو رہا تھا۔

اسے وہاں بیٹھے دو سے تین گھنٹے ہو چکے تھے اور اس پر نیند کا غلبہ بھی طاری ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں کھلی رکھے اور حواسِ اقامت رکھنے کی کھلم کوشش کر رہا تھا مگر اسے غنودگی آہی گئی۔

اور وہ۔۔۔ اب۔۔۔ اس حالت میں جاگا تھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔ ماسوائے۔۔۔ حارث قیوم کے۔

اب وہاں روشنی تھی۔۔۔ زندگی تھی اور نہ شور تھا وہاں اندھیرا تھا۔ موت کی سی خاموشی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو کر آہستہ آہستہ پیچھے کو ہونے لگا تھا۔ اب کی بار وہ بے توازن ہوا اور لڑکھڑاکر گرتے گرتے بچا تھا۔

وہ جس خوف کا شکار ہو کر اپارٹمنٹ سے بھاگا تھا اب اسی خوف کے تحت دوبارہ اپارٹمنٹ کی طرف جارہا تھا۔ اگر اب وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اس کی ٹانگیں سُن تھیں اور جسم اکڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے سیڑھیوں پہ کمر کے بل جھکتے ہوئے وہ ایک سیڑھی پہ اپنا الٹا ہاتھ رکھتا اور جسم کا تمام وزن اس پہ ڈال کر وہ سیڑھی چڑھتا اور پھر اسی طرح اس سے اگلی۔ وہ تیز چڑھنے کی کھلم کوشش میں تھا اور یہ تہی کوشش اسے ہانپنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

اپارٹمنٹ کے سامنے رکھتے ہوئے۔۔۔ ہچکیاں بھرتے ہوئے سسکیاں روکتے ہوئے۔۔۔ لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ اس نے چابی اپنی جیکٹ کی جیبوں اور پاکٹ میں سے ڈھونڈنا شروع کی تھی۔ اسے چابی کیسے مل سکتی تھی جبکہ وہ وہاں تھی ہی نہیں۔ اس

رفعہ بے بس ہوتے ہوئے وہ سر پہ ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے دروازے سے ٹیک لگا کر نیچے بیٹھا اور جیسے ہی اس نے ٹیک لگائی وزن۔۔۔ سے دروازہ ہلکی سی چرر کی آواز کے ساتھ کھلتا گیا تھا۔ اس کا رونا یک دم ٹھہرا تھا اور وہ حیران ہوا۔ وہ اپارٹمنٹ کھلا ہی چھوڑ گیا تھا۔ مگر اسے یاد نہیں تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے مڑا اور کسی بچے کی طرح گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے تیزی سے اندر داخل ہو گیا تھا اور اب وہ اندرونی طرف دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اپارٹمنٹ اسی طرح روشن تھا جس طرح وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ۔۔۔ وہاں بیٹھ کر ہانپتا رہا۔ کانپتا رہا۔ اب کی بار سردی سے۔۔۔ اس کے کپڑوں پہ لگی پرف جسم کی حدت کی وجہ سے پھل کر پانی بننے لگی تھی جو کہ سردی میں اضافہ کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ لیکن۔۔۔ اس میں ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھتا اور کپڑے تبدیل کرتا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس نے گھٹنوں میں سر چھپالیا تھا اور جب سردی اس کی برداشت سے باہر ہونے لگی تو اسے اٹھنا پڑا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے لیے۔

وہ کسی بیمار آدمی کی طرح نقاہت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ گیلے کپڑوں کو اٹھا کر اس نے باری باری جھٹکا تھا تو کچھ نوٹ نیچے گرے۔ اس نے کسی وقت ان پیسوں کو جیب میں ڈالا تھا۔ ان نوٹوں کو دیکھ کر اس نے سختی سے آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت بھی جیکٹ پہ سخت سے سخت ترین ہو گئی تھی۔

وہ نوٹ جیسے اسے کچھ یاد دلوا رہے تھے۔ کیا۔۔۔ اب کی بار اسے رونا نہیں آرہا تھا۔

اس نے جیکٹ دور پھینکی کر لسی نوٹ اٹھائے اور انہیں پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر کے اچھال دیے۔ ساتھ ہی ایک آواز اس کے منہ سے نکلی تھی۔ وہ پہلے خوف کے ہاتھوں بے بس ہوا اور اب سوچ ہو رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ ایک ایک چیز اٹھا کر دیوار پر دے مارا کہ کھڑکی کے قریب کچھ کھٹکا ہوا تھا۔

وہ پھر اسی دہشت کا شکار ہونے لگا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس گیا۔ ڈرتے ڈرتے باہر دیکھا۔

وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ دہشت کا شکار ہو کر پلٹا تھا اور تیزی سے بستر میں لیٹ کر کمبل کو خود کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

وہ اب اونچی اونچی آواز سے روتے ہوئے زینب آپا کو پکار رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کسے پکار رہا تھا۔ وحشت کی شدت سے وہ کمبل کو دونوں ہاتھوں میں بھینچے ہوئے کبھی دائیں جھٹکتا۔ کبھی بائیں اور پھر اس نے چت لیٹے ہوئے کمبل کو منہ پہ ڈال کر اور زور زور سے رونا اور زینب آپا کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح روتے روتے اچانک اس کی نظر چھت پہ پڑی تھی اور اس کے اعصاب کھینچنے لگے تھے۔ اس کے جسم کی تمام رگیں بھی تن سی گئی تھیں۔ سردی سے نہیں۔ خواب سے۔ دہشت سے۔ وحشت سے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی کہ ابھی چھت اس پہ گرنے والی تھی۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور وہ سینے میں شرابور تھا۔ پھر یک دم اس کی سانس کی رفتار ہموار ہوتے ہوتے بالکل آہستہ ہو گئی تھی۔ اور اس کا تپا ہوا اکڑا ہوا جسم یک دم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ حارث قیوم بے ہوش ہو چکا تھا۔

بے ہوش ہو جانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ انسان کا نروس سسٹم اتنی جلدی ہار نہیں مانتا اور پھر ایسا انسان جس کی قوت ارادی بے حد مضبوط رہی ہو۔ وہ جو کہ ایک بہادر۔ انتہائی قوت برداشت کا مالک شخص رہا ہو۔ جسے جسمانی تکلیف۔ اذیت بے ہوش نہ کر پائی ہو، بچپن میں چھت سے گرنے سے لے کر کوڑے کھانے تک وہ اپنے ہوش و حواس میں رہا ہو۔ ایسا شخص اگر کسی ایک رات میں۔ محض اپنے کسی خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو جائے تو اس شخص کی دماغی حالت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

وہ جذباتی انسان نہیں تھا کہ یوں بے ہوش ہو جاتا۔ وہ اک بے حس انسان تھا اور ایسے لوگ عموماً بڑی سے بڑی بیماریوں میں بھی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اپنی قوت ارادی کی بدولت سنبھل جاتے ہیں اور اب۔ ایسا ہی اک شخص محض خوف زدہ ہو کر بے ہوش ہو گیا

تھا۔ شکست کھا گیا تھا۔ حیرت کی بات تھی۔ زندگی شطرنج کی وہ بساط ہے جس پہ آپ مرے ہوتے ہیں اور یہ مرے اپنی مرضی سے نہیں چلتے۔ انہیں کوئی اور چلاتا ہے۔ وہ جو کہ ساری کائنات کا نظام چلا رہا ہے۔ ہاں۔ ہاں۔ وہ ہی تو۔



وہ پہلی دفعہ بے ہوش ہوا تھا۔ مگر یہ آخری بار نہیں تھا۔ وہ پہلی دفعہ بے ہوش ہو کر اسپتال آیا تھا، مگر یہ بھی آخری بار نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں، نہیں کھول سکا تھا، اس نے دوبارہ آنکھوں کو بند کیا۔ زور سے میچا اور پھر انہیں کھولا۔ وہ اپنے سانس کے جلنے کی آواز سن سکتا تھا۔ اس کے حواس خم ٹھیک تھے، مگر پھر بھی وہ جان نہیں پا رہا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ ”کیسا محسوس کر رہے ہو اب تم۔“ اچانک اسے اپنے ماتھے پہ کسی ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ آواز اور پنجابی لہجہ۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ پہچان نہیں پایا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ جان لیا تھا۔ وہ اس کا سکھ دوست تھا جس کے ساتھ وہ اپر نمٹ شیئر کیا کرتا تھا۔ ”ٹھیک۔“ آنکھیں دوبارہ موندتے ہوئے اس نے کہا۔

”تمہیں کیا ہوا تھا؟“

اور جواب میں اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تھا۔ وہ اس وقت کچھ بولنا، کچھ کہنا، کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خاموش رہنا چاہتا تھا، سکون محسوس کرنا چاہتا تھا۔ وہ ذہنی طور پر تھک چکا تھا۔

گیان سنگھ نے اک گہرا سانس بھر کے اس دیکھا تھا۔ وہ رات کی شفٹ کر کے جب آیا تھا حارث بے ہوش پڑا تھا۔ ایک رات میں ہی اس کی آنکھوں کے نیچے ابھرنے والی حلقوں کی لائن کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔ اس کا پیلا رنگ اور قدرے کمزور چہرہ ڈاکٹر نے اس کو کسی سائیکائرسٹ کو دکھایا، کہ کما تھا۔



زندگی میں بہت سے مراحل۔ ادوار۔ اور موڑ آتے رہتے ہیں۔ وقت کا کام گزرتا ہے سو وہ گزرتا رہتا ہے۔ اچھے دنوں کے بعد سخت دن اور سخت دنوں کے بعد اچھے دن۔ ہر حال وہ گزر ہی جاتے ہیں۔ مگر حارث قیوم کے لیے اب کہ زندگی کوئی نیا مرحلہ، کوئی نیا دور، کوئی نیا ٹرن لے کر نہیں آئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ زندگی کی سیدھی سڑک۔ چلتے اچانک سڑک کا اختتام ہو گیا تھا وہ سیدھا کسی پاتال، کسی لاوے، کسی کھائی میں جا کر اٹھا اور وقت وہیں یہ ٹھہر گیا تھا۔ وہ عذاب سے بھی بدتر دن تھے جو کہ گزر نہیں رہے تھے۔

وہ اب پہلے کی طرح کام نہیں کر سکتا۔ پہلے کی طرح پیسے نہیں کما سکتا تھا۔ پہلے کی طرح عیاشی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اس قابل ہی کہا رہا تھا۔ رات بڑا عذاب تھی اس کے لیے۔ وہ اس رات کے بعد کبھی سو نہیں پایا تھا۔ وہ جب بھی تنہا یا اکیلا ہوتا اس کا خوف اس پہ حاوی ہونے لگتا اور وہ بے ہوش ہو جاتا۔ پھر اسپتال ہوتا اور وہ ہوتا۔

اس کی جسمانی حالت، دماغی حالت کی وجہ سے متاثر ہو رہی تھی اور ان دونوں کی وجہ سے کہنی میں اس کی کارکردگی بھی ٹھیک نہیں رہ رہی تھی۔ حالانکہ وہ اپنی پوری کوشش میں تھا کہ خود کو سنبھال سکے اور وہ اپنی تمام تر کوشش صرف اسی کام میں صرف کر رہا تھا۔ مگر اب کی بار وہ ہر کام۔ ہر چیز میں ناکام ہو رہا تھا۔ اپنے خوف اور تنہائی دور کرنے کے لیے اس نے پھر سے اپنی پرانی سرگرمی شروع کرنا چاہی۔ مگر اب کہ اس کی یہ چارہ گری بھی کامیاب نہیں ہو سکی تھی کہ اس کے لیے اسے اپارٹمنٹ جانا پڑتا اور اپارٹمنٹ کی چھت کو دیکھتے ہی اس پر خوف طاری ہو جاتا اور اگر وہ اس خوف پہ قابو پالیتا تو اسے لگتا کہ اس کے ساتھ آنے والی لڑکی اسے قتل کرے گی اس کے اپارٹمنٹ کی قیمتی اشیا اس کا

والٹ لے کر ہٹا کر جائے گی یا پھر اسے لگتا کہ وہ اس کا گلا دبا دے گی یا پھر کسی اور طریقے سے اسے مار دے گی۔ یہ ایک لمبی نہ ختم ہونے والی لسٹ تھی۔ اس نے یہ کام بھی چھوڑ دیا۔ پھر اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا اور سیلینگ پلزلینا شروع کر دی۔

امریکہ کے کسی میڈیکل اسٹور پر آپ یوں ہی منہ اٹھا کر کوئی بھی میڈیسن نہیں مانگ سکتے جب تک کہ آپ کے پاس ڈاکٹر کا نسخہ موجود نہ ہو اور اسے تو پہلے دن سے ہی ڈاکٹر نے سیلینگ پلزلکھ کر دی تھیں۔ اس کے لیے یہ آسان تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی بھی تھی۔ سیلینگ پلزلینے سے اسے افادہ ہوا تھا، مگر کچھ عرصہ بعد وہ پلزل بس رات کے ایک حصے تک ہی کام کرتی تھیں اور پھر اس کے بعد اسے نیند نہیں آتی تھی۔ وہ اٹھ جاتا، اپارٹمنٹ سے باہر جاتا سڑکوں پر نکل جاتا، کسی پبلک پلیس پر کسی ہجوم والی جگہ پر۔ یا پھر یوں ہی چلتا رہتا۔ سگریٹ پھر نکلتا رہتا اور پھر سے پلزل لے لیتا۔

وہ اکثر اوقات بے بسی سے رو پڑتا۔ سخت سردی میں کسی فٹ پاتھ یا سڑک کے کنارے لگے بیچ پیٹھ کر وہ دھاڑیں مار مار کر روتا۔ وہاں امریکہ میں پوچھنے یا رک کر کسی کا مسئلہ جاننے یا حل کرنے کا کسی کے پاس وقت تھا نہ رواج۔ وہ خود کو اتنا بے بس محسوس کرنا کہ اپنے بال نوچ لیتا۔ جھنجھلا کر بیچ، پول، فٹ پاتھ کی زمین پا پھر جو کچھ بھی اس کے سامنے ہوتا اسے مار مار کر ہاتھ زخمی کر لیتا اور پھر بستے ہوئے خون کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب بھی عذاب کی سی حالت میں بھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر پاگلوں کی طرح ہر گزرنے والے کو روک کر کہتا۔

”پلزل کیا آپ میری بیڈنگ کر دیں گے؟“ اور اگر کوئی اس کی مدد نہ کرنا تو وہ یوں ہی بستے ہوئے خون کو دیکھ کر پاگل ہو، ہو جاتا اور پھر ٹراما کا شکار ہو کر بے ہوش۔ یا پھر کبھی اس کے ساتھ یہ ہوتا کہ چلتے چلتے سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے پلزل کا اثر ہوتا اور وہ وہیں کہیں گر کر سو جاتا۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہو چکا تھا

اس کے گھٹنے پیٹ کو چھو رہے تھے، جبکہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں جوڑ کر چرے۔ کے نیچے رکھے وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گیان سنگھ کے طیش میں اور اضافہ ہوا اور اس نے ایک بھرپور ٹھوکر اسے دے ماری تھی۔

”اوئے حارثا (گالی) اوئے اٹھ۔“ اس کی مسلسل ٹھوکروں اور آوازوں کی وجہ سے حارث نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور پھر دوبارہ اڑھک گیا۔

”اوئے تیری تو (گالی)“ گہرا ن سنگھ پھر سے طیش میں آیا تھا اور اب کہ ایک زوردار پھڑاس کے منہ پہ دے مارا تھا۔

وہ ہڑپایا اور پھر اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اس نے پھٹروالی جگہ پہ ہاتھ رکھا اور گیان سنگھ کو دیکھ کر کسی نیچے کی طرح منہ بسرے لگا تھا۔ اسے یوں ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے دیکھ کر گیان سنگھ کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

اس نے دکھ سے حارث کو دیکھا اور پھر غور کیا۔ اسے یاد تھا کہ جو شرٹ اس وقت حارث نے پہن رکھی تھی اس کا رنگ سفید تھا۔ مگر اب وہ پیلی اور میلی ہو چکی تھی۔ اس کی جینز کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔ اس کا شیو بڑھ چکا تھا۔ بال بھی یقیناً ترتیب میں نہیں تھے۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن بھی بڑھے ہوئے تھے اور وہ اتنے گندے تھے کہ بے اختیار گیان سنگھ کو کراہیت محسوس ہوئی۔ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے گیان سنگھ نے اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی او کو بھی محسوس کیا تھا۔ وہ ابھی تک منہ بسور رہا تھا اور گیان سنگھ کو دیکھے جا رہا تھا۔ ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے اس نے حارث کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ”کیا ہو گیا ہے یار تجھے؟“ اس نے حارث کا کندھا زور سے ہلایا۔ اس نے گردن موڑ کر گیان سنگھ کو دیکھا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر نم چرے کو صاف کیا تھا۔ پھر وہ اپنی ہپ پاٹ کھنگالنے لگا تھا۔ اسی طرح اس نے باری باری ساری پاکٹس چیک کی تھیں۔ وہاں پلڑے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ گیان سنگھ اسے نوٹ کر رہا تھا۔

کہ اسے یوں بے سدھ سو تا دیکھ کر گشت یہ موجود پولیس پکڑ کر لے جاتی۔ وہ ضرور پلڑے کی زیادتی کی وجہ سے جیل جاتا، اگر اس کے پاس سے ڈاکٹر کا نسخہ نہ نکلتا۔

اس حارث قیوم کو دیکھ کر تو کوئی یقین ہی نہ کر تا کہ یہ چند ماہ پہلے والا حارث قیوم تھا۔ وہ جسمانی اور دماغی دونوں طور پر کمزور ہو چکا تھا۔

ہاں۔ ایک اور بات۔ اس حالت میں اسے زینب آیا بہت شدت سے یاد آیا کرتی تھیں اور وہ حیران ہوتا۔ وہ کیوں اسے اس طرح سے یاد آتی تھیں کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ ان کی گود میں سر چھپا کر سو جائے۔ ویسا ہی سکون محسوس کر سکے۔ اسے کیوں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر زینب آیا اس کے پاس ہو تو وہ ساری مصیبتوں سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔ بے اختیار لاشعوری طور پہ وہ روتے ہوئے زینب آیا کو پکارتا۔ شدت سے ان کے پاس جانے کی خواہش کرتا۔

پھر۔ یک دم اسے یاد آتا اسے تو زینب آیا سے نفرت تھی تو پھر یہ کیا تھا؟ اور وہ وہیں ساکت ہو جاتا۔ ”وہ نفرت کہاں تھی جو اسے زینب آیا سے تھی۔ کیا وہ کبھی تھی بھی یا نہیں؟“



گیان سنگھ ابھی ابھی ٹائٹ شفٹ کر کے آیا تھا۔ وہ ایک بار میں کام کرتا تھا۔ اس نے چابی سے دروازہ کھولنے سے پہلے ہینڈل گھما کر دیکھا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ اکثر ہوتا تھا اور ان دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اب تک کسی حادثے سے محفوظ رہے تھے۔ غصے کی شدید اور اشتعال بھری لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ دروازے کو لاٹھیاں لٹے ہوئے وہ لٹے پیروں مڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حارث یہیں کہیں آگے پیچھے گرا پڑا سو رہا ہو گا۔ کسی نشے کے عادی کی طرح۔ نیم ٹکجے اندھیرے میں وہ اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آیا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ ایک بیٹخ پہ دونوں گھٹنے موڑے سویا ہوا تھا۔

سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔
 ”چل۔۔۔ میں تجھے لے چلتا ہوں۔“ وہ اب پیار
 سے کہہ رہا تھا۔
 ”جانا ہے کسی کے پاس؟“
 ”ہاں۔“
 ”کون ہے؟“
 ”مسلا ہے تیری طرح۔“
 گیان سنگھ اب کہہ نہ سکا کہ ہنس کر بولا تھا۔



وہ پہلے سے بہتر نظر آ رہا تھا۔ تراشیدہ سلیقے سے جے
 ہوئے بال۔ شیو بھی کی گئی تھی۔ لباس بھی صاف
 ستھرا تھا اور وہ خود بھی فریش دکھائی دے رہا تھا۔ یہ
 یقیناً ”گیان سنگھ کی وجہ سے تھا اور اس نے ہی اسے
 ڈاکٹر حسنا سے اپائنٹمنٹ لے کر دی تھی۔ وہ اس
 وقت ان کے سامنے موجود تھا۔

”ایک مسلمان ہونے کے ناتے سے ہمیں موت
 سے ڈرنا چاہیے، مگر جس طرح سے آپ کی۔۔۔“
 ”آپ غلط سمجھے ہیں۔ میں مسلمان ہونے کی
 حیثیت سے موت سے نہیں ڈرتا، یہ کیفیت کچھ اور
 ہے۔“ اس نے تیزی سے ڈاکٹر حسنا کی بات کالی
 تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے خوف کو کسی اور
 سمت میں لے جائیں۔ یہ ہی اسلام اور مسلمان کی
 طرف۔۔۔ ڈاکٹر حسنا حیران ہوئے مگر انہوں نے
 ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ کس حد تک مسلم تھا، یہ
 انہیں اس کی ہسٹری سے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ ان کو
 سب کچھ بتا چکا تھا۔ بنا کچھ چھپائے۔

”اچھا تو یہ کون سی کیفیت ہے۔“ وہ اپنی آرام دہ
 کرسی سے ٹیک لگائے، بند ہاتھوں کی مٹھی ہونٹوں پہ
 رکھے بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے یک دم
 حادثہ کے چہرے پہ الجھن کے تاثرات ابھرتے دیکھے
 تھے، یوں جیسے وہ خود کو ظاہر نہ کیا رہا ہو۔

”میرا مطلب ہے کہ تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے
 جب بھی تم موت کے بارے میں سوچتے ہو؟ موت

”سگریٹ؟“ اس نے پوچھا اور گہرا سانس بھرتے
 ہوئے اسے سگریٹ اور لائٹرنکال کر دیا تھا۔ اس نے
 ڈبیا میں سے سگریٹ نکالا، منہ میں دبا کر لائٹ کو آن کیا۔
 مگر لائٹ کا شعلہ سگریٹ کو سلگا نہیں پا رہا تھا۔ وہ دائیں
 سے بائیں ہو رہا تھا، مگر سگریٹ کو سلگا نہیں پا رہا تھا۔
 گیان سنگھ کو ایک دفعہ پھر سے دکھ ہوا۔ وہ دونوں کچھلے
 تین سال سے آنکھیں رہ رہے تھے۔ اس نے حادثہ کے
 ہاتھ سے لائٹ لے کر سگریٹ سلگایا تھا۔ حادثہ نے
 ذرا سا سرخ موڑ کر سر کو ہلایا تھا۔ تشکر کے طور پر وہ اب
 خمیدہ کمر کے ساتھ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگا
 رہا تھا۔

”حادثہ تمہیں دونوں مل چکے ہیں اب اگر تیسرا
 بھی مل گیا تو تم کیا کرو گے۔ دوست تمہیں ایذا کا خیال
 نہیں ہے، حالت دیکھی ہے تم نے اپنی؟“ گیان سنگھ
 کی بات سنتے سنتے اس کے چہرے کے تاثرات بدل
 رہے تھے اور ان میں کھنچاؤ آ رہا تھا۔

پھر ایک دم اس نے اشتعال کے عالم میں سگریٹ
 کو دور پھینکا تھا اور خود اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا
 تھا۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے میں نے اپنی خوشی سے یہ
 حالت بنائی ہے، بہت سکون ملتا ہے مجھے کبھی بیچ پر
 اور کبھی فٹ پاتھ پر سوتے میں دونوں ملنے کی خوشی
 میں بھٹکڑے ڈال رہا ہوں۔“

اس نے طیش سے بات شروع کی تھی۔ مگر اب
 آواز آہستہ ہو گئی تھی۔

”اوائے تو سکھ کا سکھ رہانا، بہت تکلیف ہے مجھے
 بہت زیادہ۔“ اس نے جھک کر گیان سنگھ کے دونوں
 کندھوں پہ ہاتھ رکھے تھے اور انہیں زور زور سے
 ہلاتے ہوئے رو کر کہہ رہا تھا۔

”تو پھر تم کچھ کرتے کیوں نہیں ہو، سائیکا ٹرسٹ
 کے پاس کیوں نہیں جاتے۔“ وہ اس کے دونوں ہاتھ
 اپنے کندھوں سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے
 بولا تھا۔ حادثہ نے تھک کر اس کے ہاتھوں سے اپنے
 ہاتھ نکالے تھے اور بیچ پہ بیٹھ کر سر اس کی پشت سے
 لگا لیا تھا۔ وہ اب آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ہلکی ہلکی

تھا اور ایک سانس میں ختم کیا تھا۔ ڈاکٹر حسنا دوبارہ اپنی کرسی پہ بیٹھ چکے تھے اور اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

”تھینکس۔“ اس نے گلاس سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی زندگی کا عجیب کیس تھا اور سمجھ سے باہر بھی تھا۔

ایک شخص جو کہ ایک فائرنگ کے واقعے میں معجزانہ طور پر بچتا ہے۔ جیل کاٹتا ہے۔ گناہ کرتا ہے۔ پھر کوڑے کھاتا ہے اور پھر گناہ کرتا ہے۔ پھر گناہ۔ وہ موت سے ڈرتا ہے۔ مگر موت کے بعد اپنے انجام سے نہیں۔ وہ جان نکلنے سے خوف کھاتا ہے۔ مگر جان دینے اور لینے والے سے نہیں۔ یہ عجیب تھا۔ یہ بہت ہی عجیب تھا۔ اگر کوئی عام مسلم شخص ان کے پاس اس طرح کا مسئلہ لے کر آتا تو وہ یقیناً اسے دلا کر۔ آیات۔ احادیث کے حوالے دے کر مطمئن کرتے کیونکہ وہ صرف سائیکالوجسٹ نہیں تھے۔ وہ قرآن بھی جانتے تھے، مگر وہ عالم نہیں تھے۔ وہ اس شخص کا کیا کرتے۔ جو ان کے سامنے بیٹھا تھا اور موت کے علاوہ

کے کس خیال سے تمہیں خوف آتا ہے۔“ ان کے اس سوال سے حادث کے جسم میں ایک کرنٹ سا دوڑی تھا۔ ڈاکٹر حسنا نے اسے خوف زدہ ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور اس کی پشت پہ کمرے ہو کر اس کے کندھوں پہ دونوں ہاتھ کا نرم سا دباؤ ڈالا تھا۔

”بی ریلیکس حادث۔ بی ریلیکس۔ یہ۔ یہ۔ صرف تمہارا خوف ہے۔ اور کچھ بھی نہیں۔ بتاؤ مجھے۔ کیا خوف محسوس کرتے ہو تم؟“ وہ بڑے ہلکے ہاتھوں سے نرمی سے اب اس کے کندھے سے ملتا رہا تھا۔

”میں مرنے سے ڈرتا ہوں۔ خ۔ خ۔ خوف آ۔ آتا ہے مجھے۔ قب قبر کا سوچ کے۔ میرا سانس بند ہوتا ہے جب میں سو۔ سوچتا ہوں کہ میرے۔ میرے اور اتنی مٹی ہوگی۔ یہ دنیا۔ میں اسے نہیں دیکھ پاؤں گا۔ میرا جسم۔“ وہ اب اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔

”میرا جسم۔ یہ کپڑوں کی خوراک بنے گا۔ وہ کپڑے جنہیں میں اپنے جسم پہ محسوس کرتے ہی گرا کر مار دیتا ہوں۔ میری زندگی۔ یہ۔ یہ ختم ہو جائے گی۔ پھر سب ختم۔ سب ختم۔ صرف اک تنگ سی قبر۔ اندھیرا۔ سانس لینے کو کوئی روزانہ۔ سوراخ تک نہیں۔ اندھیرا۔ اندھیرا۔“

اب وہ کمرے میں موجود چیزوں کو دیکھ رہا تھا اور یوں دیکھ رہا تھا جیسے آخری بار دیکھ رہا ہو۔ کمرے میں ہیننگ، سٹم ہونے کے باوجود وہ لرز رہا تھا۔ کپکپا رہا تھا۔ ہلکے مگر تیز سانس لے رہا تھا۔

”اندھیرا۔ اندھیرا۔“ وہ سکتے ہوئے مسلسل ان ہی دو الفاظ کو دہرائے جا رہا تھا۔

”ریلیکس پانی پیو۔ شاباش۔“ اسی دوران ڈاکٹر حسنا، اس کے لیے پانی لے آئے تھے۔

”شاباش پیو۔“ وہ اسے کسی بچے کی طرح پکارتے رہے تھے۔

حادث نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ گلاس پکڑا

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO



90/

250/-

350/-

طریقہ ہوگا، کچھ تو ضرور ہوگا۔“ وہ بے اختیار بہت بے چین ہوا تھا۔

”موت ایک حقیقت ہے، حارث قیوم! تمام جان داروں کا یہ ہی فانی انجام ہے۔ تمہیں موت سے کوئی چیز نجات نہیں دے سکتی۔ کچھ بھی تمہیں اس سے نہیں بچا سکتا۔ تم کچھ بھی کرنا، سرنگ کھود کر زمین کی تہوں میں جا چھپو یا پھر کسی کبر ترکی طرح آنکھیں بند کر لو۔ تمہیں مرنا ہی ہے۔ یہ ہی تمہاری حقیقت ہے۔ تمہیں نہیں مل سکتی نجات۔ مگر۔“ وہ اچانک خاموش ہوئے تھے۔

”مگر۔ مگر کیا۔؟“ حارث یک دم ٹیبل پہ دونوں ہاتھ رکھ کر آگے کوچھا تھا۔

”بویے ڈاکٹر۔ مگر کیا۔“ وہ سخت مضطرب تھا۔
 ”مگر شفا۔ مل سکتی ہے۔“ ڈاکٹر حسنا نے بھی اسی طرح سے آگے جھک کر سرگوشی میں کہا تھا اور اس کے چہرے پہ مایوسی چھائی گئی تھی۔ وہ۔ حارث قیوم۔ وہ نجات ڈھونڈنے آیا تھا۔ اس نے تھک کر ڈاکٹر حسنا کو دیکھا اور پھر کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔ وہ اب ذرا سا رخ موڑے ہوٹوں کو بھیج کر اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈاکٹر حسنا نے بھی کرسی سے ٹیک لگاتے ہوئے، اب کس۔ اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔

”حارث قیوم۔“ اس نے بے زاری سے انہیں دیکھا۔

”بیماری سے نجات نہیں ملتی، شفا ملتی ہے۔“ متبسم لہجے میں کہا گیا جملہ تھا۔

”کیسے؟“ وہ پھر سے اسی پر جوش انداز میں ٹیبل پر جھکا تھا۔

ڈاکٹر حسنا اپنی دائیں سائیڈ پر ذرا سا جھکے اور ایک دراز کھول کر کچھ نکالا تھا۔ پھر انہوں نے اسے حارث کے سامنے رکھ دیا تھا۔ حارث نے شدید حیران ہو کر کچھ کہنا چاہا۔ انہوں نے اتھ اٹھا کر روک دیا۔

(تیسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

کسی سے خوف۔ زدہ نہیں تھا۔
 ”تو کیا اس کا دل مرشده تھا؟“ اس لرزتے شخص کو دیکھ کر ڈاکٹر حسنا نے سوچا۔

”مرشده دل کسی بھی چیز سے خوف نہیں کھاتے وہ خوش۔ مطمئن اور مسرور ہوتے ہیں، اپنے ہی گناہوں میں۔ وہ ڈھیل دے گئے لوگ ہوتے ہیں۔“
 ”اور اب۔ یقیناً ڈھیل تمہیں دی گئی تھی؟“

ایک گہرا سانس بھر کر۔ کچھ بے بس ہوتے ہوئے ڈاکٹر حسنا نے اپنا قلم لے کر رائٹنگ پیڈ پہ لکھنا شروع کیا تھا۔

”یہ کچھ آیات کے نمبرز اور سورتوں کے نام ہیں۔ ان کو مستقل پڑھو، ان شاء اللہ تم فرق محسوس کرو گے۔“ وہ مصروف سے انداز میں لکھتے ہوئے بولے تھے۔

”میں قرآن نہیں پڑھ سکتا۔ نہیں پڑھا ہوا میں۔“ وہ کسی بھی قسم کی شرمندگی کے بغیر بولا تھا۔ وہ۔

اب نشو سے ماتھے پہ آیا پینہ صاف کر رہا تھا۔ یوں جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ اس نے کیا کہہ دیا تھا۔ اور ڈاکٹر حسنا۔ ان کا قلم وہیں ایک جگہ پہ ساکت تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بنا۔ اسے دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک فلیش ہوا تھا اور کوئی کرنٹ سا۔ سر سے لے کر پیر تک ڈاکٹر حسنا کے جسم میں دوڑا تھا۔ اس کی بیماری اور اس کا علاج دونوں ہی بے حد اچانک انہیں سمجھ میں آیا تھا۔ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے پین والا ہاتھ ہلایا۔ قلم ہاتھ سے چھوٹ کر شیٹ کی ٹیبل پر آواز پیدا کرتے ہوئے گرا تھا۔

”تم جانتے ہو تمہارا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ بلکہ یہ کسی۔ کے پاس نہیں ہے۔“ وہ اب براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

”تو کس۔ کس کے پاس ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔ میں کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ کچھ بھی کروں گا۔ کسی بھی طرح سے۔“ آپ مجھے بتا دیں پلیز۔ کوئی تو

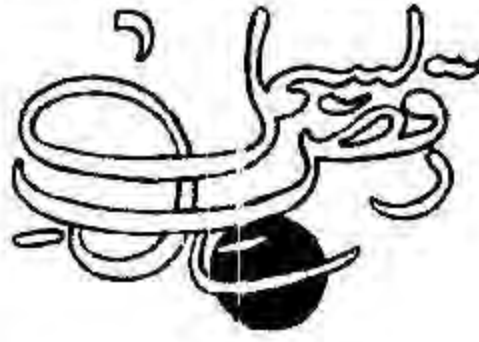


خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ

فروری 2015
کے شمارے کی ایک جھلک

- عمیرہ احمد کا ناول ”آبِ حیات“،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول ”نمل“،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول ”عہد الست“،
- نعیمہ ناز، راؤ کمیر ایاز اور حیا بخاری کے ناولٹ،
- مہک قاطمہ، حوازنہ، زینت زونی اور ریحانہ اسلم کے افسانے،
- معروف ٹی وی فنکار ”شہریار منور“ سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ ”حنا الطاف“ سے باتیں،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ”دستک“،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا فروری 2015 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔



ماورا مرتضیٰ عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلتا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی شہینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔

منزہ شہینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس میں ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیشن حاصل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ پر ہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھویتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی، آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر، تیمور و فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو ہمدا اصرار دے کر گئی ہے۔

ماورا عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور و ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔

شادی میں تیمور حیدر، ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھدرا رویہ ہر بار اسے ناکام





Copied From

کر دیتا۔ تیمور، ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کہ وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات خیام مرزا کے بیٹے مولس مرزا سے ہوتی ہے، وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مولس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

شادی کے اول روز سے آفاق کے انداز کچھ مشکوک، ہیں۔ فارہ سمجھ نہیں پاتی اور غیر مطمئن رہتی ہے۔ تیمور، فارہ کے ذریعے اور اس کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکیج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے۔ جسے ماورا کافی حیل و حجت کے بعد قبول کر لیتی ہے۔ لیکن یہ گل یہ جان کر دم بخود رہ جاتی ہیں جب انہیں پتا چلتا ہے کہ تیمور، رضا حیدر کا بیٹا ہے۔ ماورا، عافیہ بیگم کی سخت مخالفت کے باوجود ان دونوں کو لے کر کراچی کے ایٹم میں شفٹ ہو جاتی ہے جو اسے، آفس کی طرف سے ملا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے دیگر مراعات بھی تیمور مہیا کر دیتا ہے۔ تیمور کئی مرحلوں پر ماورا کی گھریلو سطح پر بھی مدد کرتا ہے۔ اتفاق سے ماورا کی زبانی تیمور سن لیتا ہے کہ ماورا ایک مقصد کے تحت اس کے آفس میں کام کرنے پر راضی ہوئی ہے۔

آفاق کا رویہ بدستور مشکوک ہے۔ فارہ اسے چھوڑ کر اپنے شہر آ جاتی ہے۔ شبنم آفاق سے خفا ہو جاتی ہیں۔ آفاق دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے لینے جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ ولید اور عزت کے درمیان محبت کا باقاعدہ اقرار ہو جاتا ہے۔ خیام مرزا عزت کا رشتہ مانگتے ہیں۔ رضا حیدر خوش ہوتے ہیں مگر تیمور انکار کر دیتا ہے۔ ماورا کے جاب چھوڑنے پر تیمور اسے باقاعدہ پروپوز کرتا ہے اور اس کی خواہش کے مطابق اپنی تمام تر جائیداد اس کے نام لکھنے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ عزت سے فون پر بات کرنے کے دوران نامعلوم افراد ولید کو گولیاں مار دیتے ہیں۔ عزت گھبرا کر تیمور کو بتاتی ہے۔ وہ اسپتال بھاگتا ہے۔ ولید کو اسی اسپتال میں لایا جاتا ہے جہاں عافیہ بیگم داخل ہیں۔

۱۸ رٹھادیوں قسطنطین

اور وہ لرزتی ٹانگوں سے پلٹ کر دوبارہ بیچ پر بیٹھ گئی۔

”یا اللہ رحم فرما۔۔۔ یا اللہ رحم فرما۔۔۔ ولید رحمان کی ماں بہ رحم فرما۔۔۔ اس کے تحت جگر کو سلامت رکھ۔ اس کو زندگی نواز دے۔“ ماورا نے آنکھیں بند کر کے مٹھیاں پیچتے ہوئے صدقِ دل سے دعا کی تھی۔

”ضمیمہ۔۔۔ ضمیمہ۔ ولید کہاں ہے؟“ تیمور حیدر کی آواز بہ ماورا نے یک دم آنکھیں کھول دی تھیں۔ تیمور حیدر بہت بوکھلائے اور گھبرائے ہوئے انداز سے ضمیمہ انصاری کی طرف برہہ رہا تھا اور اس کے پیچھے اس کی بہن عزت حیدر بھی تھیں جسے دیکھ کر ماورا بری طرح چونکی تھی۔

”وہ۔۔۔ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ ضمیمہ انصاری نے آپریشن تھیٹر کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں ڈاکٹر زجمع ہو رہے تھے۔“

”وہ بیچ جائے گا نا؟“ تیمور نے اپنے اندر کے خدشوں سے ڈر کر پوچھا تھا۔

”یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ورنہ اس کی حالت تو بہت ہی۔۔۔“ ضمیمہ انصاری نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے لب بلیچ لیے تھے۔

اور عزت نے اپنے اندر اٹھتی چیخوں کو دبانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے تھے۔

”یا اللہ۔۔۔“ تیمور زرب لب کتابے ساختہ آپریشن تھیٹر کی طرف لپکا تھا اور عزت مرے مرے قدموں سے چلتی بے دھیانی میں آکر ماورا کے برابر بیچ پر بیٹھ گئی تھی اور دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے رو پڑی تھی۔

ماورا بڑے تعجب آمیز انداز سے اسے دیکھ رہی تھی کیونکہ تیمور حیدر کی اس قدر پریشانی اور بے قراری تو سمجھ آ رہی تھی لیکن تیمور حیدر کی بہن کی ایسی کیفیت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ولید رحمان سے اس کی

بھی کوئی دوستی ہو۔ ماورا نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوال کو خود ہی جواب سے نوازا۔
 ”دوستی۔۔۔ مگر نہیں۔۔۔ عورت اور مرد میں کبھی دوستی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے اپنے جواب کو خود ہی جھٹلا بھی دیا تھا۔

”تو پھر۔۔۔“ بن نے مزید الجھانے کی کوشش کی تھی۔
 اور اس ”تو پھر۔۔۔“ سے آگے کا جواب سمجھ میں آتے ہی ماورا چونک گئی تھی اور عزت حیدر کو گردن موڑ کر دوبارہ دیکھا تھا۔
 ”اس طرح رونے سے بہتر ہے کہ آپ اس کی زندگی کی دعا کریں۔۔۔ اللہ کے حضور جھک کر اس کا رحم مانگیں۔“ ماورا نے بے حد آہستگی سے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور عزت نے یکدم چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”آپ۔۔۔؟“ عزت اسے پہچان نہیں پائی تھی۔
 ”میں بھی ولید رحمان کے لیے ہمدردی رکھنے والوں میں سے ہوں۔۔۔ وہ واقعی بہت بری حالت میں ہے۔ اسے دعا کی ضرورت ہے۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بول رہی تھی۔
 ”آپ۔۔۔ نے۔۔۔ دیکھا ہے۔۔۔ اسے؟“ عزت کو اس کی بری حالت کا سن کر یہ ہی سوال سوچا تھا۔
 ”ہاں دیکھا ہے۔ اور اس کی ماں کا کلیجہ کٹا ہوا سُتر آیا ہے۔ خون میں لت پت۔“ ماورا تھوڑی دیر پہلے کا منظر یاد کرتے ہوئے جھجھک رہی تھی۔
 ”وہ۔۔۔ بچ جائے گا؟“ عزت کا بھی وہی تیمور والا سوال تھا۔
 ”وہ بچ جائے گا۔ یہ کہنے والے ہم کون ہوتے ہیں بھلا؟ یہ ساری ڈور تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں البتہ یہ دعا ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ بچ جائے۔ اللہ اسے لمبی عمر عطا کرے۔ آمین۔“ ماورا کی بات پہ عزت نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

”میں آپ کو پہچان نہیں پائی؟“ عزت آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔
 ”ماورا! ڈرپ ختم ہو گئی ہے بیٹا! لی گل روم سے نکل کر باہر آ گئی تھیں۔“
 ”جی میں ابھی نرس کو انفارم کرتی ہوں۔“ ماورا کہتی ہوئی تیزی سے اٹھ گئی تھی اور بی گل پلٹ کر چلی گئیں جبکہ عزت جوں کی توں دیکھتی رہ گئی۔
 ”ماورا۔۔۔ اور امر تقضی۔۔۔ تہ۔۔۔ تیمور بھائی کی۔۔۔ اومائی گاٹ۔۔۔ میں اسے پہچان ہی نہیں پائی۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ۔۔۔ رات کے اس اسپرہاں کیوں ہے۔ اس کا کون بیمار ہے اور۔۔۔ اور اسے میرے۔۔۔ اور ولید کے بارے میں کیسے پتا چلا؟“

جس طرح تھوڑی دیر پہلے ماورا کے ذہن میں عجیب عجیب سوال اٹھ رہے تھے اسی طرح اب عزت کے ذہن میں بھی ایسے ہی عجیب عجیب سوال ہلچل مچا رہے تھے۔
 ”آپ کا اور ولید رحمان کا تعلق آپ کے چہرے پہ لکھا ہے۔“ ماورا دوبارہ آکر اس کے برابر بیٹھ گئی تھی۔ عزت ایک بار پھر ٹھٹکی۔

”آنسوؤں کی تحریر بڑی بامعنی ہوتی ہے۔ صاف نظر آ جاتی ہے۔ کیونکہ میری بی گل کہتی ہیں کہ آپ کو کسی کے لیے ہنسی آ جائے۔ یہ بڑی بات نہیں ہے۔ البتہ۔۔۔ آپ کو کسی کے لیے رونا جائے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ کیونکہ ہنسی صرف چہرے سے پھوٹتی ہے جبکہ آنسو دل سے پھوٹتے ہیں اور دل سے آنسو اسی وقت پھوٹتے ہیں

جب بے چارے دل پہ چوٹ پڑتی ہے۔۔۔ بلبلاتا ہے۔ بے چارہ۔“
 ماورا نے عزت کا دھیان کافی حد تک بٹا دیا تھا۔ عزت بھی اسے دیکھے جا رہی تھی۔
 ”حیران ست ہوں۔ یہ بہت عام سی باتیں ہیں۔ آپ خاص بات کی طرف دھیان دیں۔“ ماورا نے اس کی
 توجہ دوسری طرف دلائی چاہی۔

”خاص بات۔“ عزت نے زیر لب دہرایا۔
 ”دعا۔۔۔ ولید رحمان کے لیے دعا کرنے کی بات۔“ اس نے دعا کی طرف توجہ دلائی۔
 ”عزت۔۔۔ ولید کا آپریشن۔“ تیمور کافی عجلت بھرے انداز میں عزت کو دیکھ کر اس طرف آیا تھا مگر اس کے
 برابر میں بیٹھی ماورا کو دیکھ کر بے ساختہ رک گیا تھا اور بات بھی ادھوری رہ گئی تھی۔
 ”آپ یہاں۔“ تیمور کو اک نئی تشویش ہوئی تھی۔
 ”ہاں۔ میری مدر کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔“ ماورا کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔
 ”نروس بریک ڈاؤن۔؟“ تیمور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔
 ”آپ لوگ بات کریں۔ میں چلتی ہوں۔“ ماورا کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی تھی۔



”مرتضیٰ۔۔۔ مرتضیٰ۔۔۔ بی گل۔۔۔ مرتضیٰ۔“ عافیہ بیگم گہری غنودگی کے باوجود بے حد اذیت سے اور آہستگی
 سے پکار رہی تھیں اور ان کی اس پکار پر ماورا کا دل مٹھی میں اٹ گیا تھا۔
 وہ اٹھ کر ان کے بیڈ کے قریب آگئی تھی۔

”امی۔۔۔ پلیز ریلیکس۔“ اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے تھپکا تھا۔
 ”دیکھیں۔۔۔ ہم آپ کے پاس ہیں۔“ اس نے انہیں تسلی دینے والے انداز سے کہا تھا۔

”بی گل۔۔۔ مرتضیٰ۔“ عافیہ بیگم کے منہ سے جیسے سسکی ابھری تھی۔
 ”عافیہ۔ عافیہ۔ آنکھیں کھولو بیٹا۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔ دیکھو تو سہی۔“ بی گل نے بیڈ کے قریب آکر ان کے
 سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں اپنی موجودگی کا یقین دلائے، کی کوشش کی تھی۔
 ”ڈونٹ ڈری ماں جی۔۔۔ وہ بے ہوشی میں ایسی باتیں کر رہی ہیں۔“ نرس نے اندر آتے ہوئے انہیں پریشانی
 سے منع کیا تھا۔

”بے ہوشی میں بھی تو صحیح باتیں کر رہی ہے۔“ بی گل نے تلخی سے کہہ کر سر جھٹکا۔
 ”بے ہوشی میں اکثر لوگ صحیح باتیں ہی کرتے ہیں۔“ نرس ہلکے سے مسکرائی تھی۔
 ”اسی لیے تو پریشانی ہو رہی ہے۔“ بی گل تاسف سے بولی تھیں۔
 ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ مکمل ہوش میں آجائیں گی۔“ ریلیکس۔“ نرس
 عافیہ بیگم کا چیک اپ کرنے کے بعد ان سے کہتے ہوئے ماورا کا کندھا ٹھپک کر باہر نکل گئی تھی۔



ولید کو خوان کی ضرورت تھی۔
 اور اتفاق سے تیمور کا خون میچ کر گیا تھا۔
 ماورا عافیہ بیگم کے چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کو بلا نے کے لیے نکلی تھی لیکن سامنے والے روم میں بیڈ پر لیٹے

تیمور حیدر کو دیکھ کر قدم ٹھنک کر رک گئے تھے۔ جس کی نبضوں سے ولید رحمان کے لیے خون نکالا جا رہا تھا۔
 ماورا کے دل پہ اک سایہ سا گزرا تھا اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔
 وہ ٹھنکی گئی۔ رکی تھی۔ دیکھا تھا۔ کچھ ہوا تھا۔ اور آگے بڑھ گئی تھی۔
 لیکن زیادہ آگے بھی نہیں بڑھ سکی تھی۔ کیونکہ راستے میں ہی عزت حیدر بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ پریشان
 حال۔ اور نسوؤں میں ڈوبی ہوئی۔ ماورا اسے نظر انداز نہیں کر سکی۔

”عزت۔۔۔ اس کے قدم ٹھہر چکے تھے۔
 عزت نے آہستگی سے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

”میرے ساتھ آجاؤ۔“ ماورا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور عزت تو انکار کرنے کی حالت میں ہی نہیں
 تھی۔ اس کا ہاتھ تھام کر راہ داری کے بیچ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ماورا اسے ساتھ لیے اپنے کمرے میں واپس
 آگئی تھی۔



”السلام علیکم۔“ صبح ہو چکی تھی جب تیمور نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا تھا اور عزت کو چائے کا کپ
 تھماتی ماورا کے ہاتھ رک گئے تھے۔
 بی گل اور عافیہ بیگم نے بھی چونک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ عافیہ بیگم ہوش میں آچکی تھیں اور کافی دیر
 سے عزت کو دیکھ رہی تھیں کہ وہ کون ہے مگر دل میں ناراضی ہونے کی وجہ سے پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
 لیکن اس دروازے میں کھڑے تیمور حیدر کو دیکھ کر وہ عزت کو بھی پہچان گئی تھیں۔
 ”وعلیکم السلام بیٹا۔ آؤ۔ اندر آؤ۔“ بی گل دانا دشمن والے محاورے پہ پورا اترنے والوں میں سے تھیں۔
 عافیہ بیگم کی طرح دوسری طرف رخ نہیں پھیر سکتی تھیں۔
 ”تھینک یو۔“ آئی کیسی ہیں؟“ اس نے ذرا ٹھہر کر اندر داخل ہوتے ہوئے بی گل سے استفسار کیا تھا۔

”ہاں۔ اللہ کا کرم ہے اب۔۔۔ پہلے سے کافی بہتر۔۔۔ تم اپنے دوست کا سناؤ بیٹا۔۔۔ خیریت سے تو ہے نا۔“ بی
 گل نے ولید کا پوچھا تھا۔

”جی ہاں۔ اللہ کا احسان ہے۔ اس کا آپریشن کامیاب ہوا ہے۔“
 ”ریسی، بھائی!“ عزت یک دم بے قراری سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس پل پہلی دفعہ تیمور نے ذرا چونک کر
 عزت کے چہرے کی سمت دیکھا تھا اور اسے عزت کے چہرے پہ ولید کے نام کی اتنی خوشی نظر آئی تھی کہ عزت کا
 اپنا چہرہ اسے دکھائی ہی نہیں دیا تھا اور تیمور عزت کے چہرے پہ ولید کا چہرہ دیکھ کر چند انہیے کے لیے اپنی جگہ پہ گم
 صم سا ہو کر رہ گیا تھا۔

اور اس کا یہ گم صم ہونا عزت نے بھی محسوس کر لیا تھا اور ماورا نے بھی۔
 عزت نے بے ساختہ گھم گئی تھی۔

”چائے لیں گے؟“ ماورا نے مداخلت کی۔ وہ ٹھنک گیا تھا۔

”تو تھہ نکس۔۔۔ میں ابھی گھر جا رہا ہوں۔ سوچا اسے بھی ساتھ لے لوں۔ چلیں۔؟“ وہ ماورا کو وضاحت
 دیتے ہوئے عزت کی طرف متوجہ ہوا۔

”جی۔“ عزت فوراً ”سر جھکا کر اس سے پہلے ہی باہر نکل آئی تھی۔

صبح صبح سڑکوں پہ بہت زیادہ رش تھا۔
ڈاکٹرز نے تیمور کو آج کے دن ڈرائیو کرنے سے منع کیا تھا کہ خون دینے کی وجہ سے اسے کہیں کوئی چکرو وغیرہ نہ
آجائے۔ اگر وہ ایسا پریشان تھا کہ اسپتال سے خود ہی گاڑی لے کر نکل آیا تھا۔
عزت فریٹ سیٹ پہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور تیمور خاموشی سے ونڈا سکرین پہ نظریں جمائے ڈرائیو کر رہا تھا۔
”بھائی۔۔۔“ بالآخر عزت نے خود ہی اس خاموشی کا تسلسل توڑنے کی کوشش کی تھی۔
”پلیز۔۔۔ میں ابھی اس ٹاپک پہ بات نہیں کرنا چاہتا۔“ تیمور نے اسے کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا تھا۔
”لیکن بھائی! میں کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہوں۔“ عزت بڑی
تیزی سے بولی تھی۔

”میرے دل میں کوئی غلط خیال نہیں آئے گا۔ کیونکہ مجھے تم سے بھی زیادہ اس پہ بھروسہ ہے۔ اعتماد ہے۔
یقین ہے۔“ تیمور نے سنجیدگی سے یقین سے کہا۔

”تو پھر ایسا رویہ کیوں؟“ عزت نے بے ساختہ کہا۔
”افسوس ہے کہ اس نے یا تم نے مجھ پہ بھروسہ نہیں کیا۔“ تیمور نے تلخی سے سر جھٹکا۔

”نہیں بھئی۔ ایسا مت کہیں۔ میں تو۔۔۔“
”تو پھر۔۔۔ پھر کیوں ایسا ہوا کہ۔۔۔ مجھے بے خبر رکھا گیا؟“ تیمور چیخا۔
”کیونکہ وہ اس بات کے حق میں ہی نہیں تھا۔ وہ انکاری تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اس کے دوست کی بہن ہوں
اور وہ اپنے دوست کی بہن کو اس نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ اور نہ ہی۔۔۔ شادی کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے بیچ
کلاس کا فرق ہے۔ اسی فرق کو لے کر اس نے مجھے بہت نظر انداز کیا۔ میں جانتی تھی کہ وہ مجھ میں انٹریسٹ ہے
مگر اسٹیٹس کی وجہ سے اور آپ کی وجہ سے اظہار نہیں کر رہا۔“ وہ رکی۔
”اور بیچ میں پھر کچھ ایسا وقت آیا کہ میں نے غصے میں اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ لیکن جب اسے مونس

مرزا کا پتا چلا تو پھر وہ چپ نہیں رہ سکا۔ اور یہ ابھی کل کی بات ہے۔ اور آج یہ سب ہو گیا۔ پھر کیسے اور کب کچھ
بتائی آپ کو۔“

عزت نے تیمور کے سامنے ساری بات سچ سچ کہہ دی تھی اور تیمور نے ڈرائیو کرتے ہوئے اک گہری سانس
خارج کی تھی اور پھر قدرے توقف سے گردن موڑ کر عزت کی طرف دیکھا تھا۔

”ابنی دس۔۔۔ یو ڈونٹ وری۔۔۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ مجھے خوشی ہے اس بات کہ تم نے ایک اچھے
انسان کا انتخاب کیا۔ جو ہر معاملے میں سچا اور کھرا ہے۔“ تیمور نے کہتے ہوئے عزت کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا تھا اور
عزت اس کے اس قدر بھرپور ساتھ پہ بے ساختہ خدا کا شکر بجالائی تھی۔

”تھینک یو بھائی۔ تھینک یو سوچ۔“ عزت اس بے بازو سے لگ گئی تھی۔
”جانتی ہو بابا کا کیاری ایکشن ہو گا؟“ تیمور کا اشارہ مونس مرزا کے پروپوزل کی طرف تھا کہ اس کے بعد ولید کے
پروپوزل کی کیا حیثیت ہوگی۔

”ہاں جانتی ہوں۔ مگر آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی زار نہیں ہے۔ اب میں ریلیکس ہوں۔“
وہ ہنسنے ہنسنے لگی تھی اور تیمور نے مسکراتے ہوئے گیٹ پر ہارن دیا تھا۔

”جیکم صاحب۔ باہر آفاق صاحب آئے ہیں۔“ منزہر حیم ملازمہ سے ڈانٹنگ روم سیٹ کروا رہی تھیں جب ملازم نے آکر اطلاع دی اور منزہر حیم اپنی جگہ یہ جوں کی توں رہ گئیں۔

”آفاق...؟“ انہوں نے بمشکل ہونٹوں کو جھیش دی تھی۔

”جی ہاں۔ آفاق صاحب!“ ملازم نے تصدیق کی۔

”ٹھیک ہے۔ اندر بھیج دو۔“ منزہر حیم نے اپنے تاثرات سنبھال کر لیے تھے۔

”جی ٹھیک ہے۔“ ملازم کہہ کر چلا گیا تھا اور چند ثانیہ بعد آفاق کی صورت نمودار ہوئی تھی۔

”السلام علیکم آئی!“ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ منزہر حیم کا لہجہ آج پھر اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

”کیسی ہیں؟“ وہ قریب آچکا تھا۔

”ٹھیک، ہوں اللہ کی مہربانی سے۔“ انہوں نے اپنے آپ کو رفتہ رفتہ نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔

”متھینک یو۔“ آفاق نے شکریہ ادا کیا اور پھر اسے کھڑے دیکھ کر منزہر حیم خود بھی بیٹھ گئی تھیں۔

”خیر بہت۔ آج فیصل آباد کا چکر کیسے لگایا؟“ وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز سے بولی تھیں۔ آفاق بے ساختہ

ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔

”آپ وگوں سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔“ اس کے لہجے اور انداز میں نرمی تھی۔

”اتنی محبت تو نہیں ہے تمہیں ہم سے کہ ہم۔“ اس نے ملنے کے لیے فیصل آباد آجاؤ۔“ ان کے لہجے میں نہ چاہتے

ہوئے بھی طنز اتر آیا تھا۔

”آپ کو پتا ہی تو نہیں ہے کہ ہم فیصل آباد والوں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ بس کبھی کبھی اظہار میں تاخیر

ہو جاتی ہے، اور فیصل آباد والے ناراض ہو کر کراچی چھوڑ دیتے ہیں۔“ آفاق جیسے بڑے موڈ سے اور بڑے مزے

سے بول رہا تھا۔

”ہر بار تاخیر اچھی نہیں ہوتی نا۔ اس لیے۔“ منزہر حیم نے اپنی بات پہ زور دیا تھا۔

”تاخیر کی کوئی وجہ۔ کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے نا؟“ آفاق نے سوالیہ دیکھا۔

”ہر بار کوئی وجہ۔ کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ انسان کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔“

”دیکھیں آئی جان۔ کبھی کبھی انسان کی مجبوری نظر نہیں آتی۔ مرضی نظر آنے لگتی ہے مگر مجبوری اور

مرضی میں فرق جاننے کے لیے گہرائی میں اترنا پڑتا ہے اور گہرائی میں اترنے کا کام کوئی بھی نہیں کرنا چاہتا۔ اتنا

ٹائم نہیں ہے کسی کے پاس۔ کہ کوئی کسی کو جاننے کی کوشش کرے۔“ آفاق کی بات پہ منزہر حیم نے چونک کر

اس کی طرف دیکھا تھا کیونکہ اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ ان کے دل کو بھی احساس ہوا تھا۔

”ناشتا کرو گے؟“ انہیں بالآخر خیال آ ہی گیا تھا۔

”مہربانی ہوگی آپ کی۔ ناشتا تو واقعی کرنا ہے ابھی۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں ناشتا لگواتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھتے ہوئے بولیں۔

”لیکن فارہ کے کمرے میں۔“ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کمرے میں۔ لیکن فارہ تو سو رہی ہے۔“ وہ پلٹنے ہوئے رک گئی تھیں۔

”میں اسے جگاؤں گا نہیں۔ صرف ناشتا کروں گا اس کے پاس بیٹھ کر۔“ آفاق انہیں تسلی دے کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا تھا اور منہ زحیم اس کی عجیب سی باتوں پہ تیراں ہوتی کچن کی طرف چل دیر بہ اور ملازمہ کو اس کے ناشتے کے لیے کہا تھا۔



وہ بے حد ہستگی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔
 فارہ اپنے بیڈ پہ گہری اور بے خبر غند سو رہی تھی۔ آفاق بے آواز قدموں سے چلتا آہستگی سے دروازہ بند کر کے اس کے بیڈ کے قریب آ گیا تھا۔
 فارہ دائیں کروٹ سو رہی تھی اور اپنا دایاں ہاتھ چہرے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ کھڑکی سے اندر آتی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ آفاق اسے دیکھ کر پر سکون ہو گیا تھا اور پھر آہستگی سے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے سے بال پیچھے ہٹائے تھے۔
 وہ اس وقت گلابی رنگ کے سلکی ٹائٹ ڈریس میں ملبوس تھی اور اس کے سر اے کی اس قدر نرمی اور لاپرواہی دیکھ کر آفاق کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا مگر وہ اس وقت کسی بے خودی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے دل کو کچھ لگام ڈالنے کے لیے بے اختیار آہستگی سے وہ اس پہ جھانکا اور اس کے چہرے پہ اپنی بے نزاری کی مرثبت کر دی تھی۔

فارہ بے ساختہ اس لمس پہ کسمپاسی تھی اور آفاق نے جیسے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ یوں اس کے کسمپاسے پہ یک دم پیچھے ہٹا تو وہ بے وار ہو جاتی۔ پھر کالی احتیاط سے اسے بغور دیکھ کر مسکراتے ہوئے ایک اور جسارت کرتا اس کے قریب پہنچا اٹھ گیا تھا۔
 ”صاحب جی ناشتا۔“ ملازمہ نے بے حد ہلکی سی دستک دی تھی۔
 آفاق نے آگے بڑھ کر فوراً ”دروازہ کھول دیا تھا۔“

”بس یہ رکھو۔ مگر آرام سے۔“ اس نے ملازمہ کو آہستگی سے رکھنے کا اشارہ کیا تھا۔
 ”جی۔“ ملازمہ نے سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ کے ناشتے کی رُے بے حد آہستگی سے نیبل پہ رکھ دی تھی اور

باہر نکل گئی تھی۔ آفاق دروازہ بند کر کے صوفے پہ آ بیٹھا تھا۔
 اور بغیر آواز کے برتن ادھر سے ادھر رکھتے ہوئے ناشتا کرنے لگا۔
 اور ابھی وہ ناشتا کر ہی رہا تھا کہ اس کا موبائل گنگنا اٹھا۔ آفاق نے گھبرا کر موبائل کو ساکت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ فارہ کی نیند اور خواب کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔ اس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں۔ پہلی نظر صوفے پہ بیٹھے آفاق پہ ہی پڑی تھی۔ جڑے اطمینان سے براجمان۔ انتہائی سکون سے ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔ فارہ کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ اسی لیے اس نے دوبارہ پلکیں موندنے کی کوشش کی تھی۔

”گڈ مرننگ۔“ آفاق کی آواز پہ وہ یک دم چونک گئی تھی اور اس نے بے ساختہ آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا تھا کہ وہ واقعی اس کے بیڈ روم میں اور اس کی نظروں کے سامنے موجود ہے لیکن وہ اس کی حیرت سے بے نیاز لاپرواہی سے ناشتا کرنے میں مشغول تھا۔
 ”آپ۔“ وہ یک دم اٹھ بیٹھی تھی۔

”اٹس اوکے۔۔ سوئی رہو۔ ڈسٹرب نہیں کروں گا۔۔ صرف ناشتا کروں گا۔“ اس نے فارہ کو اس طرح بوکھلانے اور گھبرانے سے منع کیا تھا۔

”آپ یہاں یوں آئے ہیں؟“ فارہ کے اندر بیویوں والا غصہ عود کر آیا تھا۔

”ناشتا کرنے۔“ آفاق کی لاپرواہی ہنوز تھی۔

”آفاق۔ آپ جانتے ہیں ہمیں مذاق نہیں کر رہی۔“ فارہ لفظوں پہ زور دے کر بولی۔

”لیکن تم جانتی ہو کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔“ وہ چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

”آپ ہمیشہ مذاق ہی کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مذاق ہی اڑاتے ہیں۔ وہ بھی صرف میرا۔“ وہ اپنی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”محبت بھی تو صرف تم سے کرتا ہوں نا؟“ وہ چائے کا کپ یوں ہی ہاتھ میں لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”پلیز۔۔ میرے قریب مت آئیں۔“ وہ اسے بیڈ پہ بیٹھنے کی دیکھ کر یک دم پیچھے ہٹی تھی۔

”مجھے یقین تھا کہ تم ایسا ہی کوئی اسی لیے اس وقت تمہارے قریب آیا جب تم سو رہی تھیں۔“ آفاق نے اس کے رخسار کو بھونکا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ مزید ٹھنکی۔

”اپنے تھپڑ کا مارا ہوا بھی تو کرتا تھا؟“ آفاق کا جملہ معنی خیز تھا۔

”مارا۔۔“ فارہ کھٹک گئی تھی۔

”چلو مارا نہ سہی مرہم کہہ لو۔۔ اپنی دی ہوئی چوٹ پہ مرہم بھی تو مجھے ہی لگانا تھا نا؟“ آفاق کی ٹون ہی بدلی ہوئی تھی۔

”فارہ کو لگا وہ نشے میں ہے۔ اس نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”تمہارے سارے شکوے اور شکایتیں ختم کرنے آیا ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ آفاق کہتے ہوئے اس

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول
ہماری تھی



راحت جبین

قیمت - 300 روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز

قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی

قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عہد اللہ

قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

منگوانہ
کا پتہ:

ماہنامہ شعاع فروری 2015 255

Copied From Web

کے بالوں کو چھوٹا چاہ رہا تھا، مگر وہ یک دم بیڈ سے ہٹ کھڑی ہو گئی تھی۔
 ”میرے سارے شکوے اور ساری شکایتیں ال ریڈی ختم ہو چکے ہیں، ہمیشہ عیش کے لیے اس لیے آپ
 یہاں سے جاسکتے ہیں۔ میں اپنے گھر میں سکون سے ہوں۔“ فارہ رکھائی سے کہہ رہی تھی۔ وہ آفاق سے برگشتہ
 تھی اس کی ایسی نرمی اور نوازش پہ بھر گئی تھی۔
 ”تم اپنے گھر میں سکون سے ہوئیں تو شاید میرا بھی اپنے گھر میں سکون سے ہوتا۔ لیکن افسوس کہ سکون ہی تو

نہیں ہے نا۔“ وہ کپ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”آپ سے کس نے کہا کہ میں سکون سے نہیں ہوں؟“ وہ تلخی سے بولی۔
 ”تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں۔ تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے۔ تمہارا اک اک انداز کہہ رہا ہے۔ تم بے سکون
 ہو۔ بے چین ہو۔ اداس ہو۔“ آفاق نے گجبر لہجے میں کہتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا
 تھا اور فارہ پیچھے ہٹنے کی محض کوشش کرتی رہ گئی تھی۔
 ”بتانا۔ اداس نہیں ہو کیا؟“ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔
 فارہ کے دل میں چھپے تمام جذبات اس کی آنکھوں میں اٹھ آئے تھے اور وہ بے ساختہ رو پڑی تھی۔
 ”فارہ پلیز۔ یہ کام مت کیا کرو۔ میرے دل پہ اثر ہوتا ہے۔“ آفاق نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا تھا اور
 فارہ اس کے سینے سے لگ کے مزید پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔
 ”پلیز۔ فارہ۔ پلیز۔ چپ ہو جاؤ۔ پلیز میرے لیے۔“ آفاق اس کے بالوں کو ایک ہاتھ سے سہلاتے ہوئے
 اسے چپ کروا رہا تھا۔

”آپ کے لیے سب کر کے دیکھا ہے۔ بہت برداشت کر کے دیکھا ہے۔ مگر نہیں۔ اب نہیں ہوتا۔“ اس
 نے روتے ہوئے انکار کیا تھا۔

”صرف ایک چانس اور دے دو۔ اب دوبارہ ایسا ہو تو بے شک جو چاہے سزاؤ نا۔“ آفاق نے التجا کی تھی۔
 ”مگر گز نہیں۔“ فارہ نے اس سے الگ ہوئے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔
 ”پلیز۔“ اس نے پھر کہا۔

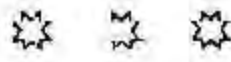
”کبھی نہیں۔“ وہ مان ہی نہیں رہی تھی۔
 ”واپس اپنے گھر چلو۔“ آفاق اسے دلچسپ اور ذومعنی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
 ”نہیں جانا۔!“ وہ ایک ہی ضدیہ اڑ چکی تھی۔

”سہیج لو۔“ آفاق کی دلچسپی ہنوز تھی۔
 ”سہیج لیا ہے۔“ وہ بھی قائم تھی۔

”ٹھیک ہے پھر جب تک تم یہاں ہو میں بھی یہاں ہی رہوں گا، بیڈ روم تو ویسے بھی خاصا خوب صورت ہے،
 انجوائے کریں گے۔“ آفاق نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
 ”واٹ۔۔۔ آپ یہاں رہیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بدک گئی۔
 ”کہوں نہیں ہو سکتا؟ یہ میری سگی خالہ کا گھر ہے اور کمراسگی کزن کا۔ مزے ہیں رہوں گا۔“ وہ کہتے ہوئے بیڈ
 پہ قدرے نیم دراز سا ہو گیا تھا۔

”آفاق۔!“ فارہ تو جیسے بری پھنسی تھی۔

اور آفاق اس کی کیفیت پہ بے اختیار مسکرا رہا تھا اور اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تھا۔



دروازے پہ دستک ہوئی تھی اور زیدہ بیگم کے کام کر۔ تہا تھ یکدم رک گئے تھے۔
یہ دستک دینے کے ہاتھ کی نہیں تھی اور وہ تھا کہ دونوں سے گھر ہی نہیں آیا تھا۔ اسی لیے وہ ذرا پریشان سی کام
چھوڑ کر دروازے تک آئی تھیں۔
”کون ہے؟“

”آئی۔ میں ہوں تیمور۔ ولید سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔“ آواز سنتے ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا تھا۔
”ولید سے ملنے کے لیے؟ مگر میں! وہ تو دونوں سے ایسا کام میں بڑی ہے کہ گھر ہی نہیں آیا۔“ زیدہ بیگم اپنی پریشانی
دباتے ہوئے بولیں۔

”اچھا۔ کیا میں اندر آسکتا ہوں؟“ تیمور نے اندر آنے کے لیے اجازت چاہی۔
”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں بیٹا۔ آؤ۔ اندر آجاؤ۔“ وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی تھیں اور وہ اندر آگیا
تھا۔

”وحید اور ککو کہاں ہیں؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تمہید باندھنے کی کوشش کی۔
”اسکول گئے ہیں۔ کیوں خیریت بیٹا؟“ ان کا دل وہم اور دوسووں کا شکار ہو چکا تھا۔
”آپ بیٹھے پلیز۔“ اس نے صحن میں کچھی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔
”تم کبھی بیٹھو نا۔“ ولید کی غیر موجودگی میں وہ بھی ان کے گھر نہیں آیا تھا اور کبھی بتا کرنے آیا بھی تھا تو
دروازے سے ہی وٹ جاتا تھا جبکہ آج تو وہ باقاعدہ اندر چلا آیا تھا اور بیٹھنے کا اشارہ دے رہا تھا۔
”جی بیٹھتا ہوں۔“ تیمور سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گیا اور پھر زیدہ خاتون بھی بیٹھ گئی تھیں۔
”دیکھیے آئی! میں آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ولید اسپتال میں ہے، لیکن
پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے وہ ٹھیک ہے اب۔“ اس نے یکدم ہٹانے سے پرہیز کیا تھا۔
اور زیدہ بیگم کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔
”کک۔ کیا ہوا ہے اسے؟“ وہ ہکلا گئی تھیں۔

”دی ہوا ہے بس کا مجھے ڈر تھا اور میں نے اسے سمجھایا بھی تھا، لیکن وہ نہیں سمجھا۔“
”مگر اسے ہوا کیا ہے؟“ وہ بمشکل بول رہی تھیں۔
”اس پر فائرنگ ہوئی ہے۔ اسے تین گولیاں لگی ہیں۔ رات کو آپریشن ہوا ہے دو گولیاں نکال دی گئی ہیں،
لیکن ایک گولی ابھی باقی ہے۔ اس کا دوبارہ آپریشن ہوگا۔“
تیمور نے بڑے محل اور بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتایا تھا تاکہ انہیں زیادہ دھچکانہ لگے، مگر پھر بھی وہ آخر
ماں تھیں ان کا کاجہ منٹھی میں آگیا تھا۔ اور وہ ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑی تھیں۔
”پلیز پلیز آئی۔ رو میں مت۔۔۔ وہ ٹھیک ہے۔ اگر ٹھیک نہ ہوتا تو میں کبھی بھی آپ کے پاس نہ آتا۔ میں
آپ کو دکھ میں نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ٹھیک ہے اب۔ خطرے سے باہر ہے۔ اسی لیے پورے اطمینان کے بعد میں
آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔ آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ وہ ٹھیک ہے اور اس کی جان بچ گئی ہے۔“ تیمور نے
انہیں اچھی طرح تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

”ہائے میرے، اللہ تیرے سوا اور کون ہے ہمارا۔ ولید کو اپنے کرم کے ساتھ میں رکھ۔ میرے بچے کو
زندگی دے۔ شفا دے۔“

زیدہ خاتون اللہ سے التجا کر رہی تھیں، تیمور نے سر جھکا لیا تھا۔
پھر جب وہ اچھی طرح دل کا غبار نکال چکیں تو وہ انہیں ساتھ لے آیا تھا۔



عافیہ بیگم کو ایک مکمل ٹریٹ منٹ کے بعد اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔
اس لیے اسپتال سے جانے سے پہلے ماوراء اولید کی خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کے روم میں آئی تھی۔

”السلام علیکم۔۔۔!“ اس نے دروازہ پر دستک دی۔ سب نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا تھا اور ان سب میں تیمور حیدر بھی تھا۔

”کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“ اس نے اجازت طلب کی۔
”آئیے۔“ زیدہ خاتون نے کہا۔

بیڈ پر پڑا اولید اسے دیکھ کر قدرے حیران ہوا، تاکہ تیمور کی ماوراء مرتضیٰ یہاں۔۔۔؟
”جیسے ہیں آپ۔۔۔؟“ وہ سیدھی اولید کے پاس آکر رہی تھی۔

”آپ کے سامنے ہوں۔“ اولید حسب عادت اتنی تکلیف کے باوجود باز نہیں آیا تھا۔ شرارت اس کے چہرے پر دوڑ گئی تھی۔

”میرے سامنے آپ اچھے حال میں نہیں ہیں، اس لیے۔“ ماوراء جانتی تھی وہ بہت شگفتہ مزاج ہے۔
”آپ سے کس نے کہا کہ میں اچھے حال میں نہیں ہوں؟ دیکھ لیں آج بڑی بڑی ہستیاں میرے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ اس سے اچھا حال اور کیا ہو گا؟“ اس نے تیمور، زیدہ بیگم اور ماوراء کی طرف اشارہ کیا تھا۔
”لیکن یہ بڑی بڑی ہستیاں آپ کو اس طرف نہیں دیکھنا چاہتیں۔ اس لیے جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“ ماوراء بڑی نرمی سے بات کر رہی تھی۔

”آپ عیادت کے لیے آگئی ہیں، سمجھ لیں میں ابھی سے ٹھیک ہو گیا ہوں۔“ تیمور پہلو بدل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا، کیونکہ اسے اولید کی خباثت کا اندازہ تھا۔ وہ اپنی کمینگی سے باز آنے والا نہیں تھا۔

”ہائیں، یہ تو اچھی بات ہے۔ فی الحال میں چاہتی ہوں۔ امی میرا انتظار کر رہی ہیں۔“ ماوراء نے اجازت چاہی۔
”اوکے، فی الحال جائیں لیکن دوبارہ آئیں گی؟“ اس نے لگے ہاتھوں آئندہ کا بھی پوچھ لینا چاہا تھا، ماوراء ٹھٹکی تھی، پھر اولید کے چہرے پر شرارت کا عنصر دیکھتے ہوئے بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

”ضرور آؤں گی۔ اللہ حافظ۔“ وہ ان سب کو خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تھی، اولید، تیمور کو دیکھ کر آنکھ دباتے ہوئے، ہنس پڑا تھا۔

”وہ۔۔۔ میری توانڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ان سے۔“ وہ تکلیف کے باوجود فریش نظر آ رہا تھا۔
”کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اولید!“ تیمور تلملا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”اپنی ہونے والی بھابھی سے بات کرنا کہاں کی کمینگی ہے بھلا۔ کیا چاہتے ہو کہ میں بات نہ کروں صرف تم کرو۔۔۔؟“ اولید الٹا خفا ہونے لگا تھا۔

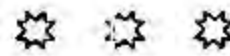
”شرم کرو۔۔۔ تمہیں تین گولیاں لگی ہیں، سیڈیا پہ تمہاری باتیں ہو رہی ہیں۔ لوگ تمہارے لیے پریشان ہیں اور تم ہو کہ پرواہی نہیں ہے، ایسے بات کر رہے ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے، یہ گولیاں تمہیں نہیں گسی اور کو لگی ہیں۔“ تیمور نے اسے بری طرح لتاڑا تھا۔

”اچھا۔ تو تم چاہتے ہو کہ میں گولیاں کھا کر بے ہوش رہا ہوں؟“ ولید نے اسے بری طرح ستایا تھا۔
 ”بے ہوش نہیں، کم از کم خاموش پڑے رہو، ناکہ پتا۔ پہلے کہ تم زخمی ہو۔“ وہ خفگی سے جھنجھلا کر بولا تھا۔
 ”زخمی تو تم بھی ہو۔“ ولید کا لہجہ اب کی بار معنی خیز ہوا تھا، تیمور نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

”آئی! میں ذرا دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں بعد میں آؤں گا۔“ تیمور پلٹ کر زبیدہ خاتون سے کتا دروازے کی طرف بڑھا۔
 ”اب کیا فائدہ۔؟ اب تو وہ جا چکی ہیں۔“ ولید نے پیچھے سے آواز دی تھی اور زبیدہ خاتون ساری بات سمجھتے ہوئے مسکرا دی تھیں۔



ماورا کچن میں کھڑی عافیہ بیگم کے لیے جوس بنا رہی تھی جب اچانک اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔ اس نے جلدی سے باہر نکلتے ہوئے کال ریسیو کی۔
 ”ہیلو! کیسی ہو۔؟“ قارہ نے چھوٹے ہی استفسار کیا۔
 ”نفس ہوں۔“ ماورا اس سے بات کرتے ہوئے دوبارہ کچن میں آگئی۔
 ”کیا ہو رہا ہے؟“
 ”ای کے لیے جوس بنا رہی ہوں۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔“
 ”خیریت کیا ہوا ان کو۔؟“ قارہ کو تشویش ہوئی تھی۔
 ”تیمور حیدر نے پریو پوز کیا ہے مجھے اور آگے کا مسئلہ تم خود سمجھ سکتی ہو۔“ ماورا جوس مکس کرتے ہوئے بولی۔
 ”اوہ اچھا! کیا کہتی ہیں آئی۔؟“
 ”کہا کچھ نہیں، بس نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔“
 ”مائی گاڈ! اتنا برا اثر لیا انہوں نے؟“ قارہ کو پریشانی ہوئے لگی۔
 ”اب اچھا لڑ بھی ہو گا۔“ ماورا کی سنجیدگی اور مضبوطی اس کے لہجے سے ہی ظاہر ہوتی تھی۔
 ”اوکے! بس بی کیسرفل میں کل کراچی آجاؤں گی۔ آن ڈیڈی اور حماد بھائی نے ہم کو روک لیا ہے۔“
 ”واٹ۔؟ تم فیصل آباد میں ہو۔؟ مجھے بتایا بھی نہیں؟“ ماورا کو اچنبھا ہوا۔
 ”سب آکر تہ اوں گی۔ ویٹ کرو۔“
 ”ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“ ماورا فون بند کر کے جوس لے کر عافیہ بیگم کے پاس آگئی۔
 ”مجھے نہیں بیٹا۔“ انہوں نے سرخ موڑ لیا تھا۔
 ”ای۔۔۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتی پلیز۔“ ماورا نے کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے پاؤں پکڑ لیے تھے، اور عافیہ بیگم دہل گئی تھیں۔
 ”ماورا۔!“ انہوں نے بے اختیار اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔



”آج بڑے دنوں بعد سکون ملا ہے۔“ ماورا نے آنکھیں موندے بڑے مزے سے کھانا فابی گل اس کے بالوں

میں تیل سے مساج کر رہی تھیں اور وہ نیچے قالین پہ بیٹھی انجوائے کر رہی تھی۔
 ”کسی کو بے سکون کرنے کا عہد کرنے کے بعد۔“ بی گل بھی کہے بغیر نہیں رہتی تھیں۔
 ”طرف داری کر رہی ہیں۔۔۔ یا ہمدردی ہو رہی ہے۔۔۔؟“ ماورا نے کیدا۔
 ”محبت تم سے کرتا ہے۔۔۔ سب کچھ تم پہ وار رہا ہے۔؟ ہمدردی ہمیں کیوں ہوئی۔۔۔؟“ بی گل نے لاپرواہی
 دکھائی اور اجواباً بے اختیار تہقکہ لگا کر ہنسی تھی۔
 ”جھلس ہو رہی ہیں۔۔۔؟“ اس نے انہیں چھیڑا تھا۔
 ”ہاں۔۔۔ بندہ ہو بھی جاتا ہے۔“ وہ جیسے افسردگی سے بولی تھیں۔
 ”ارے ڈونٹ وری میں وہ سب کچھ آپ پہ واروں گی۔“ ماورا نے بڑے پیار سے، اور بڑے شاہانہ انداز سے
 کہا تھا۔

”بس بس رہنے دو۔“ وہ خفگی سے بولیں۔
 اس سے پہلے کہ ماورا کچھ کہتی باہر دروازے پہ بیل بجنے لگی تھی اور دروازے کے قریب کلمے رکھتی عافیہ بیگم
 چونک گئی تھیں۔
 ”امی! بلیز باہر دیکھیں شاید ڈرائیور ہو گا مارکیٹ بھیجا تھا میں نے۔“ ماورا نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دی تھی
 اور پلکیں دوبارہ موندی تھیں۔
 ”کتنا خیال کرتا ہے۔۔۔ کتنی محبت کرتا ہے تم سے جاب دی گھر دیا۔ گاڑی دی۔ ڈرائیور دیا۔ اپنی محبت دی۔
 اپنا دل دیا اور اب اپنا سب کچھ دے رہا ہے۔ ایسا سفر تو اللہ بڑی نصیب والیوں کو دیتا ہے۔“ بی گل نے ایک
 بار پھر اپنے افغظوں کی لوتیز کی تھی۔
 ”تو کیا میں نصیب والی نہیں ہوں؟“ ماورا ہلکے سے مسکرائی تھی اور ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے اندر
 داخل ہوئے، تیمور حیدر کے قدم اس کی اتنی خوب صورت مسکراہٹ پہ جیسے جہاں کے تہاں گھم گئے تھے۔ مگر وہ
 عافیہ بیگم کے خیال کی وجہ سے مزید اس طرح نہیں رک سکتا تھا ورنہ بالوں میں مساج کرواتی نیچے قالین پہ بیٹھی
 ماورا اس کے دل کو چھو گئی تھی۔ اس کا یہ انداز تیمور حیدر کے دل میں اتر گیا تھا۔ اسے اس لمحے اپنی نظر کا تسلسل
 توڑنا بہت دشوار لگا تھا۔
 مگر پھر بھی اس نے گلا کھنکارتے ہوئے اپنی آمد کا سنگل دیا تھا اور وہ دونوں اپنی باتوں میں مگن چونک گئی تھیں
 ماورا نے یکدم کرنٹ کھا کے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔
 اور پھر بجلی کی سی تیزی سے کھڑی ہو گئی تھی۔
 ”آپ۔۔۔؟“ اس نے بڑے بوکھلائے ہوئے انداز سے صوفے پہ پڑا اپنا دوپٹا کھینچ کر ارد گرد پھیلا لیا تھا۔
 ”وہ میں دراصل آپ کی مدد کی عیادت کے لیے آیا ہوں۔ ولید کی وجہ سے اور کچھ ضروری کام کی وجہ سے کافی
 بڑی تھا اس لیے نہیں آسکا۔“ اس نے اسے آنے کی وضاحت دی۔
 ”آئیے۔۔۔ بیٹھیے۔“ عافیہ بیگم بھی اندر آگئی تھیں اور تیمور کو دیکھتے ہوئے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ جس
 پہ ماورا نے ٹھنک کر پہلے عافیہ بیگم پھری گل اور تیمور کی طرف دیکھا تھا۔
 اور تیمور ان کے اشارے کی تقلید کرتے ہوئے صوفے کی طرف بڑھ گیا تھا۔
 ”السلام علیکم!“ وہ بی گل کی سمت جھکا اور بی گل نے شفقت سے اس کے کندھے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔ تیمور حیدر کا
 اس قدر اپنائیت بھرا انداز دیکھ کر ماورا جزبزی ہو گئی تھی۔

کیونکہ تیمور حیدر کی اس کے گھر آمد اس کی پلاننگ یا اس کے وہم و گمان میں بھی کہیں نہیں تھی۔
”جیتے رہو۔ خوش رہو۔ بیٹھو بی گل نے بھی بیٹھنے کا کہا۔

”تھینک یو۔ آپ بھی بیٹھے ہاں! اس نے عافیہ بیگم کی طرف دیکھا۔

”ہوں ضرور۔“ وہ کہتی آگے بڑھ کے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ اور ان کے ساتھ ہی تیمور اُسی بیٹھ گیا تھا۔
”ایم سوری۔۔ میں ماورا سے ملنے کے لیے یا کسی اور کام کے لیے آتا تو یقیناً پہلے بتا کر یا اجازت لے کر آتا لیکن۔۔ میں دراصل آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اس لیے بغیر بتائے ہی آ گیا۔۔ زیادہ ٹائم نہیں لوں گا آپ کا۔“ اس نے پہلے اچانک آمد کا جواز پیش کیا تھا۔ کیونکہ وہ ماورا کے چہرے کا تعجب اور غیر یقینی نوٹ کر چکا تھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔ ماورا چائے بنا دجا کر۔“ عافیہ بیگم نے بڑے اچھے طریقے سے بات کرتے ہوئے گردن موڑ کر ماورا کو دیکھا تھا جو تیل سے بچسپڑے بالوں کے ساتھ بڑے ہونق سے انداز

میں عافیہ بیگم کو دیکھ رہی تھی کہ کیا واقعی وہ عافیہ بیگم ہیں۔؟
”ماورا!۔۔“ بی گل نے آہستگی سے ٹھوکا دیا اور ماورا چونک گئی تھی۔ تیمور نے کن اکھیوں سے اسے ایک بار پھر دیکھا تھا وہ کتنے عام سے حلیے میں بھی کتنی خاص لگ رہی تھی۔

”جی ابھی لے کر آتی ہوں۔“ وہ جانے کے لیے پلٹی۔
”نہیں پلیز۔ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس چند منٹ بیٹھوں گا۔“ تیمور نے منع کیا تھا ماکہ ماورا کو یہاں سے جانا نہ پڑے۔

”چند منٹ میں چائے بھی بن جائے گی۔ جاؤ شاباش!“ انہوں نے پھر اشارہ کیا اور ماورا فوراً وہاں سے چلی گئی تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔۔؟ وہ اب پوری طرح سے ان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔
”اللہ کا کرم ہے اب جو زندگی باقی ہے وہ جینا تو پڑے گی۔۔ چاہے جیسے بھی سہی۔“ انہوں نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا تھا جو تیمور کو بھی قیل ہوا تھا۔

”ایسا نہ کہیں آنٹی۔۔ اللہ آپ کو ہمیشہ صحت یاب رکھے، اولاد کے لیے ماں باپ بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں۔۔ ماورا کے فادر کے بلند آپ ہی تو ہیں جو۔“

”آپ کے فادر کیا کرتے ہیں۔۔؟“ عافیہ بیگم نے تیمور کی بات کاٹتے ہوئے وہ سوال کر ڈالا تھا جو بی گل کبھی مر کے بھی تصور نہیں کر سکتی تھیں کہ عافیہ زندگی میں یہ سوال بھی کر سکتی ہے۔

”میرے فادر بزنس میں ہیں بہت سال انہوں نے بزنس سنبھالا ہے اور اس معاملے میں ہمیشہ ایک کامیاب بزنس میں رہے ہیں۔ مگر میری انجکیشن ختم ہوتے ہی سب کچھ مجھے سوچ کر خود بزنس سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس لیے آج کل فراغت کے مزے لے رہے ہیں۔“

تیمور نے ایک نارمل سا جواب دیا تھا لیکن عافیہ بیگم کے سینے سے جیسے ٹرین گزر گئی تھی۔

”آپ کی مدد۔۔؟“ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اگلا سوال کیا۔

”میری مدد بہت ہی سادہ طبیعت اور گھریلو خاتون ہیں۔ بابا سے بالکل برعکس۔“ تیمور ماں کے ذکر پہ بے اختیار مسکرا دیا تھا۔

”جانتی ہوں یہ بھی جانتی ہوں۔“ انہوں نے دل ہی دل میں جیسے خود کو جواب دیا تھا۔

”سر۔! چائے۔“ ماورا نے قریب آکر کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے اسے منوجہ کیا۔

”تھینک یو۔!“ تیمور نے آہستگی سے کپ اٹھا لیا تھا۔

”آپ لوگ کبھی ہمارے گھر آئیں ناں۔“ اس طرح میرے پیرش سے بھی ملاقات ہو جائے گی آپ کی۔ اور مجھے یقین ہے میری مدر آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“ تیمور نے چائے پیتے ہوئے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

”جب اپنے گھر گئے تو تمہارے گھر بھی ضرور آئیں گے بیٹا۔“ عافیہ بیگم پہ کیا بیت رہی ہے ماورا بھی خوب جانتی تھی۔

”اپنا گھر۔؟“ تیمور کو پتا تھا کہ کراچی میں ان کا بھی کوئی گھر نہیں ہے۔

”ہاں اپنا گھر۔ یہ تو کمپنی کی طرف سے دیا ہوا فیٹ ہے ناں۔ مگر میں اپنے گھر کی بات کر رہی ہوں۔ جو ہمارا ذاتی گھر ہوگا۔ اپنا ذاتی گھر۔“

عافیہ نے جیسے اپنے لفظوں پہ زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

”انشا اللہ ایسا بھی ضرور ہوگا“ اپنی دے میں اب چلتا ہوں تھینک یو سوچ“ آج آپ سے مل کر اور آپ سے بات کر کے بہت خوشی ہوئی ہے مجھے۔“ تیمور کپ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔

”آپ نے میں آپ کو دروازے تک چھوڑ دوں۔“ ماورا کہتی ہوئی اس کے ساتھ چلتی دروازے تک آگئی تھی۔

”آپ کو برا لگا میرا آنا۔؟“ تیمور نے دروازے کے قریب رکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔“ ماورا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”آپ کا چہرہ تو یہی کہہ رہا ہے۔“ تیمور کی نظریں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں ماورا نے پلکیں جھکالی تھیں۔

”چہرے ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں۔ اس دھوکے میں نہ رہیں۔“ ماورا نے تلخی سے کہا۔

”آپ کا چہرہ بھی دھوکا دیتا ہے؟“ وہ دلچسپی سے بولا۔

”میرا چہرہ بھی تو آخر چہرہ ہی ہے ناں! دھوکا دے، بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔“ ماورا نے صاف گوئی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

”آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔؟“ تیمور نے جاتے جاتے پھر پوچھا۔

”آج سوچنے کے بعد کل فیصلہ سنا دوں گی۔“ اس کا لہجہ حتمی تھا۔

”او۔ کے“ انتظار میں ہوں۔ اللہ حافظ۔“ وہ کہہ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گیا تھا اور ماورا اس کے پیچھے دروازہ بند کر کے واپس آگئی تھی۔

”شادی کی بات کی اس نے۔؟“ بی گل نے استفسار کیا۔

”ہاں کی ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

”پھر۔؟“ انہیں تجسس تھا کہ اب ماورا کا کیا فیصلہ ہوگا؟

”میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ آج سوچنے کے بعد کل فیصلہ سنا دوں گی۔“ ماورا کہہ کر پلٹی اس نے شاور لینے جانا تھا۔ مگر اسے پھر رکنار اٹھا۔

”کیہ فیصلہ۔؟“ بی گل کا دو ٹوک سوال عافیہ بیگم چپ چاپ سن رہی تھیں۔

”یہی کہ ماورا مرتضیٰ تیمور حیدر سے شادی کے لیے تیار ہے وہ لینے کے لیے آجائے۔“

ماورا انتہائی سنجیدگی سے کہہ کر جلی گئی تھی اور پیچھے اپنی بے رحمی اور سفاکی چھوڑ گئی تھی! (باقی آئندہ ماہ ان شا اللہ)



ہم خواب سہارے زندہ ہیں،

بے شمار اندیشے ہیں
 اُن گنت ہیں دوسرے
 بے تحاشا دکھ ہیں
 بے سبب اُداسیاں
 طویل شبوں کے رت جگے
 کوئی سبب نہیں ہے جینے کا
 پھر بھی بچا رہے زندہ ہیں
 خواب سہارے زندہ ہیں
 علی راسخ

تیری جستجو کا کرم دیکھتے ہیں
 ستاروں کو زیرِ قدم دیکھتے ہیں

ہمارا شعورِ محبت تو دیکھو
 تمہیں بھی محبت سے کم دیکھتے ہیں

یہ ظالم زمانہ دکھائے گا کیا کیا
 تری آنکھ بھی آج غم دیکھتے ہیں

ذرا بنزمِ عشرت سے باہر تو آؤ
 تمہیں بھی دکھائیں جو ہم دیکھتے ہیں

قابلِ اجیری

دوست کیا معتبر نہیں ہوتے
آپ سے ہاں! مگر نہیں ہوتے

ہم ہی خطرات مول لیتے ہیں
راہتے پر خطر نہیں ہوتے

محو پرواز ہے خلاؤں میں
عقل کے بال و پر نہیں ہوتے

منہ ز لیس میرے ساتھ چلتی ہیں
راہتے مختصر نہیں ہوتے

رہناؤں کے ساتھ رہنے سے
حوہ ملے معتبر نہیں ہوتے

زندگانی سے کھیلنے والے
مورت سے بے خبر نہیں ہوتے

چار دن کی شکیبِ قربت سے
فایسلے مختصر نہیں ہوتے
شکیبِ جلالی

میں نے تو قسیر کا سوال کیا

اس نے تحقیر میں کمال کیا

ہم سفر ہاتھ تھام کر نہ چلا
ٹھوکر وں نے بہت ڈھال کیا

میرا ہتھیار میری خاموشی
صبر کو میں نے اپنی ڈھال کیا

غم کسی مسئلے کا حل کب تھا
ہم نے بے فائدہ ملال کیا

اس کی احسان مند ہوں جس نے
شامِ غم میں مرا خیال کیا

حمید شاہین

دکھا دوں تو مانوں۔

کوالٹی

حتا غلام محمد۔ کراچی

بچے

ایک آدمی نے ایک آٹومٹک۔ روٹ کار خریدی۔

ایک دن اس نے کار کو آرڈر دیا کہ اسکول سے اس کے بچے لے آئے۔ کار چلی گئی اور بہت دیر تک واپس نہ آئی۔ آدمی پریشان ہو گیا اور پولیس کو رپورٹ کرنے گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ کار بہت سارے بچوں کو لے کر آگئی۔ جس میں اس کی ملازمہ کے دو بڑے بچے، دو سالی کا ایک اور سیکریٹری کے دو بچے بھی تھے۔ آدمی ان بچوں کو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس کی بیوی غصے میں بولی۔

”اس کا مطلب ہے یہ سارے بچے تمہارے ہیں؟“

”یہ تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ آدمی نے جواباً چلا کر کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ۔ کار ہمارے دو بچوں کو لے کر کیوں نہیں آئی۔“

ثناء عمر۔ شارجہ

اسپیشلسٹ

ایک تقریب میں ایک خاتون کی ملاقات ایک ڈاکٹر سے ہوئی۔ خاتون فوراً ”خوش اخلاقی سے ان کی طرف متوجہ ہو میں۔“

”ڈاکٹر آف فلاسفی؟“

”نہیں۔ ڈاکٹر آف میڈیسن۔“

”جنرل؟“

”نہیں۔ اسپیشلسٹ۔“

”آنکھ، ناک اور گلا؟“

ریڈیو چینل سے کلاسیکی موسیقی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ ریڈیو کا ڈائریکٹر اپنے گھر پر پروگرام سن رہا تھا۔ پروگرام کی کوالٹی کے بارے میں اس نے اپنے ماتحت ڈیوٹی افسر کو فون کیا اور کہا۔

”کیا آپ پروگرام سن رہے ہیں؟“

”جی سر! میں سن رہا ہوں۔“

”پھر آپ کو بھی اندازہ ہو رہا ہو گا کہ طبلہ کی آواز کس زور سے آرہی ہے؟“

”سوری سر! میں ابھی جا کر دیکھتا ہوں۔ آپ ہولڈ کیجئے؟“

تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی افسر دوبارہ فون پر آئے اور ڈائریکٹر سے کہا۔

”سر! دراصل دو طبیلی طبلہ بجا رہے تھے۔ میں نے ایک رکوا لیا ہے۔“

فرح بابر۔ کراچی

جنگلی لڑکی

مصور کی شوقین صاحب نے جنگل میں ایک لڑکی کو دیکھا اور فوراً ”اس کی تصویر بنانے کا ارادہ کر لیا۔ جنگلی لڑکی کو گرا اور چنے دے کر ماڈل بننے پر راضی کیا اور درخت کی ایک اونچی شاخ پر بٹھا کر اس کی تصویر بنانے لگے۔ ایک آٹھ بجے بعد لڑکی نے بے چینی سے پہلو بدلاتو صاحب نے ذرا منہ بنا کر کہا۔

”میں نے تو سنا تھا کہ جنگلی لڑکیاں بڑے صبر اور برداشت والی ہوتی ہیں۔ تم تو ایک گھٹنے میں ہی گھبرا گئیں۔“

لڑکی نے مصور کی بات سن کر شاخ سے چھلانگ لگادی۔ ”تم س شمد کے چھتے پر پانچ منٹ بھی بیٹھ کر

”نہیں۔ صرف تاک۔“

”دونوں نکتوں کے؟“

”نہیں۔ صرف دائیں نکتے کا۔“

”تاک۔ مرد کی یا عورت؟“

میرے دل میں خواہش ہوئی کہ میں باہر نکلوں اور کوئی ملازمت تلاش کروں۔“

”تو پھر اس خواہش پر تم نے عمل کیا؟“ دوست نے ذرا خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ ست الوجود نے ایک بڑی سی جمالی لے

کر جواب دیا۔ ”میں اس وقت تک بستر لیٹا رہا۔ جب

تک یہ خواہش میرے دل سے نکل نہیں گئی۔“

شازیہ ٹھیکل۔ اسلام آباد

اعتراف

برادری کی روایت کے مطابق شادی کے موقع پر

نکاح سے قبل لڑکی کے باپ نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر

مہمانوں سے بلند آواز میں کہا۔

”میں اپنی بیٹی کی شادی شہزادہ ولد راجہ ولد دار

سے کر رہا ہوں۔ کسی صاحب کو کوئی اعتراض تو نہیں

ہے؟“

”مجھے ہے۔“ غصے سے بھری ایک آواز آئی۔

”تم چپ رہو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ تم دو لہما ہو۔“

لڑکی کے باپ نے ڈپٹ کر کہا۔

خدا بے رحم۔ ضلع کھسپاٹک

بے غیرتی

”سڑک کے اس پار دو تین منزلہ بلڈنگ ہے نا اس

کے کونے والے فلیٹ میں جس کی بالکونی دوسری

سڑک پر ہے۔ اس میں جو میاں بیوی رہتے ہیں،

تو بے انتہائی بے غیرت ہیں۔ انہیں دیکھ کر تو میری

نظریں شرم سے جھک جاتی ہیں۔ جب دیکھو بالکونی

کے ساتھ والے کمرے میں۔“ خاتون خانہ نے اپنے

شوہر کو بتایا۔

شوہر نے اپنی بالکونی سے اس فلیٹ کی طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔ ”مگر یہاں سے ان کا فلیٹ واضح نظر نہیں

آتا۔“

”یہ تو تھوڑی نظر آتا۔“ خاتون خانہ نے جھنجھلا کر

کہا۔ ”سیڑھی لگا کر دیکھنا پڑتا ہے۔“

الماس توریہ ہزارہ

افشاں فرقان۔ کراچی

خرچہ

پانچ سالہ بچی سے اس کی نئی کجوس پڑوس نے

پوچھا۔ ”بیٹا! آپ کے گھر میں کتنے بچے ہیں؟“

”پندرہ۔“ بچی نے انگلیوں پر حساب لگا کر جواب

دیا۔

”اور پندرہ بچے۔“ پڑوس کو بڑی حیرانی ہوئی۔ ”بڑا

خرچہ آتا ہو گا۔“

”ہم بچوں کو خریدتے تھوڑی ہیں، جو خرچہ آتا

ہو۔“ بچی نے کھلکھلا کر بے ساختہ کہا۔ ”ہم تو پیدا

کرتے ہیں۔“

صائمہ عمران۔ دہراڈی

موسیقی

ایک نوجوان نے باپ سگر کے گانے پر جھوم رہا

تھا۔ اچانک اس کا باپ آگیا۔ باپ کے چہرے پر ناوار

تاثرات دیکھ کر اس نے باپ کی توجہ ہٹانے کی غرض

سے کہا۔

”ڈیڈی! آپ نے اس سے پہلے ایسی موسیقی بھی

سنی ہے؟“

”ہاں بالکل!“ باپ نے خوش مزاجی سے جواب

دیا۔ ”ایک دفعہ شہر جاتے ہوئے دو ٹرکوں کو ٹکراتے

ہوئے دیکھا تھا میں نے۔ ایک میں دودھ کے خلی گرم

تھے اور دوسرے میں موسیٰ۔“

رشیدہ تول۔ کراچی

خواہش

نہایت ست الوجود ایک شخص نے اپنے دوست

سے کہا۔ ”آج صبح جب میں سو کر اٹھا تو بے اختیار

شکوہ جہاں گلشنِ حرم

غلے کی یہ فراوانی اب کے سال آپ کی تختِ نشینی سے شروع ہوئی ہے۔ جب بادشاہ عادل ہوا اور رعایا شکر گزار ہو تو شہر اور جنگل سب آباد ہو جاتے ہیں ورنہ سراسر برباد۔
غمرہ۔۔ کراچی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ آئے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔“

نصیحت،

ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور کہا۔
”مجھے کوئی نصیحت دے دیجئے“
کہا۔ ”کوئی چیز نہ ہے تو خوش نہ ہو، چلی جائے تو غم نہ کر۔ انسانوں کا سب سے بڑا خیر خواہ وہ ہے جو انہیں اللہ کی رحمت سے مایوس اور گناہ پر جری نہ ہونے دے۔“

غصہ میں انصاف،

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شرابی کو زمین پر گرا ہوا دیکھا۔ اسے مزادینے کے لیے دنا اٹھایا ہی تھا کہ اس نے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ آپ نے اسے چھوڑ دیا اور واپس چل پڑے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا۔
”اس نے گالیاں دے کر مجھے غصہ دلایا اور غصہ میں انصاف نہیں ہو سکتا۔“

دوسرے کی تعریف،

دوسرے کی تعریف داصل اس حقیقت کا اعلان ہے کہ وہ آپ سے بعض باتوں میں ملتا جلتا ہے۔
(فارابی)

نقشِ گر،

کہتے ہیں کہ لقمان کا رنگ کالا، چہرے پر چمکتے داروغہ و خال جیشوں جیسے تھے۔ ایک دن کسی نے ان سے کہا۔

”مجھے انہاری صورت ناپسند ہے۔“
جواب دیا۔ ”تمہیں یہ نقش ناپسند ہے یا نقش بنانے والا۔“

معلم کے لیے مشورہ،

محقق طوسی ۱۲۷۴ھ نے اساتذہ کے متعلق ہلاکو خان ۱۲۶۵ھ کو مشورہ دیا۔

”ایک معلم پچیس سال کی عمر تک پڑھے۔ چالیس سال کی عمر تک تحقیق کرے۔ ساٹھ سال کی عمر تک لکھے اور پھر دکنی تنخواہ پر اس کو سبک دوش کر دیا جائے۔“

عدل کی برکت،

نوشیرواں ۵۷۹ھ جنگل میں گھوم رہا تھا۔ ہرچہ طرف پھل درودخت اور سرسبز کھیت دیکھ کر پوچھنے لگا۔

علم کے آداب،

امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم ۱۷۹ھ سے کسی نے پوچھا۔

”کیا ہر سال فصلیں ایسی ہی ہوتی ہیں؟“
بزرگ مہر نے کہا۔ ”نہیں صاحب عالم! پھل اور

”علم کے آداب کیا ہیں؟“

انہوں نے کہا۔

اول علم

دوم تجربہ سے سنا

سوم یاد رکھنا

چہارم اس پر عمل کرنا

پنجم اس کی تبلیغ کرنا

موازنہ

عرب کے ایک فیاض بن زائدہ 786ء نے اپنے ایک یتیم بھتیجے یزید بن زید کو بھی پال رکھا تھا۔ ایک

دن اس کی بیوی نے شکایت کی اور کہا۔

”تم یزید پر زیادہ مہربان ہو اور اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتے۔“

انہوں نے کہا۔ ”اس کی وجہ ہے“

پوچھا۔ ”وہ کیا ہے؟“

کہا۔ ”ایسا آنکھوں سے دیکھ لو۔“

معن نے اسی وقت اپنے دو بیٹوں کو بلایا۔ وہ اس حال میں آئے کہ بہترین ریشمی لباس تن پر تھا اور ساتھ خدمت گاروں کی ایک فوج تھی۔

پھر اس نے اپنے بھتیجے کو طلب کیا۔ وہ ذرہ بہن کر اور شمشیر و سان سے مسلح ہو کر فوراً پہنچا۔

جب معن نے مسلح ہونے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ ”بچا جان، اقا صد نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ

نے کیوں یاد فرمایا ہے۔ میں نے سوچا مسلح ہو کر جاؤں اگر میری تلوار کی ضرورت پڑے تو تعمیل میں دیر نہ لگے

ورنہ ذرہ اتارنے میں کیا دیر لگتی ہے۔“

یہ منظر دیکھ کر معن کی بیوی نے کہا۔

”بے شک میرے بچوں کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں۔“

صبحہ شوکت۔ لاہور

مرغن غذا میں

ایک دلچسپ کا دستور تھا کہ جب کسی مریض کو دیکھ جاتا تو سب سے پہلے گھر کے باورچی کو بلا کر گلے لگاتا

کسی نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا۔

”میرا تمام کاروبار ان ہی باورچیوں کی وجہ سے

چل رہا ہے۔ اگر یہ لوگ مرغن اور ناقابل ہضم غذا میں

گھر والوں کو نہ کھاتے تو کوئی بیمار ہوتا۔“

شاد عبدالقیوم۔ بنک

مصیبت پر شکریہ

ابن عربی 240ھ سے کسی نے پوچھا۔

”مصیبت میں کیا کرنا چاہیے؟“

فرمایا۔ ”جب تجھ پر کوئی مصیبت آتی ہے تو چار

مرتبہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔“

1۔ اس بات پر کہ مصیبت اس سے بڑی بھی ہو سکتی تھی۔

2۔ برداشت کرنے کی ہمت، دی۔

3۔ دعا و عبادت بڑھ گئی۔

4۔ مصیبت جسمانی تھی، دینی نہ تھی۔

عائشہ جمیل۔ لاہور

اقوام ابوالکلام آزاد

① انسان کی سب سے بڑی عقل مندی عبرت پذیر ہے

② ہے مگر سب سے بڑی غلطی غفلت اور غماص ہے۔

③ اگر ستجانی کو اس کی اصل ضرورت کے وقت پیش نہ کیا جائے تو اس کے وجود کا اعتراف بے کار ہے

④ اور چراغ جلانے کا وقت غروب آفتاب کے بعد آتا ہے نہ کہ پہلے پہر۔

⑤ غلامی کے چارے کیسے حسین نام کیوں نہ رکھے جائیں

⑥ غلامی بہر حال غلامی ہے۔

⑦ درخت سب پوتے ہیں لیکن ہر شخص کے نصیب

⑧ میں یہ نہیں ہوتا کہ پھل کھائے۔ نہایت مبارک

⑨ ہے وہ ہاتھ جو بیج بوسے کے بعد ہی اپنے دامن میں اس کے پھلوں کو بھی دیکھے۔

⑩ دلوں کی اقلیم میں مننوں اور لمحوں کے اندر انقلاب آجاتا ہے اور اس کے انقلاب سے اس دنیا کے انقلاب وابستہ ہیں۔

⑪ صن، خوشبو، نغرا اور زیت و آسائش الگ الگ نام ہیں لیکن حقیقت صرف ایک ہے۔ یعنی

عدل و اعتدال -
نخبہ اکرم - گاؤں گوئیکی

دین

اپنے دین کی سچائی کو لائے بناؤ۔ اپنے دین کی
سچائی کو میسران بن کر دوسرے ادیان کی سچائی کو مہمان
بناؤ۔ دوسروں کا ذوق یقین بھی ان کے اندر وہی یا
اس جیسی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ جیسے آپ کے ساتھ
آپ کا ذوق یقین۔ بڑا دین یا سچا دین بڑے دریا کی
طرح ہوتا ہے۔ جو سب ندی، نالوں کو اپنے ساتھ ملا کر
سمندر سے وصل کرتا ہے کیونکہ دریا ملاپ کرتے ہیں
”لڑائیاں نہیں“

(اشفاق احمد)

ٹینڈر عطری، صبا نوشاہی - بکرات

حضرت بایزید بسطامی کا قصہ

حضرت بایزید بسطامی کا قصہ ہے کہ ان کو
کسی نے بعد و نات خواب میں دیکھا۔ پوچھا آپ
کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا۔
”مجھ سے سوال ہوا تھا کہ ہمارے واسطے کیا
لائے؟“

میں نے سوچا کہ اور اعمال تو میرے ناقص ہیں
ان کا تو کیا نام لوں البتہ میں مسلمان ہوں اور محمد اللہ
توحید میری کامل ہے اس کو پیش کر دوں چنانچہ
میں نے عرض کیا کہ توحید لایا ہوں۔ ارشاد ہوا۔

”وہ دودھ والی رات یاد نہیں“

یہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ تھا کہ ایک بار حضرت
بایزید بسطامی نے دودھ پیا تھا اس کے بعد پیٹ
میں درد ہو گیا تھا۔ تو آپ کے منہ سے نکل گیا۔
”دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا۔ اس
پر مواخذہ (پکڑ) ہوا کہ تم نے درد کو دودھ کی طرف
منسوب کیا۔ کیا یہی توحید ہے۔ جس کو تم ہمارے
واسطے لائے ہو کہ دودھ کی طرف درد کی نسبت
کرتے ہو“

حضرت بایزیدؒ یہ سن کر گھبرا گئے اور عرض کیا۔
”الہی! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں“

ارشاد ہوا۔ ”راہ پر آگئے تو جاؤ۔ اب ہم تم کو
ایسے عمل سے بخشے ہیں جس پر تمہارا گمان بھی نہ
تھا کہ اس سے بخشش ہو جائے گی۔ وہ یہ کہ تم نے
ایک رات ایک بلی کے بچے کو سردی میں اکڑاتے
ہوئے دیکھا تھا۔ تم کو اس پر رحم آیا اور اپنے لحاف
میں لاکر سلا لیا۔ اس بچے نے دعا کی اے اللہ! اس
کو ایسے ہی راحت دیجئے جیسے اس نے مجھے راحت
دی۔ جاؤ ہم تم کو اس بلی کے بچے کی دعا سے بخشے
ہیں۔ سارا تصوف گاؤں خود دو گنا سارے مراقبے
اور مجاہدے رکھے رہ گئے۔ اور ایک بلی کے بچے
کی سفارش سے بخشے گئے۔“

نمرہ اقرأ - کراچی

زمانہ

بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کے یہ
اشعار بوقت مرگ کہے گئے۔
”زمانے کے انقلاب پر لعنہ دینے والے سے
کہہ دو کہ زمانہ اس کے خلاف ہو جاتا ہے جو
کوئی درجہ رکھتا ہے۔“
”تم دیکھتے نہیں دریا۔“
”تیسرے ہیں لیکن موتی اس کی تہہ میں بیٹھے
ہیں۔“
”اگر زمیں تہہ ہمیں ستایا اور اس کی سختیاں

ہم پر پڑی ہیں تو کوئی تعجب نہیں۔ آسمان میں
بے شمار ستارے موجود ہیں مگر ہمیں صرف چاند
اور سورج ہی کو لگتا ہے۔“

(الکثر جلد 2 نمبر 7)



فہرست کتب

نوشاہ منظور ————— بھاریاروڈ

وقت نے وہ خاک اڑائی کہ دل کے دشت سے
قافلے گزرے ہیں پھر بھی نقش پا کوئی نہیں
شادی علی ————— منڈوالہ یار

آہٹ پہ کان، در پہ نظر بار بار کیوں
تو جا چکا ہے پھر بھی تیرا انتظار کیوں
کوثر خالد ————— جڑوالہ

اس زندگی کے حسن کی تابندگی نہ پوچھ
جو عادتوں کی دھوپ میں تپ کر نکھر گئی
خدیجہ مومن ————— پشاور

مجھے خود اپنی نہیں اُس کی فکر لاحق ہے
بچھرنے والا بھی مجھ سا ہی بے سہارا تھا
عائشہ جمیل ————— لاہور

دل ہی تو ہے نہ سنگ، دشت دروے بھر نہ آسکے
دوینے لگے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
سیدہ لوباسجاد ————— کپڑا

اس کی جدائی کھا گئی گھن کی طرح ہمیں
ہم سخت جان پہلے تو یوں کھو کھلے تھے
جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا وہ بھانہ تھا
انہی بڑے بھی کب تھے اگر ہم بھلے نہ تھے

ناہید شبیر رانا ————— رحمن گوٹھ

دسمبر کی آخری شب نہ پوچھو کس طرح گزری
مجھے لگتا تھا یہ ہر دم کہ وہ کچھ پھول بھیجے گا
عمران جمیل ————— میان چنوں

اس کی یادوں کی یہ بھی تو اک کرامت ہے
ہزار میل پہ ہو کر بھی ساتھ ہو جیسے
ہمارے دل کو کوئی مانگنے نہ آیا محسن
کسی عزیز کی بیٹی کا ہاتھ ہو جیسے

فوزیہ ثمر بٹ ————— گجرات

کس تذبذب میں ہے نئے سال کی ویلینڈر پر
جو کھویا ہے اس کا غم نہ کر جو پایا ہے اس کا بندر
نہیں حاصل محرومیوں کے کچھ شمار سے
گزرے غموں کو بھول کر نئی خوشیاں تلاش کر
یاسمین حنفی ————— کراچی

میرا لیے حرف دعا ہو گیا وہ شخص
مارا دھوکوں کے دور ہو گیا اک شخص
پڑھتا تھا میں نماز سمجھ کے اُسے قاتل
پھر ازل ہوا کہ مجھ سے تھا ہو گیا وہ شخص

طیبہ نواز ————— لاہور

نہ اٹھ تھا م سکے، نہ پکڑ سکے دامن
بہت قریب سے اٹھ کے چلا گیا کوئی
عائشہ بانجھا ————— ڈسکہ

کیا خرم نے کہاں، کس روپ میں دیکھا ہے مجھے
میں کہیں پھر کہیں مٹی، کہیں آئینہ ہوا پھرتا ہوں
عائشہ فاطمہ ————— لدھیانہ

منہرا ایل ستم پر ہی نہیں ہے محسن
تو اب اپنی کی عنایت سے بھی مر جاتے ہیں
آرم امتل ————— گجرات

اپنا کام ہے صرف محبت، باقی اس کا کام
جب چاہے وہ دو تھے، جب چاہے من جلے
ثمینہ یاسمین ————— میانوالی موہ

بچھا سکو تو دیا بچھا دو دیا سکو تو صدا دیا دو
دیا نہ بچے گا تو صبح ہوگی صدا دے گی تو حشر ہوگا
مدیحہ نورین ملک ————— برنالہ

کمال کرتے ہو اے دل تم بھی
اُسے فرصت نہیں، تمہیں چین نہیں

انجیل _____ ڈہری
 نہ جانے کتنی مدت سے دل میں ہے یہ عمل جاری
 ذرا سی ٹھیس لگتی ہے بہت سا لوٹ جاتی ہوں
 سیدہ نسبت زہرا کبھی چہرے بھی پڑھے تم نے
 ان سے پوچھو کبھی چہرے بھی پڑھے تم نے
 جو کیا کرتے ہیں کتابوں کی باتیں اکثر
 عراق قریشی _____ ملتان

سکوتِ شام سے وحشت ہے، کیا کیا جلنے
 تمہارا بحر قیامت ہے، کیا کیا جلنے
 بہت سی باتیں فراموش کرنی پڑتی ہیں
 یہ عمر بھر کی رفاقت ہے، کیا کیا جلنے
 حیرانوشین _____ منڈی بہاؤالدین
 وہ مستقبل میں کیا تہذیبِ عالم کی امیں ہوں گی
 جو نسلیں سانس لے رہی ہوں ان زہریلی فضاؤں میں

سویا مبین _____ موہڑہ دھیال
 یہ کیا ہوا کہ بھرے آسمان کے آنگن میں
 بجھ کر گیا وہ ستارہ جو ہمارے نام کا تھا
 ساجی عاصم _____ منڈو آدم
 اک انفس بھی ادھر سے ادھر نہ ہونے پلنے
 میں جیسا تمہیں ملا تھا مجھے ویسا جدا کرو
 عائشہ جمیل _____ بلدیہ ٹاؤن
 صحنِ شربت میں قضا دیسے مت آنا کہ
 خرچِ تدفین کا لگ جاتا ہے بیماری پر

مانیہ نصیر _____ فیصل آباد
 چچہ چکے دے جلتے ہیں
 گہرے لوگ سنہرے لوگ
 کوثر ناز _____ حیدر آباد
 محبت میں ان کی شدت ہی اس قدر تھی ساقی
 گرا قرار سوئپ آتے تو وہ جان سے گزر جلتے
 کوثر خالد _____ جڑانوالہ
 اس زندگی کے صحن کی تابندگی نہ پوچھو
 جو عادتوں کی دھوپ میں تپ کر نکھر گئی

عالیہ نور _____ منڈوالہ یار
 مرے دل کی لڑاکھ کرید مت، اسے مسکرا کے ہوا نہ دے
 یہ چراغِ پھر چراغ ہے تیرا ہاتھ جلانا دے

نوزیہ ثمر بٹ _____ ہجرات
 خوش مزاجی بھی مشہور تھی اب سادگی بھی کمال ہے
 ہم شریر بھی انتہا کے تھے اب سنجیدگی بھی کمال ہے
 نوال افضل _____ لاہور

کوئی تو ایسی بات کرو
 جس سے لگے تم میرے ہو
 مدیحہ جاوید _____ سرگودھا
 اے مصوٰرا تجھے استادِ مان لوں میں
 میرا درد بھی کھینچ لے تصویر کے ساتھ

آمنہ اجالا _____ ڈہری
 بھڑنے کی کہاں ملتی ہے مہلتِ راہِ ہجرت میں
 نہ جانے کتنے چہروں کو پسِ دیوار چھوڑ آئے

آفتِ آتش _____ چیچہ وطنی
 کیوں کر بڑھائیں ربطِ محبت اجنبی کے ساتھ
 ساتھی تھے عمر بھر کے جو غیر دل سے جلنے
 زر عونہ خان _____ پشاور
 وقت کی قید، خواہشوں کے جال
 زیست کچھ بھی سہی، غلامی ہے

سرت احمد _____ فیصل آباد
 میں کیوں نہ ترکِ تعلق کی ابتدا کرتا
 وہ دودِ دیس کا بھاسی تھا کیا وفا کرتا
 وہ میرے ضبط کا اندازہ کرنے آیا تھا
 میں ہنس کے زخم نہ کھاتا تو اودھ کیا کرتا

نمرہ بوگن _____ دتال ساگلہ ہل
 ورقِ ورق پر تیری عبارت، تیرا فسانہ تیری حکایت
 کتابِ ہستی جہاں سے کھول تیری ہی یاد دل کا باب نکلا

نوزیہ ثمر بٹ _____ ہجرات
 ہر شام چراغوں کی طرح جلتی ہیں آنکھیں
 کیا کوئی چلا جائے تو یوں ہوتا ہے محسوس



کیسا لگا؟ جنوری کے شمارے میں ڈاکٹریوٹس بٹ سے ملاقات کر کے بڑا مزہ آیا۔ بہت خواہش تھی ان کا انٹرویو پڑھنے کی۔ شاہین رشید سے گزارش ہے کہ وہ سمیع خان اور ارم اختر کا انٹرویو شائع کریں۔

بہت شکریہ تمینہ! شاہین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ تمینہ اچھا ہوتا کہ آپ ”غریقِ رحمت“ کی قسط پڑھ کر اس کے بارے میں بھی لکھتیں۔

صائمہ مشتاق نے حافظ آباد سے لکھا ہے

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی کیم کور سالہ میرے ہاتھ میں تھا۔ سرورق کچھ خاص نہ تھا۔ فہرست پر نظر دوڑائی تو مریم عزیز کو دیکھ کر مسکراہٹ دوڑ گئی لبوں پہ۔ اس لیے اس بار سب سے پہلے ”یارم“ کے بابائے ”میرے ساتھ رہنا“ کو ترجیح دی۔ وجہ صرف اتنی سی ہے کہ یارم کے بعد کچھ اور پڑھنے کے قابل نہیں رہتی۔ ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے ایک دن ”یارم“ پڑھتی ہوں اور اگلے دن پورا شعاع۔

خیر... مریم عزیز کا ناول تھا تو ہمیشہ کی طرح۔ مگر ہمیشہ کی طرح اس بار زیادہ مزہ سکا۔ (لوجی! بجلی کل۔ ٹھہریں ایمر جیسی لائٹ جلا لینے دیر۔ جی تو وہی ساہو سی کہانی تھی مگر مزہ نہیں آیا۔ ابھی اب ”زندگی دھوپ“ تم گھنٹا سا یہ

جیسا مصطفیٰ روز روز جنم نہیں لیتا تا۔ مریم پلیز! ایسی کہانیاں لکھیں کریں جیسی مصطفیٰ والی ہے۔ افسانوں میں ”مما“ سب سے بہترین تھا۔ جملے بہت زبردست تھے اور واقعات بالکل حقیقی اس لیے بہت اچھا لگا پڑھ کے۔

مصباح نوشین کا ناول بھی زبردست تھا۔ لگا ہم بھی اسی زمانے میں پہنچ گئے۔ منظر نگاری لا جواب تھی۔ رائٹرز کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بہت عمدگی سے قلم بند کیا ہے مصباح نے۔ حشمت زیدی کے احساس کمتری نے جو خلا اس کی شخصیت میں بھر دیا ہے۔ بہت نقصان کیا اس نے حشمت کا۔ اپنی انا اور احساس کمتری کے ہاتھوں اس نے اپنی جنت خود جہنم بنا دی۔ جس محبت میں عزت نہ ہو اس کی طرف تو دیکھنا ہی نہیں چاہیے۔ اتفاق اور ارادہ کی کہانی مجھے بہت اچھی لگی۔ ویل ڈن مصباح۔ بہت زبردست ناول تھا۔ ایک اور زبردست کہانی ”غریقِ رحمت“



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، گجراتی۔

Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔
آپ سب کی عافیت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے
دعا میں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو، ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفاظ
امان میں رکھے۔ آمین
اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف

پہلا خط درگاہی پور سے تمینہ ارشد کا ہے، لکھتی ہیں
سمیرا جمیل کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں
ہیں۔ امرت پور تو مجھے بہت غصہ آتا ہے، ہر انا کام امرت ہی
کیوں کرتی ہے۔ اب آتے ہیں ”رقصِ بگل“ کی طرف
جو بلاشبہ ایک زبردست ناول ہے۔ رخسانہ نگار عدنان کا
ایک بھی مثال ”بھی اچھا ناول ہے۔ حقیقت سے قریب
مکمل ناول دونوں ہی اچھے تھے۔ افسانوں میں ”بیماری ال“
نمبروں تھا۔ کینز نور علی کا ”انتخاب“ بھی اچھا افسانہ تھا۔
سحر ساجد کا ناول ”غریقِ رحمت“ پورا پڑھ کر تائیں گے

رکھا جاتا ہے۔ ہماری طرف سختہ پردہ ہوتا ہے ہم ٹولی والا برقعہ پہن کر اسکول اور کالج جاتے ہیں مگر ہمیں اس پر بھی بھی کسی سے بھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی بلکہ ہمیں فخر ہے۔ اپنے پردے پر۔

بنوں کی عید کا بھی اپنا مزہ ہے۔ عید کی روایتی ڈش سفید چاولوں کے ساتھ اصلی گھی اور پلاؤ یا زردہ ہر گھر میں بننا ہے۔ عید والے دن ہماری امی فجر سے ایک دو گھنٹے پہلے اٹھ کر یہ سب تیار کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ نماز عید کے بعد گاؤں کے سب مرد ایک گروپ کی شکل میں ہر گھر میں حاضری دیتے ہیں اور روایتی ڈش چکھتے ہیں صرف چکھتے اس لیے ہیں کہ ہر گھر میں حاضری دینا لازمی ہوتا ہے اس لیے گنجائش رکھی جاتی ہے (پیٹ میں)

اسی طرح عورتیں بھی گروپ ہی کی شکل میں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ برقعوں میں ملبوس عید ملنے جاتی ہیں ہماری عید بہت پیاری ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں مذہب کو خاص اہمیت حاصل ہے اور نماز بھوڑنے کا تصور بھی گناہ سمجھا جاتا ہے یہاں کے تمام لوگ نماز اور روزے کے پابند ہیں اور سچ کہوں مجھے ان لوگوں پر ترس آتا ہے جو نماز اور روزے کی پابندی نہیں کرتے اور شکر ہے خدا کا ہماری طرف ایسے لوگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

بنوں میں بہت سی مشہور چیزیں ہیں جس میں سکندر خیل پالا کی جلیبی طور کہ بازار کے پکوڑے، ولبر کا حلوہ اور سورانی کے امروہ شامل ہیں، سورانی میں ایک مشہور جگہ

کورمہ ہے جسے لوگ دیکھنے آتے ہیں یہ بہت خوب صورت جگہ ہے آبادی سے دور سرسبز شاداب زمینیں چند ایک باغات اور تاحد نگاہ پانی کی نہر جو نجانے کہاں تک جاتی ہے۔ یہاں شعاع اور خواتین وقت پر مل جاتے ہیں۔ مگر ایک کمی ہے اور وہ یہ کہ سورانی میں پی پی وی کی نشریات نہیں آتیں۔ رات کو تو کبھی ٹی وی دیکھ لیتے ہیں مگر دن کے وقت تو ٹی وی ایک خواب ہو گیا ہے۔

پیاری ٹوبہ! اللہ تعالیٰ آپ کے بنوں کو ہمیشہ سلامت رکھے اور یہاں ہمیشہ امن وامان رہے، آپ کے شہر اور آپ لوگوں کی روایات کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی۔ پختون بہت غیور۔۔۔ مہمان نواز محنت کش ہوتے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ ان پر کبھی کوئی باہر سے آکر حکومت نہیں کر سکا ہے۔ انگریزوں نے پورے برصغیر پر

نے دل چھو لیا۔ سحر ساجد ہمیشہ کچھ نیا اور زبردست لکھتی ہیں۔ اتنی بے قراری سے میں کہانی پڑھتی گئی اور جب آخری صفحے پر پہنچی تو ”آخری حصہ آئندہ ماہ“ دیکھ کر بے ساختہ منہ سے ”اوہ نو“ نکلا۔ زینب آیا کا کردار بہت کمال کا تھا۔ ان میں مجھے اپنی شازی بچو کی جھلک نظر آئی۔

ڈاکٹر بولس ٹ سے مل کر اچھا لگا۔ ”ہم سب امید سے ہیں“ تو میں بھی بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ بنیش چوہان میری پسندیدہ اداکارہ ہیں اس لیے ان سے مل کر اچھا لگا۔ منہاج عسکری۔۔۔ قطعی پسند نہیں۔ مستقل سلسلوں میں میرے پسندیدہ ”باتوں سے خوشبو آئے“ ”خط آپ کے“ سارے پڑھتی ہوں۔ فائزہ افتخار اور سعدیہ عزیز آفریدی کو ڈھونڈ لائیے خدا را۔

پیاری صائمہ! آپ کا طویل خط پڑھا۔ بہت جامع اور اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ سعدیہ عزیز آفریدی اور فائزہ افتخار کی کمی ہم بھی محسوس کرتے ہیں ان تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

آپ کی رائے مصنفین تک ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ٹوبہ رحمن قریشی کے پی کے خوب صورت شہر بنوں کے احوال کے ساتھ شریک محفل ہیں لکھا ہے

سابق وزیر اعلیٰ اکرام درانی کا گاؤں ”سورانی“ میرا بھی

گاؤں ہے جو کہ بہت سرسبز شاداب ہے۔ بنوں میں ہر طرح کی سہولیات موجود ہیں اور حال ہی میں یہاں گیس بھی آچکی ہے جو کہ بہت خوشی کی بات ہے۔ یہاں ایک بہت مشہور مل ہے جو بنوں وولن مل کہلاتی ہے ایک شوگر مل بھی ہے اور کچھ سال پہلے بنوں یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں آیا ہے۔ اسی طرح لا تعداد اسکولز اور کالجز ہیں جن میں لاکھوں لوگ علم کی دولت حاصل کر رہے ہیں۔ بنوں اور خاص کر سورانی کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں (اگر یقین نہ آئے تو کبھی آکر آزمائیں) اگرچہ ہر میدان میں ترقی ہو چکی ہے مگر پھر بھی یہاں روایات اور رسم و رواج کو مقدم سمجھا جاتا ہے خوشی اور غمی میں سب ایک دوسرے کا ساتھ نبھاتے ہیں۔ ہمارے ہاں شادیاں گھروں میں ہوتی ہیں (اگرچہ ایک دو شادی ہال بن چکے ہیں) ہزاروں لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے لیکن شادیوں میں بھی پردے کا خاص خیال

قبضہ کر لیا لیکن اس خطے پر قابو نہ پاسکے۔
ہماری دعا ہے کہ ہمارے ملک کے تمام شہر گاؤں ہمیشہ
آباد خوش حال رہیں۔ آمین۔

بیلہ سائنس نے میرپور آزاد کشمیر سے شرکت کی ہے
لکھتی ہیں

ایک بار پہلے بھی میں نے یہ شکایت کرنے کا سوچا تو اٹھ
بھلا کرے ایک بہن نے مجھے زحمت سے بچا لیا۔ اسے بھی
آپ نے وی جواب دیا جو جنوری کے شمارے میں دیا قریشی
کو دیا اور مجھے مجبور کیا کہ اب کی بار میں خود اپنا غصہ
نکالوں۔ ہندی لہجے اور الفاظ کی بابت آپ کا موقف میری
نظر میں انتہائی غیر مدلل ہے (معذرت کے ساتھ) میں مانتی
ہوں کہ اردو کا مطلب لشکر ہے تقریباً "سات زبانوں" نے
مل کر اردو کو جنم دیا ہے جن میں ہندی بھی شامل ہے۔ ہم
لوگ اردو میں انگریزی کا ضرورت سے زیادہ استعمال بھی
کرتے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ بہت سی زبانوں کے بہت سے
الفاظ اردو میں شامل نہ ہونے کے باوجود وہ ہماری زبان میں
شامل ہیں جن کو "مستعمل" کہا جاتا ہے۔ آپ نے کہا کہ
"اردو کو محدود نہ کریں اس کا دامن بہت وسیع ہے" اس کا
مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم ہر اچھی بری چیز اس کے دامن
میں اچھال دیں۔ ایک کہاوت ہے کہ جہاز میں گندم کے
دانے کے برابر بھی سوراخ ہو تو آخر کار جہاز کے ڈوبنے کا
باعث بن جاتا ہے۔ آج ہم اردو کی جگہ ہندی لہجہ اختیار
کریں گے، کل کو ہندوؤں کی طرح جذبات کے بجائے۔

"جذباتوں" کا استعمال کر رہے ہوں گے۔ ہر زبان اپنے اندر
دوسری زبان کو سمونے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنا
ایک خاص ماحول اور مزاج رکھتی ہے اور اسے اس کے
ماحول اور مزاج کے مطابق بولا جائے تب ہی اس کا دامن
برقرار رہتا ہے اور کشش محسوس ہوتی ہے۔ میرے بچے
خواب کی جگہ "سپنا" بولیں تو میں انہیں فوراً "ٹوکی" ہوں
کہ جب اردو میں لفظ موجود ہے تو آپ کارٹون سے کہنا کر
یہ کیوں بولیں جب یہ کہا جاسکتا ہے کہ "میں اس کی وجہ
سے پریشان ہوں" تو پھر "اس کو لے کر پریشان ہوں" کہنے
کا مقصد؟ اور یقین کیجئے اچھی خاصی تحریر پڑھتے ہوئے
انسان۔ بے تحاشا برگشتہ ہو جاتا ہے آج "لے کر" بول
رہے ہیں، کل "لے کر کے" بھی بولیں گے۔ اور اب یہ

ساری لکھاری بہنیں دیکھا دیکھی ایک ہی ڈگر پہ چل رہی
ہیں۔ ہندو اردو بولتے ہیں اپنے انداز میں۔ جہاں ہندی لہجہ
محسوس ہوتا ہے۔ ہم اردو کی اصل روح کے ساتھ اردو نہ
بول کر اپنی علیحدہ شناخت کیوں کھو رہے ہیں۔ خدا را
تحریروں کا مزا کرنا ہونے سے بچائیے۔ ہم بہت سی زبانوں
خصوصاً اپنی علاقائی زبانوں کا بڑا ضرور لگاتے ہیں۔ اردو
میں بڑا مزا برہاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے پھر مزا کرنا
کرتے ہیں۔

تبصروں میں خبروں کے ساتھ طنز و مزاح سے رہتے
میں بہت مزا آتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں کسی فنکار کی عزت
نفس پہ بھی خاصا حملہ محسوس ہوتا ہے۔ سو "ہتھ ہولا"
رکھا کریں۔

ایک درخواست ہے کہ کسی خاتون یا حکیم صاحب سے
مشوروں کا اگر سلسلہ شروع کر سکیں تو۔ یہ لوگ ٹی وی پہ
جو بتاتے ہیں وہ چیزیں بولتے ہوئے لکھنا یا سمجھنا مشکل ہوتا
ہے۔

پاری بیلہ! آپ کی شکایت سر آنکھوں پر ہم نے غلط
اردو لکھنے کی حمایت نہیں کی تھی۔ نہ ہی انڈین ڈراموں میں
جو اردو بولی جاتی ہے اس کو صحیح قرار دیا تھا۔
ہم نے صرف اردو میں ہندی الفاظ کی آمیزش کے
بارے میں لکھا تھا۔ اردو میں ہندی کے بہت سے الفاظ
شامل ہیں۔ انشاجی کی نظم کا ایک حصہ لکھ رہے ہیں۔ اس
میں ہندی الفاظ کا شمار کیجیے۔

جب سورج ڈوبے، سانجھ بھی
اور پھیل رہا اجیارا ہو

کسی ساز کی تہ پر جہنم جہنم
کسی گیت کا ٹکڑا جاگا ہو
اس تال پہ ناچتے پڑوں میں
ایک چپ چپ بہتی ندیا ہو
ہو چاروں گٹ سنگدھ بسی
جیوں جنگل پہنا گجرا ہو
اس سندر شینل شانت سے
ہاں بولو بولو پھر کیا ہو؟
وہ جس کا ملنا نا ممکن
وہ مل جائے تو کیسا ہو؟

یہ انشاجی کی ایک طویل نظم "انشاجی بہت دن بیت

چکے کا ایک حصہ ہے۔

اس میں اجیارا، ٹکھڑا، سنگدھ، جیوں، شیتل، شانت سے یہ تمام الفاظ ہندی کے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی اگر ہم اردو کے اساتذہ شعر اور مستند نثر نگاروں کو دیکھتے ہیں تو ان کی تحریروں میں ہندی الفاظ شامل ہوتے ہیں۔

آپ نے بہت اچھا خط لکھا، ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں بلا ضرورت ہندی الفاظ کا استعمال ہمیں بھی پسند نہیں کویشن کریں گے کہ ہندی الفاظ کا استعمال نہ کیا جائے۔

اروم عزیز نے سیالکوٹ سے لکھا ہے۔

ایک شکایت، ہر دفعہ وہ ہی پرانے ناولوں کے ناموں کی اشاعت ہزار دفعہ کہا۔۔۔ مگر کوئی فرق نہ پڑا، کسی مصنف سے کوئی ملاقات نہیں۔؟ ہم سے ضرور آپ کی دشمنی ہے۔ ورنہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ ہماری مرضی نہ سنیں! سرورق بس سو سو تھا۔ میرا حمید کی تصویر دکھائیے۔ کیوں ہمیں تڑپ رہی ہیں اور ہاں تمام مصنفات کے ناولز جو کہ شعاع کی ابتدا سے لکھ رہی ہیں۔ لسٹ میں دے دیں۔ پلیز۔ کہنے کو بہت کچھ ہے مگر وقت کی کمی ہے۔ انسان جو ٹھہرے، ابھی ہم فارغ ہوئی نہیں سکتے۔

اروم! دشمنی کا سوال ہی نہیں ہمیں اپنی تمام قارئین بے حد عزیز ہیں اور ہم ان کی آرا کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ ان کے مشورے کو مد نظر رکھ کر پچا ترتیب دیتے ہیں پرانی مصنفین کی تحریروں کی دوبارہ فرمائش میں صرف ایک مسئلہ ہے، وہ یہ کہ ہماری قارئین پرانی سے پرانی

تحریروں کے نہ صرف کردار بلکہ ان کے عنوان اور مصنفین کے نام بھی یاد رکھتی ہیں۔ ہم نے یہ تحریروں

دوبارہ شائع لیں تو انہیں کوئی ہوتی۔

جہاں تک مصنفین کی تصاویر کی بات ہے، ہم مصنفین سے سروے میں ان کی تصاویر دیتے رہے ہیں یا رم کے مکمل ہونے کے بعد میرا حمید کا انٹرویو دیں گے اور اگر انہوں نے اجازت دی تو ان کی تصویر بھی شائع کریں گے۔ اس بار تو آپ کا خط شکایت نامہ تھا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

روبی ڈیشن انک سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

آئی 2013ء کو شادی کے مقدس بندھن میں بندھ کر ایک نئی زندگی سے روشناس ہوئی۔ نئی زندگی، اجنبی لوگ، پر اللہ تعالیٰ کا بہت احسان ہے کہ شوہر کے روپ میں بہت تخلص اور محبت کرنے والا سا تھا دیا۔ بہت طویل عرصے بعد خواتین میں عمیرہ احمد کو "آب حیات" کے ساتھ دوبارہ ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑتے دیکھ کر خط لکھنے سے خود کو روک نہ سکی۔

فائزہ افتخار کہاں غائب ہو گئی ہیں جی؟ بشری سعید کے بھی منتظر ہیں۔ "ایک تھی مثال" کی ابھی ایک ہی قسط پڑھی ہے پراچھا لگا۔

آئی پچھلے سال میرے ابو جی، فقیر علالت کے بعد وفات پا گئے۔ ابو جی کی علالت کے دوران پہلی بار لوگوں کے بناوٹی ردیوں کو دیکھا۔ لہجوں کو بدلتے دیکھا کہ ہر رشتے سے اعتبار اٹھ گیا۔

پیاری روبی! اللہ تعالیٰ آپ کے والد کی مغفرت کرے۔ کسی کے ردیوں سے اسے پرکھنا درست نہیں۔ آج کے دور میں ہر انسان بہت سے حصوں میں بٹا ہوا ہے اور زندگی پہلے کی طرح آسان نہیں رہی ہے۔ رشتے نبھاتے ہوئے تمہیں نہ کہیں کوئی کمی یا کوتاہی ہو جاتی ہے۔ اس کو دل سے لگانا یا دل میں رکھنا صحیح طرز عمل نہیں۔ افسوس ضرور

سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ نور عین کے چچا شوکت علی صاحب قضا نے الٹی سے وفات پائی گئے۔

اللہ وانا الیہ راجعون

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

زیادتی ہوئی اور ہماری چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے آپ کو
وضاحتیں دینا پڑیں۔ اس سہ کے لیے معذرت خواہ ہیں۔
کائنات خان نے مجلس سے شرکت کی ہے، لکھتی
ہیں

جنوری کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔

”سمیرا امید“ بکاپل یارم میری فیورٹ کہانی ہے۔ نبیلہ
عزیز کا ناول ”رقص بکسل“ بہت اچھا ہے۔ پلیز نبیلہ جی
اس کہانی میں تھوڑی سی تیزی لائیں۔ رخسانہ نگار عدنان
کا ناول ”ایک بھی مثال“ اپنی مثال آپ ہے۔

پیاری کائنات! شعاع کی محفل میں خوش آمدید آپ
نے ان دونوں ناولوں میں کرداروں کو ملانے کی بات لکھی
ہے ایک بات ہمیں بہت عجیب لگتی ہے۔ حقیقی زندگی میں
دو افراد اپنی زندگی کا خود فیصلہ کر کے ملنا چاہیں تو کوئی بھی ان
کا ساتھ نہیں دیتا جبکہ ناول اور افسانوں میں ہر قاری بہن
کی فرمائش یہی ہوتی ہے کہ مرکزی کرداروں کا ملاپ کر دیا
دیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ ہم۔ آپ کی ساری
فرمائشیں پوری کریں گے اور جن کرداروں کے بارے میں
آپ نے لکھا ہے ان کا ملن ضرور ہوگا۔

فرح یعقوب اور سائرہ واؤڈ پورہ غازی خان سے شرکت
کی ہے، لکھتی ہیں

سب سے پہلے تو سرورق پر خوب صورت سی ماڈل دل کو
بھاگئی۔ ماڈل کے بال تو سب سے پیارے لگے۔ اس کے
بعد ڈریس کا کلر..... پہلے اپنے موٹ فیورٹ ناول
یارم کی طرف دوڑ لگا دی۔ مجھے امرحہ کی بددعا میں بڑی
اچھی لگتی ہیں اور ہنسی بھی خوب آتی ہے۔ کبھی کہتی ہے
ویرا روس کے برفانی طوفان میں دب کر مر گئی ہوگی تو کبھی
کارل مر گیا ہوگا (خیر ہنس ہنس کے برا حال ہو جاتا ہے) چلو
شکر ہے کہ کارل کا غور توڑنے والا بھی کوئی پیدا ہوا (چچ چچ
بیچارہ کارل.... ہماری پاکستانی! امرحہ زندہ باد) باقی رسالہ ابھی
ذریعہ مطالعہ ہے۔

فرح اور سائرہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ سمیرا
حمید تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہی
ہیں۔ باقی رسالہ آپ نے پڑھا نہیں، اس لیے تبصرہ بھی
ادھورا ہے۔ دادا جی نے اپنا رویہ اس لیے تبدیل کیا کہ وہ
نہیں چاہتے ان کی مسلمان، پاکستانی پوتی اپنی مرضی سے

ہوتا ہے لیکن ایسی باتوں کو بھلا دینا چاہیے۔
فائزہ انٹار چینلز کو پیاری ہو گئی ہیں، ہمیں وہ اب
بھولے سے بھی یاد نہیں کرتیں۔ لیکن ہمیں بہت یاد آتی
ہیں شاید کبھی لوٹ آئیں۔
بشری! سعید ضرور لکھیں گی ان شاء اللہ وہ آج کل ایک
ناول پر کام کر رہی ہیں۔

آپ نے لکھا ہے رخسانہ نگار کے ناول کی ایک ہی نسخہ
پڑھی ہے۔ اس بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔ رخسانہ
کے ناول کی 23 اقساط شائع ہو چکی ہیں کیا آپ شروع سے
ناول نہیں پڑھ رہی ہیں۔

عائشہ جمیل نے لاہور سے لکھا ہے

جس دن باجی شعاع لے کر آئیں تو میں نے سب سے
پہلے سروے کھول کر دیکھا پھر میں رسالہ باجی اسماء کو دے کر
چمچن میں غلی گئی۔ کچھ دیر بعد باجی اسماء کی آواز آئی۔ میں
نے جا کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

کہنے آئیں ”یہ تم نے لکھا ہے؟“ میں نے پڑھا اور
آنکھیں جھیل گئیں۔

”نہیں، یہ تو میں نے نہیں لکھا۔“ پھر پڑھ کر دیکھا۔
اپنے لکھے کی نشان دہی کی۔ وہ تو کسی اور کا سروے شروع ہو
رہا تھا۔ میرے سروے کے نیچے سے۔ مگر اس کا نام نہیں
لکھا تھا۔ جی اسماء نے پینل سے لائن لگا کر اینڈ لکھ دیا۔

پرسوں مریم علی کامیج آیا ”عائشہ تمہاری شادی ہو
رہی ہے؟“ ”اف! میرے تو سر پر لگی۔ غصے میں اسے بھی سنا
ڈالیں کہ: ”ہیان سے دیکھو۔ نئی نمبرنگ شروع ہو رہی
ہے۔ میں کیا پاگل ہوں جو ایک سوال کا دو دو بار جواب
لکھوں گی۔“ اب آپ سے گزارش ہے کہ پلیز اس غلطی
کی وضاحت کر دیں۔ گھر والوں کو تو میں نے بتا دیا۔ بلکہ
انہیں بتاتا ہوں۔ اتنی دور بیٹھی دوستوں کو کیسے سمجھاؤں؟
سارا مزہ کراہو کر رہ گیا جی میں۔

سائرہ رضا اور عائشہ فیاض جو خطوط لکھتی ہیں۔ شان
دار ہوتے ہیں۔ پہلے تو نمبرہ احمد بھی لکھا کرتی تھیں۔ اب
کیوں نہیں لکھتیں؟ کبھی کبھار لکھا کریں نا نمبرہ جی!
تاریخ کے جھوٹے ”مجھے بہت پسند ہے۔“

پیاری عائشہ! ہمیں احساس ہے کہ آپ کے ساتھ

کائنات! شرقی عورت قابل تعریف ہے لیکن مشرقی روایات نہیں۔ شادی کے لیے لڑکی کی مرضی پوچھنا ضروری ہے۔

رافیہ کنول دائرہ دین پناہ سے لکھتی ہیں

خط لکھنے کی وجہ سمیرا حمید کی کہانی ”یارم“ ہے عالیان کے ساتھ اتنا ظلم، محبتیں بانٹنے والا لڑکا خود کتنا ادھر رہا ہے کیا محبت واقعی میں اتنے دکا دیتی ہے۔

محبت بھی کتنی عجیب شے ہے دو ہفتے مسکراتے زندگی سے بھرپور انسانوں کا کیا حال کر دیتی ہے اور آخر میں یہ کابل کے جملے ”تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میری کچھ سانسیں تم سے راستہ بنا کر مجھ تک آتی ہیں اور یہ بھی نہیں بھولنا کہ کابل کا شمار بھی بد نصیبوں میں ہوتا اگر اس کے پاس عالیان نہ ہوتا مکمل ناول میں تم ساتھ رہتا مرمم عزیز بازی لے گئیں۔ حمیرا نوشین کا افسانہ ”مما“ اچھا تھا کیا انہوں نے پہلی مرتبہ لکھا ہے۔

جی رافیہ! ہمارے ہاں یہ ان کا پہلا افسانہ تھا۔

سمیعہ سحر قریشی نے ضلع ہاول نگر سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

رقص بسل بڑھا۔ ولید بے چارے کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ ایک تھی مثال۔ مثال اپنے فیصلے پر قائم رہی۔ میرے بے خبر میرے بے نشان بھی پسند آیا۔ اس میں مجھے کلی کا کردار بہت اچھا لگا۔ تم ساتھ رہنا۔ تو بہت ہی اچھا ناول تھا۔ شعاع کی جان ”غریق رحمت“ پڑھا پر یہ کیا باقی آیدہ؟

افسانے بھی بہت پسند آئے۔ اور جو سب سے زیادہ پسند آیا وہ ہے۔ انتخاب اور یہ کہ آبی جی بالوں کو دھونے کے لیے جو آئینہ۔ رہنما اور سب کا کالی کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ کس طرح کریں۔ ضرور بتائے گا۔ انڈیوز اچھے اچھے لیا کریں۔ مثلاً ”نقد مصطفیٰ یعنی جعفری صبا قرمر۔

شادی کرے اور وہ بھی ایسے لڑکے کے ساتھ جس کے باب کا ہی پتا نہیں ہے۔

کائنات! مغرور ہر کسی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ٹائٹل اچھا لگا۔ ویسے ٹائٹل گرل کے ہونٹ تو نارمل تھے پھر بھلا آپ اسٹک اتنا آؤٹ کیوں تھی۔ پھر نئے سال کی دہلیز پر آکر لکھے ہوئے۔ ہمیں ناہی ماہ و سال کے گزرنے سے کوئی فرق پڑتا ہے اور ناہی بدلتے موسموں سے کسی نے کیا خوب کہا کہ ”سال ختم ہونے سے کچھ نہیں ہوتا

صرف ہند سے بدلتے ہیں مقدروں کے لکھے تھوڑی تا بدلتے ہیں۔ ہماری زندگیاں تو ویسے بھی ٹھہرے پانیوں کی طرح ہیں۔ سروے میں ایک قاری بسن کے جوابات تو لکھے مگر ان کا نام نہیں تھا۔ وہ اپنے رشتے کے حوالے سے اتنا پریشان کیوں تھیں۔ ہمارے یہاں بھی لڑکیوں سے پوچھے بغیر ان کے والدین رشتہ طے کر دیتے ہیں۔ بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میں مشرقی عورت اسپیشلسی اپنی برادری کی عورتوں کو سیلوٹ پیش کرتی ہوں۔

”رقص بسل“ پڑھا لگتا ہے۔ نبیلہ عزیز بے دلی ہے لکھ رہی ہیں۔ ”ایک تھی مثال“ کیا اولاد باپ کی نہیں ہوتی؟ حقیقت میں میں نے دیکھا ہے کہ جب ماں ہوتا ہے تو باپ بھی ہے۔ ورنہ نہیں یارم میں یقین ہے کہ لاسٹ میں سب ٹھیک ہو گا۔ اینڈ میں سب اچھا کیوں جاتا ہے کیونکہ حقیقت تو یہ نہیں ہے۔ مرمم عزیز نے خونی رشتوں کی۔ فاک کی کو واضح الفاظ میں بیان کیا سحر ساجد۔ ناول کا نام ”بے نوب آبا“ ہونا چاہیے تھا۔ ”میرے بے خبر میرے بے نشان“ چہ چہ حشمت زیدی رشتوں کو دولت کے ترازو میں تولتا ہوا۔

حمیرا نوشین پہلے مفت مشورہ لیں کہانی کو اس طرح ہونا چاہیے تھا کہ ممنا بھنا بچوں سے چڑتی تھیں نا تو بچوں کے دل میں بے لیے پیار ہونا چاہیے تھا۔ وہ اپنے بچوں کا اچھا رویہ دیکھ کر کچھ تائیں۔

اعتذار

رخسانہ نگار عندنان کے ناول ”ایک تھی مثال“ کی قسط تاخیر سے موصول ہونے کے باعث شامل اشاعت نہ ہو سکی۔ اس کے لیے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

دو سراحصہ اتنی جلدی شائع ہو گا۔ پلیز نمبر احمد سے کہیں کہ ”جنت کے پتے“ کا دو سراحصہ لکھیں۔ لیکن اتنے سال نہ لگائیں کہ ہم بوڑھے ہو جائیں۔ سمیرا احمد کو کیا کہوں میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ اتنا زیادہ ظلم عالیان اور امرد کے ساتھ۔ رلا دیا قسم ہے۔ پلیز مثال کے ساتھ اب اتنا ظلم نہ کریں اور ”رقصِ بل“ میں تیمور بہت غصہ آتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو اتنا بھی ڈی گریڈ نہ کرے اور آپ سے نمبر احمد کے انٹرویو کی فرمائش کی تھی ہمب پورا کریں گی۔

پیاری صبا اور فوزیہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے شعاع کے ساتھ ساتھ خواتین بھی پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ نمل مکمل ہو جانے دیں۔ ان شاء اللہ نمبر احمد کا انٹرویو ضرور شائع کریں گے۔

ملتان سے سدرہ تنول شریک محفل ہیں لکھا ہے ”یارم“ کے بارے میں پہلی قسط سے لکھتا چاہ رہی تھی، لیکن وقت کی کمی اور پوسٹ کا مسئلہ۔ کارل کا کردار سب سے مزے کا ہے۔ امرد کی حرکتیں اور اس کی عجیب و غریب سی بد دعائیں جہاں ہمیں ہنسنے پر مجبور کرتی تھیں، آج وہی امرد ہمیں رلا رہی ہے۔ سروے بھی اچھا تھا۔ اور مثال کے ساتھ کچھ زیادہ ہی برا ہو رہا ہے رخسانہ نگار اپنی ہر ہیروئن کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں (سوری رخسانہ جی) نئے سال پر کوئی نیا سلسلہ شروع کریں (جس میں میں بھی شامل ہو سکوں)۔

پیاری سدرہ! ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے آپ سے کوئی جھوٹا وعدہ کیا تھا، اچھا ہوتا کہ آپ ہمیں یاد دلاتیں۔ ہم اتنے خط بڑھتے اور شائع کرتے ہیں کہ ساری باتیں یاد رکھنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ یارم آجندہ ماہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی صرف ایک قسط باقی ہے۔ امرد آپ کو رلا رہی ہے۔ اس کا ہمیں بھی دکھ تو ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو کردار رلاتے ہیں وہ قارئین کو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

✽

سمیعہ جی! آپ ان تینوں چیزوں کو بھگودیں، پھر رہنمائی نکال کر پیسٹ بنالیں۔ بالوں میں لگائیں۔ آدھے گھنٹے بعد سردھولیں۔ انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچائی جا رہی ہے۔

صبا خان اور فوزیہ شکیل سسٹرن۔ سہلا ٹٹ ٹاؤن میرپور خاص سندھ سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع اور خواتین ہمارے پسندیدہ ترین ڈائجسٹ ہیں۔ کیونکہ نمبر اندھ شعاع چھوڑ کر خواتین میں شفٹ ہو گئی ہیں اور اب انہیں عمیرہ احمد نے بھی خواتین کی شان بڑھادی ہے۔ ”آبِ نیات“ پڑھ کر یقین نہیں آیا کہ ”پیر کامل“

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف مرکز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس و فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپس ممکن نہیں ہوگی۔

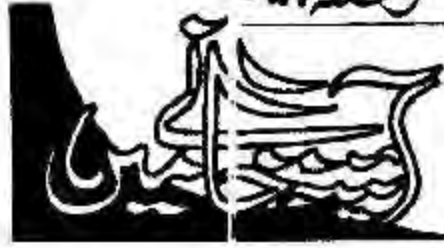
6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع

37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین، ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہوئے۔ ناولے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کہن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ذیلی چینل پر ڈراما ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط بہ کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔



بعد منظر سے غائب ہو گئے اب ایک طویل عرصے کے بعد وہ اپنی ٹیلی فلم محافظ کے ذریعے دوبارہ شوہر میں آچکے ہیں، لیکن اب وہ فلم کے پردے پر جلوہ گر ہوں گے۔ حسن وقاص رانا کی یلغار کے علاوہ عاشر عظیم نے خود بھی فلم بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ”مالک“ جی یہ نام ہے عاشر کی اس فلم کا جس کی کہانی بھی عاشر عظیم نے خود لکھی ہے اور اس کی ہدایت بھی وہ خود دیں گے۔ (یعنی یہ فلم انڈسٹری کے لیے دھواں جیسی کوئی زبردست چیز ہوگی۔) عاشر عظیم نے اس کے لیے فنکار بھی ٹی وی سے ہی لیے ہیں، فردان علی آغا، ساجد حسن، حسن نیازی اور سب سے بکوج کے نام فاسٹل کیے جا چکے ہیں (ہیں! ہم تو سمجھے تھے کہ نیبل اور نازی نصر کے نام تجھی ہوں گے اس میں لیکن۔۔؟) یہ تمام فنکار پہلی مرتبہ فلم میں کام کریں گے۔

جواب

آج کل ہر طرف عامر خان کی ”پی کے“ کا چرچا



پیا دلیس

لیجے جناب ایک اور اداکارہ پیا دلیس سدھار گئیں، جی ہم بات کر رہے ہیں صنم سعید کی، ان کی شادی فرحان حسن کے ساتھ گزشتہ دنوں لاہور میں انجام پائی۔ ان کے شوہر ان کے بچپن کے دوست ہیں۔ یہ شادی دونوں نمائندوں کی باہمی رضامندی سے ہوئی ہے۔ فرحان حسن ورلڈ بینک میں ملازمت کرتے ہیں اور امریکا سے شادی کرنے کے لیے خصوصی طور پر لاہور آئے تھے۔

صنم سعید: ننوں نے اپنے کیریئر کا آغاز ماڈلنگ سے کیا، پھر ٹی وی پر اداکاری کی اور اب صنم فلم انڈسٹری میں اپنے فلمی کیریئر کا بھی آغاز کر رہی ہیں۔ انجم شہزاد کی فلم میں صنم کے ساتھ ایمان علی اور فہد مصطفیٰ مرکزی کردار ادا کر رہے ہیں۔

واپسی

راتوں رات پی ٹی وی کوئٹہ کی سیریل ”دھواں“ کے ذریعے شہرت حاصل کرنے والے عاشر عظیم اپنی بھرپور اداکارانہ صلاحیتوں کے باوجود سیریل دھواں کے

تھے ان کی وجہ سے تو انہوں نے شرمندہ ہونے کے بجائے حمائمہ سے بد تمیزی کی۔ (ان کی نوکری کو کوئی خطرہ تھوڑی تھا جو وہ شرمندہ ہوتے۔!) اس صورت حال میں دیگر مسافروں نے بھی حمائمہ کا ساتھ دیا۔ حد تو یہ ہوئی کہ ایک مسافر نے موبائل پر اس سارے منظر کو قید کر لیا۔ لیکن قومی ایر لائن کے پائلٹ اور انجینئر پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

ذہمائد

میکال ذوالفقار کا کہنا ہے کہ ”بھارتی ڈراما“ ان کی اپنی فلموں سے متاثر ہے۔ جس میں ایک خیالی دنیا ہوئی ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے۔ ”میکال نے مزید کہا کہ ”میں بھارتی فلموں اور ڈراموں میں ضرور کام کرنا چاہتا ہوں (ہائے ہمارے فنکاروں کے ارمان) مگر میں بولڈ مناظر عکس بند نہیں کراؤں گا (ابھی کام ملا نہیں اور شرطیں۔۔۔ واہ جی واہ۔!) میکال کا کہنا ہے کہ اچھے ڈرامے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا موضوع صرف قتل و غارت گری یا محبوب کی بے وفائی ہی ہو۔ (تو؟) آپ اب ڈراما لکھیں نا بھی ان موضوعات سے ہٹ کر۔)

تبدیلی

عتیقہ اوڈھو کہتی ہیں کہ اب انہیں سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں رہی (بھئی کا سیمٹکس کا بزنس جو کر رہی ہیں۔) انہوں نے کہا کہ سیاست کچھ دواور کچھ لو کا نام ہے (یہ چلن تو ہر جگہ ہے) جب کہ میں سیدھی سادی فطرت کی مالک ہوں (آہم۔ آہم۔) چنانچہ اب میں اس پیچھے پر پہنچی ہوں کہ میں اچھی سیاست دان نہیں بن سکتی۔ عتیقہ نے مزید کہا کہ ہمارے معاشرے میں زیادہ تر مرد نہیں چاہتے کہ عورت سیاست کے میدان میں کامیاب ہو (آپ کے منہ سے یہ باتیں کچھ عجیب لگ رہی ہیں کہ مرد؟) اسی لیے عورتوں کے راستے میں کئی رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں (کیا کنٹینر لگا کر؟) عتیقہ نے کہا کہ جب تک

ہے عام رخان نے ”پی کے“ کا کردار بہت اچھے انداز میں کیا ہے، وہ ایک دوسرے سیارے کی مخلوق بنے ہیں جو اپنا ریموٹ کھو بیٹھتا ہے جس کے ذریعے وہ واپس اپنے سیارے پر جاسکتا ہے۔ اب اس ریموٹ کی تلاش کی جدوجہد اسے مختلف مذاہب کے بارے میں جاننے کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ اس تلاش و جستجو میں وہ مختلف ڈھونگیوں اور مذہبی گروہوں سے ملتا ہے جو مذہب کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس فلم کے ایک سین میں وہ کردار لی کے کئی بوی پر آب مذہب کے ماننے والے سے کہتا ہے کہ ”میں کہتا ہوں کہ ہمیں اس بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے جس نے ہمیں بنایا ہے اور تم کہتے ہو کہ ہمیں اس بھگوان کی پوجا کرنی چاہیے جسے تم نے خود بنایا ہے۔“ یہ فلم کا سب سے متاثر کن اور مضبوط سین ہے۔ (اسی وجہ سے اس فلم پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔) اس سین میں پی کے آگے کہتا ہے کہ ”تم کہتے ہو کہ مسلمان دھوکا دیتا ہے میں کہتا ہوں کہ مسلمان دھوکا نہیں دے سکتا۔“ یہ مسلمانوں اور خاص کر بھارتی مسلمانوں کے حق میں بہت اچھی آواز ہے کہ جب مسلمانوں کے خلاف آواز اٹھائی جا رہی تھی تو اس پروپیگنڈے کا اس سے بڑا جواب نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ بھارت میں نریندر مودی جیسے انتہا پسند کو منتخب کیا گیا ہو۔

ڈھٹائی

پچھلے دنوں حمائمہ ملک اپنی قومی ایر لائن میں سوار ہوئیں، ہائی ویر گزر گئی، لیکن جہاز نے اڑنے کا نام نہیں لیا۔ سب پریشان ہو رہے تھے۔ سوا گھنٹے کے بعد یہ خبر آئی کہ جہاز کے عملے کے تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے فلائٹ لیٹ ہوئی ہے۔ حمائمہ ملک فوراً اگلے حصے میں پہنچیں، جہاں سے پائلٹ اور فلائٹ انجینئر خراماں نرلماں چلے آ رہے تھے (بھئی اپنی قومی ایر لائن در ہے۔!) جب حمائمہ نے ان سے یہ پوچھا کہ وہ تاخیر سے کیوں آئے ہیں؟ سارے مسافر پریشان

اٹھتی اور پھر وہیں ڈھیر ہو جاتی۔

(حفیظ اللہ نیازی۔ جنگ)

تجزیہ کیا جائے تو پاکستان میں ٹیلی ویژن صحافت کا ایک ایسا بھیانک چہرہ ہے جسے اگر اس صحافت کے ذمے دار خود بھی غور سے دیکھ لیں تو ڈر جائیں۔

(شاہنواز فاروقی۔ فرانی ڈے اسپیشل)

شیخ رشید صاحب کی پیش گوئیاں فال نکالنے والے طوطے کی طرح ہوتی ہیں یا اس جعلی پیر کی طرح جس نے اود کے لیے کسی کو تعویذ لکھ دیا تھا لڑکانہ لڑکی۔

لڑکا ہو گیا یہ تاویل کہ ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا ”نہ لڑکی“ لڑکی ہوئی تو یہ کہ ہم نے کہا نہ تھا ”لڑکانہ“ یعنی لڑکانہ نہیں بلکہ لڑکی ہوگی اگر مجھ نہ ہو تو یہ دلیل ”تعویذ میں صاف لکھا ہے“ لڑکانہ لڑکی ”یعنی کچھ نہیں ہونے کا۔ پرویز مشرف کے وزیر اطلاعات بن کر موصوف نے بہت ڈھنگ سیکھ لیے ہیں۔

(بین السطور۔ جسارت)



فنا کی زندگی میں تبدیلی نہ آئے وہ کچھ نہیں سیکھتا اور تبدیلی پیدا کیے بغیر وہ لوگوں کے دلوں میں گھر بھی نہیں کر سکتا۔ (عتیقہ کہیں آپ عمران خان کی ”تبدیلی“ بھی نہ سمجھ جیسی تبدیلی کی بات تو نہیں کر رہی ہیں لیکن ایسی تبدیلیاں تو آپ بھی کر چکی ہیں تو کچھ سیکھا آپ نے؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ مگرام جیل کے ایک قیدی سراب خان کا چشم دید بیان ”جنورانی کی ایک بیخ بستہ صبح عافیہ کو جیل کے باریک لباس میں گھسیٹ کر والان میں لا کر بیٹھ دیا۔ عافیہ ہلک رہی تھی اس کی چیخ دیکار سے سارے قیدی جاگ گئے۔ ہم لوگ سلاخوں کے ساتھ لگ کر ذات باری سے رحم رحم کی بھیک مانگ رہے تھے عافیہ کا پورا جسم آہنی زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا نظر آیا۔ گرم گپڑوں میں جھپکنوں، لمبے جوتوں، اونٹنیوں سے مزین درجنوں سی آئی اے اہلکار اور سٹی القلب امریکی فوجیوں نے برفانی پانی کی بالٹیاں عافیہ پر اندھیل دیں۔ ایک گارڈ رائفل کے پچلے حصے سے مسلسل مار رہا تھا، حکم نامہ کہ جیل کے والان کے چکر لگاؤ۔ عافیہ بمشکل



طالع محمد علی

روم اور نیو

روم کا جابر و سنگدل بادشاہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ درباری سوچ رہے تھے کہ نہ جانے اب کون سی مصیبت آنے والی ہے۔ کیوں کہ جب کبھی بادشاہ ایسی سوچ میں گم ہوتا تو کوئی نہ کوئی ظلم یا کھیل تفریح کے لیے ضرور سوچتا تھا۔ اچانک تل میں بادشاہ کی آواز گونجی۔ ”میں روم کو دوبارہ تعمیر کرواؤں گا۔“

”کیا؟“ درباری حیران ہو گئے۔ ایک درباری نے عرض کیا۔ ”جناب عالی! روم تو پہلے ہی فن تعمیر کا شاہکار ہے اس کی مزید تعمیر کیا معنی؟“

”مزید تعمیر نہیں۔“ بادشاہ نے کہا۔ ”اس کو تباہ کر کے دوبارہ تعمیر کرواؤں گا۔“ بادشاہ نے زور سے جواب دیا۔

ایک درباری نے آہستہ سے کہا کہ لوگ کہاں جائیں گے۔ غرض کہ درباریوں نے ہزاروں خدشات کا اظہار کر کے بادشاہ کو اس عمل سے روکنے کی کوشش کی، لیکن بادشاہ اپنی بات پر قائم رہا اور درباریوں کو دھمکی دی کہ جو اس بات کی مخالفت کرے گا اس کا یہ فعل بغاوت سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اپنی خاص فوج کو حکم دیا کہ رات کے اندھیرے میں شہر کے مختلف حصوں میں آگ لگادی جائے تاکہ شہر مکمل طور پر تباہ ہو جائے۔ اس طرح نئے سرے سے شہر کی تعمیر ہوگی اور مجھے ایک وافر تفریح دیکھنے کو بھی ملے گی۔

حکم کی تعمیل ہوئی۔ لوگ آگ لگتے ہی بدحواسی میں جان بچانے کے لیے گھروں سے نکل کر بھاگے۔ لیکن کوئی امرانا اپنے کنبے کے مکمل افراد کے ساتھ محفوظ مقامات پر نہ پہنچ سکا۔ کسی کا باپ، کسی کی ماں، کسی کی بہن، کسی کا بھائی ایک دوسرے سے پھڑکے،

اور کئی لوگ آگ میں بھلس گئے۔ ادھر یہ قیامت خیز افراتفری کا منظر تھا۔ دوسری طرف بادشاہ روم نے اپنے محل میں تاریکی کا راج کر رکھا تھا اور محل کے سارے دروازے کھول دیے گئے تاکہ شہر کا منظر ظلم کی روشن اسکرین کی طرح نظر آئے اور بادشاہ اس خوفناک سین کو بغیر کسی دقت کے دیکھ سکے۔ اس لطف کو مزید برصانے کے لیے اس نے محفل موسیقی کا بھی انتظام کیا تھا۔ بادشاہ خود بھی بانسری بجا رہا تھا۔

آگ محل تک پہنچ گئی تو بادشاہ خفیہ راستے سے نکل گیا۔ پورا شہر جل کر خاکستر ہو گیا۔ ہزاروں انسان جیتے جی موت کے منہ میں چلے گئے۔

اس ظالم حکمران کا نام نیو تھا۔ انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے ”روم جل رہا تھا اور نیو بانسری بجا رہا تھا۔“ یہ مقولہ اسی واقعے کی یاد دلاتا ہے۔

روم کے جل جانے کے بعد شہر کی دوبارہ تعمیر کے لیے نیو نے دولت کو پانی کی طرح بہانا شروع کیا۔ لیکن بھی مچی رعایا اب اس ظالم بادشاہ کو ختم کر دینا چاہتی تھی۔ نیو کے خلاف بغاوت، شروع ہوئی تو بغاوت کی خبر سن کر نیو رعایا کو سمجھا۔ نے یونان سے روم واپس آیا۔ لیکن غصے سے بھرے عوام نے اس کے محل کا محاصرہ کر لیا۔ نیو بڑی مشکل سے جان بچا کر اپنے ملازم کے ساتھ اس کے گاؤں چلا آیا۔ لیکن یہاں بھی یاغیوں نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ آخر کار وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن دوسروں کے جسموں کو اذیت دینے والے کھیلوں کے بادشاہ کے لیے خود کو موت کے گھاٹ اتارنا مشکل ہو گیا۔ جب کہ اس نے اپنی اذیت پسند فطرت کو تسکین دینے کے لیے ”میکسم تھیٹر“ کی بنیاد رکھی تھی۔ جہاں صرف اذیت کے مناظر سے

تسکین حاصل کرنے والے جذبے کی تکمیل کے لیے روزانہ کئی لوگوں کو زندہ درگور کیا جاتا تھا۔

جب نیو خدپر خنجر اٹھانے لگا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ آخر اس کے بے حد وفادار ملازم نے آگے بڑھ کر خود ہی خنجر اس کی گردن میں گھونپ دیا۔

(بشری سجاد)

سیب کی خواہش

”ایک سیب چاہیے! ایک سیب کھانے کو مل جاتا تو مجھے تسکین ہو جاتی۔ نہیں سچ مجھے ایک سیب لا دو!“ ایک بیوی نے اپنے شوہر کو سیب کا مطالبہ کر کے

پریشان کر دیا۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانے کی بات ہے کہ ایک کسان کی بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ وہ غریب جھنگ کے علاقے میں رہتا تھا۔ بیوی نے جو سیب کی خواہش کی تو بڑا پریشان ہوا۔ بستی میں کہیں سیب نہ ملا تو کسی نے کہا کہ بستی کے باہر ایک سوداگر آیا ہوا ہے۔ اس سے پوچھ لو شاید سیب مل جائے۔ وہ سوداگر کے پراؤ پر پہنچا۔ اس کے کارندوں نے کہا۔ ہمارے پاس تو نہیں شاید ہمارے مالک کے پاس ہو۔ ہوتے ہوتے وہ کسان سوداگر تک جا پہنچا۔ سوداگر گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے تھا۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا تھا۔ ایسا کایاں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کسان کی بیوی کے بچہ ہونے والا ہے۔ اسے سیب کھانے کی خواہش ہو رہی ہے۔ اس نے کسان سے کہا۔ ”یہ لوسیپ موجود ہے۔ مگر ایک شرط پر سیب تمہیں دیتا ہوں۔“ کسان نے کہا۔ ”وہ کیا؟“

سوداگر بولا۔ ”میرے تجارتی مال پر جو ٹیکس لگتا ہے وہ پوری مملکت میں معاف کیا جائے۔“ کسان نے جواب دیا۔ ”میری کیا مجال کہ تمہاری بات مانوں۔“ سوداگر بولا۔ ”تو بس ایک سفارش مجھے لکھ دے۔ میں یہ معافی آج نہیں چاہتا۔ تیرا بیٹا جب بڑا ہو کر وہ کچھ بن جائے گا جو میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں تب میں یا میری اولاد تیری لکھی ہوئی سفارش اسے بتا کر اپنا مطلب

حاصل کر لیں گے۔“ کسان نے بڑی خوشی سے تحریر پر انگوٹھا لگایا اور سیب لے کر چلتا ہوا۔

مغلیہ سلطنت میں دو شخص وزیر اعظم ہوئے۔ ایک ابو الفضل اور دوسرا سعد اللہ۔ دونوں اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر یہاں تک پہنچے۔ دونوں ذہین و فطین تھے۔

نواب سعد اللہ خان لکھتے ہیں کہ میں جب ذرا کھینے کودنے کے قابل ہوا تو کسان باپ نے کہا کہ گائے بھینس چرایا کرو! اس زمانے میں مجھے مکتب جانے والے ہم عمروں پر بڑا رشک آتا تھا۔ وہ رہ کے دل میں ہو کر اکتی کہ کاش میں بھی پڑھ سکتا! ایک دن گائے بھینسوں کو چراتے چراتے میں ایک جگہ گھاس پر لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے کہا کہ۔ دلی جا اور پڑھائی شروع کر! یہ بات میں نے اپنے باپ سے کہہ سنائی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ شاید ایسے سوداگر کی بات یاد آگئی جو مجھے اس وقت معلوم نہ تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بولا۔ ”جانا ہے تو دلی چلا جا۔ خواہش میری بھی یہی ہے کہ تو پڑھ لکھ کر کچھ بن جا۔“ اگلی بات پلے باندھ لے کہ میں غریب ہوں۔ پیسہ نکا تجھے بھیج نہیں سکتا۔ نہ سفر خرچ دے سکتا ہوں۔“

دیوانے کو تو ہو چاہیے۔ سعد اللہ خان کو اتنی بات کافی تھی۔ تین مہینے پیدل چل کر اور دنیا بھر کے دھکے کھا کر لڑکھن میں وہ دلی پہنچ گیا۔ اور ایک مسجد کے کتب میں پڑھنے لگا۔ دن محنت، مزدوری میں گزارتا اور راتوں کو پڑھائی ہوتی۔ کئی سال اسی طرح گزرے تو جہانگیر کا بیٹا شاہاب الدین محمد شاہجہاں کا لقب اختیار کر کے تخت پر بیٹھا۔ اسی دنوں شاہ ایران نے ایک خط بھیجا کہ۔ تم تو ہند کے بلو شاہ ہو پھر سارے جہان کے بادشاہ۔ شاہجہاں کھانے کے تم کیسے مستحق ہوئے ہم کوئی تم سے کم ہیں؟ بہتر یہ ہے کہ تم فوراً ”یہ لقب بدل دو۔ وہ خط دربار میں پڑھا گیا تو شاہجہاں نے کہا کہ۔ تم لوگ اس کا جواب لکھو۔ درباریوں نے بہت عرصہ لڑایا، مگر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ آخر بلو شاہ نے حکم دیا کہ دلی

ایک دن ایک بوڑھا سوداگر اس سے ملنے آیا اور ایک تحریر اسے پیش کی۔ سعد اللہ خان نے اس کی بڑی آج بھگت کی اور تمام سلطنت مغلیہ میں اس کے سامان تجارت پر محصول معاف کر دیا۔

احتیاط

ایک دن امیر المومنین منصور نے یزید بن مسلم سے ابو مسلم کے بارے میں مشورہ کیا۔ یزید نے کہا۔ ”امیر المومنین کی عمر بڑا ہو۔ مناسب یہ ہے کہ اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے تاکہ اس کے فرخشاں سے نجات مل جائے۔“

یہ سن کر منصور خفا ہو کر بولا۔ ”تیری زبان جل جائے یہ کیا کہہ رہا ہے اگر تیرے درینہ حقوق ہم پر نہ ہوتے تو جو سزا تو اس کے لیے تجویز کر رہا ہے ہم تیرے لیے تجویز کرتے۔“

یہ کہہ کر اسے حکم دیا گیا کہ وہ نظروں سے دور ہو جائے۔

ان باتوں کو ایک مدت گزرنے کے بعد جب منصور نے ابو مسلم کو قتل کر دیا تو یزید بن مسلم کو بلوایا اور پوچھا۔

”تمہیں یاد ہے کہ ایک بار ہم نے ابو مسلم کے بارے میں تم سے مشورہ لیا تھا اور تم نے اسے ٹھکانے لگانے کا مشورہ دیا تھا؟“

یزید نے جواب دیا۔ ”میں کیوں کر بھول سکتا ہوں۔“

منصور بولا۔ ”شاید تمہیں معلوم نہ ہو کہ تم نے جو مشورہ دیا تھا وہی معقول تھا، لیکن میں نے بناوٹی غصے کا اظہار کیا۔ اس خیال سے کہ یہ بات کسی کے سامنے تمہاری زبان سے نہ نکل جائے۔ پھلتے پھلتے ابو مسلم تک پہنچ جائے اور وہ میرے ہاتھ نہ آئے۔ اس لیے باوجود اس کے کہ تم نے بہترین رائے دی تھی۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ اسے ظاہر نہ ہونے دیا جائے۔“



کے مکتبوں میں اس کی اطلاع کرا دی جائے تاکہ اسے ناد اور ان کے شاگرد اس کا جواب لکھیں۔ سعد اللہ خان کی جماعت میں جب یہ فرمان سنایا گیا تو سب جواب لکھنے میں لگ گئے۔ سعد اللہ خان نے کاغذ پر اپنا نام دہتا لکھ کر جواب لکھا کہ ہند اور حمان کے اعدا برابر ہیں۔ اس لیے شاہ ہند کو زیبا ہے کہ شاہ حمان کھلائے۔ یہ ہند میں ہ کے پانچ۔ ن کے پچاس ور کے چار عدد ہوتے ہیں۔ جملہ انٹھ بنتے ہیں۔ جہاں میں ج۔ کے تین ہ کے پانچ۔ الف کا ایک اور ن۔ کے پچاس جملہ انٹھ ہوتے ہیں۔

استاد نے یہ جواب پسند نہ کیا اور سب سے یہ ہے جواب راہ کر شاہی محل بھیج دیا۔ اتفاق سے بادشاہ کے ہاتھوں میں جب یہ پلندہ آیا تو آخری کاغذ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس نے اٹھا کر سب سے پہلے اس کو پڑھا تو یہ سعد اللہ خان کا جواب تھا۔ بادشاہ کو یہی جواب پڑ آیا۔ اس نے حکم بھیجا کہ سعد اللہ آج سے ہمارے ذاتی عملے میں شامل کر لیا جائے۔ یہ تقرر کیا ہوا سعد اللہ خان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ترقی کے دروازے کھول دیے۔ پھر بہت جلد سعد اللہ خان مغلیہ سلطنت کا وزیر اعظم بن گیا۔

سچے خیر خواہان

حکمت عبداللہ



قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

کی اور بی ایڈ کے کورس کے لیے علامہ اقبال یونیورسٹی سے منسلک ہو گئی۔ شعاع سے وابستگی برقرار رہی۔ اس کی والدہ اپنے چھوٹے موٹے کام خود کرنے لگیں۔ جون 2008ء میں اس کے لیے جدہ میں مقیم ایک آرکیٹیکٹ کارشہ آگیا جو ہر لحاظ سے بہتر لگا۔ پھر لڑکے نے پاکستان میں سہیل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سب نے مشورہ دیا کہ فرض کی ادائیگی میں دیر نہ کی جائے۔ یوں میری غم گسار، ہم راز اور نخت جگر مجھ سے بچھڑ گئی۔ اب وہ آمنہ اور علیزہ کی ماما ہے۔ اس کی ہر بات ان ہی سے شروع ہوتی ہے اور ان ہی پر ختم۔ آج آمنہ نے یہ کیا تو علیزہ نے وہ۔ ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے اسے وقت ہی نہیں ملتا۔ وہ ان معصوم گلیوں میں گمن ہو کر اکثر ہمیں بھی بھول جاتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں نے ان رسائل کو بند نہیں کیا۔ ہر مہینے ہا کر باقاعدگی سے ہمیں دے جاتا ہے۔ میں پانچ سال سے ان کا قاری ہوں۔ انہیں پڑھے بغیر مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ شعاع کے اس سلسلے میں حصہ لینے کا یہ پہلا موقع ہے۔ شامل اشاعت ہو یا ردی کی زیست۔

2۔ ہماری صبح حسب معمول نماز سے ہوتی ہے۔ بیگم تبیج پکڑ و ظیفے میں مشغول ہو جاتی ہیں اور میں چھوٹے سے لان میں چہل قدمی کر لیتا ہوں۔ اس اشاعت میں رضیہ سلطانہ (ملازمہ) آ جاتی ہے اور وہ بیگم کی زیر نگرانی گھر کا نظام سنبھال دیتی ہے۔ میں دو گھنٹوں کے لیے سو جاتا ہوں۔ اتنی دیر میں ناشتا تیار ہو جاتا ہے۔ ناشتے کے بعد میں کلینک کا رخ کرتا ہوں۔ رات کو جب واپس آتا ہوں تو رضیہ اپنے شوہر کے ساتھ جا چکی ہوتی ہے۔ میں عشاء کی

1۔ پیٹھے کے لحاظ سے میں ایک ڈاکٹر ہوں اور لاہور کے مضافاتی علاقے فریدنگر میں رہائش پذیر ہوں۔ اس کے واحد بازار میں میرا کلینک واقع ہے۔ یہ علاقہ دریائے راوی سے متصل ہے اور قدرے پسماندہ اور گردلو ہے۔ کے کارخانے ہیں۔ یہاں طبی سہولتوں کا فقدان ہے۔ اس مٹی کا قرض چکانے کے لیے میں نے اپنی پریکٹس کا آغاز اسی علاقے سے کیا اور تیس سال کا عرصہ ہو گیا، میں مصروف خدمت ہوں۔ اگرچہ میری مالی حالت اوسط درجے کی ہے۔ لیکن محبت و شفقت کا دولت بے بہا ہے جس سے طمانیت قلب حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں میں سے ایک رحمت میری چھوٹی بیٹی شائلہ رضا (اب شائلہ امجد) ہے جس نے میری زندگی کے انتہائی نازک دور میں میرا بڑا سہارا دیا۔ مجھے اور میرے گھر کو بکھرنے سے بچایا۔ اس کی والدہ کو 2004ء میں فالج نے مکمل طور پر زیر کر لیا۔ وہ سن اور دیکھ سکتی تھیں۔ لیکن گویائی متاثر ہو گئی تھی۔ یہ بچی سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا اور رات رات بھر جاگ کر ماں کی خدمت کی۔ ان کے پٹنگ کے پاس کرسی ڈال کر بیٹھی رہتی۔ اس نے نہ صرف ماں کا خیال رکھا۔ آنے والے مہمانوں کو بھی سنبھالا۔ میرے معمولات میں میرا بہ حد ساتھ دیا۔ تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع نہ ہونے دیا۔ پرائیویٹ تیاری شروع کر دی۔ نہ جانے کب اس کی دوستی شعاع اور خواتین ڈائجسٹ اور دوسرے رسائل سے ہو گئی۔ وہ خود بھی مطالعہ کرتی اور ماں و بھی منتخب چیزیں پڑھ کر سناتی۔ بیگم کے مزاج میں خوشگوار تبدیلی جھلکنے لگی۔ چڑچڑے پن کی جگہ مسکراہٹ سے ہمارا واسطہ پڑنے لگا۔ صحت یابی کا رفتار میں اُسی تیزی آ گئی۔ پہلے ہاتھوں میں جان پڑی۔ پھر پاؤں حرکت کرنا شروع ہوئے، پھر واکر کے سہارے۔ صحن میں چہل قدمی ہونے لگی۔ اس تین سال کے عرصے کے دوران شائلہ نے بی اے میں کامیابی حاصل

نماز ادا کرتا ہوں۔ اتنے میں بیگم کھانا گرم کر لیتی ہیں۔ کھانے کے بعد وہ لیٹ جاتی ہیں اور میں اسٹڈی میں پہنچ جاتا ہوں۔ ہلکی آواز میں میوزک سنتے ہوئے شعاع، خواتین ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتا ہوں۔ پھر کچھ دیر بعد نیند آجاتی ہے۔ صبح فجر کی اذان کے وقت جاگ جاتا ہوں۔

3۔ ذاتی زندگی میں بہت حساس، سنجیدہ اور ہمدرد ٹائپ شخص ہوں۔ اسی لیے بچے بڑے مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ بیگم جب زندہ لاش کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ بہت سی مہمان خواتین و مرد حضرات دوسری شادی کے لیے بے شمار جواز پیش کرتے تھے۔ وہ افادیت بیان کرتے تھکاتے نہیں تھے۔ میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ جو میری زندگی میں اکیس سال شامل ہے۔ اس سے منہ موڑ کر نئی ہم سفر تلاش کروں۔ اللہ کے فضل سے میں یہ سلامت اس دور سے گزر گیا۔ اسلام آباد اور دل میں بڑی جنگ ہوئی۔ آخر کار وفاتِ دل حیت گیا۔

کسی بھی جریدے کی مقبولیت اور کامیابی میں جہاں ادارے اور مصنفین کی کاوشیں شامل ہوتی ہیں وہیں قارئین کی پذیرائی اور آرا بھی چار چاند لگانے کی وجہ بنتی ہیں۔ قارئین کی توجہ بھی عملے میں نئی روح اور لگن کا باعث بنتی ہے۔ شعاع کے قارئین کے خطوط بہت لطف دیتے ہیں۔ میری پسندیدہ مصنفین کی لسٹ کافی لمبی ہے۔ محترمہ نسیم سحر قریشی، رفعت ناہید، سجاد، نگہت، عبداللہ، ناہید سلطانہ اختر، نمرہ احمد، فرحت اشتیاق، عنبرہ سید، انیسہ سلیم اور آسیہ رازی شامل ہیں۔ باقی بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آج کل صائمہ اکرم، چوہدری اور سائرہ رضا کے چرچے ہیں۔ کینر نووی، فاترہ افتخار اور رخسانہ نگار بھی اچھا لکھتی ہیں۔ قارئین میں انیسہ، نوال افضل، گھمن، نمرہ، اقرا، آمنہ اجالا، کرن شبیر، قرۃ العین رائے اور نوشین اقبال نوشی اور دوسری خواتین کا انتخاب اور رائے عمدہ ہوتے ہیں۔ ایک محترمہ تھیں سیدہ نسبت زہرہ گیلانی ان کے تبصرے کہاں کے ہوتے تھے۔ وہ آج کل کدھر غائب۔

ہیں۔

4۔ خوبیاں اور خامیاں نژاد سرے ہی جتا سکتے ہیں۔ اپنے لیے تجزیاتی رائے دینا بہت مشکل ہے۔ میری بیٹی سمجھتی ہے کہ آپ کی عداوت و اطوار ”شہر ذات“ ڈرامے کی ہیروئن سے ملنے جلتے ہیں۔ وہ بھی آپ کی طرح ہمدرد اور حساس ہے۔

5۔ زندگی اس قدر مصروف ہے کہ ساون کے پکوانوں کا لطف لینا بہت مشکل ہے۔ صبح اٹھ کر پتا چلتا ہے کہ رات بارش ہوئی تھی۔

6۔ جہاں تک لطیفوں کا تعلق ہے تو طنز و مزاح سے بھرپور بہت کتابیں میرے ذخیرہ کتب میں موجود ہیں۔ ویسے مجھے عطاء الحق قاسمی کی تحریریں بہت پسند ہیں۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی میٹروپول

1۔ یادوں کی شمع روشن کی تو نئے موسموں کی اوٹ سے پرانے مناظر دکھنے لگے۔ ہر یاد ایک ایک کر کے ذہن پر دستک دینے لگی۔ شعاع سے میرا تعارف میری فرینڈ نے کرایا۔ جب میں بی اے میں تھی۔ تین سال تک سیکنڈ ہینڈ لے کر پڑھتی رہی۔ پھر جب خط لکھنے کا شوق پیدا ہوا تو فروری 2010ء سے باقاعدگی سے پڑھنا شروع کیا۔

شعاع کے حوالے سے ایک اہم واقعہ میرے ذہن میں آ رہا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ میں اپنے کزن اسامہ سے رسالہ منگواتی ہوں، ایک دفعہ میں نے اسامہ کو 2 تاریخ کو میسج دیے کہ کل اپنے ساتھ رسالہ لے آئے، کیونکہ مجھے عموماً 3 تاریخ تک رسالہ مل جاتا ہے۔ مگر تین تاریخ کو جب اسامہ آیا تو خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا۔ ”رسالہ کہاں ہے؟“ اسامہ نے کہا۔ ”نہیں ملا، پانچ تاریخ تک آئے گا“ پانچ تاریخ کو میں نے اسامہ کو ایس ایم ایس کیا۔ ”رسالہ ملا یا نہیں؟“ تو جواب ملا ”ہاں مل گیا ہے“ لیکن میں نے کسی دوست کی دکان میں رکھا تھا اور وہیں بھول گیا اور شاید وہ شاپ تین چار دن بند رہے گی۔ یہ سن کر میں پریشان ہو گئی، تو اسامہ نے کہا۔ ”21 جلدی کیا ہے، مل جائے گا تو آرام سے پڑھ لینا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے پڑھ کر خط

کوئی ڈرامہ فیورٹ رائٹر کا ہو تو وہ ڈرامہ مس نہیں کرتی۔

3 شعاع کے ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی تحریر ایسی ضرور ہوتی ہے جو دل چھو لینے والی اور متاثر کن ضرور ہوتی ہے۔ جیسے رخسانہ نگار عدنان کے ناول ”زندگی اک روشنی“ نے مجھے بہت اسسپائر کیا۔ فرحت اشتیاق کے ناول ”بن روئے آنسو اور جو بچے ہے سنگ سمٹ لو“ میرے موسٹ فیورٹ ناول رہے اور نمرہ احمد کے ناول میں ”قراقرم کا آج محل“ اور ”جنت کے پتے“ ایک خوب صورت یاد بن کر دل پر نقش ہیں۔ صوفیہ بشیر کا ناول ”اداس چاند“ دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے علاوہ نبیلہ ابرار راجہ کا ناول ”زندگی کے رنگ“ اور نبیلہ عزیز کے ناول میں کردار مہمان نائے نی اور نہ برت بے نیازی“ اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ تحریریں ہمارے ذہنوں پر برسوں حاوی رہیں گی۔ نبیلہ عزیز کے ناول مائے نی پڑھ کر دل بہت دیر تک الجھا جب مومو کی ڈھتھہ ہوئی! ابھی تک یہ بات ذہن میں گردش کرتی رہتی ہے کہ کاش! مومو کی ڈھتھہ نہ ہوتی۔

4 جہاں تک میری خوبیوں اور خامیوں کا تعلق ہے تو میں کلیوں کی طرح نرم و نازک ہوں، تو کبھی چٹان کی طرح مضبوط، کبھی بہار کی طرح رنگین، تو کبھی خزاں کے زرد پتوں کی طرح اداس۔ میں ضدی طبیعت کی مالک ہوں، کلنی حد تک انا پرست، ہوں، موڈی ہوں اور اگر ایک بار ناراض ہو جاؤں تو جب تک کوئی پہل نہ کرے بات نہیں کرتی۔ خویہیں میں۔ بہت ہی حساس طبیعت کی مالک ہوں، بہت نفاست پسند ہوں۔ صائمہ نے کہا کہ میرا دل بہت بڑا ہے۔ کھل کر خراج کرتی ہوں۔ ندائے کہا اپنے آپ میں رہتی ہوں۔ بہت فرینڈلی ہوں، تعریفی جملہ۔ سمجھنے والے، گھر میں جب کسی کی طبیعت خراب ہو تو سب گھبراتے ہیں، لیکن تم نہیں گھبراتیں۔ بلکہ اس سچویشن کو بہت اچھی طرح ہینڈل کرتی ہوں۔“



لکھتا ہوتا ہے پندرہ تاریخ تک۔ میری پریشانی دیکھ کر اسامہ دو سرار سالہ لینے گیا۔ لیکن اب وہ شاپ پر بھی ختم ہو گیا تھا۔ ان دو سالوں میں پہلی بار ایسا ہوا کہ شعاع کی کسی بھی تحریر پر تبصرہ نہیں کر سکی، کیونکہ رسالہ چودہ تاریخ کو مجھے ملا تھا۔“

2 میری زندگی میں صبح کا آغاز ابو کی آواز پر ہوتا ہے جو نماز کے لیے جگا رہے ہوتے ہیں۔ نماز کے بعد ایک گھنٹے کے لیے سو جاتی ہوں، پھر اٹھ کر امی کی پہلپ کرتی ہوں۔ ابو کے آفس جانے کے بعد صبح صبح چھت پہ جا کر پودوں کو پانی دیتی ہوں، ان کے ساتھ باتیں کرتی ہوں، سبزہ دیکھ کر موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے۔ امی نے ہم بہنوں کی باری منظر کی ہے۔ میں چھت اور سیڑھیوں کی صفائی کرتی ہوں اور ہفتے میں دو یا تین بار گراؤنڈ فلور کی تفصیلی صفائی کرتی ہوں۔ ندائی کے ساتھ کچن کی صفائی اور رات کے کھانے کی تیاری کرتی ہے، جبکہ رباب ان کی پہلپ کرتی ہے اور صائمہ سیکنڈ فلور کی صفائی کرتی ہے۔ دوپہر کے کھانے کا کچھ خاص انتظام نہیں ہوتا ہے، لیکن اگر کچھ بنانا ہو تو صائمہ ہی بنالیتی ہے۔ میں اس دوران فریش ہو کر شعاع کے لیے تھوڑا وقت نکال لیتی ہوں۔ ظہر کی نماز پڑھ کر سب اکٹھے کھانا کھا کر باتیں کرتے ہیں یا ریسٹ کرتے ہیں۔ جبکہ میرا یہ وقت صرف شعاع کے لیے ہی ہوتا ہے۔

پھر دو گھنٹے تک ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ بچوں کے جانے کے بعد عصر اور مغرب کی نماز پڑھتی ہوں۔ تھوڑا وقت اپنے بھانجے محمد راحیل کو دیتی ہوں۔ میں رات کا کھانا کبھی کبھار ہی بناتی ہوں۔ کیونکہ ابو کو تو صرف امی کے ہاتھ کے کھانے ہی پسند ہیں۔ البتہ اگر ابو کا چائیز کھا۔ نے کاموڈ ہو تو میں شوق اور دل لگا کر بناتی ہوں۔ رات کے کھانے کے بعد جس کی باری ہو وہ برتن دھوتی ہے۔

عشاء کی نماز کے بعد رات ساڑھے بارہ بجے تک پھر شعاع پڑھتی ہوں۔ شعاع تنہائی میں ہی پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ مائے مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ ریڈیو سننا اچھا لگتا ہے۔ ٹی وی دیکھنے کا خاص شوق نہیں، مگر



مَوَہ کے پکوان خالد جیلانی

پالک کے پرائٹھے

ضروری اجزا :

پالک

دودھ تازہ بالائی

چکن کیویز

میدہ آنا

نمک، گھی

ترکیب :

پالک، دھو کر باریک کاٹ لیں اور دودھ ڈال کر پکنے دیں۔
دودھ خشک ہو جائے تو اتار کر ٹھنڈا کر لیں اور پیں۔
اس کے بعد چکن کیویز کو اچھی طرح پالک میں ملا لیں۔
میدے اور آٹا میں نمک اور ایک کپ گھی ملا لیں۔ اس کو
پانی یا دودھ سے قدرے سخت گوندھ لیں اور تھوڑی دیر کے
لیے رکھ دیں۔ اب مناسب سائز کے پیڑے بنالیں۔ روٹی
تیل کر درمیان سے آدھا کاٹ لیں۔ روٹی پر بالائی آٹا
لگا میں۔ پھر پالک کی تہ لگا کر رول کرنا شروع کریں۔ اور

تکون شیب میں عمل کر کے اوپر سے دبا کر دوبارہ پیڑے کی
شیب بنالیں۔ سارے پیڑے اسی طرح بنالیں۔ پھر تیل کر
گرم توے پر گولڈن مل کر اتار لیں۔ گرم گرم پیش کریں۔
کھڑے مسالے کا پلاؤ

ضروری اجزا :

مٹن

چاول

دہی

پیاز

چھوٹی بڑی الائچی

تیزیات لونگ

سونف، ثابت دھنیا

تیل، نمک

ترکیب :

مکمل کے کپڑے میں ثابت دھنیا، سونف، آدھی مقدار
میں لونگ، دار چینی، تیزیات، سیاہ مرچ بڑی اور چھوٹی

ایک کلو
ایک کلو
ایک پاؤ
تین عدد
پانچ پانچ عدد
چار چار عدد
ایک کھانے کا چمچ
حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

قیمہ میں نمائز، دو پیاز، اورک، لہسن، لال مرچ، گرم مسالا، بیسن ڈال کر پیس لیں اور کباب بنالیں۔ دیکھی میں تیل گرم کریں۔ باقی پیاز لچھے دار کٹ کر گول کئے نمائزوں کے ساتھ تہہ لگائیں، پھر کباب رکھیں، پھر پیاز، نمائز کی تہہ لگائیں، پھر کباب رکھیں۔ اور بیسن منٹ دم پر رکھ دیں۔

چپاتی اور رانتے کے ساتھ پیش کریں۔
کیلے کا میٹھا

ضروری اجزا :

کیلے
دودھ
چینی
کافی
فریش کریم
کارن فلور
اخروٹ
چھ عدد
آدھا لیٹر
ایک کپ
دو گمانے کے چمچے
ایک پیکٹ
دو گمانے کے چمچے
حسب ضرورت

ترکیب :

چینی میں دودھ اور چینی ملا کر پکائیں، تھوڑے سے ٹھنڈے دودھ میں کارن فلور حل کریں اور اسے پورے دودھ میں ملا کر پکائیں۔ مسلسل چمچ چلاتی رہیں۔ فریش کریم میں کافی ملا کر پھینٹیں اور دودھ والے آمیزے میں شامل کر دیں۔ ٹھنڈا کرنے کے لیے فریج میں رکھیں۔ پھر اس میں کئے ہوئے کیلے، کریم اور اخروٹ شامل کریں اور مزید ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔



سراوق کی شخصیت

ماڈل ----- رابعہ جمیل
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ----- موسیٰ رضا

الپچی باندھ کر پونلی بنالیں۔ ایک دیکھی میں گوشت، پونلی اور پانی شامل کر کے اتنا پکائیں کہ گوشت گل جائے، پھر پونلی کو نچوڑ لیں اور چھلنی کی مدد سے گوشت اور نیچنی علیحدہ کریں۔

الگ ہتلی میں تیل گرم کر کے پیاز براؤن کریں، پھر اورک، لہسن اور آدھی مقدار میں بجا ہوا گرم مسالا ہری مرچیں اور گوشت شامل کر کے اچھی طرح بھونیں، پھر بھیکے ہوئے ہال کے ساتھ نمک اور نیچنی شامل کریں۔ جب پانی خشک ہو جائے تو اس کے اوپر زردے کا رنگ ڈال کر چاول کو دم پر رکھ دیں۔ رانتے کے ساتھ پیش کریں۔

اسپیگنھی سوپ

ضروری اجزا :

اسپیگنھی
نمائز کا پیسٹ
پیاز
نیچنی
نمک
مکھن
آدھا پیکٹ
ایک کپ
ایک عدد
چار کپ
حسب ذائقہ
دو گمانے کے چمچے

ترکیب :

اسپیگنھی اہال کر رکھ لیں۔ الگ برتن میں مکھن گرم کر کے پیاز فرانی کریں پھر نمائز کا پیسٹ اور نیچنی ڈال کر پکائیں۔ سوپ گاڑھا ہو جائے تو نمک اور سیاہ مرچ ڈال کر نمکس کر دیں۔ پیالے میں اسپیگنھی ڈال کر سوپ ڈالیں اور پود۔ پنے سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

قیمہ کباب مسالا

ضروری اجزا :

قیمہ
نمائز
اورک، لہسن، پیسٹ
لال مرچ، گرم مسالا
پیاز
بیسن
نمک، تیل
آدھا کلو
دو عدد
ایک کھانے کا چمچ
آدھا، آدھا چائے کا چمچ
پانچ عدد
دو کھانے کے چمچے
حسب ذائقہ ضرورت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بھی ملا لیں۔ اس آمیزے کو چہرے پر لگالیں۔ تقریباً
بیس منٹ کے بعد چہرہ نیم گرم پانی سے دھو لیں۔
مناسب جسم

جسم خواہ کتنا ہی مناسب ہو مگر برصا ہوا پیٹ ساری
خوبصورتی اور دلکشی کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے، پیٹ کم
کرنے کے لیے نہار منہ سارہ چائے (بغیر دودھ اور شکر
کے) میں چوتھائی لیموں کا رس شامل کر کے روزانہ
ایک ماہ پابندی سے پیئیں تو برصا ہوا پیٹ کم ہو جائے
گا۔ اس کے علاوہ بڑھے ہوئے پیٹ کے لیے ایک
انتہائی آسان ورزش ذیل میں درج ہے۔ اس ورزش کا
دہرہ فائدہ حاصل ہو گا۔ ایک تو برصا پیٹ کم ہو جائے
گا۔ دوسرے اگر ٹانگیں وزنی ہیں تو ان کے وزن میں
بھی کمی واقع ہوگی۔

زمین پر سیدھی لیٹ جائیں۔ ٹانگوں کو ہوا میں بلند
کر کے سائیکل کی طرح چلائیں۔ یہ عمل سو سے ڈیڑھ
سو مرتبہ کریں۔ ابتدا میں جتنی باریہ عمل کر سکتی ہیں
کریں پھر آہستہ آہستہ برصا کر سو مرتبہ کر دیں۔ دو
مہینوں میں خاطر خواہ اثر پڑے گا۔ اس کے ساتھ غذا کو
متوازن رکھیں تاکہ ورزش بہتر اثر کر سکے۔
(ایسی خواتین جنہیں سانس یا قلب کا مرض لاحق

ہو ڈاکٹر کے مشورے سے بغیر یہ ورزش نہ کریں)

صحت مند اور روشن آنکھیں

آنکھیں چہرے کو خوب صورت بنانے میں کافی
اہمیت کی حامل ہیں اسی لیے ان کا صحت مند اور روشن
رہنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں رات کو سوتے وقت
اصلی شہد (اگر شہد نیم کے درخت کا حاصل کردہ ہو تو
اثر بہتر ہو گا) ایک ایک سلامتی دونوں آنکھوں میں
پھیر لیں۔ اس سے نہ صرف آنکھیں روشن اور صحت
مند ہوں گی بلکہ بینائی بھی بہتر ہو جائے گی۔

روزانہ صبح ٹھنڈا پانی تین دفعہ آنکھوں میں ڈالنے
سے بھی بینائی اور آنکھوں کی صحت پر مجموعی اثر پڑے
گا۔



چہرے کی دلکشی کے لیے

چہرے پر جھریاں عموماً "عمر میں اضافے یا پھر زیادہ
دھوپ میں رہنے سے پڑ جاتی ہیں۔ عمر میں اضافہ نموالی
کاتو کوئی علاج ممکن نہیں، لیکن جھریاں اگر دھوپ کی
وجہ سے ہیں تو کوشش کریں کہ دھوپ میں کم ٹکلا
کریں۔ اس کے علاوہ دھوپ میں نکلنے سے پہلے چہرے
پر اچھے سن بلاک کا استعمال کریں۔

تاکہ چہرے کی قدرتی نمی برقرار رہے۔
جھریوں سے بچنے کے لیے بہت ہی سستا اور آسان
ماسک گھر پر بھی تیار ہو سکتا ہے۔

چہرے کی دال لے کر پیس لیں یعنی موٹا چور بنا لیں۔
پھر اس میں ایک انڈے کی سفیدی جو کہ پہلے ہی سے
جھاگ کی شکل میں پھینٹ لی گئی ہو اور تھوڑا سا شہد